# شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
# کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال مکمل ہونے پر

کی

## خصوصی اشاعت

۱۵/دسمبر ۲۰۱۳ء — ۱۰/صفر ۱۴۳۵ھ

ترتیب و پیشکش
**محمد سالم جامعی**
خادم ادارۂ تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی

شائع کردہ

**ہفت روزہ الجمعیۃ** مدنی ہال، ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲

قیمت:-/100 روپے

# فہرست مضامین

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد سالم جامعی

# تحریک ریشمی رومال نمبر

یہ ایک سچائی ہے کہ جو قوم اپنی تاریخ بھلا دیتی ہے اس کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ بھی اسی المیہ سے دوچار ہے۔ مسلمانوں نے ہندستان کو اپنے آٹھ سو سالہ دورِ اقتدار میں کیا دیا اس کو تو چھوڑ دیجیے اس کے بارے میں تو آج ہماری نوجوان نسل کو ہی خود کوئی دلچسپی نہیں ہے، انھیں اگر کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ جتنا انھیں متعصب مغربی مورخین اور اپنے ملک کے فرقہ پرست مصنّفین نے اپنی کتابوں کے ذریعہ بتا دیا ہے اور جس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمان غاصب کی حیثیت سے داخل ہوئے اور ہندستانی عوام کی سادہ لوحی اور ان کے اختلافات کا فائدہ اُٹھا کر اس کے حکمراں بن بیٹھے۔ یہ ہی سوچ تھی جس نے ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے سقوط اور انگریزی سامراج کے اقتدار پر نہ صرف ملک کے اکثریتی عوام کو خاموش تماشائی بنائے رکھا بلکہ ایک طرح سے ان کے دلوں میں انگریزی سامراج کے تعلق سے ہمدردی و خیر خواہی کے جذبات بھی پیدا کر دیئے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا جس کے اوّلین شاگرد رشید کا اسم گرامی محمود حسن دیوبندی تھا۔ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ سے جو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار و مقام کے حامل تھے، آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ آپ ہی مولانا نانوتویؒ کے علوم و افکار کے امین ثابت ہوئے خاص طور پر جہادِ حریت کی جو شمع آپ کے محترم استاذ نے روشن کی تھی آپ نے اس شمع کی روشنی کو نہ صرف اندرونِ ملک پھیلا دیا بلکہ اس روشنی کو آپ بیرونِ ملک تک لے گئے اور اس طرح حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے جنونِ حریت نے ملک کو دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ایک با مقصد تحریک عطا کر دی جس کے نتیجے میں ۱۸۶۶ء میں قائم ہونے والا یہ ایک چھوٹا سا مدرسۂ عربی کچھ ہی عرصہ میں ایک بڑا دارالعلوم بن گیا اور پھر یہ ادارہ صرف تعلیم اور کتاب و سنت کے مرکز تک محدود نہ رہ کر تحریک آزادی کا ایک بڑا مرکز بھی بن گیا جہاں تعلیم و تعلّم کے ساتھ آزادی کے متوالوں کی تربیت اور ذہن سازی کا فریضہ بھی انجام پانے لگا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ بھی اسی دارالعلوم کے تربیت یافتہ تھے جس کی وجہ سے آپ کے سینہ میں وطن کی آزادی کا جذبہ موجزن تھا۔ اسی جذبۂ حریت نے جو آپ کے اساتذہ کی نظر خاص کا مرہونِ منّت تھا اس منظّم اور باضابطہ تحریک کی بنیاد ڈالی جسے تحریک ریشمی رومال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد انگریزی سامراج کے خلاف ایک ایسی جدوجہد کا آغاز تھا جس کے ذریعہ اندرونِ ملک بغاوت کے ساتھ بیرونِ ملک سے حملہ کی تیاری کرنا تھا، اس کے

لیے حضرت شیخ الہندؒ نے انتہائی خاموشی اور راز داری کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں میں مراکز قائم کیے۔ان مراکز پر پیغام رسانی کا پروگرام طے کیا گیا جس کے لیے ریشمی رومال کا انتخاب ہوا۔ریشمی رومال تحریک کے کمانڈرانچیف حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے پیغام تیار کرنے کا کام حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سپرد تھا۔اس تحریک کے نتیجہ میں مجاہدین اندرونِ ملک بغاوت پر کمر بستہ تھے مگر چونکہ بیرونی حملے کے بغیر کامیابی کا امکان نہیں تھا اس لیے پہلے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان، ترکی اور جرمنی بھیجا گیا۔انھوں نے ان ملکوں میں ماحول سازی کی، پھر بیرونی امداد کو یقینی بنانے کے لیے خود حضرت شیخ الہندؒ انتہائی راز داری اور احتیاط کے ساتھ حجاز کے لیے روانہ ہوئے جہاں آپ نے ترکی گورنر سے ملاقات کرکے انھیں اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی۔

تحریک کی راز داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ جو اس وقت مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے اور مسجد نبوی میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد شاگرد ہونے کے باوجود ان سرگرمیوں سے بے خبر تھے، مگر افسوس کہ یہ راز افشا ہوگیا اور پنجاب کے گورنر مائیکل ایڈوائر کے ہاتھ وہ تین خطوط پڑ گئے جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنے قیامِ افغانستان کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کو اپنی سرگرمیوں کے متعلق بھیجے تھے۔یہ تینوں خطوط ایک زرد ریشمی کپڑے پر تحریر تھے۔حضرت شیخ الہندؒ اس دوران حجاز کے لیے روانہ ہوچکے تھے اور چونکہ اس وقت حجاز پر ترکی کی حکمرانی تھی اس لیے انگریزی سامراج حضرت شیخ الہندؒ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ایک طرف ہندستان میں مولانا سندھیؒ کے بھیجے ہوئے خطوط پکڑے گئے اور دوسری طرف شریف مکہ کی بغاوت کے نتیجہ میں حجاز سے ترکی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔پھر کیا تھا حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء گرفتار کرلیے گئے اور اس طرح انگریزی سامراج ریشمی رومال تحریک کی دھار کند کرنے میں کامیاب ہوگیا اور وہ تحریک جس نے انگریزی اقتدار کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں بے اثر ہوکر رہ گئی۔اس طرح ریشمی رومال تحریک ہندستان کی تحریک آزادی کا ایک ایسا باب ہے جس سے پورے ہندستان کی تاریخ روشن ہے۔یہ ہی وہ تحریک تھی جس نے ہندستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک آزادی کی شمع روشن کردی تھی اور جس نے غلامی کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کا آغاز کیا تھا۔

یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہماری آج کی نسل ریشمی رومال تحریک تو کیا اس بات سے بھی واقف نہیں ہے کہ اس ملک کو آزاد کرانے میں ہمارے آبا واجداد کا کیا رول تھا اور انھوں نے اس کے لیے کیا قربانیاں دی تھیں۔۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا آغاز مسلمانوں کے ذریعہ ہی عمل میں آیا تھا جس کی قیادت علمائے کرام کے ہاتھوں میں تھی۔ تحریک آزادی کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور علماء نے فتویٰ جاری کردیا کہ ملک کو انگریزی سامراج سے چھٹکارا دلانا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے جس سے تحریک پاکر نہ معلوم کتنے مسلمانوں نے ہندستان کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کردیں۔یہ مسلمان ہی تھے جن کے جذبۂ آزادی سے تحریک پاکر دوسرے برادرانِ وطن نے تحریک آزادی

میں شرکت کی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران بڑی تعداد میں مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر کے نہ معلوم کتنے لوگوں کو عبور دریا شور کی سزا دی گئی اور نہ معلوم کتنے مسلمانوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس دور کے تاریخ نویسوں نے مسلمانوں کی قربانیوں کے بارے میں جو لکھا ہے وہ اس پر شاہد عدل کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس بد دیانتی کا کیا کیا جائے کہ آج مسلمانوں کی اس تاریخ کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھلایا جارہا ہے اور تاریخ کو مسخ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کا کوئی رول نہیں ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کے نتیجہ میں سرکاری حلقوں میں تحریک آزادی میں مسلمانوں کے رول کی اہمیت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ ابھی گزشتہ سال ۲۰۱۲ء میں وزارتِ مواصلات کی طرف سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی تحریک آزادی میں عظیم خدمات کے اعتراف میں ان پر ڈاک ٹکٹ کا اجراء عمل میں آیا تھا اور اس سال ۱۱؍جنوری ۲۰۱۳ء کو ملک کو آزادی کی روشنی عطا کرنے والی ریشمی رومال تحریک کی یاد میں حکومت نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام نئی دہلی کے معروف وگیان بھون میں ریشمی رومال تحریک کے جشن صد سالہ کے موقع پر صدرِ جمہوریہ ہند مسٹر پرنب مکھرجی کے ہاتھوں یہ ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔

ریشمی رومال تحریک کا آغاز حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۳ء میں فرمایا تھا۔ یہ ہی وہ تحریک تھی جس کے ذریعہ ملک کی آزادی کے لیے ایک ایسی شمع جلائی گئی تھی جس کی روشنی میں سفر کرتے ہوئے ہندستان کو آزادی کی دولت میسر آئی۔ حضرت شیخ الہندؒ اس تحریک کے روحِ رواں تھے جنھوں نے اس کی پاداش میں مسلسل تین سالوں تک مالٹا میں سخت قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، پھر جیل سے رہائی کے بعد ہندستان واپس آ کر بھی انتہائی بیماری، ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود آپ کا یہ مشن جاری رہا۔ آپ نے اسی حال میں دیوبند سے علی گڑھ کا سفر کیا اور وہاں تحریک ترک موالات کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی جو آج نئی دہلی کے اوکھلا میں ایک اقلیتی یونیورسٹی کی شکل میں مسلم نوجوانوں کو زیورِ علم سے آراستہ کر رہی ہے۔

زیر نظر ہفت روزہ 'الجمعیۃ' کی یہ خصوصی اشاعت 'تحریک ریشمی رومال نمبر' آپ کے سامنے ہے جس میں تحریک ریشمی رومال، اس کے بانی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ، تحریک ریشمی رومال کے جانباز سپاہی حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور تحریک کی پاداش میں قید و بند کی زندگی گزارنے والے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا عزیر گلؒ، حضرت مولانا وحید احمد صاحبؒ اور حکیم نصرت حسینؒ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ہم اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں یہ فیصلہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑ رہے ہیں تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ وقت کی تنگی اور کاموں کے ہجوم کی وجہ سے ہم اس اشاعت کو اس کی شایانِ شان نہیں بنا سکے ہیں جس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو قبول فرمائے اور ملت کے لیے نفع بخش بنائے، آمین۔ ❑❑

## ہندستان دار الحرب ہے لہٰذا ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ

# اجنبی طاقت کے خلاف اعلانِ جنگ کردے

## ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ جہاد

اٹھارہویں صدی کی شام کو جب ہندستانی عظمت کا آفتاب غروب ہورہا تھا اس وقت غلامی کی شب تاریک تیزی سے پورے ملک پر چھارہی تھی اور انگریز اقتدار کی صبح صادق نمودار ہورہی تھی۔

اب آزادیِ وطن کی سونی بزم میں صرف مرہٹی اقتدار کی ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع باقی تھی۔ لال قلعہ میں جو کچھ اُجالا تھا وہ اسی کا عکس تھا۔ ایک چراغ شمال مغربی علاقہ میں بھیگ رہا تھا۔ یہ راجہ رنجیت سنگھ کا چراغ تھا۔ مسلمانوں کی تمام قابلِ ذکر طاقتیں ختم ہوچکی تھیں۔ جو ختم نہیں ہوئی تھیں وہ مفلوج ہوکر انگریزی اقتدار کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ ۱۸۰۰ء کے آخر میں لارڈ لیک، انگریزی فوجوں کو لے کر دہلی کی طرف بڑھا۔ سندھیا کی فوجیں شاہی اقتدار کی محافظ تھیں۔ وہ سینہ سپر ہوئیں، مگر انگریز کی فوجی طاقت مرہٹوں کی قوت اشارے سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ مجبوراً شکست خوردہ دہلی نے انگریزوں کا استقبال کیا۔ لارڈ لیک نے دہلی پر تسلط کرکے شاہ عالم سے ایک نیا معاہدہ کیا۔ سندھیا پیچھے ہٹا تو ہلکر اور امیر علی خاں آگے بڑھے، مگر دہلی کے محاذ پر ان کو بھی شکست ہوئی تو سکھوں کی بہادری کا صدقہ لینے کے لیے پنجاب پہنچے۔ ان کو یہاں کچھ مالی امداد تو مل سکی مگر فوجی امداد کے لیے کوئی سردار تیار نہیں ہوا۔ بڑی امید مہاراجہ رنجیت سنگھ سے تھی، اس نے بھی صاف انکار کردیا۔

اب مجبوراً ان کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور ۱۸۰۶ء میں لارڈ لیک سے ایک معاہدہ کرکے اپنے ملک واپس ہوئے، مگر انگریزوں کے خلاف غم وغصہ کی جو آگ ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی وہ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ پورے ہندستان میں کوئی نہیں تھا جو ان کی ہمنوائی کرتا۔ صرف ایک راجہ اور ایک فقیر ان کا ہمنوا تھا۔ راجہ مادھو جی سندھیا اور فقیر شاہ عبدالعزیز۔ ہلکر اور سندھیا کی باہمی رقابت وعداوت تاریخ کا مشہور افسانہ ہے۔ اس رقابت نے ان کو الگ الگ کر رکھا تھا لیکن انگریزوں کی مخالفت ایک مشترک مقصد تھی جس نے ان تینوں امیر علی خاں، ہلکر اور سندھیا کو متحد کردیا تھا۔

۱۷۵۶ء میں جب پٹنہ اور بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ (اودھ) اور شاہ عالم کو شکست ہوچکی تھی تو فوراً ہی دہلی پر قبضہ کرلینا بھی مشکل نہیں تھا کیونکہ انگریزوں کی فوجی طاقت اتنی ترقی کرچکی تھی کہ وہ آسانی سے یہ پروگرام کامیاب کرسکتے تھے۔ مگر انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرنے والوں کو اپنی موت مرنے دیا جائے، اس کو گولی کا نشانہ بناکر بلاضرورت کارتوس خراب نہ کیا جائے۔ چنانچہ انگریز مدبرین وہ زہریلے نسخے تو استعمال کرتے رہے جو مرض کو مہلک بناکر موت کو یقینی بنادیں، مگر اس کے روادار نہیں ہوئے کہ فوجی قوت کے ذریعہ ایک سال بعد مرنے والوں کو آج ہی ختم کردیں۔ ان کے تجارتی مقاصد کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ زراندوزی اور ملک گیری کے وہ راستے نہ اختیار کریں جن سے عوام میں بددلی پیدا ہو۔ جب ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا تو یہاں بھی اس سوچی سمجھی اور طے شدہ پالیسی سے کام لیا گیا۔ یعنی بادشاہ کو معزول کرنے اور شاہی تخت وتاج چھیننے کے بجائے بادشاہت کا وہ

نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو انگلستان کی آزاد پارلیمنٹ خود اپنے بادشاہ کے لیے طے کر چکی تھی اور جس پر خود انگریزوں کے وطن میں سالہا سال سے عمل ہو رہا تھا۔ یعنی بادشاہ کو تاج وتخت کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے صرف اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تسلیم کرا لیے گئے اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ ’’خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔‘‘

غور فرمایئے کہ کس قدر نازک پوزیشن ہے۔ خدا کی خدائی اور اس کی قدرتِ کاملہ تسلیم کر کے مذہب کا دامن بھی دونوں ہاتھوں سے تھام لیا گیا۔ مغل بادشاہ کی بادشاہت اور آل تیمور کی عظمت بھی محفوظ کر دی گئی۔ صرف کاروبارِ حکومت جو ہندو یا مسلمان، امراء اور وزراء کے حوالہ ہوا کرتا تھا، اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔۔ تہذیب اور کلچر کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ ان کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے بلکہ ہندوؤں کے سماجی معاملات پنڈتوں کے اور مسلمانوں کے معاشرتی قاضیوں کے سپرد کر کے ان کو کلچرل اٹانمی (تہذیبی خود مختاری) بھی دے دی گئی ہے۔ عوام تو عوام اس زمانہ کے خواص بھی اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے تھے جو سابق امراء اور وزراء کے اختیارات یا انگلستان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے درمیان تھا۔ ان کی نظر مذہب، تہذیب اور بادشاہ پر تھی۔ یہ سب محفوظ تھے۔ لہٰذا ایک نہایت ہی نازک سوال تھا کہ موجودہ حالت کو آزادی کہا جائے یا غلامی۔ اسلامی قوانین کی رو سے پیچیدہ سوال یہ ہے کہ اب ہندستان کو دارالاسلام مانا جائے جیسا کہ پہلے تھا یا دارالحرب کہا جائے۔ جہاں برسرِ اقتدار طاقت سے جنگ کرنا یا اس ملک سے نکل جانا مذہباً فرض ہے، یا اس کو دارالامن مانا جائے جہاں اگرچہ حکومت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہے اور مذہبی آزادی ان کو حاصل ہے اور اس بنا پر حکومت سے جنگ کرنا درست نہیں ہے۔

بہر حال ایک نہایت ہی پیچیدہ سوال تھا جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی سیاسی مفکرین اور علمائے کرام کے سامنے آیا۔ اس سوال کے جواب میں اختلافِ رائے ہو سکتا تھا اور انگریز جیسی شاطر اور ڈپلومیٹک قوم کے لیے نہایت آسان تھا کہ اس اختلاف سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کو گمراہ کر لے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہوئی۔ مگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (قدس اللہ سرہٗ العزیز) کی سیاسی درس گاہ کے تربیت یافتہ پختہ کار ایسے شعبدوں سے مسحور ہونے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اس پارٹی کے رہنما سیّدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فارسی زبان میں ایک فتویٰ صادر فرمایا جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:

’’یہاں عیسائی افسران کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظامات رعیت، خراج، باج، عشر و مال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے انتظامات، مقدمات کا تصفیہ، جرائم کی سزاؤں وغیرہ (یعنی سول، فوج، پولیس، دیوانی اور فوجداری معاملات، کسٹم اور ڈیوٹی وغیرہ) میں یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ ہندستانیوں کو ان کے بارے میں کوئی دخل نہیں۔ بے شک نمازِ جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤں جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور حریت کی بنیاد ہے (یعنی ضمیر اور رائے کی آزادی اور شہری آزادی) وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ عوام کی شہری آزادی ختم ہو چکی ہے۔ انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا ہندو ان کے پاسپورٹ اور پرمٹ کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتہ تک انھیں کی عمل داری ہے۔ بیشک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ، رام پور میں چونکہ وہاں کے فرماں رواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔‘‘

( مگراس سے پورے ملک کے دارالحرب ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ) ( فتاویٰ عزیزی فارسی، جلد اوّل، ص ۱۷، مطبوعہ مطبع مجتبائی )

ایک دوسرے فتویٰ میں بھی مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ہندستان کا دارالحرب ہونا ثابت کیا ہے۔ ( جلد اوّل، ص ۱۰۵، فتاویٰ عزیزی افارسی، مطبوعہ مطبع مجتبائی )

فتویٰ کی زبان مذہبی ہے کہ 'دارالحرب' کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر روح سیاسی ہے اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ:

۱- قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

۲- مذہب کا احترام ختم ہے۔

۳- اور شہری آزادی سلب کرلی گئی ہے۔

لہٰذا ہر محبِّ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلانِ جنگ کردے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کردے، اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔

اس موقع پر یہ حقیقت نظرانداز نہ ہونی چاہیے کہ نجف علی خاں کی وفات ( ۱۷۸۲ء ) کے بعد تقریباً بیس سال سے اقتدار مرہٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرہٹوں کا پیشوا ( مادھونرائن پھر باجی راؤ ) امیرالامراء تھا اور مادھوجی سندھیا نائب امیرالامرا اور جس طرح آج یہ اعلان ہورہا تھا کہ "حکم کمپنی بہادر کا" بیس سال پہلے سے دُنیا دیکھ رہی تھی کہ جو کچھ حکم تھا وہ پیشوا یا سندھیا کا تھا یعنی پایۂ تخت اور اس کے گردونواح میں ایک غیر مسلم طاقت یعنی مرہٹوں کا تسلط تھا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اوران کی پوری پارٹی دہلی میں موجود تھی، ان کے سامنے یہ سب کچھ ہورہا تھا۔ ان کے منہ میں زبان تھی اور ہاتھ میں قلم تھا۔ چنانچہ جن باتوں میں وہ مرہٹوں کے نظامِ حکومت سے ناراض تھے ان پر سخت سے سخت تنقید کی تھی۔ آج بھی وہ عربی اور فارسی کے اشعار سب موجود ہیں جن میں مرہٹوں پر گہری تنقید ہے، لیکن بایں ہمہ ان بیس سالوں میں نہ وطن عزیز کو دارالحرب قرار دیا اور نہ ہندستانیوں کے لیے "آزادی اور نہ ترکِ وطن" کا فتویٰ صادر کیا، بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کا جنگجو طبقہ جو شاہ عبدالعزیز صاحب سے گہری عقیدت رکھتا تھا یعنی روہیلہ پٹھان، ان کے تعلقات مرہٹوں سے اور زیادہ مضبوط ہوگئے۔ یہ بھی فراموش نہ ہونا چاہیے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو اذیتیں پہنچانے کی جو روایتیں نقل کی جاتی ہیں ان میں جس کا نام لیا جاتا ہے وہ نجف علی خاں ہے، جو انگریزوں کا پرانا وظیفہ خوار اور ان کا لایا ہوا وزیر تھا۔

فتوے کا اثر:

عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کرسکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو، ان کے لیے اب راستہ کھل گیا جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگجو طبقہ جابجا اس طاقت سے وابستہ ہوگیا جو اس وقت انگریزوں کے برسرِ پیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت ضرور مرہٹوں کی تھی۔

چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہوگئی اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان مرہٹوں کی فوج میں شامل ہوکر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہوگئے۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے خاص معتقد اور مرید سید احمد صاحب کو امیر علی خاں سنبھلی کے پاس بھیجا جو جسونت راؤ ہلکر کے ساتھ ایک عرصہ سے انگریزی طاقت پر شب خون مار رہے تھے۔

یہ ہی وہ عظیم فتویٰ ہے جس کے اثرات حضرت شیخ الہندؒ کی جدوجہد آزادی میں صاف اور نمایاں نظر آرہے ہیں۔ □□

# تحریک شیخ الہند سے روشناس کرانے کی ضرورت

## خطبۂ صدارت اکتیسواں اجلاس عام جمعیۃ علماء ہند کا اقتباس

ہمداردان ملک وقوم! آپ کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ اور مؤ قر اکابرو اسلاف کے روشن کارنامے حال کو بنانے اور مستقبل کی نقشہ گری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ اور اپنے اکابر کے نقوش حیات وخدمات کو گم کردیں گے تو ہم خود حالات وزمانے کے جنگل میں کھو جائیں گے۔ نئی نسل کی کامیابی میں بزرگوں کے کارناموں کی رہ نمائی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ ایسے ہی اکابرو اسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے جرأت ورہ نمائی اور ظلم وجبر کے خلاف جدوجہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک وقوم کو توقیر وبلندی ملتی ہے۔ تحریک آزادی ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برٹش سامراج کے خلاف جدوجہد کے روشن ابواب آتے ہیں۔ ۱۹ ویں صدی اور بیسویں صدی کی دو دہائی تک اگر غور سے دیکھا جائے، حضرت شیخ الہند دیو بندیؒ کی شخصیت اور فکر چھائی نظر آتی ہے۔ اس دور کی بیشتر عظیم شخصیات چاہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہوں، یا مولانا محمد علی جوہر، یا گاندھی جی، مولانا حسرت موہانی، یا دیگر سماجی، سیاسی، مذہبی شخصیات سب کے لیے حضرت شیخ الہندؒ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ مولانا عزیر گل، جیسے اعاظم رجال تو ان کے تلامذہ ہی تھے اور ان میں ہر ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا وتلامذہ نے ان کی رہ نمائی وقیادت میں ملک وقوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برٹش سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے کی جو عظیم جدوجہد کی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس بے توجہی اور بے اعتنائی و نافرض شناسی کا غلط نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے۔ اور ان کی تحریک نے ملک وملت کے وقار و معیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیاد سے محروم کردیا جائے، تو وہ فکر وعمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کر پائے گی۔ اب تو یہ حال ہوتا جا رہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اس کے مدنظر شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ”نام نیکاں ضائع مکن“ کی آواز لگاتے ہوئے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابرو اسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اس نیک مقصد کے پیش نظر سو سال پورے ہونے پر جمعیۃ علماء ہند نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی سمت میں قدم بڑھایا ہے اور طے کیا ہے کہ پورے ملک کے مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینارز کیے جائیں۔ اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ آبرومندانہ زندگی کی نیک خواہش اور اس کے لیے جدوجہد کی تاریخ ہمارے لیے راہ عمل کے تعین میں کسی حد تک رہ نمائی کرتی ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حالات وضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لاکر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔ یہ حالات کا تقاضا بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

## اکتیسواں اجلاسِ عام منعقدہ ۱۸-۱۹/مئی ۲۰۱۲ء، بمقام دہلی کی منظور کردہ

# تحریک شیخ الھند سے متعلق تجویز

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام تحریک آزادی کے معمار، قافلہ حریت کے سپہ سالار اور جمعیۃ علماء ہند کے فکری رہنما حضرت شیخ الھند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے کے موقع پر خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ان اکابر و اسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک و قوم کو توقیر و سربلندی ملتی ہے۔ تحریک آزادی ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے روشن ابواب آتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا و تلامذہ نے ان کی رہ نمائی وقیادت میں ملک و قوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برطانوی سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے میں جو عظیم قربانی دی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے ذکر کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس بے اعتنائی اور بزرگو ں کی قربانیوں سے عصبیت کی بنیاد پر صرف نظر کرنے کا یہ غلط نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے اور ان کی تحریک نے ملک وملت کے وقار و معیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیادوں سے محروم کردیا جائے، تو وہ فکر و عمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کرپائے گی۔ اب تو یہ حال ہوتا جارہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے فراموش کرتے جارہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کے رہ جائیں گے۔ اس کے مدنظر یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ:

۱. آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابر و اسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی غرض سے ملک بھر میں مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینار کیے جائیں۔ اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ با عزت زندگی کی نیک خواہش اور اس کے لیے جدوجہد کی تاریخ راہ عمل کے تعین میں کس حد تک رہ نمائی کرتی ہے اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔

۲. جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حال وضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لاکر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔

۳. حضرت شیخ الہند کے نام کسی یونیورسٹی کو منسوب کیا جائے

۴. نصاب کی کتابوں میں حضرت شیخ الہند کا تذکرہ شامل کیا جائے۔

# گوشۂ تحریک شیخ الہندؒ

انقلابی تحریکات میں ایک تحریک وہ ہے جسے 'ریشمی رومال تحریک' کہا جاتا ہے۔ محکمہ خفیہ کے کارپردازوں کو ہمہ دانی کا بہت کچھ دعویٰ ہے۔ ممکن ہے کسی تحریک کے متعلق یہ دعویٰ درست ہو مگر جہاں تک اس تحریک کا تعلق ہے یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ ایک خط جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا۔ وہ سی. آئی. ڈی کے ہاتھ لگ گیا۔ یہی خط سی. آئی. ڈی کی تجسّس و تفتیش کی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انھوں نے ایک عمارت کھڑی کی اور اس کا نام 'ریشمی خطوط والی تحریک' رکھ دیا۔ یہ بنیاد ہی بے بنیاد ہے تو جو عمارت اس پر کھڑی ہوگی وہ بھی سراسر ریگ کا تودہ ہوگی۔

سی. آئی. ڈی کی رپورٹوں کا ایک طومار ہے جو لندن کے 'انڈیا آفس' میں محفوظ تھا۔ انڈیا آفس سے وہ خارج (ریلریز) کیا گیا تو محترم مولانا موسیٰ بھائی کرماڈی اور اُن کے چند مخلص احباب نے اس کے 'فلم' لے لیے۔ یہ فلم 'جمعیۃ علماء ہند' کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کا ترجمہ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے ہے۔

یہ خط مولانا عبیداللہ سندھی کا لکھا ہوا تھا۔ سی. آئی. ڈی نے مولانا سندھی ہی کو اس تحریک کا بانی سمجھ لیا جو سراسر غلط ہے۔ اس خط کی بنیاد پر تحقیق و تفتیش کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بہت سے حضرات شبہ میں گرفتار کئے گئے۔ عرصہ تک ان کو کسی مقام پر نظر بند رکھا گیا یا جیل میں ڈال دیا گیا۔ تو محکمہ نے یہ سمجھا کہ ہماری جدوجہد نے تحریک کو ختم کر دیا حالانکہ تحریک جس وقت شباب پر تھی سی. آئی. ڈی کو اس کی کسی پرچھائیں کا بھی پتہ نہیں چلا لیکن جب تحریک خود اپنے حالات کی بنا پر افسردہ ہوگئی اور کارپردازوں نے بھی رازداری کو غیر ضروری سمجھا تب سی. آئی. ڈی کو موقع ملا کہ وہ دعویٰ ہمہ دانی کا سہرا باندھ سکے۔ اور تحریک کی ناکامی کو اپنی جدوجہد کا نتیجہ قرار دے۔

### بانی تحریک کون؟

سوال یہ ہے کہ بانئ تحریک کے سلسلہ میں ان رپورٹ کرنے والوں کا بیان صحیح مانا جائے یا وہ بیان صحیح مانا جائے جو خود مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی ذاتی ڈائری میں تحریر فرمایا جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جارہے ہیں۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں۔

۱۳۲۷ھ-۱۹۰۹ء میں شیخ الہند رحمۃ اللہ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا۔ اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس تحریک کی تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابومحمد صاحب لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا ۱۳۳۱ھ-۱۹۱۴ء 'میں نظارۃ المعارف' قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقارالملک ایک ہی طرح شریک تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا تھا۔ اسی طرح دہلی بھیج کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لائے۔ اور ڈاکٹر انصاری صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاست سے واقف رہا۔

۱۳۳۳ھ-۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصّل پروگرام نہیں بتایا گیا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہ کرتی تھی۔ مگر تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی اپنا نمائندہ بنا دیا مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہیں بتا سکے۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے۔ اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر

منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ اس کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

(۱) اس بیان سے واضح ہوگیا کہ اس تحریک کے بانی مولانا عبیداللہ سندھیؒ نہیں تھے بلکہ (۱۹۱۵ء تاریخ روانگی مولانا سندھی سے) پچاس سال پہلے تقریباً ۱۸۶۵ء میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اور شیخ الہند رحمۃ اللہ ہندستان میں اس جماعت کے نمائندے تھے۔

(۲) ایک جماعت ہندستان میں بھی قائم ہو چکی تھی۔ اس کے ارکان مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں وغیرہ تھے رحمہم اللہ۔ یہ جماعت بھی مولانا سندھی کی جدوجہد سے نہیں۔ بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے قائم ہوئی تھی یا خود ارکانِ جماعت کے احساس اور اُن کے اتحادِ فکر نے اِس کی بنیاد ڈال دی تھی اور اب حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی کو اس میں شریک کرایا تھا۔

(۳) یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ مولانا سندھی کا دیوبند سے دہلی منتقل ہونا ذمہ دارانِ دارالعلوم کے کسی اختلاف کے باعث نہیں تھا۔ بلکہ جماعت کے پروگرام کے بموجب ان کا کام مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے دہلی منتقل کیا گیا تھا جو پورے ہندستان کا سیاسی مرکز تھا۔

(۴) مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۳ھ - ۱۹۱۵ء میں کابل تشریف لے گئے وہاں آپ نے ایک جماعت دیکھی جو پچاس سال سے کام کر رہی ہے۔ (یعنی ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء سے) یہ وہ زمانہ ہے کہ علماء صادق پور کی جماعت کے امیر مولانا عبداللہ (خلف اکبر حضرت مولانا ولایت علی صاحب) (جو نومبر ۱۹۰۲ھ شعبان ۱۳۲۰ھ تک امیر رہے) اور ہندستان میں اس جماعت کے افراد پر سازش کے مقدمات چل رہے تھے۔

(۵) لیکن مولانا سندھی رحمۃ اللہ نے جن سے رابطہ قائم کیا وہ اگرچہ اپنی اہمیت اور عظمت کے لحاظ سے جماعت تھے بلکہ اِن میں کا ہر ایک فرد جماعت تھا۔ مگر وہ کسی جماعت سے منسلک نہیں تھے۔

بیشک وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ اور ان کے شیخ ومرشد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ کے دامنوں سے وابستہ تھے۔ مگر ان کی خدمات اپنے اپنے حلقوں میں محدود تھیں کوئی جماعتی انسلاک نہیں تھا۔ یہی حضرات تھے جن کے متعلق مولانا سندھی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ جس جماعت کے نمائندے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے ’غیر منظّم شکل‘ میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہے۔ (علماء حق جلد ا، ص ۲۳۱)

**پوری تحریک پر اجمالی نظر:**

سی. آئی. ڈی کی رپورٹ بلکہ محکمہ خفیہ کی پوری کارروائی آپ کے سامنے آگے آئے گی۔ مگر اس سے تحریک کا قابل اطمینان نقشہ آپ کے سامنے نہیں آسکے گا اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تحریک کا قابلِ اطمینان نقشہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے یہ نقشہ محترم غلام رسول صاحب مہر کا مرتب فرمودہ ہے۔ وہ اگرچہ تحریک کے رکن نہیں تھے مگر حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ کے دور سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے دور تک جس کی مدت سو سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس پوری تحریک اور اس کی شاخوں کے کارناموں اور ان کی سرگذشتوں کے حالات کے بہترین محقق اور ماہر ہیں۔ پہلے ان کا مرتب کیا ہوا نقشہ پیش کیا جا رہا ہے اس کے بعد اس تحریک کے عظیم رکن شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ کی مرتب فرمودہ روداد پیش کی جائے گی۔ آپ یہ نقشہ اور روداد ملاحظہ فرما لیجیے۔ پھر آپ سی. آئی. ڈی کی رپورٹ پر علی وجہ البصیرت نظر ڈال سکیں گے۔

# شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی

**تحریر: حضرت مولانا غلام رسول مہرؒ**

میرے مطالعہ اور غور وفکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے۔ اور اسے لباس عمل پہنانے کی کوششیں انھوں نے اُس وقت سے شروع کر دی تھیں۔ جب ہندستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔

ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی وہ ثریا سے تحت الثریٰ میں جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریقۂ عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے جن کے خلوص پر اعتماد کیا جاسکے۔ اور جو پیشِ نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتیٰ الامکان محفوظ رکھیں۔

**اسلامی درسگاہوں کی تحریک:**

میرے اندازہ کے مطابق انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جن جن اصحاب میں عملی صلاحیت پائیں۔ اُنھیں جابجا خصوصاً یاغستان (آزاد قبائل) کے مختلف حصوں میں دینی اور اسلامی درسگاہیں قائم کرنے کی ترغیب دیں۔ 'ملا صاحب سنڈاکے' نے بھی حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے جب کام شروع کیا تو ابتدا میں ایک سلامتی درسگاہ ہی قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

''حاجی صاحب ترنگ زئی'' شیخ الہندؒ سے استفادہ کر چکے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر بھی درسگاہیں قائم کرنے ہی کا سلسلہ تھا۔

سیّد عبدالجبار صاحب ستھانوی لکھتے ہیں:

جب مجھے نمائندگانِ صوات نے بتایا کہ 'ملا صاحب سنڈاکے' اسلامیہ کالج پشاور کے بالمقابل ایک عالی شان اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں تو میں نے ان پر صاف صاف واضح کر دیا۔ کہ یہ اصطلاح ایک خاص جماعت کا شعار ہے جس میں مولوی صاحبان اور علماء شامل ہیں۔ انھوں نے اسلامی درسگاہوں کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف تنظیمات کا پردہ بنالیا ہے۔ اور حاجی صاحب ترنگ زئی جو اپنے ضلع میں ایسی درسگاہیں قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس حلقہ کے ایک رکن ہیں سیّد صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ تو علم نہ تھا کہ اصطلاح کس نے ایجاد کی اور اس کا مرکز کہاں تھا، لیکن جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان نے واضح کر دیا تھا کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ترکوں کے دشمن حملہ آوروں کی پشت بانی کر کے خلافتِ اسلامیہ کو برباد کر دینے کے درپے ہیں۔ اِس پر مسلمانوں میں ہمہ گیر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ علمائے حق خلافتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے سرگرم عمل ہو گئے اس سلسلہ میں تبلیغ واشاعت کے لیے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا کہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی میں اسلامی درسگاہیں قائم کر دی جائیں۔ (شہادۃ الثقلین، حصہ دوم قلمی نسخہ، ص ۴۳)

**صحیح تربیت:**

غرض شیخ الہندؒ کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا اور اسے حضرت کے تعلیمی مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ یاد رہے کہ سیّد احمد شہیدؒ نے جب مسلمانوں کو بغرضِ جہاد منظّم کرنے کا قصد فرمایا تھا تو پیروں کے شیوہ کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیئے تھے۔ جگہ جگہ وعظ بھی ہوتے بیعت بھی لی جاتی توجہ بھی دی جاتی۔ اس طریقہ کو سیّد شہیدؒ کے مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ میرے نزدیک مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمدؒ گنگوہی بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد ونصب العین بھی وہی تھا جس کے لیے کارفرمایان دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الہندؒ سرگرم عمل ہوئے۔ اس طریقہ اور شیوہ کے مطابق جلد حسب مراد نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ رکھی جاسکتی تھی تاہم ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پاتا جاتا۔ جس طرح سیّد شہیدؒ کی دعوت اصلاح میں انجام پاتا تھا اُس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت خیز اور تباہ کن شئے کوئی نہیں ہوسکتی جس کے عوام، پیشِ نظر مقاصد کی تربیت سے کاملاً بے بہرہ ہوں دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعہ سے کھیتوں میں پہنچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے

انبار فراہم کردیتی ہیں لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کرلے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا۔

**حوادث کا ہجوم و تواتر:**

مجھے یقین ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ مرحوم ومغفور اپنے اسی منصوبہ کے مطابق کاربند رہنا چاہتے تھے لیکن حالات کی خوفناک مخالفانہ رفتار اور حوادث کا ہجوم وتواتر اُن کے صبر وشکیب کے لیے شدید آزمائشوں کا موجب بن گیا۔

مولانا حسین احمد فرماتے ہیں کہ حضرت کی گہری نظر واقعاتِ عالم بالخصوص ہندستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روزافزوں چیرہ دستیوں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام وچین تقریباً حرام ہوگیا گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ نتائج وعواقب سے بے پرواہوکر اُنھیں سربکف اور کفن بردوش میدانِ انقلاب میں نکلنا پڑا۔ زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں احوال کی نزاکتیں اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں۔ اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گزرا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس لیے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادرِ مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کرکے کام شروع کردیا۔ (نقشِ حیات جلد دوم، ص ۱۳۵-ص ۱۳۶)

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اُٹھا سکے تھے کہ پہلی جنگِ یورپ شروع ہوگئی۔ دوتین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ گویا اطمینان ودلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی۔ اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو فی الفور کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو۔ ترکوں کو تقویت پہنچے۔ اور ہندستان کی آزادی کا خواب اپنی صحیح تعبیر سے ہم آغوش ہوجائے۔

**فوری کام کی ضرورت:**

حضرت شیخ الہندؒ ان تمام اصحاب کی طبیعتوں اور صلاحیت استقامت کا اندازہ فرماتے رہتے تھے۔ جوان کے پاس تعلیم واستفادہ کی غرض سے آتے۔ ان میں سے بعض موزوں اصحاب کو انھوں نے اپنے کام کے لیے چن لیا تھا۔ انھیں حکم دے دیا کہ جلد سے جلد یاغستان پہنچ جائیں۔ اور آزاد قبائل کو ہندستان پر حملہ کے لیے اُٹھائیں۔ مولانا عبیداللہ مرحوم کو انھوں نے افغانستان بھیج دیا کہ امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان کو اس نازک وقت میں خدمت اسلام کے لیے جانبازانہ اقدام پر آمادہ کریں۔

حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملا صاحب سنڈا کے متعلق ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود اکبر حضرت شیخؒ کے خاص کارکن تھے۔ خود ہندستان میں ان کے مخلص کارکنوں کا شمار مشکل ہے۔ مثلاً مولانا عبدالرحیم رائے پوری مولانا خلیل احمد مولانا محمد احمد چکوالی مولانا محمد صادق (کراچی) شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا عبدالرحیم راندیری، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود (امروٹ ضلع سکھرا) ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سینکڑوں ایسے اصحاب ہیں جن کے نام بھی معلوم نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک اور وقت کے اکثر بڑے بڑے رہنما حضرت شیخ الہندؒ کے مشیر ومعاون تھے۔

**مولانا عبیداللہ سندھیؒ:**

مولانا عبیداللہ سندھی کابل جانے کے لیے تیار ہوگئے تو اس سلسلہ میں پہلا اہم مسئلہ روپیہ کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم سے ملاقات کی۔ انھوں نے بے تائل پانچ ہزار روپے پیش کردیئے جو مولانا عبیداللہ کو دے دیئے گئے۔

معلوم نہیں اس کے سوا بھی کوئی رقم ملی یا نہ ملی دوسرا مسئلہ اخفاء کا تھا۔ خفیہ پولیس مولانائے مرحوم پر متعین تھی اور اُن کی ہر نقل وحرکت کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ مولانا بھاول

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اُٹھاسکے تھے کہ پہلی جنگ یورپ شروع ہوگئی۔ دوتین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ گویا اطمینان و دلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی۔ اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو فی الفور کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو۔

پورا اور سندھ چلے جائیں وہاں دیہات میں اس طرح رہنے لگیں گویا کوئی کام اُن کے پیشِ نظر نہیں چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں دہلی چھوڑ کر پہلے بھاولپور بعد ازاں سندھ پہنچ گئے۔ اس اثنا میں راستہ کے انتظامات بھی کرتے رہے۔ پھر یکا یک نکلے اور ۱۵/ اگست کو 'سوریا یک' کے علاقہ میں داخل افغانستان ہوئے۔ شیخ عبدالرحیم سندھی (یہ اچاریہ کریلانی کے بڑے بھائی تھے مسلمان ہو جانے کے بعد پوری زندگی تبلیغ اسلام میں بسر کردی سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سرہند میں وفات پائی۔ میرے عزیز ومکرم دوست شیخ عبدالمجید سندھی بھی اُن کے عزیزوں میں ہیں وہ بھی اسلام لانے کے وقت سے برابر قید وبند کی تکلیفیں اُٹھاتے رہے۔ (مہر) بلوچستان کی آخری حد تک ساتھ رہے قیام افغانستان کے حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ قندھار ہوتے ہوئے ۱۵/ اگست ۱۹۱۸ء کو کابل پہنچے سردار نصر اللہ خاں امیر حبیب اللہ خاں اور اُن کے فرزند اکبر سردار عنایت اللہ خاں سے ملاقاتیں کیں۔ ترکی اور جرمن مشن آیا۔ اور ہندستانیوں نے حکومتِ موقتہ قائم کی۔ تو مولانا بعض وجوہ سے اس کے ہم نوا نہ رہ سکے راجہ مہندر پرتاپ صدر حکومت مؤقتہ کے متعلق مولانا کو یقین ہو چکا تھا وہ کانگریس کے بجائے ہندو مہا سبھا کے کارندے ہیں اور انھوں نے خود حکومتِ مؤقتہ کی اسکیم لالہ لاجپت رائے کو دے دی تھی غالباً اسی اسکیم کی بنا پر لالہ جپت رائے نے یہاں افغانوں کے حملہ کا افسانہ تیار کیا تھا۔ حکومتِ مؤقتہ کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی مشن بھیجے گئے۔ مولانا ان کی تجویز وترتیب میں شریک رہے۔ افغانستان میں خدام خلق کی ایک جماعت بنائی۔ جس کا نام 'جنود اللہ' رکھا۔

امیر امان اللہ خاں کے عہد میں ایک ہندستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت لی لیکن برطانوی سفیر نے زور دے کر یہ اجازت مسترد کرادی ۱۹۲۳ء میں افغانستان سے نکل کر اس کو اور استنبول ہوتے ہوئے مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آ گئے۔

**ریشمی خطوط:**

مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی پارچہ پر لکھ کر شیخ عبدالحق نومسلم کے ہاتھ شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے پاس بھیجا تھا اور تاکید کردی تھی کہ شیخ صاحب فوراً حجاز چلے جائیں یا کسی معتمد علیہ حاجی کے ذریعہ سے خط حضرت شیخ الہندؒ کو پہنچا دیں۔ شیخ عبدالحق طلباء کے ساتھ ہجرت کر کے کابل پہنچا تھا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ نواز خاں کا ملازم تھا وہ شخص ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد تھا۔ لیکن خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ اس نے خط شیخ عبدالرحیم کے حوالہ کرنے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دے دیا۔ ان کے ذریعہ سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر کے پاس پہنچا۔ اس طرح حکومت کو حضرت شیخ الہندؒ، مولانا عبیداللہؒ اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ راز معلوم ہو گئے۔ اُسی وقت سے شیخ عبدالرحیم کا تعاقب شروع ہو گیا اور حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مکہ معظمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے بالآخر گرفتاری ونظر بندی قبول کرنی پڑی۔ اصل خط کا مضمون غالباً یہ تھا کہ حکومتِ مؤقتہ نے افغانستان سے عہد نامہ کرلیا ہے باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت ترکیہ سے بھی ربط وضبط پیدا کرنا منظور ہے۔ آخر میں حضرت موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ ربط وضبط پیدا کرنے اور معاہدہ کرانے میں امداد دیں۔

اِس ریشمی خط کے ساتھ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کی طرف سے بھی ایک خط تھا (رولٹ رپورٹ میں ریشمی خط کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے وہ غلط اور ناقص معلوم پر مبنی ہے)

**حضرت شیخ الہندؒ:**

ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہو جائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطّل میں بسر نہ ہوں۔ لہٰذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے اُنھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں بیٹھ کر کام کرنا چاہیے اگر اس اثنا میں گرفتاری ہو جائے تو اسے قبول کئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ باہر جا کر کوئی کام نہ ہوسکتا تھا۔ اور باہر رہ کر معطّل بیٹھنے سے اندر رہ کر معطّل ہو جانا بہر حال بہتر تھا۔

حضرت شیخ نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں۔ وہاں سے ذمہ دار ترک وزیروں اور ماموروں سے ربط وضبط پیدا کر کے ایران وافغانستان کے راستے یاغستان جائیں چنانچہ چند رفقاء کے ساتھ حجاز چلے گئے۔

حج کیا۔ اُس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کا گورنر تھا مکہ معظّمہ کے مشہور تاجر حافظ عبدالجبّار دہلوی کے ذریعہ سے غالب پاشا کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور اُن سے تین تحریریں حاصل کیں:

(۱) پہلی تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی۔
(۲) دوسری تحریر مدینہ منور کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی جس میں مرقوم تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ معتمد علیہ شخص ہیں اُن کا احترام کیا جائے اور انھیں استنبول پہنچا دیا جائے۔
(۳) تیسری تحریر غازی انور پاشا کے نام تھی کہ ان کے مطالبات پورے کئے جائیں غالب پاشا نے خود حضرت موصوف کو تاکید کی کہ آپ تمام ہندستانیوں کو آزادی کامل پر آمادہ کریں۔ ہم ہر ممکن امداد دیں گے اور صلح کی کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں ہندستان کے لیے آزادی کامل کی حمایت کریں گے ان میں سے پہلی تحریر ہندستان کی تاریخ سیاسیات میں 'غالب نامہ' کے نام سے معروف ہوئی۔

**انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات:**

حضرت شیخ الہندؒ حج سے فارغ ہوکر مدینہ منوّرہ چلے گئے اور ابھی وہ استنبول جانے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے کہ انور پاشا وزیر حربیہ ترکیہ اور جمال پاشا گورنر شام کے مدینہ منورہ پہنچنے کا تار آ گیا۔ چنانچہ اُن سے بھی تخلیہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جمال پاشا نے وہی مطالب دوہرائے جو غالب پاشا حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ نیز وعدہ کیا کہ وہ شام پہنچ کر حضرت کے حسبِ خواہش ترکی عربی اور فارسی میں ایسی تحریرات بھیج دے گا جنھیں جابجا شائع کیا جا سکے۔ حضرت نے یہ بھی کہا کہ مجھے محفوظ طریق پر حدودِ افغانستان تک پہنچا دیا جائے تاکہ میں یاغستان چلا جاؤں۔ ہندستان کے راستہ گیا تو انگریز مجھے گرفتار کرلیں گے۔ جمال پاشاہ نے اس بنا پر معذوری ظاہری کی کہ روسی فوجیں ایران میں سلطان آباد تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا افغانستان کا راستہ کٹ گیا ہے۔ فی الحال آپ کو افغانستان پہنچنا غیر ممکن ہے۔ واپسی میں گرفتاری کا خطرہ ہے۔ تو حجاز یا ترکی عملداری کے کسی دوسرے مقام پر ٹھہر جائیں۔

**'غالب نامہ' کا ارسال:**

حضرت خود حجاز ہی میں ٹھہر گئے۔ لیکن 'غالب نامہ' اور دوسرے ضروری کاغذات بطریق محفوظ ہندستان پہنچانے کی تدبیر یہ سوچی کہ کپڑے رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا۔ اُس کے تختے اندر سے کھود کر کاغذ رکھ دیئے پھر اُنھیں اس طرح ملا دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو پتہ نہ لگا سکے بلکہ شُبہ بھی نہ کر سکے یہ صندوق مولانا ہادی حسن رئیس خاں جہاں پور (ضلع مظفرنگر) اور حاجی شاہ بخش سندھی کے حوالہ کردیا گیا۔ بمبئی میں جہاز پرسی۔آئی۔ڈی بھی موجود تھی اور اہلِ شہر بھی بکثرت آئے ہوئے تھے اُنھیں میں سے مولانا محمد نبی نام ایک مخلص نے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو ابھی مجھے دے دیجیے۔ چنانچہ صندوق انھیں دے دیا گیا وہ اسے محفوظ نکال لائے اور توڑ کر تحریریں نکال لیں۔ دہلی میں حاجی احمد میرزا فوٹو گرافر نے ان کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں عزّت منصور انصاری کے ہاتھ یہ تحریریں سرحد بھیج دی گئیں بعدازاں حضرت نے اپنے ایک عزیز کو اس خیال سے تحریروں کا راز بتا دیا کہ وہ ہندستان واپس جا کر اُن کے فوٹو لینے اور جابجا پہنچا نے کا پیغام ارباب کار تک پہنچانے کا انتظام کریں۔ مگر اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ اور اس نے سب کچھ بتا دیا۔ جس کی بنا پر مختلف اصحاب کی تلاشیاں ہوئیں اور انھیں گوناگوں مصائب سے سابقہ پڑا۔

> **ہندستان میں گرفتاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ بہت پریشان ہوگئے تھے۔ کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہوجائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطّل میں بسر نہ ہوں۔ لٰہذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے اُنھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے۔**

**حضرت شیخ الہندؒ کی اسیری اور رہائی:**

شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ عہد و پیمان کر کے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفیقوں کو اسیر کر کے شریف نے جدہ پہنچا دیا۔ جہاں سے انگریز پہلے مصر لے گئے پھر مالٹا میں نظر بند کردیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰/ رمضان ۱۳۳۸ھ (۸/ جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کر انھیں رہا کیا۔

زمانہ قیام حجاز میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری حکیم عبدالرزاق انصاری مولانا محمد ابراہیم راندیری وغیرہ نے حضرت کی جو خدمت کی وہ ان کے حسنات عالیہ کا گراں بہا حصہ ہے۔ ◻◻

# تحریک ریشمی خطوط

## تحریک کی کہانی شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی زبانی

اس تحریک کے ابتداء میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (Violence) ہندستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے اوراس طرح کے انقلاب کے لیے محفوظ مرکز اور مرکز کے علاوہ اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنابریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا۔ کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا۔ اور انھیں سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمیہ اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

(ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(د) حضرت سیّد احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے لوگ جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستھیانہ اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دُور کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کے لیے مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہٖ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انھیں مقاصد کے لیے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جاکر ان مقاصد کے لیے کوشش کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں۔ ان کو حل کرنے کے خیال سے وہ تاخیر فرمارہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور ترک بھی مجبور کردیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کردیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انھوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے ضبط کرلیے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے۔ یہ ان معاملات کے علاوہ تھے جو کہ طرابلس غرب اور بلقان کریٹ یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے۔ بہرحال ترکی حکومت نے مجبور ہوکر اعلانِ جنگ کردیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر عدن پر سویز پر چناق قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہنچے مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہوگیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سیّد احمد صاحب شہید) کی جماعت بھی مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلِ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بے حد نقصان اٹھا کر اپنی حد پر لوٹ آنا پڑا۔ اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہوگیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کارروائیاں شروع کردیں:

(الف) فوجوں کو اطراف ہندستان سے جمع کرکے بڑی مقدار میں سرحد پر بھیجنا۔

(ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا کہ یہ جہاد نہیں۔ جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔

(ج) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانانِ سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

(د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیے اور اس وقت تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

(ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کرکے

دستخط کریں اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں۔
(و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لیے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمھارے لیے فلاں فلاں وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔ ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اثر ہوا اور بہت برا ہوا۔ مگر اتنا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آ جاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانانِ ہند کے ہیجان اور اضطراب کے روکنے کے لیے ہندستان میں اعلان کیا گیا۔
(۱) ترکوں کو جنگ کے لیے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ (حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا)
(۲) یہ جنگ سیاسی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ (حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا)
(۳) ہم مسلمانوں کے متعدد مقامات جدہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر نہ بمباری کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے۔ مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا۔
(۴) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ (حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبد المجید مرحوم سے فرمان مسلمان کے لیے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندستان میں پروپیگنڈہ کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مسلمانوں کے لیے مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔ چنانچہ امیر عبد الرحمٰن مرحوم والی کابل اپنی ترک میں لکھتے ہیں: ''کہ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔''
بہر حال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لیے پیش کئے گئے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور پھر بھرے مجمع میں ان کو پھینک دیا۔
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوس کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں۔ جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہادِ حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ ساتھ لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد کو اپنے گاؤں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوس کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے۔ اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لیے تیار کیجیے۔ چنانچہ اس امر کی بنا پر شیخ الہند کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچنا ضروری قرار دیا۔
چونکہ اس وقت کے واقعات ہو رہے تھے۔ حکومت بوکھلائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں اس لیے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا۔ فوراً روانہ ہو گئے۔
مکہ معظّمہ میں بہت سے ہندستانی تاجر کاروبار کرتے ہیں مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے۔ تجارت بھی ان کی بڑی پیمانے پر ہے اور دینداری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے۔ اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان خاندان کا حضرت سیّد احمد شہید اور ان کے متبعین مجاہدین ستھیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبد الجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں معمر سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے معاملات کا ذکر کر کے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی۔
انھوں نے اسی وقت ایک ہندستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ تسبیحوں کی تجارت کراتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور وہاں کے ترکی اسکول کے پڑھے ہوئے تھے، بلایا اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ کر دیا۔ وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرادی اور جو باتیں حضرت شیخ الہندؒ نے کیں ان کا ترجمہ کر کے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس روز واپس آ گئے۔ غالب پاشا نے ہندستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن صاحب کی حیثیت ہندستان میں کیا ہے۔ لوگوں نے حضرت کی علمی اور عملی حیثیت شہرت اور

قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ لہٰذا اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے۔ اور جو کچھ حضرت نے کہا اس کو قبول کیا۔ دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ ان سے ملنے کی کوئی ضرورت آپ کو نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر تمام ہندستانی مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی اور ایک تحریر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کا احترام کرواور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچادو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کیجیے پھر تحریکِ آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں کہ آپ تمام ہندستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے۔ عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے حلفاء جرمنی اور آسٹریلیا وغیرہ ہندستان کی مکمل آزادی کے لیے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ ہندستانی لیڈر سست پڑجائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (میڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہوجائیں۔ تمام ہندستانیوں کو اخباروں عام مجمعوں، تقریروں، تحریروں، اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان اور ایک قلم ہوکر یہی مطالبہ جاری رکھنا چاہیے اور جب تک مقصد حاصل نہ ہوجائے، ساکت نہ ہونا چاہیے۔ اس کا پروپیگنڈہ پوری طرح پر جاری کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق اور اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا از بس ضروری ہے۔

حضرت نے فرمایا اس وقت انگریز نہایت ہی خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندستان جاؤں گا تو راستہ ہی میں گرفتار کرلیا جاؤں گا۔ مگر میں اپنے رفقا کو اس کام کے لیے تیار کرکے ہندستان بھیجتا ہوں اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عمل درآمد کررہی ہے مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زوردار طریقہ پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندستان کی مغربی حدوں میں جانا چاہتا ہوں وہاں میرے مشن کے لوگ کام کررہے ہیں۔ ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظّمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت راز کے ساتھ ہوئیں۔ مکہ معظّمہ کے ہندستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہیں ہوسکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے دن قیام کرکے استنبول کو روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا سہول صاحب وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندستان کو روانہ کردیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندستان جانے والا نہ ملا۔ اس لیے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔

جدا ہوتے وقت مرتضیٰ حسن صاحب کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں محمد منصور الانصاری کے نام سے مشہور ہوئے، خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی ان کو دی گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریکِ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہمنوا ہوگئے تھے۔

میں اس وقت نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جبکہ محاذ سوئز کے لیے مدعوئین (والنٹیئر) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا۔ ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہوکر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاست کی ابدا اور بسم اللہ کا وقت ہے۔ اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہمنوا رہے۔

اس وقت مدینہ تک حجاز ریلوے جاری تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی۔ ایک روز یکا یک تار آیا کہ یہ دنوں وزیرانِ جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچیں گے۔ ہم نے بھی عرضی تیار کی۔ حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی اور اہلِ شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانے میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا چوتھے فلیق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور عربی پر یعنی میدان سوئز، سینا، حجاز پر متعین تھا، کمانڈ تھے۔ اس لیے انور

پاشا کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری کرتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لیے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی غربی پر پہنچے اور سوریا (سیریہ شام) اور سوئز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ دوجہاں سرورِ کائنات علیہ السلاۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔ اس لیے مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً نو یا دس بجے وہ اسپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزرا اور اور رفقا تھے۔ حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقت متعین سے پہلے مشتقانہ ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر دیا تھا۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ (نقش حیات)

میں مولانا (حسین احمد صاحب) تاک میں تھا کہ موقع ملے تو انور پاشا کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کردوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو (جس میں حضرت شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی) پیش کردی۔ انھوں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو دے دی۔ مفتی ماموں بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار تھے اور نقیب الاشراف شامی رحمہ اللہ کو جو کہ رفقائے انور پاشا میں سے تھے، میں نے پہلے سے تیار کرلیا تھا۔ ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی مساعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ اللہ رحمہ اللہ موقعہ ملاقات پر پہنچے۔ ایک تنہا اور بند کمرے میں ملاقات ہوئی۔ جمال پاشا سے باتیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں۔ اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہلِ ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنی چاہیے جب تک مقصود یعنی آزادیٔ کامل حاصل نہ ہوجائے ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ ہم اہلِ ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے۔ تم لوگ مطمئن رہو اور جس طرح ممکن ہوگا اہل ہند کی امداد واعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لیے انھوں نے کہا تمھاری خواہش کے موافق تحریر بھی دیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیے تاکہ اہلِ ہند سمجھ سکیں۔ انھوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسبِ پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لیے ہم شام (دمشق) جاکر تحریریں مکمل کرکے بھیج دیں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو حدود افغانستان تک بالا بالا پہنچا دیا جائے۔ ہندستان کے راستہ سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یاغستان تک) اس وقت پہنچنا غیر ممکن ہے۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کرکے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آباد تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے۔ یا تو آپ جدہ ہی کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمائیں۔ اطمینان بخش باتوں کے ہوجانے کے بعد ہم واپس آگئے۔ چند گھنٹے بعد یہ حضرات شام کے لیے روانہ ہوگئے۔ پھر دو تین روز بعد حسبِ وعدہ یہ تحریریں بھی تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کے دستخط سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ شام سے آگئیں۔ مضمون سب کا ایک ہی تھا، صرف زبان کا فرق تھا۔ جس میں ہندستان کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارے میں امداد واعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو ترکی رعیت یا ملازم ہو، حکم تھا کہ مولانا محمود حسن (شیخ الہندؒ) پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصہ لے۔

چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو میں مرکز تحریک یاغستان جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ (اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کرکے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں) اس لیے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لیے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر وہ پہنچا دیئے جائیں۔ مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی۔ کسی چیز کا نکال کرلے جانا نہایت ہی مشکل ہوتا۔ اس لیے تجویز ہوئی کہ لکڑی کا صندوق کپڑوں کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کررہا تھا۔ اس سے کہا گیا۔ اس نے اسی طرح جاوی لکڑی کا صندوق بنا دیا اور کھدے ہوئے تختہ میں کاغذات رکھ کر اس طرح بند کردیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کرسکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی

تھان ریشمین اور غیر ریشمین مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لیے رکھ دیئے گئے۔ اور چونکہ ہر مہینہ تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلّہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا۔ تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے بقیہ رفقا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے رفقا روانہ کر دیئے جائیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لیے جہازوں کی آمد ورفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقا میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خان جہانپور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدر آباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا اپنے مکان پر کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر) کو دے دیں۔ وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقا کا قافلہ ۱۲؍ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر آخری ماہ کورہ میں مکہ معظّمہ پہنچا۔ حضرت شیخ الہندؒ قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظّمہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد فرمایا۔ اور ۲۰؍ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دیگر رفقا مکہ معظّمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے۔ جب ۱۰؍ شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظّمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقا جہاز آ جانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں۔ چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہندؒ کے طائف سے واپس ہونے کی نہیں تھی اس لیے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ضروری سمجھا کہ ان سے وداعی ملاقات کی جائے۔ اس لیے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اُتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے۔ اور حضرت رحمہ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن صاحب خان جہانپوری اور حاجی خان بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سبھوں کو حضرت شیخ الہندؒ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔ بمبئی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہندؒ تشریف لائیں گے۔ اس لیے انگریزی پولیس سی آئی ڈی اور اہلِ شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین میں سے تھے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجیے۔ میں اس کو نکال دوں گا اور جہاں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیجیے وہاں پہنچا دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگر چہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص اور صداقت کا یقین ہو گیا اور صندوق ان کے حوالہ کر دیا۔

یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ صندوق قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو اس کی ہوا بھی نہ لگ سکی۔ (یہ حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت تھی) جب یہ صاحب صندوق اٹھوا کر لے جا رہے تھے اس وقت سی آئی ڈی حضرت شیخ الہندؒ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نہیں ہیں البتہ ان کے ساتھ کچھ لوگ ہیں تو پولیس حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ مگر بحمد اللہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہنچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے وہاں پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کا ساتھ نہ جاتے میں تھا نہ آتے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج وزیارت میں میری شرکت بھی رہی۔ میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا حاجی ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا۔ ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا، سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا۔ مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تو ایک ڈیڑھ ماہ بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے۔ لہٰذا جیسے ہی صندوق پہنچا اس کے کپڑے نکال کر لکڑی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ مولانا کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی۔ اور ایک تختہ کے اندر ضروری کاغذات برآمد ہوئے۔ فوراً ہی ان کاغذات کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلایا کہ وہ کاغذات لکڑی کے ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب

کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کرلیا۔ ایک عجیب وغریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد نبی صاحب اسی وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کررہے تھے۔ سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو موڑ توڑ کر صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی ایک بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں بند کردیا گیا۔ ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان میں سے بھی نکال دیا گیا۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی سختی آئی اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کردیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر لٹکی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔ چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رتھیڑی بھی ضلع مظفر نگر میں ہے یہاں جناب حاجی نورالحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ العزیز نے یہ طے فرمایا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی مگر ناکام واپس ہوئی۔

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا مگر اب تک وہ تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ حاجی نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ اسی وقت ان کو لے جارہے تھے جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔ دوسرے وقت حاجی نورالحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجیے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے۔ خدشہ اور خطرہ موجود ہے۔ مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہوکر حاجی صاحب نے فوٹو لیے۔ عین اسی وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان ماری۔ ہر ایک البم ٹٹولا۔ مگر طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

فوٹو کاپیاں تیار ہوگئیں۔ حاجی نورالحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا پہنچادیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلادیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبیداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے مگر چونکہ حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہورہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلادیا ہو تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے حلیف پوری امداد کرتے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتح مندی اور کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہوگیا اور مسٹر ولسن کے پُرفریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزیوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آگئے اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کرکے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلادی۔ تاآنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل وغارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے اور جدوجہد سے کام چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی ناکامی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ جس سے چاہے چھین لیتا ہے۔

انور پاشا جمال پاشا سے جب تحریری دستاویزیں حاصل کرلیں تو حضرت شیخ الہندؒ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر) پہنچ جائیں۔ مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا۔ جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہوگئے تھے۔ اس لیے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستہ سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے بلکہ بلوچستان کے کسی بندر (مکران وغیرہ) بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہنچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہوجائیں۔ مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے۔ چند ضروری باتیں اسی ملاقات میں طے کرنی تھی۔ اس لیے پہلے مکہ معظّمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لیے روانہ ہوگئے۔ غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظّمہ

میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زیارت بھی کرنی ہے۔ اس لیے میں طائف جا رہا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آ جاؤں گا۔ چنانچہ طائف ۲۰؍رجب کو مکہ معظّمہ سے روانہ ہوکر ۲۳ یا ۲۴؍رجب کو طائف پہنچے۔ اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں اور کچھ کے لیے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے۔

ایام حصار میں حضرت ایک مرتبہ غالب پاشا سے پھر ملے۔ پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظّمہ جا کر ہندستان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندستان رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کریں۔ مجلس صلح میں جو کہ عنقریب منعقد ہونے والی ہے انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندستان آزادانہ ہو یا کم ازکم ہندستانیوں کو زیر سایہ برطانیہ اور اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے مگر ہندستانی باشندوں کو چاہیے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر جانے کی سہولت حاصل ہوئی اور ۶؍شوال ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظّمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کمانڈر تھا۔ اس نے ایک شب ہماری مہمان داری کر کے صبح کو مکہ معظّمہ تک سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم ۱۰؍شوال کو مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظّمہ میں ہمارا قیام کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں لہٰذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لیے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا۔ مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے چند رفقا تھے جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ حضرت کو کسی حال چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ حضرت ان کی جدائی پسند کرتے تھے۔ کیونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہٰذا کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھی۔ ان سب کے حمل ونقل کے لیے چند سواریاں درکار تھیں اور خاموشی سے دفعتاً روانہ ہو جانا مشکل تھا۔ تاہم جب حضرت کا تقاضہ شدید ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔

چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے کہ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہوگئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔ محرم ۱۳۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظّمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا۔ اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرادو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا۔ ''من علماء مكة المكرّمة المدرسين بالحرم الشريف المكي'' (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بنا پر کی گئی تھی کہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ محضر ان علماء مکہ مکرمہ کی طرف سے ہے جو کہ حرم مکی میں پڑھاتے ہیں اور میں ہندستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا۔

حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے۔ نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ معنون۔ معنون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔

دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا اور سیّد ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ خفیہ عہد و پیمان کر کے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفیقوں کو اسیر کر کے شریف نے جدہ پہنچا دیا جہاں سے انگریز پہلے مصر لے گئے پھر مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰؍رمضان ۱۳۳۸ھ (۸؍جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کر انھیں رہا کیا۔ □□

# ریشمی خطوط کے کیس کا خلاصہ

زیر نظر کیس کو ہم اپنی آسانی کے لیے ریشمی خطوط کا کیس اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس بارہ میں ہمیں گہری اور مکمل واقفیت اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے تین خطوط کے پکڑے جانے سے حاصل ہوئی۔ جو کابل میں موجود سازشیوں نے حجاز میں موجود سازشیوں کو بھیجنے کے لیے روانہ کئے تھے۔ یہ واقعات جو اس تفتیش اور تحقیقات کا باعث ہیں ان کا سلسلہ ۱۹۱۵ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔

**(۱) افغانستان کو پنجابی طلبا کا مشن:**

اس سال ماہ فروری میں پنجاب کے مختلف کالجوں کے پندرہ طلبا خفیہ طور سے اپنے گھروں سے روانہ ہوئے۔ اور شمالی مغربی سرحد کو عبور کر کے آزاد علاقہ میں پہنچے۔

پھر دوسرے طلبا نے ایک ایک کر کے یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں ان کی پیروی کی۔ بعد کی اطلاعات سے ظاہر ہوا کہ ان کی اس کارروائی کا محرک سلطنت برطانیہ کی مخالفت کا جذبہ تھا۔ ترکی سے برطانیہ کی جنگ اس کا سبب تھی۔ جس کے خلاف غیر وفادار واعظوں اور مبلغوں نے نہایت زبردست مکروہ پروپیگنڈا کیا تھا۔ ان جوانوں کا ارادہ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ پہلے تو وہ برطانوی قلمرو سے نکل جائیں اور پھر جس کام کے لیے بھی ان میں صلاحیت ہو۔ جیسے جاسوس۔ قاصد، واعظ، یا مبلّغ جہاد یا فوجی اس کام کے لیے وہ اپنی خدمات ترکوں کو پیش کر دیں۔

انھیں اُمید تھی کہ افغان گورنمنٹ کی عنایت اور تعاون سے وہ ترکی پہنچ سکیں گے انھیں توقع تھی کہ افغانستان برطانیہ عظمیٰ سے برسر جنگ ہونے والا ہے۔ یا ہندستان کے غیر وفادار لوگ بدگمانیاں پیدا کر کے اور دباؤ ڈال کر اسے لڑائی پر مجبور کر دیں گے۔

۱۹۱۵ء میں جو تفتیش اور تحقیقات کی گئی اس سے اس اہم واقعہ کا بھی انکشاف ہوا کہ صوبہ سرحد تک طلبا کے سفر کا انتظام پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں وہابیوں کی ایک جماعت کرتی تھی۔ اور برطانوی قلمرو کے عبور کر لینے کے بعد طلبا کو سرحد پار کے وہابی بُنیہ پہنچا دیئے تھے جو آزاد علاقہ میں اُن وہابیوں کی بستی ہے۔ جن کو مجاہدین یا متعصب ہندستانی کہا جاتا ہے۔

**(۲) ہندستان میں وہابیت:**

اُنیسویں صدی کے شروع میں عرب کے وہابیوں کی تحریک ہندستان میں داخل ہوئی بریلی کے مولانا سیّد شاہ نے گنگا کی وادی میں اسے رائج کیا (جہاں سے یہ بڑی تیزی سے بالائی ہندستان میں پھیل گئی) انھوں نے ۱۸۲۳ء میں کچھ پیرووں کے ہمراہ خود بھی شمالی مغربی سرحدی صوبہ کو عبور کیا۔ اور یوسف زئی قبائل کے علاقہ میں مجاہدین یا متعصب ہندستانی مسلمانوں کی ایک بستی قائم کی تب سے یہ ہندستان کے بے دین حکمرانوں کے لیے عذاب بنی ہوئی ہے۔

شروع میں اس کا قیام خاص اس مقصد کے لیے عمل میں آیا تھا۔ کہ سرحدی قبائلیوں کو سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے اُکسائے۔ جو اس وقت پنجاب پر قابض تھے۔ تب سے بستی ہندستانی وہابیوں کی مالی امداد سے اور ہندستان سے یہاں آتے رہنے والے، نوجوان وہابیوں کی وجہ سے میدانِ جنگ میں ہزیمتیں اُٹھانے اور برطانیہ کے دوست قبائل کی طرف سے سیاسی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنے کے باوجود تاہنوز قائم ہے۔

ہندستان میں ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۳ء تک وہابیوں کے خلاف عدالتی تحقیقات اور مقدمات کے طویل سلسلہ کے دوران ہندستان میں سازشیں کرنے اور روپیہ جمع کر کے اسے سرحد پار کے متعصب ہندستانیوں کو بھیجنے والی ایک جماعت کا پتہ چلا تھا جس پر کئی بڑے بڑے وہابیوں کو سزائیں دی گئی تھیں اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب یہ تحریک ہندستان میں گویا ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد ہندستان میں وہابی عقائد کے ماننے والے مختلف ناموں سے پکارے جانے لگے۔ جیسے اہلِ حدیث، غیر مقلد، فرازی وغیرہ اور جلد ہی ہندستان سے وہابیوں کا بظاہر نشان مٹ گیا۔ سرحد پار بھی مجاہدین کی بستی کی طاقت اور اثر گھٹ گیا۔ بعد میں اس کا اثر نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

۱۹۱۰ء میں یہ تحریک پھر سر اُٹھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کیونکہ افغانستان کے انگریز دشمن جماعت کے ایک نہایت طاقتور رکن نے متعصب ہندستانیوں کی مالی امداد اور ہمّت افزائی شروع کر دی۔

**(۳) کابل کو طلبا کے مشن کی اہمیت:**

یہ تھی وہ جماعت جس کے احیا کی جھلک فروری ۱۹۱۵ء میں پنجابی طالب علموں کے فرار کے واقعہ میں دکھائی دی۔ اس وقت اس معاملہ کی تیزی سے انکوائری نہیں کی گئی کیونکہ یہ بات اُس وقت کی پالیسی سے ہم آہنگ نہ تھی کہ مسلمانوں کے معاملات میں ایسے نازک موقع پر اتنی گہرائی میں جا کر تحقیقات کی جائے چند لوگوں کے بارے میں یقین ہوگیا کہ انھوں نے اس مہم میں عملاً مدد کی ہے ان کو نظر بند بند کر دیا گیا۔ لیکن اتنی گہرائی تک تحقیق نہ کی گئی۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ مہم وہابیوں کی اپنی کوشش تھی یا کسی دوسرے سازشی نے وہابیوں کی جماعت کی اس باقیات کو باغیانہ اور اتحاد اسلامی کے مقاصد کے لیے بالقصد استعمال کرنے کی کوشش کی۔

**(۴) مولوی عبیداللہ تحریک کا سربراہ:**

ابھی حال ہی میں اس امر کا پتہ چلا ہے کہ آخری بات درست ہے اور یہ کہ طالب علموں کی ہجرت کا محرک اصلی مولوی عبیداللہ ہے جس نے کلکتہ کے ابوالکلام کی رضا مندی اور تعاون سے جو اتحاد اسلامی کا حامی مولوی ہے نیز کچھ اور وہابی لیڈروں کی مدد سے اس مہم کو چلایا ہے اور اُس کے مصارف برداشت کیے ہیں۔

مولوی عبیداللہ نو مسلم سکھ پنجابی ہیں انھوں نے دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور یو۔ پی میں تعلیم پائی ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے بارہ برس سندھ میں گزارے۔ جہاں وہ بہت بااثر ہوگئے تھے اور انھوں نے جنونی جذبات رکھنے والوں کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔ پھر وہ دیوبند میں اُستاد بن کر واپس آئے اور انھوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی۔

**مولوی عبیداللّٰہ نو مسلم سکھ پنجابی ہیں انھوں نے دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور یو. پی میں تعلیم پائی ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے بارہ برس سندھ میں گزارے۔ جہاں وہ بہت بااثر ہوگئے تھے اور انھوں نے جنونی جذبات رکھنے والوں کے لیے مدرسہ قائم کیا تھا۔ پھر وہ دیوبند میں اُستاد بن کر واپس آئے اور انھوں نے جمعیۃ الانصار قائم کی۔**

یہ دیوبند کے پرانے طالب علموں کی انجمن تھی۔ بظاہر یہ بالکل بے ضرر تھی۔ لیکن اس کے مقاصد جیسا کہ اب واضح ہوا ہے باغیانہ تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں ایک استاد کی حیثیت سے مولوی عبیداللہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ کئی اساتذہ کی وفاداری کو متاثر کیا، جن میں خصوصیت سے مولانا محمود الحسن صدر مدرس شامل ہیں۔ وہ نہایت بااثر عالم ہیں۔ اس معاملہ میں آگے پھر ان کا ذکر آئے گا۔

اساتذہ میں اختلاف کے باعث بالآخر مولوی عبیداللہ کو برطرف کر دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ دلی میں متوطن ہوگئے اور ترکوں کے مشہور حامی۔ رام پور کے مولانا محمد علی مدیر کامریڈ کے گہرے دوست بن گئے۔ عبیداللہ نے دلّی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے عربی کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کے قیام کا مقصد اسے اتحاد اسلامی کی سازش کا ہیڈ کوارٹر بنانا تھا۔

**(۵) آزاد علاقہ کو مولوی سیف الرحمن کا مشن:**

آیئے اصل واقعات کی طرف لوٹیں جون ۱۹۱۵ء میں مولوی سیف الرحمٰن جو فتح پوری مسجد میں استاد تھے اچانک غائب ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شمالی مغربی سرحد کو عبور کر کے آزاد علاقہ میں پہنچ گئے ہیں۔

وہ فوراً حاجی صاحب ترنگ زئی سے وابستہ ہوگئے وہ ضلع پشاور کا ایک پُر جوش لیکن بااثر کٹّر متعصب ہندستانی تھا۔ اور ہجرت کر کے آزاد علاقہ میں آ گیا تھا۔

اس نے حاجی صاحب کو مجبور کیا کہ علم جہاد بلند کرنے کی ان تھک کوشش میں سرحد کا دورہ کریں۔ وہ کامیاب رہا۔ اس کا ثبوت ان واقعات سے مل گیا۔ جن کے نتیجہ میں ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء کو رستم کے مقام پر جنگ ہوئی۔ جس میں کئی متعصب ہندستانی کام آئے۔

اس کے بعد ہماری سرحدوں پر رہنے والے قبائل کے بے چینی اور شورشیں بھی حاجی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ اس وقت یہ بات معلوم نہ تھی لیکن بعد میں اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ کہ سیف الرحمٰن کے مشن کی ذمہ داری بھی عبیداللہ پر ہے۔ یہ اس کی سازش کا ایک لازمی حصّہ تھا۔

## مولوی عبیداللہ کا فرارِ کابل

### کابل میں ہندستانیوں کی سازشیں

### اگست ۱۹۱۵ء اور بعد کے واقعات:

اسی ماہ یعنی جون ۱۹۱۵ء سے سرکاری کاغذات سے مولوی عبیداللہ کا

کچھ پتہ نہیں چلتا اس کے بعد سے انھیں برطانوی ہند میں نہیں دیکھا گیا۔

اب معلوم ہوا ہے کہ سندھ میں چند ماہ کے قیام میں انھوں نے اپنے پُرانے روابط کو تازہ کیا۔ اپنے باغی دوستوں سے صلاح ومشورہ کیا اور ان سے خط وکتابت کے طریقے متعین کیے اور اس کے بعد اپنے حلیفوں کے ہمراہ براہ کوئٹہ وقندھار کابل کو روانہ ہوگئے ۔ ۱۸؍اکتوبر کو وہ کابل پہنچے اور لاہوری طلبا کو پیرا جو اس وقت کابل پہنچ چکے تھے اور ترک جرمن مشن سے جس کے سرغنہ دو غدار ہندستانی مہندر پرتاب اور برکت اللہ تھے اِن سے وہ جا کر مل گئے ۔ مہندر پرتاب اور برکت اللہ نے براہِ برلن وقسطنطنیہ کابل کا سفر کیا تھا۔ وہ قیصر جرمنی اور سلطان ترکی کے خطوط لائے تھے کہ افغانستان کو ہندستان پر حملہ کے لیے آمادہ کرسکیں۔ کابل میں ہندستانی سازشوں نیز سردار نصر اللہ خاں اور افغانستان میں جنگ کے حامی عناصر کے درمیان کئی بار صلاح ومشورہ ہوا۔

روسی ترکستان قسطنطنیہ اور برلن کو برطانیہ کے خلاف مشن روانہ کئے گئے کابل میں موجود ہندستانی سازشوں اور ہندستان میں موجود ان کے مشیروں کے درمیان بہت کافی خط و کتابت ہوئی جس کا نقطۂ عروج اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کا پکڑا جانا ہے۔ جو ایک لاہوری طالب علم کے پاس سے برآمد ہوئے جو قاصد کا کام کررہا تھا۔

**(۶) مولوی محمود حسن کا حجاز کو مشن** ستمبر ۱۹۱۵ء:

دریں اثنا دیوبند کے ممتاز مولویوں کی دو جماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں حجاز کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہ عام طور پر افواہ تھی کہ ان کا ارادہ ہجرت کرنے کا ہے۔ اور مخالف حکومت جذبہ نے ان کو اس اقدام پر آمادہ کیا ہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے ان کو ہندستان ہی میں روکا جاسکے۔

بمبئی میں گرمجوشی سے رخصت کئے جانے کے بعد یہ دونوں جماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی سے روانہ ہوگئیں مولوی خلیل احمد اور اُن کی پارٹی ۸؍ستمبر ۱۹۱۵ء کو اور مولانا محمود حسن اور اُن کی پارٹی ۱۸؍ستمبر ۱۹۱۵ء کو روانہ ہوئیں۔

۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں اور ۱۹۱۶ء کے موسم بہار میں اِن پارٹیوں کے بعض اراکین ہندستان لوٹ آئے۔ لیکن جب تک کہ ریشمی خطوط کے ذریعہ ہمیں عبید اللہ کی سازش اور محمود حسن کے اس سے تعلّق کے بارہ میں قابلِ اطمینان واقفیت حاصل نہ ہوئی۔ ان میں سے کسی سے پوچھ تاچھ نہیں کی گئی۔

**(۷) ساری سازش کا انکشاف ریشمی خطوط کے ذریعہ ہوا:**

اس سازش کے اراکین کو 'جنود ربانیہ' (خدائی فوج) نام دیا گیا تھا۔ اس کے تمام اراکین کو فوجی عہدے دینا اور مدینہ کو اس کا خاص مرکز بنانا طے پایا تھا۔ جہاں دیوبند کے مولوی محمود حسن کو القائد یا جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے ثانوی مراکز استنبول، تہران اور کابل تھے۔ کابل میں مولوی عبید اللہ کو قائم مقام جنرل مقرر کیا گیا تھا۔

**دریں اثنا دیوبند کے ممتاز مولویوں کی دو جماعتیں ستمبر ۱۹۱۵ء میں حجاز کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہ عام طور پر افواہ تھی کہ ان کا ارادہ ہجرت کرنے کا ہے۔ اور مخالف حکومت جذبہ نے ان کو اس اقدام پر آمادہ کیا ہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ وہ حجاز میں چند خاص ترک افسروں سے ملاقات کریں گے لیکن بروقت کوئی ایسی اطلاع نہیں مل سکی جس سے ان کو ہندستان ہی میں روکا جاسکے۔**

اس فوج کا مقصد کافروں کے تحتِ حکومت ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے سلاطین اسلامیہ کو متحد کرنا تھا۔ مولوی محمود حسن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ حجاز کے ذریعہ خلافت عثمانیہ سے رابطہ قائم کریں اور اس حکومت کو چند شرطیں ماننے پر آمادہ کریں۔ جن کے پورے ہونے پر حکومت افغانستان، برطانیہ سے برسرِ جنگ ہوجائے گی۔ اس فوج کے جو افسران کابل میں تھے ان کے ذمہ تھا کہ وہ بھی اسی مقصد کے لیے افغانستان کے انٹی برٹش عناصر سے جوڑ توڑ کرتے رہیں اور آزاد قبائل میں برطانیہ کے خلاف ہر وقت عداوت اور دشمنی کے جذبات کو مشتعل کرتے رہیں۔

ہندستان میں جو سازشی موجود تھے۔ ان کا کام (غالبًا پُرانی وہابی تحریک کے ذریعہ) روپیہ جمع کرنا تھا تاکہ کابل ہندستان اور حجاز میں سازش کے مصارف پورے ہوسکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں ہندستانی مسلمانوں میں مذہبی جنون کو اتنا زیادہ بڑھا دینا تھا کہ افغانستان اور ہندستان کے درمیان جنگ چھڑتے ہی وہ بھڑک کر ہر طرف آگ

لگا دیں۔

اس فوج کے افسروں کی ایک فہرست خطوط کے ساتھ منسلک تھی۔ جس سے ظاہر ہوگیا کہ سازش کی ہدایت کرنے والی طاقت عبیداللہ کی تھی۔اس فوج کے افسران واضح طور پر چار گروپوں میں منقسم تھے۔

(۱) عبیداللہ کے کٹّر متعصب جنونی دوست، پیرو اور رشتہ دار جو سندھ میں تھے اور اُن کے رابطے ہندستان کے سب حصوں میں تھے۔

(۲) دیوبند (سہارنپور) اور دلّی کے مولویوں کا گروپ جنھیں عبیداللہ نے جب وہ دارالعلوم دیوبند میں اُستاد تھا۔ نیز جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآنیہ سے تعلّق کی بنا پر اپنے اثر میں لے لیا تھا۔

(۳) بہار، یوپی، پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے وہابی جو چندہ جمع کیا کرتے تھے۔

(۴) اتحاد اسلامی کے حامی مشہور لیڈر۔جنود ربانیہ کی اسکیم ایک اور جماعت سے مربوط تھی جسے حکومت موقتہ ہندیہ کہا جاتا تھا۔جس کے کارکنوں کے لیے مسلمان ہونا لازم نہ تھا راجہ مہندر پرتاب اس کے صدر تھے۔ وزیر اعظم مولوی برکت اللہ اور وزیر امور ہند مولوی عبیداللہ تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا مقصد تھا ہند اور افغانستان میں تصادم اور افغانستان میں جو غیر مطمئن ہندستانی تھے اِن کے وفود کو غیر جانب دار یا دُشمن ممالک میں بھیج کر جوڑ توڑ اور سازباز کرنا۔

مختصر یہ کہ عبیداللہ کی اسکیم یہ تھی کہ ہندستان میں اسلامی عسکریت کی سوکھی ہڈیوں میں سے جن اجسام میں زندگی کی رمق باقی ہے۔اُن سے کام لیا جائے۔اس طرح اس نے اپنی سازش میں وہابی تحریک کی باعمل مشینری مولوی طبقہ کا اسلامی جوش وجذبہ اور اتحادِ اسلامی کے حامیوں کی سیاسی توانائی اور تلخی کو یکجا کر دیا تھا۔

اس کا مزید منصوبہ یہ تھا کہ ایک دوسری سازشی جماعت (یعنی حکومت موقتہ ہند) کے پہلو بہ پہلو کام کیا جائے تاکہ ہندوؤں کے انقلاب پسند عناصر اس کی جانب رہیں۔

**(۸) حجاز میں مولوی محمود حسن کی سرگرمیاں:**

اُن خطوط کے برآمد ہونے سے جو مدینہ طیبہ میں مولوی محمود حسن کے نام تھے۔ مولوی محمود حسن کی ہر پارٹی کے ان لوگوں کے خلاف تحقیقات شروع ہوئی جو واپس آچکے تھے۔ان کے بیانات سے ہمیں حجاز میں مولوی محمود حسن کی سرگرمیوں کا کچھ اندازہ ہوا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روانگی کے وقت بجز اس کے اور کچھ پیشِ نظر نہ تھا کہ ہمدردی رکھنے والے ترک افسروں سے ملاقات اور جوڑ توڑ کرکے ہندستان کے خلاف یا افغانستان کی مدد کے لیے فوج بھجوانی ہے کہ وہ ہم پر حملہ کرسکے۔

اس کی اور خلیل احمد کی جماعتیں حجاز میں باہم مل گئیں۔لیکن اس بات کا یقین نہیں کہ کیا مولوی خلیل احمد سازشیوں کے اندرونی رازوں سے واقف تھا اور نہ اس بات کا کہ کیا دونوں جماعتوں کے اراکین مساوی طور پر سازش میں ملوث تھے۔

محمود حسن نے حجاز کے والی غالب پاشا سے یقیناً غدارانہ سازباز کی لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آخرالذکر نے اس مہم میں اُس کی کچھ زیادہ ہمّت افزائی کی۔ غالب پاشا نے کہا کہ ترک دوسرے قصوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔اور وہ نہ تو افغانستان کو مدد بھیج سکتے ہیں اور نہ ہندستان کو لشکر روانہ کرسکتے ہیں۔

تاہم انھوں نے مولانا کو ایک فرمان جہاد دے دیا جسے مولوی محمد میاں نے ہندستان پہنچا دیا۔ وہ اس جماعت میں شامل تھے جو جنوری ۱۹۱۵ء میں ہندستان لوٹی تھی کہا جاتا ہے کہ آزاد علاقہ کے کٹّر متعصب قبائل کو ہمارے خلاف مقابلہ میں لانے کے لیے اُسے بڑے مؤثر طریقہ پر استعمال کیا گیا۔اس کی نقلیں کرکے ہندستان میں بھی تقسیم کی گئی تھیں۔

یقین کیا جاتا ہے کہ مولوی محمود حسن اور مولوی خلیل احمد دونوں نے ۱۹۱۶ء میں کسی وقت حجاز میں جمال بے اور انور بے سے ملاقات کی تھی۔ لیکن ان ملاقاتوں کے بارہ میں کسی اور تفصیل کا علم نہیں۔ مولوی خلیل احمد ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہندستان واپس آگئے جبکہ مولوی محمود حسن اور اُن کی جماعت کے چند منتخب اراکین حجاز ہی میں ٹھہرے رہے اور شاید اب بھی مدینہ میں ہیں۔

کسی وقت مولوی محمود حسن کو خیال ہوا تھا کہ وہ حجاز سے قسطنطنیہ جائے۔لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس نے اپنا ارادہ پورا کرلیا ہو۔ابھی حال ہی تک وہ مکہ میں تھا۔

دستخط

وی۔وی۔ویان

□□

# تحریک ریشمی رومال ایک تعارف

**مفتی محمد سلمان منصورپوری** (مدرسہ شاہی مرادآباد)

نوٹ : اس مقالہ میں تحریک شیخ الہند سے متعلق حصہ، راقم الحروف نے جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام منعقدہ ''شیخ الہند سیمینار'' (بتاریخ یکم جنوری ۱۹۸۶ء) میں پیش کیا تھا، اس وقت احقر دارالعلوم دیوبند میں درجہ ششم عربی کا طالب علم تھا۔ غالبًا یہ احقر کا پہلا تحقیقی مقالہ تھا، جسے سیمینار کی دوسری نشست (منعقدہ مدنی ہال دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی) میں ہندوپاک کے اہم علماء واکابر کے مجمع میں پڑھ کر سنایا گیا، اور بحمدہ تعالیٰ حضرات سامعین نے توقع سے زیادہ حوصلہ افزائی اور پذیرائی سے نوازا، بالخصوص محسن ومشفق بزرگ اور باذوق مؤرخ ومحقق حضرت مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نوراللہ مرقدہ نے توجہ سے سن کر اظہار مسرت فرمایا اور دلی دعاؤں سے سرفراز کیا، فجزاہم اللہ احسن الجزاء، بعد میں یہ مضمون متعدد رسائل میں شائع ہوا، پاکستان کے بعض احباب نے اسے الگ کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کیا۔ اب یہ مضمون اپنے قارئین کے استفادہ کے لیے 'تحریک ریشمی رومال نمبر' میں پیش کیا جارہا ہے۔ فالحمدللہ علی ذلک۔ (مرتب)

استاذ الاساتذہ شیخ العالم، عارف باللہ، بطل حریت، مجاہد جلیل، شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نوراللہ مرقدہ (م ۱۳۳۹ھ) کا نام نامی جب لیا جاتا ہے تو یکا یک قلب ودماغ میں جھری جھری سی آتی ہے اور غیر شعوری طور پر ایک ان جانے جوش سے بدن کا رُواں رُواں سرشار ہوجاتا ہے۔ یہ اثر ہے اس عظیم محسن قوم وملت کے بے نظیر جوش عمل، اور اس مردمجاہد کے بے مثال تدبر کا، جس کے کارناموں کے ان مٹ نقوش ہندستان کی اسلامی تاریخ میں نیرّ تاباں بن کر چمکتے رہیں گے، جس کا علمی اور روحانی فیض پوری قوت کے ساتھ انشاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا اور جس کے بلند پایہ خیالات اور وطنی ودینی جذبات سے آنے والی نسلیں برابر مستفیض ہوکر اپنی کامیاب زندگی کے خطوط متعین کرتی رہیں گی۔

**ولادت اور تعلیم:**

حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ء (۱۸۵۱ء) میں بریلی میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، چھ سال کی عمر میں دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت میاں جی بنگلوریؒ کے پاس تعلیم کا آغاز فرمایا، اس کے بعد عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں میانجی عبداللطیف اور مولوی مہتاب علی سے پڑھیں، حسن اتفاق کہ ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا جس کے اولین اساتذہ میں صاحب معرفت بزرگ ملا محمود دیوبندیؒ اور ان کے اولین شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ شامل تھے۔ اسی سال استاذ الاساتذہ جامع العلوم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ بھی یہاں رونق افروز ہوگئے اور ایک عظیم چشمۂ روحانی سرزمین دیوبند سے جاری ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی علمی اور روحانی ماحول میں پروان چڑھنے لگے۔

**استاذ اعظم کی خدمت میں:**

۱۲۸۶ھ میں آپ نے اپنے عظیم ترین استاذ اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں صحاح ستہ کا آغاز فرمایا اس وقت حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے پھر بعد میں دہلی منتقل ہوگئے اور اس دوران دیوبند اور نانوتہ بھی بکثرت آمدورفت رہی، حضرت شیخ الہندؒ علم کی طلب اور استاذ کی خدمت کی غرض سے سفر وحضر میں استاذ مکرم کے ساتھ رہنے لگے اور اپنی پوری زندگی اور زندگی کی سب چاہتیں اپنے نابغۂ روزگار استاذ پر نچھاور کردیں، آپ کی کمالِ سعادت مندی، نیازمندی اور جاں سپاری کی بدولت آپ کو استاذ مکرم کی طرف سے ایسی شفقتیں اور عنایتیں نصیب ہوئیں کہ آپ اس معاملہ میں اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے گئے اور حضرت حجۃ الاسلامؒ کے علمی و روحانی فیض کی اشاعت کا بڑا ذریعہ قدرت خداوندی نے آپ ہی کو بنادیا، حضرت شیخ الہندؒ نے استاذ معظم حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ سے محض علوم دینیہ ہی میں شرف تلمذ حاصل نہیں کیا تھا، بلکہ آپ نے اپنے دل میں استاذ کے سینہ میں لگی ہوئی وہ آگ بھی سلگالی تھی جس نے انہیں ۱۸۵۷ء میں شاملی کے میدان میں سربکف ہوکر انگریز دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ گویا کہ یوں کہیے کہ ''قاسم'' نے جب مئے عرفان ومحبت تقسیم کی تو ''محمود'' نے اپنے دامن کو آئینہ بنا کر ساقی کی صورت وسیرت حتی کہ اس کے ارادے اور عزائم بھی اپنے اندر جذب کرلیے، اب قاسم

محمود الگ الگ نہیں رہے، بلکہ ایک جان دو قالب بن گئے۔ جو ''قاسم'' سوچتے وہی ''محمود'' کا مطمح نظر ہوتا، اور جو ''محمود'' منصوبہ بناتے وہ ''قاسم'' ہی کی ترجمانی ہوتی تھی۔ جس کا کچھ اندازہ آپ کی سیاسی واصلاحی تحریکات سے لگایا جاسکتا ہے۔

**فیضان علمی:**

۱۲۸۹ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس کے طور پر تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا، ۱۲۹۰ء میں منعقد ہونے والے پہلے عظیم الشان جلسہ دستار بندی میں وقت کے اکابر و معظم علماء کے ذریعہ آپ کو دستار فضیلت عطا ہوئی، ۱۲۹۲ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کا باقاعدہ مدرس بنایا گیا، اور اگلے ہی سال (۱۲۹۳ء) سے آپ نے دورۂ حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں کا درس دینا شروع فرمادیا جو متواتر ۴۴؍سال تک جاری رہا۔ اور اس دوران سینکڑوں تشنگانِ علومِ نبوت نے آپ سے استفادہ کیا اور پورے برصغیر میں آپ کی شہرت وقابلیت کا ڈنکا بجنے لگا۔ ۱۳۰۵ء سے تاحیات یعنی ۳۴؍سال تک آپ نے دارالعلوم کی بلند پایہ صدارت تدریس کو بھی زینت بخشی، جو بجائے خود ایک امتیاز ہے۔

آپ کا درس اپنی نرالی شان رکھتا تھا، علوم نبوت کا وہ فیضان تھا کہ الفاظ ان کا بیان کرنے سے عاجز تھے۔ جس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوجاتی لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مبدأ فیاض نے آپ کا سینہ علم ومعرفت کے لیے کھول دیا تھا۔ علماء کے اقوال کی توجیہات، متعارض نصوص میں تطبیق، مسلک حقہ کی تائید اس انداز میں فرماتے کہ ہر شخص مطمئن ہوجاتا، خود آپ کے اکابر اور اساتذہ کو بھی آپ کے علم کا اعتراف تھا چناں چہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ ''مولوی محمود حسن علم کا کھٹلا ہیں''، یعنی ان کے رگ وپے میں علوم نبوت رچ اور بس گئے ہیں۔

**سلوک ومعرفت:**

ایک طرف یہ علمی تبحر تھا اور دوسری طرف آپ سلوک معرفت میں بھی اپنے وقت کے امام تھے، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جب آپ نے اپنے استاذ معظم حضرت نانوتویؒ کے ہمراہ پہلی مرتبہ حج مبرور کی سعادت حاصل فرمائی تو مکہ معظمہ میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور حضرت حاجی صاحبؒ نے اسی سفر میں آپ کو خلافت واجازت سے بھی مشرف فرمادیا، اسی نسبت خاصہ کا اثر تھا کہ آپ کی پوری حیات طیبہ اتباع سنت مبارکہ سے عبارت تھی۔ تواضع وعاجزی کمال درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمام تر کمالات علمیہ وعملیہ اور وجاہت وقبولیت کے باوجود کوئی شخص آپ کی ظاہری کیفیت دیکھ کر آپ کے مقام ومنصب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ذوق اطاعت اور شوق عبادت ایسا تھا کہ آپ کے معمولات دیکھ کر جوانوں کو شرم آجاتی۔ گفتگو میں متانت، نرمی اور سنجیدگی غالب تھی۔ اور دل میں نصیحت وخیر خواہی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے مردم شناسی اور افراد سازی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اسی کمال کا نتیجہ تھا کہ آپ کے شاگردوں کے ذریعہ پورا عالم علم حدیث کی روشنی سے منور ہوگیا۔ آج جدھر نظر ڈالیے شیخ الہند کے شاگردوں کا طوطی بولتا نظر آتا ہے۔ محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (جو بکمال ادب اپنے استاذ معظم کو ''شیخ الہند'' کے بجائے ''شیخ العالم'' کے لقب سے یاد فرماتے تھے) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، شیخ الاسلام پاکستان حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ وغیرہ جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے ہی یہ مقام حاصل کیا ہے۔ سچ ہے:

ایں سعادت بزور طاقت نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

**تحریک شیخ الہند:**

علم وعمل کی مسند سجانے اور اشاعت علوم نبوت کے میدان میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ شیخ الہندؒ احوال زمانہ سے بھی کبھی غافل نہیں رہے بلکہ انہوں نے دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر پورے عالم کے حالات پر نظر رکھی۔ لوگوں کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ زاہد فی الدنیا بزرگ جس کی ظاہری زندگی مسجد اور مدرسہ تک محدود ہے۔ اور جس کا منحنی سا وجود علوم نبوت کے لعل وجواہر ڈھونڈنے میں ہمہ وقت مشغول ہے، کیا وہ کسی بین الاقوامی تحریک کی قیادت بھی کرسکتا ہے؟ اور کیا وہ ایسی حکومت کی بنیادیں، ہلانے کی بھی طاقت رکھتا ہے؟ جس کی حکومت میں اس دور میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا؟ یہ بات شاید کسی کے وہم وخیال میں بھی نہ گذرتی ہوگی، مگر آگے جاکر وقت نے بتادیا کہ یہی مجاہد استاد کا مجاہد شاگرد ''محمود حسن'' تھا جو دسیوں سال دیوبند میں بیٹھ کر خلافت عثمانیہ کے

خلاف انگریزی ریشہ دوانیوں، بلقان وطرابلس کی خوں چکاں داستانوں، اور عالم عرب پر انگریزی چیرہ دستیوں پر کرب کی حالت میں راتوں کو کروٹیں بدلتا رہا، اور جس نے بالآخر ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو انگریز سے نجات دلانے کے لیے ایک تحریک کا منصوبہ بنایا جسے بعد میں ''تحریک شیخ الہندؒ'' یا ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے جانا گیا۔ یہ تحریک کیا تھی؟ کہاں سے شروع ہوئی؟ کن کن مراحل سے گذری؟ اور پھر اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جواب درج ذیل مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ (حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیل حالات کے لیے ''حیات شیخ الہندؒ'' مؤلفہ حضرت مولانا سید اصغر علی صاحبؒ اور نقش حیات جلد دوم مؤلفہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا مطالعہ کیا جائے)

## دار العلوم دیوبند کے قیام کا مقصد:

لوگ کہتے تھے کہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۷ء) میں دیوبند میں قائم ہونے والا دار العلوم ایک خالص دینی ومذہبی مدرسہ ہے۔ مگر شیخ الہندؒ کی سوچ سب سے الگ تھی، ان کے سامنے جب دار العلوم کو صرف مرکز تعلیم وتعلم کے بطور پیش کیا جاتا تو ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی، صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا، اور بے اختیار اصل حقیقت زبان پر آجاتی، ایک مرتبہ آپ کے شاگرد رشید مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے آپ کے سیاسی مسلک کے بارے میں سوال کیا، اس پر آپ کا ردعمل کیا تھا؟ خود مولانا گیلانیؒ کی زبانی سنئے:

''اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے۔ اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم جن کو وہ ''حضرت الاستاذ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے انہی کا نام لیکر فرمایا '' کہ حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا (صرف) درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی تلافی کی جاسکے'' پھر ارشاد ہوا: ''تعلیم وتعلم جن کا مقصد اور نصب العین ہے ان کی راہ میں میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے دار العلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذؒ نے قائم کیا تھا۔'' (دار العلوم میں بیتے ہوئے دن ''مولانا گیلانی'' ماہنامہ دار العلوم دیوبند جمادی الثانیہ ۱۳۷۳ھ)

یہی وہ نظریات وخیالات تھے جن کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے ہندستان کو غلامی سے نجات دلانے اور اس ملک میں اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لیے ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کا منصوبہ بنایا، اور ظاہری اسباب ووسائل نہ ہونے کے باوجود خدمت دین وطن کے لیے جدوجہد شروع کردی۔

## انجمن ثمرۃ التربیت:

ابھی دار العلوم کے قیام پر ایک دہائی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں اس عظیم مرکز کے سب سے پہلے فرزند جلیل مولانا محمود الحسنؒ نے اپنے رفقاء کی اعانت اور اپنے استاذ جلیل مجاہد حریت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایما پر ''سالانہ چندہ دہندگان'' کے عنوان سے ایک انجمن قائم کی جس کا نام ''ثمرۃ التربیت'' تجویز کیا گیا، اس جمعیۃ عظمیٰ میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ اٹھارہ اور مرکزی ارکان تھے، جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں (۱) مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ (۲) مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ (۳) مولانا عبد الحق صاحب پر قاضویؒ (۴) مولوی محمد فاضل صاحب ساکن پھلتؒ (۵) مولوی میر محمد صادق صاحب مدراسیؒ (۶) مولوی عبد القادر صاحب دیوبندیؒ (۷) مولوی فتح محمد صاحب تھانویؒ (۸) مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھویؒ (۹) مولانا محمد مراد صاحبؒ ساکن پاک پٹن (۱۰) مولانا عبد اللہ صاحب گوالپاڑیؒ (۱۱) مولانا عبد العلی عبد اللہ پوری میرٹھیؒ (۱۲) مولانا نہال احمد صاحب دیوبندیؒ (۱۳) مولوی عبد اللطیف صاحب سہسپوری (۱۴) مولوی عبد اللہ صاحب جلال آبادیؒ (۱۵) مولوی محمد اعلیٰ صاحب انبیٹھوی (۱۶) مولوی محمد عبد العدل صاحب پھلتی (۱۷) مولانا کوثر صاحب نگینویؒ (۱۸) مولانا کرامت اللہ صاحب دہلویؒ۔ (پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی الرشید دار العلوم نمبر ۲۸۲/۲۸۳)

اس انجمن کا مقصد اصلی کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مؤرخ تحریک آزادی حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کا یہ تجزیہ لائق مطالعہ ہے، مولانا انجمن کے مقاصد پر چند قرائن ذکر کر کے تحریر فرماتے ہیں: ''بہرحال اس پس منظر کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ ثمرۃ التربیت سے صرف فضلا ومنتسبین دار العلوم کی تنظیم مقصود نہیں تھی؛ بلکہ دراصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا جو قیام دار العلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلے میں کام کرسکیں۔'' (اسیران مالٹا ۱۲)

لیکن افسوس کہ اس عظیم انجمن کے قیام کے چند ہی دنوں بعد ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پچاس سال سے بھی کم عمر میں اس دار

فانی سے رحلت فرما گئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) اور ثمرۃ التربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے عظیم ترین شاگرد ارشد مستقبل کے شیخ الہند پر آپڑی، چنانچہ اس تلمیذ رشید نے اپنے استاذ اجل کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد شروع کر دی اس کے بعد متواتر تیس برس تک آزادی کے متوالوں اور ملت اسلامیہ کے نام لیواؤں کی یہ خفیہ انجمن نہایت رازداری کے ساتھ اپنے مقصد حقیقی کی طرف گامزن رہی اور ان منتخب افراد کے سینوں میں جذبات حریت بھڑکاتی رہی جن کے قلوب روح ایمانی سے معطر اور بدن جذبۂ شہادت سے سرشار تھے، اس انجمن کی سرگرمیاں اگرچہ ہندستان میں رکی ہوئی نظر آتی تھیں لیکن قبائلی علاقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے جاں نثار شاگردوں کے ذریعہ یہ تحریک نہایت رازداری کے ساتھ سرگرم عمل تھی، اور تحریک کے روحِ رواں حضرت شیخ الہندؒ ان علاقوں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ (تجزیہ مولانا محمد میاں صاحب اسیرانِ مالٹا ۲۵)

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۳۱۵ھ نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو جو ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم سے فارغ ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے تھے دیوبند طلب فرمایا اور اس وقت کے حالات کے پیش نظر علمی کام کے ساتھ ساتھ سیاسی کام کرنے کی بھی تلقین فرمائی اور ان کو اپنی تحریک کا ایک اہم رکن منتخب کر لیا، اس کے بعد مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کا سیاسی پروگرام لے کر اپنے وطن پہنچے اور اپنی عملی زندگی کا آغاز گوٹھ پیر جھنڈا حیدرآباد میں ''دارالرشاد'' نامی ایک مدرسہ کے قیام سے کیا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں سندھ کے گردونواح میں آزادی ہند کے لیے مخفی طریقہ سے کام جاری تھا، جس کی قیادت سرزمین سندھ کے عظیم المرتبت بزرگ خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عبید اللہ سندھیؒ بھی اس تحریک سے منسلک ہو گئے تھے کیونکہ حضرت دین پوریؒ آپ کے پیرومرشد بھی تھے، لیکن ۱۳۱۵ھ کے بعد جب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تعلق ''تحریک شیخ الہند'' سے ہوا، تو انھوں نے سندھی تحریک کو ''تحریک شیخ الہند'' کے ساتھ مربوط کر کے حضرت شیخ الہندؒ کو زبردست سیاسی قوت سے ہم کنار کیا، حضرت دین پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان تعلق پیدا کرنے میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے عظیم الشان رول ادا کیا۔ (''ید بیضا'' حامی عبیدی)

قیام سندھ کے زمانہ میں حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ کا خفیہ رابطہ برابر دیوبند سے رہا اور حضرت شیخ الہندؒ سے برابر مشورہ لیتے رہے، حتی کہ ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں امتحان لینے کے بہانے سے حضرت شیخ الہندؒ کو سندھ کا دورہ کرایا اور یہاں پر ہونے والے کام سے متعارف کرایا۔ (داستان خانوادہ مولانا احمد علیؒ: ۵۸/عبدالرؤف ملک، ید بیضا ص: ۸۳/علاوہ ازیں نقش حیات: ۱۹۶/۲، میں حضرتؒ کے امروٹ، سندھ جانے کا تذکرہ ہے)

**جمعیۃ الانصار:**

اس کے بعد اس جماعت کا ظہور ''جمعیۃ الانصار'' کے نام سے (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء) میں ہوا یہ اصل میں ''انجمن ثمرۃ التربیت'' ہی کا ایک نیا لیبل اور عنوان تھا، جس کی تائید مولانا محمد میاںؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ھ کا ہنگامہ خیز دور جس میں بقول سرونیزل انیٹس گورنر پنجاب، ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے موقع تھے، ان کے دماغوں میں نئی ہوا بھری ہوئی تھی وہ منتظر تھے کہ اس تحریک کا کیا نتیجہ نکلتا ہے،'' (یہ زمانہ) حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کی جماعت کے لیے ایک حیات بخش دور تھا جس کی تمہید خفیہ طور پر ستائیس سال پیشتر کی جاچکی (یعنی ثمرۃ التربیت کے قیام کے ذریعہ) چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں اس کو منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا گیا اور جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہمہ گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا جس کی مقبولیت بھی اسی طرح ہمہ گیر ہوئی۔'' (علمائے حق، ۱۳۰/۱/۳)

اس اہم ترین جماعت کی ادارت کی ذمہ داری حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلا کر سپرد کی، چنانچہ خود مولاناؒ ذاتی ڈائری صفحہ ۲۰ میں تحریر فرماتے ہیں: ''۱۳۲۷/۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند میں رہ کر کام کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا، چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔''

یہ تحریک یا تنظیم کیوں کہ عام لوگوں کے لیے جدید تھی اس لیے اس کو لوگوں میں متعارف کرانے کے لیے دارالعلوم کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، یہ عظیم اجتماع ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ (علمائے حق ۱/۱۳۱)

اس طرح کا اجتماع اس زمانہ میں کسی جماعت کو نصیب نہ ہوا تھا، اجتماع میں ہر طبقہ کے لوگوں نے شرکت کی ان میں ایک معتد بہ مقدار ان لوگوں کی تھی جو ثمرۃ التربیت کے قیام کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے، ان کو اس جلسہ کے ذریعہ مل بیٹھنے کا سنہرا موقعہ

ہاتھ آ گیا تھا چنانچہ اس عظیم الشان اجلاس میں سندھی تحریک آزادی کے قائدین خواجہ غلام محمد دین پوریؒ اور مولانا تاج محمود امروٹیؒ بھی شریک ہوئے تھے۔ (ید بیضا ۱۰۷) اس کے علاوہ اس جلسہ سے جمعیۃ الانصار کا تعارف بھی بحیثیت تنظیم فضلاء دارالعلوم لوگوں میں ہو گیا تھا اس کے بعد اپریل ۱۹۱۱ء میں شہر مرادآباد میں جمعیۃ کا پہلا باقاعدہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید احمد حسنؒ نے فرمائی آپ نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں وضاحت کی کہ: ''بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی شن کی نقل ہے، لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں، جمعیۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس سال پہلے شروع ہو گئی تھی اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے وہ طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور فنون کے آفتاب ہیں اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر بھی ناز کرے کم ہے''۔ (علمائے حق ۱۳۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی ہمہ گیر اور منظّم تحریک کی ابتدا ثمرۃ التربیت سے کی تھی اور بعد میں از سرنو تنظیم کے لیے جمعیۃ الانصار نام تجویز کیا۔

جلسہ مرادآباد کے بعد جمعیۃ کے پانچ چھ جلسے ملک کے مختلف حصوں میں ہوئے جن میں شملہ، میرٹھ، دیوبند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس جمعیۃ کے ذریعہ عوام سے رابطہ اور تعلق کی ایک صورت پیدا ہوئی، اور مسلم سیاست پر جو ایک عرصہ سے جمود طاری تھا اس میں کافی حد تک کمی آ گئی، تقریباً چار سال تک یہ انجمن باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام انجام دیتی رہی اور لوگوں پر اس تحریک کا مثبت اور مؤثر اثر رونما ہوا لیکن حکومت افرنگیہ کے کان بھی اس نئی تحریک کو دیکھ کر کھڑے ہونے لگے، کیوں کہ انگریز کو معلوم تھا کہ اس تنظیم کا قائد شیخ الہندؒ اس مجاہد دوراں کا تربیت یافتہ ہے جس نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا، اور حکومت وقت کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ اگر یہ تحریک چلتی رہی تو بہت جلد ہی انگریز کو ہندستان سے در بدر ہونا پڑے گا۔ یہ رپورٹیں حضرت شیخ الہندؒ اور دارالعلوم کے منتظمین کو پہنچ رہی تھیں جس کی بنا پر یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں جمعیۃ الانصار کی وجہ سے حکومت دارالعلوم کو نقصان پہنچا دے، اتفاق سے اس عرصہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ میں چند علمی مسائل میں اختلاف پیدا ہو گیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے ان اختلافات کو بنیاد بنا کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی جانے کا حکم مرحمت فرمایا، اور جمعیۃ الانصار کی نظامت سے آپ سبک دوش ہو گئے۔ (نقش حیات ۲/۱۴۴)

## نظارۃ المعارف (القرآنیہ):

دہلی پہنچ کر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے دینی تربیتی مرکز کی بنیاد رکھی، جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہندؒ، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک برابر کے شریک تھے۔ (نقش حیات ۲/۱۴۵)

یہ مدرسہ بقول حضرت مولانا محمد میاں صاحب دردمندان حریت کے لیے جائے اطمینان اور آزادی کے ساعیوں کے لیے خفیہ مشورہ گاہ تھا۔ (اسیران مالٹا ۲۷) اس مدرسۂ آزادی میں طلبہ میں جذبات حریت کیسے پیدا کیے جاتے تھے؟ اس کی ایک جھلک مولانا شائق عثمانیؒ کے اس بیان سے ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''نظارۃ المعارف دہلی کے دوران قیام ہم لوگوں کو کبھی مولانا عبید اللہ سندھیؒ اس طرح کا مضمون لکھنے کو دیتے تھے کہ اگر تم کو ہندستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح چلاؤ گے۔'' (مجلۃ العلم کراچی بابت جنوری تا مارچ ۱۹۶۰ء بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲/۱۰۸)

## سیاسی حالات میں تبدیلی:

جس وقت مولانا سندھیؒ نے نظارۃ المعارف قائم کی، یہ ۱۹۱۳ء کی ابتدا تھی، سرزمین ہند پر تو انگریزی مظالم تھے ہی اس کے علاوہ عالم اسلام پر بھی برطانوی چیرہ دستیاں بڑھ رہی تھیں، اہل اسلام کی تمناؤں کا مرکز، مسلمانوں کی امیدوں کا منبع، یورپ کا مرد بیمار ترکی انگریز اور اس کے حواریوں کے اکسانے سے بلقان وطرابلس بلغاریہ ومونٹی نگرو کی بھیانک جنگوں سے نبرد آزما تھا، حکومت برطانیہ کی خلافت عثمانیہ سے دشمنی واضح ہو چکی تھی اور پھر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کو زبردستی گھسیٹ کر اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کے وجود کو چیلنج کر دیا گیا تھا، یہ وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مسلمان کا دل رو رہا تھا، پورے عالم میں ایک سنسنی تھی، حزن وملال کے بادل محبان وطن پر چھائے ہوئے تھے، اور ابھی یہ جذبات اور زخم ہندستانی مسلمانوں کے قلوب سے مندمل نہ ہوئے تھے کہ کانپور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کی غرض سے ایک مسجد کو شہید کر دیا گیا جس سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے، یہ حالات اس بوریہ نشین ہند کے عظیم ترین انقلابی قائد حضرت شیخ الہندؒ پر بھی اپنا اثر کیے

بغیر نہ رہ سکے جو بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ دیکھنے میں منحنی اور لاغر ونحیف تھے مگر سینہ میں صبر واستقامت کا ایک کوہ گراں رکھتے تھے، بظاہر اپنے گوشہ عزلت میں سب سے الگ تھے لیکن ان کی نظر جہاں بیں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل ونہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں، عمر کے لحاظ سے بھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے لیکن بایں ہمہ اس کے درد وگداز اور جذب وسوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں میں اور جلوتوں میں، رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اُجالے میں کبھی جنگ بلقان وطرابلس کے واقعات پڑھ کر آنسو بہاتے تھے اور کبھی اپنے ملک کی زبوں حالی ودرماندگی پر نوحہ کناں ہوتے تھے۔ (ماہنامہ برہان، ستمبر ۴۸ء مضمون مولانا اکبر آبادیؒ بعنوان ''علمائے ہند کا سیاسی موقف''، الجمعیۃ دار العلوم نمبر/ ۲۲۷)

**منصوبہ کیا تھا؟:**

ان حالات کے رونما ہونے سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ منصوبہ تھا کہ تحریک کے نمائندے اپنی اپنی جگہ پر پہنچ کر دینی مدرسوں کے قیام کے لیے جدوجہد کریں اور ساتھ ہی ساتھ جذبات حریت کو بھی ابھارتے رہیں تا آنکہ میدان بالکل ہموار ہوجائے اور ہر طرف سے حمایت کی امید قطعی ہوجائے تو ایک تاریخ میں یکلخت پورے ہندوستان میں بغاوت کردی جائے اور کسی دوسرے ملک کی مدد سے یاغستان آزاد قبائل کی طرف سے ملک پر حملہ کردیا جائے، ظاہر ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک طویل زمانہ کی ضرورت تھی۔ لیکن خدا کا کرنا کہ مندرجہ بالا واقعات سے پورے ملک میں بیداری کی ایک لہر پھیل گئی، دوسرے جنگ عظیم شروع ہوجانے کی وجہ سے انگریز کو کسی بھی طریقہ سے نقصان پہنچانا ضروری ہوگیا لہٰذا تحریک جہاد فوراً شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ (تفصیل کے لیے ''تحریک شیخ الہند'' ۶۵ تا ۶۸ دیکھیں)

**یاغستان میں جہاد:**

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۴ء میں مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو حاجی ترنگ زئی کے پاس پشاور روانہ کیا اور ان کو پشاور سے یاغستان ہجرت کرنے کا حکم دیا اور یہ فرمایا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ میدان عمل میں آجانا اور سربکف ہوکر کام شروع کردینا از بس ضروری ہے۔ (نقش حیات ۲/ ۲۱۰)

چنانچہ یاغستان کے موضع زیگی میں ریاست میں تحریک کا مرکز قائم کیا گیا اور حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کی قیادت میں انگریز کے خلاف جہاد کا سلسلہ شروع ہوا، ابتدا میں مجاہدین نے برطانوی فوج کی پلٹنیں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیں اور دشمن کو زبردست نقصان پہنچایا لیکن بعد میں اسلحہ اور رسد کی کمی کے باعث اس سلسلہ کو بند کرنا پڑا اور حضرت شیخ الہندؒ کو یہ اطلاع پہنچائی کہ بغیر کسی حکومت کی پشت پناہی کے سلسلہ جہاد جاری رکھنا دشوار ہے۔ (نقش حیات ۲/ ۲۱۲)

اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ حتی الوسع مالی امداد کا خیال رکھتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایک عظیم حکومت سے ٹکر لینا آسان کام نہ تھا۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا سفر حجاز اور مولانا سندھی کا سفر کابل:**

بیرونی حکومتوں سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے سرگرم شاگرد حضرت مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجنے کا اردہ کیا تاکہ وہ حکومت افغانستان کو انگریز کے خلاف نبرد آزما ہونے پر آمادہ کریں اور خود حجاز مقدس جانے کا اردہ فرمایا تاکہ دولت عثمانیہ سے تحریک کے سلسہ میں مدد لی جاسکے، آپ نے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو دہلی سے طلب فرمایا اور بغیر کوئی مفصل پروگرام بتائے ہوئے کابل جانے کا حکم دیا، حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ کابل جانے کا واقعہ اپنی ذاتی ڈائری میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل وکرم سے نکلنے کا راستہ صاف کردیا اور افغانستان پہنچ گیا۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں، ''کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں موجود ہے، ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر ہونے لگا۔ (ذاتی ڈائری/ ۲۳)

الغرض مولانا عبید اللہ سندھیؒ کئی مہینہ مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے خفیہ طریقہ سے ۱۵/ اگست ۱۹۱۵ء یعنی آزادیٔ ہند سے ٹھیک ۳۲/ سال پہلے افغانستان کی سرحد میں داخل ہوکر قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے جہاں تحریک کے خفیہ ممبران آپ کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ اور وہاں پہنچ کر آپ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے، ادھر حضرت

شیخ الہندؒ کی سیاسی سرگرمیوں کی بناپر حکومت ہند آپ کو گرفتار کرنے کی مکمل ارادہ کرچکی تھی، جس کی اطلاع ڈاکٹر انصاری نے حضرت شیخ الہند کو دے دی تھی، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ پہلی فرصت میں برطانوی قلمرو سے نکل جانا چاہتے تھے، اتفاق سے حج کا زمانہ قریب تھا، موقع کو مناسب سمجھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے حج کے بہانے سے سفر حجاز کا قصد فرمایا ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ نے خود ہی جملہ مصارف ادا کردیے اور حضرت شیخ الہندؒ اپنے جاں نثار خادموں مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ وغیرہ کے ساتھ حجاز مقدس کے لیے روانہ ہوگئے اور ۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء میں آپ بخیر وعافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے، دوران سفر حکومت نے آپ کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن آپ آگے آگے رہے اور گرفتاری کا وارنٹ پیچھے پیچھے۔ (اسیران مالٹا ۳۸)

**تحریک کے اہم مراکز:**

قبل اس کے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی خدمات اور حجاز میں حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں کو ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کے اہم مراکز پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے تاکہ تحریک کی ہمہ گیری اور تنظیم کا پتہ چل سکے، جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے تحریک کے مندرجۂ ذیل اہم ترین مراکز تھے۔ (۱) دیوبند (۲) دہلی (۳) دین پور شریف (۴) امروٹ شریف (۵) کھڈہ کراچی (۶) چکوال (۷) زیگی یاغستان۔

**دیوبند:**

دیوبند کے مرکز کو حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز روانہ ہونے سے قبل تک اس عظیم ترین انقلابی تحریک کے ہیڈ کواٹر ہونے کا شرف حاصل رہا، یہاں بقول حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا جس میں ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے انقلابی لیڈر اور تحریک کے خفیہ کارکن جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان آکر ٹھہرتے تھے، اور حضرت شیخ الہندؒ رات کی اندھیریوں میں ان لوگوں سے ملاقات کرتے اور ہدایات دیتے تھے حضرت اکثر بڑے بڑے لیڈروں کو تحریک میں شامل کرنے کے لیے ان کو دیوبند طلب فرماتے تھے، چنانچہ تحریک کے ایک وفادار اور جانباز سپاہی جناب خان عبدالغفار صاحب کا بیان ہے کہ: ''دیوبند کے افغان طلبہ کی وساطت سے سرحد میں شیخ الہندؒ کو میری سرگرمیوں کا علم ہوا چنانچہ انھوں نے مجھے دیوبند طلب کیا اور اپنی تحریک میں شامل کرلیا۔''

خان صاحب کا یہ بھی بیان ہے کہ، جب میں دیوبند جاتا تو حضرت شیخ الہندؒ مجھے اپنے مکان میں خفیہ رکھتے، بسا اوقات وہ دیوبند سے باہر ایک غیر معروف مقام پر مجھ سے مل کر مجھے جو ہدایات واحکام دینے ہوتے عطا فرماتے۔ (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶/جنوری ۵۸ء)

**دھلی :**

اس مرکز کے قائد اور صدر بقول حضرت شیخ الاسلامؒ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے جو حضرت شیخ الہندؒ سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، جب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کی تو اس کی مرکزیت میں اور اضافہ ہوگیا تھا، اس شہر کو جو سیاسیات ہند کا بھی مرکز عظمیٰ تھا یہ سعادت برابر حاصل رہی تاآنکہ تحریک کے راز فاش ہونے کے بعد نظارۃ المعارف کے نائب ناظم مولانا احمد علی لاہوریؒ گرفتار کرلیے گئے۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۰۱)

**دین پور** (سندھ):

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ شہر اصل میں قادری راشدی بزرگان کی چلائی ہوئی خفیہ تحریک آزادی کا مرکز تھا، جس کی قیادت سندھ کے مقبول ترین ولی کامل خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ فرما رہے تھے اور بعد میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی انتھک جدوجہد سے یہ تحریک ''تحریک شیخ الہندؒ'' کے ساتھ مربوط ہوگئی تھی، چنانچہ اس ربط کے قائم ہونے کے بعد دین پور سرحدی علاقوں میں تحریک شیخ الہندؒ کا مرکز قرار پایا، اس مرکز کے ذریعہ جہاں لوگوں کی ذہن سازی کا کام لیا جاتا تھا وہیں جہاد کے لیے اسلحہ بارود وغیرہ بھی جمع کیا جاتا تھا، اس مرکز کے قائد حضرت دین پوریؒ کی خانقاہ کے صدر دروازے کے نیچے تہ خانہ میں گولہ بارود بنانے کی ایک فیکٹری تھی جس میں خانقاہ کے فقراء تندہی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ (دیکھئے ''ید بیضا'' ۱۲۰ مصنفہ حامی عبیدی)

دیوبند اور دین پور میں قوی رابطہ تھا، آپس کے ربط اور تبادلۂ اخبار کے حیرت انگیز نظام کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جب دیوبند سے کابل کے لیے روانہ ہوئے اور دین پور پہنچے تو فوراً حضرت دین پوریؒ نے دریافت فرمایا ارے تم کابل نہیں گئے؟ (ید بیضا ۱۲۱) گویا ان کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی آمد سے پہلے ہی پورے پروگرام کا علم ہوچکا تھا۔

**امروٹ شریف:**

یہاں حضرت دین پوریؒ کے پیر بھائی اور تحریک شیخ الہندؒ کے ایک

جانباز خادم حضرت مولانا تاج محمود امروٹیؒ اقامت پذیر تھے اور آس پاس کے علاقوں میں بھی آزادی کی روح پھونکنے کا کام انجام دیتے تھے، جہاد آزادی کے لیے یہاں بھی زبردست تیاری تھی، اس مرکز کا بھی دیوبند کے مرکز سے قریبی تعلق تھا اور برابر ہدایات موصول ہوتی رہتی تھی۔

**کھڈہ (کراچی):**

یہ مرکز ایک مدرسہ کی شکل میں موجود تھا جس کی قیادت مولانا محمد صادق صاحب کراچویؒ فرماتے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور تحریک آزادی کے زبرست حامیوں میں سے تھے۔ (تاریخ دارالعلوم ۷۸/جلد دوم سید محبوب رضوی) اس مرکز کے نمائندوں کی خدمات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب انگریز عراق پر حملہ کرنا چاہتا تھا تو مولانا محمد صادقؒ اوران کے رفقاء نے ''لس بیلا'' کے مقام پر بلوچی قبائل میں بغاوت کرادی جس کے نتیجہ میں نئی کمک نہ پہنچنے کی بنا پر عراق میں انگریزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، حضرت شیخ الاسلامؒ نقش حیات میں لکھتے ہیں کہ ''اس بغاوت کی وجہ سے عراق میں جو انگریزی فوج محصور ہوئی تھی ابتداً اس کی تعداد تیس ہزار تھی اور جب حصار ٹوٹا ہے تو کل تیرہ ہزار افراد باقی بچے تھے''۔ گویا یہ بغاوت سترہ ہزار انگریزوں کی ہلاکت کا ذریعہ بنی۔ اس بغاوت کے جرم میں حکومت ہند نے مولانا محمد صادق کراچویؒ کو گرفتار کرلیا تھا۔ (نقش حیات ۲/ ۱۹۷)

**چکوال (جہلم):**

اس مرکز کے منتظم مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ تھے، جن کو جمعیۃ الانصار کے بانی ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ (بحوالہ نقش حیات ۲/ ۱۴۴)

یاغستان کے آزاد علاقے میں سرمایہ پہنچانے کا کام مولانا ابومحمد احمد چکوالیؒ اور مولانا حمد اللہ پانی پتیؒ انجام دیتے تھے۔ (دیکھئے تحریک شیخ الہند آخری حصہ ۸)

**زیگی (باجوڑ، یاغستان):**

یہ مرکز جہاد ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے دوران قائم کیا گیا جب حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئیؒ اور مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ کو جہاد شروع کرنے کے لیے یاغستان بھیجا تھا، یہاں جناب خان عبد الغفار خاں صاحب کا یہ بیان دستاویزی حیثیت رکھتا ہے:

''حضرت شیخ الہندؒ آزاد قبائل یاغستان میں ہمارے ذریعہ سے ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں وہ خود بھی آکر شامل ہونا چاہتے تھے، اس غرض کے لیے میں نے اور مولانا فضل محمودؒ نے آزاد قبائلی ریاستوں میں مرکز کے لیے موزوں مقام تلاش کرنے کے لیے انتہائی مشقتیں اٹھائیں، انگریز کی نگرانی کافی سخت تھی اس کے باوجود ایک مرکز ''زیگی'' ریاست باجوڑ میں قائم کرنے کی کامیابی ہوئی۔'' (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۶ رجنوری ۸۵ء)

حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے ۱۹۱۴ء میں اسی مرکز سے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے زیر قیادت تحریک جہاد شروع ہوئی جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، لیکن انگریزی ڈپلومیسیوں اور رسد کی کمی کے باعث جب جہاد کا سلسلہ بند ہوا تو حاجی صاحبؒ ریاست مہمند میں مقیم ہوگئے تھے، اور حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب وغیرہ کابل روانہ ہوگئے۔ (نقش حیات ۲/ ۱۸۸)

ان مراکز مشہورہ کے علاوہ حضرت شیخ الہند کے مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد اس کو بھی مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی تھی، وہاں اگرچہ پہلے سے حضرت شیخ الہندؒ کے محبوب شاگرد حضرت شیخ الاسلامؒ اقامت گزیں تھے مگر اس وقت تک ان کو سیاسیات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے نقش حیات ۲/ ۲۱۵)

حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ نے باقاعدہ سیاست میں قدم رکھا تھا، مدینہ منورہ کے مرکز تحریک ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ''الجنود الربانیہ'' نامی فوج کا ہیڈ کواٹر مدینہ منورہ کو قرار دیا تھا۔ (تحریک شیخ الہند ۲۷۳)

اس کے علاوہ کابل کو بھی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے پہنچنے کے بعد تحریک کا ایک اہم مرکز سمجھا جانے لگا تھا، اگرچہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے پہلے ہی سے وہاں تحریک شیخ الہندؒ کے سرگرم کارکن موجود تھے، اس کی تائید مولانا سندھیؒ کے اس عجیب وغریب حیران کن انکشاف سے ہوتی ہے جس کو فاضل مصنف قاضی عدیل عباسی نے اپنی کتاب ''تحریک خلافت'' میں ذکر کیا ہے کہ: ''مولانا منظور نعمانی سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچے تو جو کام انھیں کرنا تھا اس کے بارے میں ایک لفافہ خود امیر حبیب اللہ والی افغانستان نے ان کو دیا۔'' (قاضی عدیل عباسی ۴۷)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کابل میں رہ کر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی ذمہ داریوں کی تفصیل حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پہنچادی تھی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دیوبند سے روانگی کے وقت حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کوئی مفصل پروگرام نہ بتلایا تھا۔

علاوہ ازیں اس بات سے بھی کابل میں تحریک شیخ الہند کے اثرات

پائے جانے کوتقویت ملتی ہے کہ افغانستان کے قاضی القضاۃ قاضی عبد الرازق صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت گنگوہیؒ کے علم حدیث کے شاگرد تھے حضرت مولانا عبیداللہؒ جب کابل میں ان سے ملے اورانھیں اطمینان ہوگیا کہ یہی مولانا عبداللہ سندھیؒ ہیں تو قاضی صاحب کونہایت خوشی ہوئی تھی۔ (دیکھئے دارالعلوم کی تاریخ سیاست، شاہین جمالی ۱۱۹و۱۲۰)

### اسلحہ کا کارخانہ:

تحریک شیخ الہند کے انقلابی منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر اسلحہ خانے بھی قائم تھے اس سلسلہ میں ہم دین پور کے مرکز کی سرگرمیاں ذکر کرآئے ہیں، جہاں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے وہیں اپنے اندرایک حکمت عملی کو چھپائے ہوئے ہے، ملاحظہ کیجئے:

’’عصر حاضر کے مشہور مصنف مولانا منظور احمد نعمانیؒ راوی ہیں کہ ان سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بتلایا کہ وہ کراچی میں تھے کہ شیخ الہندؒ کا ایک نامہ ملا جس میں ان کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ایک شخص فلاں دن فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے اسے محفوظ کرلینا، اوراس سے کوئی سوال نہ کرنا چنانچہ کراچی کی مسجد میں ایک شخص آیا، اوراس نے میگزین کی تفصیل بتلائی بندوق گولہ بارود وغیرہ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اس کو محفوظ کرلیا، اور جب دیوبند گئے تو حضرت شیخ الہندؒ کو بتلا دیا، ان کو کچھ نہ معلوم تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ بعد میں لوگوں کے ذریعہ پتہ چلا کہ مولانا (شیخ الہندؒ) نے میگزین کا کوئی کارخانہ قائم کیا تھا، جہاں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے تھے، جس کا کوئی پتہ آج تک سی آئی ڈی کو نہ لگ سکا، یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا۔‘‘ (تحریک خلافت ۴۷و۴۸)

اس روایت سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ تحریک کا نظام کس قدر رازداری سے چلتا تھا اور کہاں تک اس کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔

### تحریک کا دائرۂ کار:

تحریک شیخ الہندؒ سے متعلق چند اور باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے، چنانچہ جناب عبداللطیف کرت پوری جو بقول خود ایک عرصۂ دراز تک حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں رہے تھے، (تحریک خلافت ۴۵) بیان کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ایک جماعت مخلصین کے نام سے بنائی تھی، جس کے بہت ہی چنے ہوئے ارکان تھے وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں تو سب کچھ لکھ دیں گے مگر مخلص کا لفظ نہیں لکھیں گے، یہ لفظ صرف جماعت کے نہایت اہم ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ کسی کو لکھ دیں کہ یہ بہت مخلص ہیں ان کو دس ہزار روپیہ دے دو تو وہ مکان اثاث البیت غرضیکہ ہر چیز بیچ کر دس ہزار روپیہ ادا کردے گا۔ (قاضی عدیل عباسی، تحریک خلافت ۴۵) جناب عبداللطیف صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی اسکیم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت مولانا کی اسکیم یہ معلوم ہوتی تھی کہ سرحد کے قبائلیوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے اور اس طرح مجاہدین کی ایک زبردست فوج تیار کی جائے، چنانچہ چند علماء وہاں بھیجے گئے جو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن پاک کی شرح میں جو جہاد کی تعلیم ہے، اور جس سے ایک زمانہ سے علما صرف گذر جاتے ہیں اس پر سب سے زیادہ زور دینا طے تھا، انجام یہ ہوا کہ قبائلیوں میں زبردست جوش جہاد بھر گیا، اور وہ انگریزوں کے سخت مخالف ہوگئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو پستول کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا اور کام سے لوٹ کرآتا تو پوچھتا تھا کہ اے میرے بچے: آج تونے کتنے انگریز مارے؟ وہاں اسلحہ خانہ بھی قائم ہوگیا تھا، رائفلیں اور پستول وہ لوگ خود بناتے تھے۔ (تحریک خلافت ۴۵)

### بیرون ہند تحریک کے اثرات:

جناب عبداللطیف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے شیخ الاسلام ترکی کے مفتئ اعظم، شیخ الجامعۃ جامعہ ازہر اور علماء ومفتیان مصر حضرت شیخ الہندؒ کے ہم نوا تھے۔ (حوالہ مذکورہ ۴۵)

### ایران میں مخلصین کا کارنامہ:

شیخ الہندؒ کی قائم کردہ جماعت مخلصین کے افراد ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے، اس سلسلہ میں عبداللطیف کرت پوری کا بیان کردہ مندرجہ ذیل واقعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ’’جس زمانہ میں شاہ ایران نے اپنے ملک میں تمباکو کی واحد ٹھیکہ داری انگریز کو دے دی تھی تو وہاں کے مجتہد العصر قابو میں نہ آتے تھے، چنانچہ جماعت مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اتارنے کا کام شروع کیا اور انگریز نگراں جب شراب پی کر بد مست ہوگئے تو ایک صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا اس میں تمباکو کے بجائے آلات حرب بند تھے، تب مجتہد العصر نے فتوی دیا کہ ’’تمباکو نوشیدن دریں زمانہ حرام است‘‘ رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلاف معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا، آواز دی تو کوئی نہیں بولا، بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے۔ ’’من آواز می دہم وکس نمی شنود، ایں چہ

ماجرا است؟''۔تو بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور کہا کہ آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا تو بادشاہ نے فوراً دربار کیا اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ حضرت یہ فتویٰ کیسا ہے؟ اسلام تو ایک عالم گیر مذہب قیامت تک کے لیے ہے، یہ کیا کہ تمبا کو پینا اس زمانہ میں حرام اور دوسرے میں حلال، ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال، تو مجتہد العصر نے بادشاہ سے تنہائی کی درخواست کی اور پورا واقعہ بتلایا، اس طرح سے ایران میں انگریزوں کی تمبا کو پر سے اجارہ داری ختم ہوئی۔(تحریک خلافت ۴۶)

تحریک کے مذکورہ بالا انکشافات اگر چہ عام مؤرخین ذکر نہیں کرتے لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی عظیم انقلابی تحریک کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں، اور اس طرح کے نہ جانے کتنے مراکز اور نہ معلوم کتنے واقعات ہوں گے جو آج انہی متعلقہ افراد کے ساتھ اس دنیا سے پردہ کر چکے ہیں۔ بہر حال تاریخ کے ان دھندلے نقوش سے تحریک کے بارے میں جو عظیم تصور قائم ہوتا ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مراکز میں رابطہ کا ایک خفیہ اور زبر دست نظام تھا جو ہمیشہ متحرک رہتا تھا۔

## بزرگوں کی کرامت:

تحریک شیخ الہندؒ کے ان مراکز کا آپس میں ربط اور احکامات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت راز داری کے ساتھ منتقلی، اور وہ بھی ایسے نازک دور میں جب سگانِ فرنگ جگہ جگہ سازشوں کی بو سونگھتے پھرتے تھے، ہندستان کے گوشہ گوشہ اور قریہ قریہ میں سی آئی ڈی کے سفید پوش افراد متعین تھے، کسی اور کے نزدیک راز کے فاش نہ ہونے کی چاہے جو وجوہات ہوں راقم الحروف اس کو ان بزرگوں اور عارفین عظام کی کرامت سمجھتا ہے، جن کے اخلاص کو دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے تھے، جن کے جذبۂ ایمان کا مشاہدہ کر کے قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جو تحریک آزادی میں جاہ و منصب، عزت و شرافت کے لیے نہیں بلکہ شرعی فرض سمجھ کر شریک ہوئے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے پیغامات کو تحریک کے دوسرے مراکز تک پہنچانے میں حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے حجاز روانہ ہونے سے قبل آپ کو حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کے پاس بھیجا تھا اور ان کی واپسی تک سفر کو موقوف رکھا تھا۔(دیکھئے ''تحریک شیخ الہند'' آخری حصہ ۳۲)

اس کے علاوہ خان عبد الغفار خان مرحوم کا بھی بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ حاجی ترنگ زئیؒ سے خط و کتابت کا کام انہی خان عبد الغفار صاحب کی وساطت سے انجام دیتے تھے۔(الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن ۵۸ء)

## ایک عجیب طریقہ:

علاوہ ازیں بعض لوگوں نے ان مراکز کے درمیان سفارت کا ایک عجیب وغریب طریقہ ذکر کیا ہے جس سے قطع نظر کر لینا بھی کلیۃً مناسب نہیں، چنانچہ پاکستان کے ایک پروفیسر جناب محبوب الرحمٰن صاحب نے دار العلوم کے عنوان پر اپنے ایک مضمون میں جو ماہنامہ بینات کراچی میں جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ:

''ایک شخص پشاور سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس حاضر ہوتا وہ کاغذ کے پھول اور گلدان بنانا جانتا تھا حضرت اسے کابل کے لیے خط دیتے وہ اسے پھول کی شکل میں بدلتا اور دیگر پھولوں کے ہمراہ گلدان کی صورت میں پشاور لے جاتا کسی کو گمان بھی نہ ہوتا کہ کسی پھول میں خط بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ شخص باقی پھول تو مقامی طور پر فروخت کر دیتا لیکن اصل پھول کسی کابل والے کے ہاتھ تھما دیتا جو اس غرض سے پشاور میں موجود تھا۔'' (پروفیسر محبوب الرحمٰن مظفر آبادی بینات کراچی بابت جولائی ۸۰ء، ص ۴۴۔ مذکورہ بالا واقعہ کی تائید فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم نے بھی مقالہ پڑھنے کے دوران فرمائی اور بتلایا کہ انہوں نے بذات خود گلدان بنانے والے معمر شخص سے ملاقات کی ہے، محمد سلمان)

اس طرح کے واقعہ کا ثبوت اگر چہ تاریخ جنگ آزادی کی عام کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن تحریک شیخ الہندؒ جیسی تحریکات کے لیے بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔

تحریک کے مراکز میں تعلق کے سلسلے میں ایک اور واقعہ اس جگہ قابلِ ذکر ہے، سندھ میں تحریک شیخ الہندؒ کے سب سے اہم مرکز دین پور کے قائد حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوریؒ کے صاحب زادہ مولانا عبد الہادی صاحبؒ اپنے بچپن کا واقعہ ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز کے بعد حضرت دین پوریؒ کے پاس ایک سرخ وسپید نوجوان مسجد میں آیا اور باادب ہو کر حضرتؒ سے مصافحہ کیا حضرت فوراً کھڑے ہو گئے (غالباً حضرت نے تحریک کا نشان یا اشارہ پا لیا تھا) اور اس شخص کو اپنے ساتھ لے گئے، جماعت کے فقراء کیوں کہ حضرت کے مزاج شناس تھے اس لیے کوئی فقیر اس طرف نہیں گیا لیکن چوں کہ میں (راوی) بچہ تھا اس لیے قریب

جا کر دل چسپی سے یہ کارروائی دیکھتا رہا، اس نو وارد نے اپنی مشہدی اتاری اور اپنی زریں کلاہ کو ادھیڑ ڈالا، اس میں سے زرد رنگ کا ایک ریشمی رومال برآمد ہوا جسے اس نے حضرت کی خدمت میں پیش کردیا۔'' (یدبیضا ۱۳۴ و ۱۳۵)

یہ تھی تحریک کے مراکز اور ان کے درمیان رابطہ کی ہلکی جھلک۔ اب ہم مقصد کی طرف لوٹتے ہیں۔

## مولانا عبید اللہ سندھیؒ کابل میں:

پہلے ذکر آچکا ہے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ جانے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ ہونے کا حکم دیا تھا، چناں چہ آپ نے وہاں پہنچ کر تحریک کے لیے انتھک جدوجہد شروع کردی، اگر چہ قدم قدم پر مصائب سدراہ ہوئیں، اپنوں اور غیروں نے دھوکہ دیا، لیکن آپ صبر کے پتلے بنے رہے اور کبھی بھی مایوسی کو پاس نہ آنے دیا۔ کابل میں رہ کر آپ کی اہم خدمات کو ''نقش حیات'' سے ملخصاً نقل کیا جاتا ہے۔

(الف) آپ نے ترک جرمن مشن کو ہندوستان کی آزادی اور مستقبل کی صحیح پوزیشن سمجھائی اور اپنی بات کو منوایا۔

(ب) عارضی حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاب سنگھ کو صحیح راستہ بتلایا، ان کو متفق کیا اور غلط راہ سے ہٹنے پر مجبور کیا۔

(ج) آپ نے اپنا قوی اثر اراکین دولتِ افغانیہ میں پیدا کیا، اگر چہ امیر افغانستان سردار حبیب اللہ کو جنگ آزادی پر عملی طور سے آمادہ نہ کرسکے اور انگریز کی ڈپلومیسی سدراہ بنی تاہم امیر صاحب مرحوم نے آپ سے بہت تاثر حاصل کیا اور آپ کے لیے مفید مشورے دیئے جن میں ہندو مسلم اتحاد بھی ہے۔

(د) آپ نے عمومی طور پر اراکین دولت افغانیہ کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کا کھلا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا کہ روسی مشن کی واپسی کے بعد جب امیر صاحب نے جرگہ بلاکر انگریزوں سے جنگ کی رائے لی تو تمام ممبرانِ جرگہ انہیں کے ہم خیال وہم زبان تھے۔

(ہ) انہوں نے آئندہ آنے والے امیر امان اللہ خان کو اس قدر متأثر کیا کہ وہ اقتدار پا جانے کے بعد بالکل آپ کا ہم خیال ہوگیا، اور انہوں نے دولتِ افغانیہ کے استقلال کامل کا اعلان کردیا اور جب افغان برطانیہ جنگ ہوئی تو آپ نے تدابیر جنگ میں پورا حصہ لیا، اور اپنی جنود اللہ کے تربیت یافتہ افراد کو بھی جنگ میں شرکت کا حکم دیا تا آنکہ برطانیہ کو شکست ہوئی، اس پر برطانیہ کے سفیر متعینہ کابل نے کہا تھا کہ ''یہ افغانستان کی نہیں عبید اللہ کی فتح ہے''۔ (ماخوذ از نقش حیات جلد دوم ۱۷۹ و ۱۸۰ ملخصاً)

اس کے علاوہ کابل میں رہ کر آپ کا ایک اہم کارنامہ جنود اللہ نامی فوج کی تشکیل تھا، جس کے سپہ سالار حضرت شیخ الہندؒ متعین کیے گئے تھے، اور بہت سے تحریک کے ممبروں کو ان کی سرگرمیوں کے مطابق میجر، جنرل، لیفٹنٹ کرنل وغیرہ کے عہدے دیئے گئے تھے، اس جماعت کا ہیڈ کواٹر ''مدینہ منورہ'' کو قرار دیا گیا تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اور بھی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کے ذکر کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

## حضرت شیخ الہندؒ کی حجاز میں سرگرمیاں:

دوسری طرف حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے جاچکے تھے، اور انہوں نے مکہ معظّمہ پہنچتے ہی وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے ہندستان کی صحیح صورت حال سے ان کو مطلع کیا تھا اور آپ نے غالب پاشا مرحوم سے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام بھی حاصل کرلیا تھا جس میں مسلمانان ہند کو ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی تھی، اس پیغام کو لے کر آپ خود ہی استنبول کے راستے سے یاغستان پہنچانا چاہتے تھے لیکن عراق پر انگریزوں کے حملے کی وجہ سے راستہ مخدوش تھا اس لیے غالب پاشا نے آپ کو براہِ استنبول یاغستان پہنچانے سے معذرت ظاہر کی، اس کے بعد آپ نے ''غالب نامہ'' (غالب نامہ کے لیے ایک مخصوص صندوق تیار کیا گیا تھا، جس کے تختوں کے بیچ میں غالب نامہ رکھ کر مولانا ہادی حسن خانجہانپوری کے سپرد کیا گیا جنھوں نے اس کو ہندستان پہنچانے کی خدمت انجام دی اس کے بعد حاجی احمد مرزا نے تحریروں کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ نے ان کو سرحد پہنچایا) کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہندستان بھیجنے کا انتظام فرمایا، اور مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کو یہ خدمت سپرد کی کہ یہ تحریر سرحد اور آزاد قبائل میں بکمال احتیاط پہنچادیں، اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں ترکی کے وزیر جنگ جناب انور پاشا اور شامی محاذ کے سربراہ جمال پاشا سے ملاقات کی اور ان سے بھی مختلف تحریریں اور وثائق حاصل کیے، ان وثائق کو لے کر آپ براہ ''مکران'' افغانستان پہنچنے کا ارادہ رکھتے تھے، چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر دوبارہ مکہ معظّمہ اور وہاں سے طائف تشریف لے گئے تاکہ غالب پاشا سے امداد حاصل کرسکیں، لیکن قدرت کو کچھ اور

ہی منظور تھا کہ اچانک شریف مکہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور حضرت شیخ الہندؒ طائف میں محصور ہوگئے، کافی مشقتوں کے بعد مکہ معظّمہ آنا ہوا۔ (تفصیل دیکھئے نقش حیات ۲/۲۱۴و۲۲۵تا۲۲)

**غالب نامہ آزاد قبائل میں:**

ادھر ہندستان کے راستہ سے مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے ذریعہ سرحد اور آزاد قبائل میں غالب پاشا کا پیغام پہنچا جس سے مجاہدین کے جوش میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور انھوں نے انگریزی غلامی کے طوق کو اتار پھینکنے کا قصد کرلیا، جناب خان غازی کابلی کی تحقیق کے مطابق مولانا منصور انصاریؒ جن تحریروں کو لے کر کابل پہنچے تھے ان میں ایک تحریر حکومت مؤقتہ اور جنود ربانیہ کے ارکان کے نام حضرت شیخ الہندؒ کی تھی جس میں انھیں حکم دیا گیا تھا کہ ۱۹رفروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ میں مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کریں، یہ حکم ایک زعفرانی رنگ کے ریشمی رومال پر تھا (۱) قلات اور مکران کے قبائل ترکی فوجوں کی قیادت میں کراچی پر حملہ آور ہوں (۲) غزنی اور قندھار کے قبائل ترک فوج کی مدد سے کوئٹہ پر یلغار بول دیں (۳) پشاور کے محاذ پر درہ خیبر کے مہمند اور آفریدی شینو ازی قبائل حملہ آور ہوں (۴) اوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کی امداد سے حملہ کیا جائے (۵) اس تاریخ کو ہندستان میں آزادی کا پرچم لہرایا جائے۔ (خدام الدین حضرت لاہوری نمبر ۳۰۲)

اگر خاں صاحب موصوف کی تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی تحریک میں کہاں تک مراحل طے کر چکے تھے اور کامیابی کی منزل ان سے کتنی دور رہ گئی تھی؟ جبھی تو مولانا محمد علی جوہرؒ اپنی مجلسوں میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ہمارے اذہان وخیالات بھی وہاں تک نہیں پہنچے۔ (نقش حیات ۲/۲۴۴) لیکن حضرت شیخ الہندؒ کچھ اور منصوبے بنا رہے تھے اور تحریک کے بارے میں تقدیر خداوندی کچھ اور ہی چاہتی تھی۔

**تحریک کے راز کا افشاء:**

چناں چہ صرف ایک کارکن کی چوک سے وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا، اور اس عظیم تحریک کا راز فاش ہوگیا جو دارالعلوم کی سرزمین سے انجمن ثمرۃ التربیت کی شکل میں اٹھ کر پورے نصف عالم کو اپنے لپیٹ میں لے چکی تھی، اور جس کے قدم کامرانی کے بس لب بام تک پہنچ چکے تھے۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلے میں کابل میں ہونے والے کام کی تفصیل امیر تحریک حضرت شیخ الہندؒ تک پہنچنی چاہئے تاکہ مفید مشورے لیے جاسکیں اور آئندہ کا لائحۂ علم طے کریں، چناں چہ اس مقصد کے پیش نظر حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک خط حضرت شیخ الہندؒ کے نام ایک ریشمی رومال پر تحریر کیا، جس میں جنود ربانیہ اور حکومت موقتہ کے احوال کی تفصیل درج تھی، ساتھ ہی ایک خط سندھ کے مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کو لکھا جس میں خط کو مدینہ منورہ پہنچانے کی ہدایت درج تھی، ایک تیسرا خط مولانا محمد میاں انصاریؒ کا حضرت شیخ الہندؒ کے نام تھا۔ یہ تینوں خطوط جو ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۰/ جولائی ۱۹۱۶ء میں عبدالحق کو حوالہ کیے کہ وہ ان خطوط کو مولانا عبد الرحیم سندھیؒ کے پاس پہنچا دے، عبدالحق اگر چہ تحریک کا ایک ممبر اور قابل اعتماد شخص تھا لیکن نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ وہ خطوط اس نے اپنے سابق آقا رب نواز کے حوالہ کردیئے جو انگریز کا کاسہ لیس تھا، رب نواز کے ساتھ چند دنوں پہلے یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ اس کا لڑکا شاہنواز ملتان سے بھاگ کر کابل میں مجاہدین سے مل گیا تھا، جس کی وجہ سے انگریزی حکام کی نظر میں رب نواز کی شخصیت مشتبہ ہوگئی تھی، بدنامی کے اس داغ کو زائل کرنے کے لیے اس نے یہ شرمناک حرکت کی کہ وہ خطوط عبدالحق سے لے کر ملتان ڈویژن کے کمشنر کو دیدیئے (تاریخ دار العلوم ۲/۲۰۱) بعد ازاں ان خطوط پر جب سی آئی ڈی مطلع ہوئی تو اس عجیب وغریب انکشاف سے قصر بکنگھم تک دہل گیا، پورے حکومت برطانیہ کے قلمرو میں زلزلہ آگیا، حکام ششدر رہ گئے، برٹش انٹلیجنس کے کارندے اپنی ناکامی پر حیران رہ گئے، اور جب ان ظالموں کو کچھ ہوش آیا تو ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ تحریک کے نمائندوں کو گرفتار کرکے، ان کو سزائیں دے کر اور ان کو تکلیف میں مبتلا کر کے اپنے جذبۂ انتقام کو سرد کریں، چنانچہ پورے ہندستان میں جہاں جہاں تحریک کا اثر ہونے کا شبہ تھا چھاپے مارے گئے اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا حتی کہ شریف مکہ کے ذریعہ ترکوں کے خلاف ایک فتویٰ کو بہانہ بنا کر حرم محترم بیت اللہ المعظم سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے جاں نثار رفقاء حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا عزیر گل صاحبؒ، حکیم نصرت حسین صاحبؒ اور مولانا وحید احمد صاحبؒ کو گرفتار کرا کر مالٹا کے قید خانوں میں آہنی سلاخوں میں مقید کردیا، وہاں رہ کر ان صبر کے پیکروں نے قوم وطن کے لیے جو مصائب اٹھائیں

اورمظالم برداشت کیے وہ تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے جن کو یہ مختصر مضمون محیط نہیں ہوسکتا، ادھر کابل کی انگریز نواز حکومت سے حکومت برطانیہ نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اوران کے رفقاء کے بارے میں زبردست احتجاج کیا جس کے نتیجہ میں مولانا سندھیؒ اوران کے رفقاء کوایک تنگ مکان میں بند کردیا گیا، مولانا محمد میاں صاحب کوکابل سے یاغستان روانہ کردیا گیا جہاں جاکر انھوں نے اپنا نام محمد منصور انصاری رکھ لیا جس سے سی آئی ڈی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بعد جب امیر امان اللہ کی حکومت آئی تو ان لوگوں کی رہائی اور واپسی ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے سب سے پہلی جلاوطن کانگریس پارٹی کوقائم کیا بعدازاں ۱۹۲۳ء میں روس گئے سات مہینہ وہاں رہنے کے بعد ترکی گئے تین سال وہاں قیام کیا پھر مکہ معظّمہ تشریف لے گئے، ۳۹ء میں وطن واپس ہوئے اور آزادی سے تین سال قبل ۴۴ء میں بمقام دین پور وفات پائی اوراپنے پیرومرشد کے قریب دفن ہوئے، رحمۃ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

اس طرح تحریک آزادی کی اس عظیم تحریک کے نظام عادی کوختم کردیا گیا اور وہ منصوبہ ناکام ہوگیا جو حضرت شیخ الہندؒ نے سفرحجاز سے پہلے متعین فرمایا تھا مگر منصوبہ کی ناکامی کا اہم ترین سبب جنگ عظیم میں ترکی اوراس کے حلیف جرمنی کی شکست تھا، اگر حکومت ترکیہ اوراس کے خلفا پوری طرح تحریک کی مدد کرتے تو آج ہمارے ملک کا نقشہ اور ہوتا۔

## منصوبہ کی ناکامی کے بعد:

شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ تحریک شیخ الہند جس وقت شروع ہوئی اس وقت ملک میں کاسہ لیسی کی فضا عام تھی انگریزوں کا خوف لوگوں میں اس قدر تھا کہ اس کا عشرعشیر بھی خوف خدائے قہار سے نہ تھا، ان حالات میں آزادی کے لیے کسی آئینی جدوجہد کا تصور ناممکن تھا، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے انقلابی اورتشدد پرمبنی تحریک کا راستہ اپنایا، اور اپنے طور سے اس راہ میں وہ قربانیاں دیں جن کا تصورنہیں کیا جاسکتا، یہ دوسری بات ہے کہ تدبیر پر ہمیشہ تقدیر غالب آتی رہی اور کارپرداز قضا وقدر کا یہی فیصلہ رہا کہ ہندستان انگریزوں کی غلامی کا دردناک عذاب چکھتا رہے، اوراس کی بظاہر صورت یہ ہوئی کہ انقلابی تحریک کے لیے جن دوملکوں (ترکی وجرمنی) سے تعاون حاصل کیا جاسکتا تھا وہ جنگ عظیم میں شکست سے دوچار ہوگئے اور برطانیہ عظمی صفحہ ہستی پر ایک زبردست طاقت بن کر سامنے آیا۔ (دیکھئے علمائے حق ۱/۲۰۱ء)

## مالٹا سے اب نسیم جاں فزا آنے کو ہے:

ابھی گذرچکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا میں اسارت کے دوران ہندستان کے حالات بہت دگرگوں رہے، ابتدا میں حکومت کی طرف سے حضرتؒ کے متعلقین کو بہت ہراساں کیا گیا، جابجا چھاپے مارے گئے، گرفتاریاں ہوئیں وغیرہ وغیرہ، تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حالات معمول پر آگئے۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی جدائی آپ کے شاگردوں اور جاںنثاروں کے لیے ایک ایسی کسک تھی جس کی ٹیسیں رہ رہ کر دل میں اٹھتی تھیں اور بےقابو بنادیتی تھیں، اسی لیے دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران اورملکی سطح کے سیاسی قائدین جوسب حضرت شیخ الہندؒ کے نیازمندوں میں تھے برابر حضرتؒ کی رہائی کے لیے اپنی حدتک کوششیں کرتے رہے، انگریز افسران کے توسط سے وائسرائے تک سفارشیں بھجوائیں، وفود نے ملاقاتیں کیں، مگرکوئی اطمینان بخش جواب نہ ملتا تھا، بالآخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب حکومت کی طرف سے یہ شاہی فرمان جاری ہوا کہ سیاسی قیدیوں کوجلد رہائی ملے گی، تو مایوسی کے بادل چھٹنے لگے اور اس مبارک گھڑی کا انتظار کیا جانے لگا جب ''اسیران مالٹا'' کی دید سے نگاہیں شادکام ہوں، اوراسی انتظار میں ایک ایک دن گنا جانے لگا، اس وقت لوگوں کے جذبات کیا تھے؟ اورعوام وخواص کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے لیے کیسی محبت ڈال دی گئی تھی؟ اس کا کچھ اندازہ درج ذیل بےتابانہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے جو انتظار کے عالم میں دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ''القاسم'' و''الرشید'' میں مولانا سراج احمد رشیدی نے تحریر کیے تھے، چند بند آپ بھی ملاحظہ کریں:

مالٹا سے اب نسیمِ جاں فزا آنے کو ہے
دل میں جاں آنے کو ہے عیسی ادا آنے کو ہے

وہ گئے تو زندگانی کا مزا جاتا رہا
اب وہ آتے ہیں تو جینے کا مزا آنے کو ہے

اب لبوں پر خیر مقدم مرحبا آنے کو ہے
قاسم خیرات کا وہ لاڈلا آنے کو ہے

بحرِ ہستی کا سفر آسان ہوگا بالیقیں
کشتیٔ طوفاں زدہ کا ناخدا آنے کو ہے

ہو مبارک تجھ کو اے دارِ حدیث دیوبند
وہ ترا شیخِ حدیثِ مصطفیٰ آنے کو ہے

پھر پھلے پھولے گا گلزار رشیدؔی قاسمؔی
سالکو ! گھبراؤ مت رہنما آنے کو ہے
حضرت آئیں گے حسینؔ احمد کو بھی لائیں گے ساتھ
شیخ آنے کو ہے ساتھ میں اس پرفنا، آنے کو ہے
شیخ حسین احمؔد وحید احمؔد، عزؔیر باصفا
دوستانِ باصفا کا قافلہ آنے کو ہے
(حیات شیخ الہندؒ ۱۱۲، ۱۱۳)

الغرض ہر طرف ایک اشتیاق کا عالم تھا اور سب لوگ حضرت کی آمد کی خوشخبری سننے کو بے تاب تھے، ادھر حضرت شیخ الہندؒ ۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲/ مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانہ ہو چکے تھے، راستہ میں اسکندریہ میں کچھ عرصہ رکنا ہوا، پھر وہاں سے ''سویس'' پہنچے اور وہاں سخت مشکلات برداشت کیں، کئی مہینہ سویس میں رکنے کے بعد ''عدن'' کے لیے روانہ ہوئے ۱۳/ رمضان ۱۳۳۸ھ ۲۸/ مئی ۱۹۲۰ کو عدن سے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندستان بذریعہ تار یہ خبر بھیجی کہ ۸/ جون تک ہمارا قافلہ بمبئی پہنچ جائے گا، اس خبر نے پورے ہندستان میں خوشی ومسرت کی لہر دوڑادی اور خصوصی متعلقین نے شدت گرمی اور رمضان المبارک کا مہینہ ہونے کے باوجود اپنے عزیز ترین قائد کے استقبال کے لیے بمبئی حاضری کا قصد کرلیا۔

۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸/ جون ۱۹۲۰ء کو جب حضرت شیخ الہند کا مقدس قافلہ بمبئی کے ساحل پر پہنچا تو عوام کے علاوہ بڑی تعداد میں آپ کے متعلقین، تلامذہ اور سیاسی قائدین جن میں مسٹر گاندھی بھی شامل تھے آپ کے استقبال کیلیے گودی پر موجود تھے۔ دو دن آپ نے بمبئی میں قیام فرمایا، اسی دوران خلافت کمیٹی بمبئی کی طرف سے آپ کو استقبالیہ پیش کیا گیا اور آپ کو شیخ الہندؒ کے خطاب سے نوازا گیا جو بعد میں آپ کے اسم گرامی کا جزو بن گیا، ۲۲/ رمضان المبارک (۱۰/ جون) کو آپ بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۲۴/ رمضان المبارک (۱۲/ جون) کو دہلی رونق افروز ہوئے، دہلی کے اسٹیشن پر آپ کا پرتپاک استقبال کیا گیا، اگلے دن آپ دیوبند کیلیے روانہ ہوئے راستہ میں ہر اسٹیشن پر آپ کی زیارت کے لیے خلق خدا اُمڈ پڑتی تھی، نعرہ ہائے تکبیر کی گونج سے جابجا اسلامی شان وشوکت کا اظہار ہوتا تھا، اسی دوران آپ کے ایک عقیدت مند مولوی مظہر الاسلام صاحب نے درج ذیل قصیدہ پڑھ کو جوش وخروش مزید دوبالا کردیا:

دھوم ہے محبوبِ محبوبِ خدا آیا ہے آج
وارث کل انبیا و اولیا آیا ہے آج
جس قدر جاتا رہا اس سے سوا آیا ہے آج
کل شہیدان وطن کا خوں بہا آیا ہے آج
لائے ہیں تشریف مولانا، مبارک دیوبند!
خوش ہوا ئے کنعاں کہ پھر یوسف ترا آیا ہے آج
وہ محدث، وہ جہاں اُستاد محمودالحسن
یعنی شیخ الہند اسیر مالٹا آیا ہے آج
اے تماشہ دیکھنے والو خدا کی شان کا
بھیس میں درویش کے فرماں روا آیا ہے آج
کل تلک جو غیر ممکن تھا وہ ممکن ہوگیا
بیٹھ کر کشتی میں دریا علم کا آیا ہے آج
(حیات شیخ الہندؒ ۱۲۵)

غازی آباد میرٹھ، مظفرنگر، حتی کہ روہانہ جیسے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی مشتاقان زیارت کی بھیڑ تھی بعض جگہوں پر تو زیارت کیلیے آپ کو چوکی پر بٹھانا پڑا، اور بالآخر جب گاڑی دیوبند پہنچی تو پورے پلیٹ فارم پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر سے فضا گونج رہی تھی اور لوگ پروانہ وار اپنے محبوب استاذ کی زیارت کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے، آپ سواری پر سوار ہوکر اولاً دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث میں رونق افروز ہوئے اور دعا فرمائی اور عشاق کو مصافحہ اور زیارت سے مشرف فرمایا اس کے بعد تقریباً ۱۵/ یوم دیوبند میں قیام فرمانے کے بعد اپنے رفیق سفر اسیر مالٹا حکیم حضرت مولانا حکیم نصرت حسین صاحبؒ (جن کا مالٹا میں اسارت کے دوران انتقال ہوگیا تھا) کے اہل خانہ سے تعزیت کے لیے فتحپور کا سفر فرمایا اور درمیان میں لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، غازی پور، فیض آباد اور مراد آباد وغیرہ بھی اترنا ہوا، ہر جگہ عاشقان زیارت کا مجمع قابل دید تھا، اور کھلے طور پر قبولیت کے آثار نمایاں تھے، ۲۵/ شوال کو آپ دیوبند واپس تشریف لے آئے یہاں آپ کی اہلیہ مکرمہ شدید بیمار تھیں، اور بیماری بالکل آخری مرحلہ تک پہونچ گئی تھی، تا آنکہ ۱۷/ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو مرحومہ نے سفر آخرت اختیار فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

❑❑

# تحریک ریشمی رومال کے خدوخال

مولانا عبدالحمید نعمانی

تحریک ریشمی رومال، ملک کی آزادی کی جدوجہد کے تناظر میں ایک اہم عنوان کے طور پر ایک خاص اہمیت رکھتی ہے؛لیکن اس سلسلے میں ابھی تک باقاعدہ ایسی تحریر سامنے نہیں آئی ہے، جس کی بنیاد پر تحریک آزادی کے حوالے سے ایک واضح تصور بنائی جاسکے۔حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے تلامذہ و رفقا کے بیانات، خطوط، تحریروں اور انگریزی حکومت کی خفیہ رپورٹوں کا اس قدر حصہ ہماری دسترس میں یقیناً آگیا ہے، جس سے اس نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے کہ ریشمی رومال کی تحریک، ملک کو برٹش سامراج کے پنجۂ استبداد و غلامی سے آزاد کرانے کے مقصد سے کی جانے والی کوششوں میں سے ایک اہم جدوجہد کے عنوان سے عبارت ہے۔اس سلسلے کے دو اہم نام ہیں: شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی امام انقلاب، جن کی جدوجہد آزادی کے اہم مرحلے میں تحریک ریشمی رومال کا ذکر آتا ہے۔ ملک کو آزاد کرانے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی مختلف سطحوں پر جدوجہد کر رہے تھے۔اسے عام طور سے ''تحریک شیخ الہند'' کے نام سے تحریک آزادی کے سلسلے کی دستاویز میں درج کیا گیا ہے، اسی کا ایک اہم باب ریشمی رومال تحریک بھی ہے، برٹش لائبریری میں اس کے متعلق انگریزی حکومت کے خفیہ شعبے کی طرف سے تیار کردہ جو رپورٹیں ہیں، ان کا جو کچھ حصہ سامنے آگیا ہے اور مولانا محمد میاںؒ نے اپنے تبصرے اور تشریح کے ساتھ تحریک شیخ الہندؒ انگریزی سرکار کی زبان میں ریشمی خطوط کیس اور کون کیا تھا کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ پوری کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حکومت کے خفیہ شعبے کے افسران کو بعض معاملات اور ناموں میں مغالطہ ہوا ہے اور خفیہ اطلاعات کے بعض امور کے درمیان ارتباط پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی، اس کا بھی تحریک شیخ الہندؒ کی پوری اور صحیح تصویر سامنے نہ آنے میں دخل ہے، اس کمی کی تلافی بڑی حد تک شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اسیر مالٹا اور خود نوشت سوانح نقش حیات سے ہوتی ہے۔ خصوصاً آخر الذکر کتاب میں اس حوالے سے پہلی بار تحریک ریشمی رومال کا قدرے مفصل تعارف نظر آتا ہے، جب کہ اول الذکر کتاب اسیر مالٹا میں مخصوص حالات کے سبب تحریک ریشمی رومال کا ایسے اسلوب میں ذکر کیا گیا، جس سے واضح تصویر نہیں بن پاتی ہے۔ صرف بین السطور میں حقیقت کو پڑھا اور دیکھا جاسکتا ہے، بتایا اور لکھا نہیں جاسکتا ہے، صرف تحریک میں شامل افراد ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اشارہ کس طرف ہے، تاہم مخالف و موافق نقاط نظر اور تحریروں کو ملا کر پڑھنے سے تحریک شیخ الہند کا ایک ایسا خاکہ تیار ہو جاتا ہے، جو یہ بتاتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال گرچہ بے احتیاطی اور کچھ لوگوں کی غلطیوں کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پائی، تاہم آزادی کی جنگ میں اس کا بنیادی رول ایک مسلمہ بات ہے، ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ انگریزی حکمرانی سے آزادی کرانے کے منصوبوں پر مبنی تحریروں میں کیا تھا اور اس کو تحریک ریشمی رومال کا عنوان کیسے ملا، یہ عنوان دیا ہوا کس کا ہے، انگریزی افسران کا یا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا مولانا عبیداللہ سندھیؒ وغیرہ مسلم مجاہدین کا ہے؟ دستیاب ذخائر کے مطالعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ برٹش افسران نے باہمی افہام و تفہیم کی غرض سے جاری تحریک آزادی کو یہ عنوان دیا تھا، چنانچہ حکومت برطانیہ کی سی آئی ڈی کی رپورٹ میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ ''زیر نظر کیس کو اپنی آسانی کے لیے ریشمی خطوط کا کیس اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس بارے میں ہمیں گہری اور مکمل واقفیت اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے تین خطوط کے پکڑے جانے سے حاصل ہوئی جو کابل میں موجود سازشیوں نے حجاز میں موجود سازشیوں کو روانہ کیے تھے۔''

اس سے اور دیگر دستاویز و تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا میاں وغیرہ نے شیخ الہندؒ وغیرہ کو جو خطوط روانہ کیے تھے، وہ چوں کہ ریشمی کپڑے پر لکھے گئے تھے، اور ان میں ملک کو آزاد کرانے اور آیندہ کی حکومت سازی اور دیگر تفصیلات تحریر تھیں، اس کے مدنظر برٹش حکومت کے افسران نے اسے جو ریشمی خطوط کیس قرار دیا تھا، وہی ریشمی رومال تحریک کا عنوان بن گیا، اس سلسلے کے دیگر خطوط جو تحریک شیخ الہند میں شامل افراد نے تحریر کیے ہیں ان سے اور حکومت کے کارپردازوں کی

طرف سے منصوبہ بندی کرنے والوں کے خلاف قائم مقدمہ کی تفصیلات سے بھی صورت واقعہ پر روشنی پڑتی ہے، اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے، جو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تحریک ریشمی رومال اور آزادی کے لیے جاری تحریکات کے سلسلے میں تحریک شیخ الہند کوئی خاص ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے مخصوص رنگ میں پیش کیا جائے۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ، نقش حیات (شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی) کی ذاتی ڈائری (از مولانا عبیداللہ سندھیؒ) اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور ڈاکٹر ضیاء الدین لاہوری نے اس سلسلے میں جو مزید تحقیقات کی ہیں، ان سے ریشمی رومال کا رشتہ قطعی سے تحریک آزادی وطن اور اپنی حکومت بنانے کے منصوبے سے قائم ہو جاتا ہے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ سے بھی گرچہ شیخ الہندؒ کی اہمیت اور خاص کردار سامنے آتا ہے، تاہم اس میں معاملہ ناکافی معلومات یا غلط فہمی سے برعکس کر دیا گیا ہے، یعنی مولانا عبیداللہ سندھیؒ اصل روح رواں اور مولانا محمود حسنؒ کو ان سے متاثر اور تابع وق پیروکار کے طور پر پیش کیا ہے، حالاں کہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا سندھیؒ، مولانا دیوبندیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں اور تحریک شیخ الہندؒ کے فرماں بردار ارکان میں سے تھے۔

دیگر تفصیلات پر ایک نظر ڈالنے سے معاملے کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے رفقا کے تعاون سے ترکی کے غالب پاشا سے جو تحریریں حاصل کی تھیں، ان میں سے ایک قدرے تفصیلی تحریر، ہندستان کو آزاد کرانے کے منصوبوں اور فوجی کارروائیوں پر مشتمل تھی، اسے ہی غالب نامہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور اسے حضرت شیخ الہندؒ نے ایک زعفرانی ریشمی کپڑے پر تحریر کر کے ایک صندوق میں خاص طور سے رکھ کر ہندستان بھیجا تھا اور مولانا سندھیؒ تک افغانستان پہنچا دیا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے اس ارسال کردہ مکتوب کے جواب میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا محمد میاں نے تین خطوط میں دو حضرت شیخ الہندؒ اور ایک شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام بھیجے تھے، وہ بھی ریشمی کپڑے پر ہی تحریر کیے گئے تھے، اس لحاظ سے حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ وغیرہ کے خطوں کا تحریک ریشمی رومال سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے، تاہم حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے ارسال مکتوب کو اولیت اور بنیاد کی حیثیت و درجہ دینا پڑے گا۔

تصویر ذرا واضح شکل میں پیش کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حوالوں میں رولیٹ کمیٹی کے نقل کردہ ضروری اقتباسات پیش کر دیے جائیں۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتا چلا، یہ ایک منصوبہ تھا، جو ہندستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدوں پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

اس منصوبہ کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لیے مولوی عبیداللہ سندھیؒ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں: عبداللہ، فتح محمد اور محمد علی کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو پار کیا، عبیداللہ پہلے سکھ تھا، بعد میں مسلمان ہوا اور دیوبند ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا، وہاں اس نے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند مدرسین اور طلبہ میں بھی پھیلایا، جن لوگوں پر اس نے پنا اثر ڈالا تھا، ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی، جو مدتوں تک درس گاہ دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعہ ہندستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالم گیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے، مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان میں ہی ختم کر دیا، مولانا محمود حسن ہر حال میں دیوبند میں ہی رہے اور عبیداللہ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، مولانا کے مکان پر خفیہ مجالس قائم ہوتیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۸ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبیداللہ کی پیروی کی اور ہندستان چھوڑ دیا مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کا خطہ حجاز پہنچ گئے، روانہ ہونے سے بیشتر عبیداللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں، جن میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا، اس شخص (عبیداللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا (شیخ الہندؒ) کا اہم مقصد یہ تھا کہ بیک وقت ہندستان پر باہر سے حملہ کرایا جائے اور ہندستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے ہم اس جدوجہد کی تفصیل بتاتے ہیں، جو اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے عمل میں لائے۔

عبداللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے، وہاں عبیداللہ کی ملاقات، ترکی جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا، کچھ عرصہ بعد اس کا دیوبندی دوست محمد میاں بھی اس سے جاملا، یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا۔ اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا، جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے موصول کیا تھا، یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے، محمد میاں نے اس کی کاپیاں ہندستان اور سرحد دونوں میں تقسیم کیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی، ان کے ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمے پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی، اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا، یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے اخیر میں اسے اٹلی، سویزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا، یہ سیدھا جینوا گیا اور وہاں کے بدنام زمانہ ہردیال سے ملا، ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا وہاں سے یہ برلن آیا، بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا، خود مولانا عبیداللہ کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا، مولانا برکت اللہ کرشن ورما کا دوست اور امریکن غدار پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستے سے کابل پہنچا تھا، وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا، اور انگلستان، امریکا اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا، ٹوکیو میں وہ ہندستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا، وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا، جس کا نام اسلامک فرنیٹرنئی (اسلامی برادری) تھا، حکومت جاپان نے اس اخبار کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا کہ وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر پارٹی سے جاملا، ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے، ہندستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ (پرویژنل گورنمنٹ) نے اسے ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے جن میں اسے برطانیہ کے ساتھ چھوڑنے اور ہندستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی، ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بھی برطانیہ کے ہاتھ آ گئے، زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا اور اس کی ایک تصویر میں (رولٹ کمیٹی کے ارکان) دکھلائی گئی ہے، حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کیے جائیں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام ایک خط لکھا، اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ ۸/رمضان (۹/جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں نے لکھا تھا ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیجا گیا، شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے لفافہ پر ایک تحریر تھی، جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ہاتھ مولانا محمود حسن کے پاس مکہ معظّمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں، مولانا محمود حسن کے نام خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل، قیام کے بھاگے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا، اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی، اس میں فوج کی بھرتی، ہندستان سے کرنی تجویز ہوئی تھی، اور اس کا کام اسلامی حکومتوں کے درمیان سلسلہ اتحاد کا قائم کرنا تھا، مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں، مولانا عبیداللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب ومکمل نقشہ تھا، اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم تھا، خود محمود حسن کو سالار اعلیٰ بننا تھا، ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار مولانا عبیداللہ کو بننا تھا، اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرمنوں اور کئی اور اعلی فوجی عہدوں کے نام درج ہیں، لاہور کے طلبہ میں ایک کو میجر جنرل بننا تھا، ایک کو کرنل اور چھ کو لیفٹیننٹ کرنل، ان اعلیٰ عہدوں کے لیے جن اشخاص کو تجویز کیا تھا، ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہو سکی تھی، مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں لکھا گیا تھا چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضے میں آ گئے، اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنے والے غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے، اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس

پر دستخط کیے ہیں۔ (نقش حیات صفحہ ۲۹۷ تا ۳۰۳ مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند اشاعت ۱۹۹۹ء)

اس رپورٹ سے واقعہ کی مجموعی تصویر سامنے آجاتی ہے گرچہ رولٹ کمیٹی کے ارکان کو واقعات کا مکمل اور صحیح علم نہیں ہے تاہم، اس رپورٹ کے مذکورہ اقتباس سے بھی چاہے مبہم طور پر ہی سہی، مولانا محمود حسن کی شخصیت ہی مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے، اور مولانا سندھی کے خطوط حضرت شیخ الہند کی طرف سے غالب نامہ سے معروف خط کے بھیجے جانے اور ملنے کے بعد صورت واقعہ کو مولانا سندھی نے اپنے خطوط میں تحریر کر کے ارسال کیا تھا، گزشتہ ابتدائی سطور میں یہ سوال سامنے آیا تھا کہ ریشمی خطوط کے بنیادی خط اور مولانا سندھی کی طرف سے ارسال کردہ ریشمی خطوط بنام حضرت شیخ الہندؒ و شیخ عبدالرحیم کے مضامین کیا تھے، جب تک ان کا پورا متن سامنے نہیں ہوگا، قدرے اطمینان بخش طور پر تحریک ریشمی رومال کا کاکہ نہیں بن پائے گا۔

حضرت مدنیؒ کی نقش حیات، مولانا عبیداللہ کی ذاتی ڈائری اور مولانا محمد میاں کی علماء ہند کا شاندار ماضی اور علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے اور تحریک شیخ الہند اور مقام محمود وغیرہ میں ریشمی خط غالب نامہ کے حوالے سے جو بحث پائی جاتی ہے، اس سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح برطانوی اقتدار کو ہندستان سے بے دخل کیا جا سکتا ہے، البتہ اول الذکر دونوں تصنیف میں غالب نامہ رولٹ کمیٹی کے ذیل میں ضرورت بھر جو حصہ نقل کیا گیا ہے، وہ اس طرح ہے

ایشیا یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے کود پڑے ہیں، ترکی فوج اور مجاہدین اسلام، دشمنوں پر غالب آ گئے ہیں، اس لیے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو، اس پر حملہ کرو، دشمن کو مرنے پر مجبور کرنے کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو، ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو، یہ بھی تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا، ہم نے اس بارے میں اس (ان) سے اتفاق کیا اور انھیں ضروری ہدایات دیں، اگر وہ تمھارے پاس آئے تو تمھیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے اور آدمیوں، روپیوں اور ہر اس چیز سے ان کی امداد کی جائے، جس کی ضرورت اسے (انھیں) پیش آ سکتی ہے۔'' (ذاتی ڈائری ص ۶۰، نقش حیات ص ۳۰۳ تا ۳۰۴)

یہ پورا غالب نامہ نہیں ہے، بلکہ اس کے کچھ ضروری حصے یہاں وہاں سے نقل کیے گئے ہیں مولانا محمد میاں کی کتاب تحریک شیخ الہند ریشمی خطوط کیس کے مطالعہ سے صاف ہو جاتا ہے کہ ان کے سامنے غالب نامہ کا متن نہیں تھا، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ اصل خط کا مضمون غالباً یہ تھا (مذکورہ کتاب ص ۶۷، مطبوعہ الجمعیۃ بکڈپو) اس کے مدنظر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پورا غالب نامہ نقل کر دیا جائے تاکہ قاری کو یہ سمجھنے اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ ریشمی خطوط کے بنیادی خط کی کیا اہمیت ہے اور برٹش سامراج نے اسے کیوں اتنی اہمیت دے کر باقاعدہ مقدمہ تیار کیا تھا، غالب نامہ کا متن یہ ہے:

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفہ رسول رب العالمین، امیر المومنین دام اقبالہ۔

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگ، عموماً گذشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رخ کیے ہوئے ہے۔ روس، فرانس اور انگریز (دشمنانِ اسلام) ممالک عثمانیہ پر بری و بحری حملے کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر حضرت امیر المومنین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیا علیہ الصلاۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسے پر جہاد مقدس کا اعلان کر دیا ہے، جس کے جواب میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان جنگ میں کود پڑے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین کی تعداد دشمنان اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے اور انھوں نے دشمنوں کی قوت کو مات دیا اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔

چنانچہ روسیوں کی قوت کا ایک بڑا حصہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوج اور ان کے جہاز درۂ دانیال اور دوسرے مقامات پر تباہ کر دیے گئے ہیں۔ ترکوں، جرمنوں اور آسٹریلیوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک تھائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامان جنگ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور اس نے سربیا کے علاقے میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دے دی ہے، اس لیے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جوان

حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ وہ اب مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں اور بالکل لاچار و بے یار و مددگار ہیں اور ان کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے، وہ محض خیالی ہے۔

مسلمانو! آج تمھاری نجات کا دن ہے، اس لیے اب اپنی ذلت و خواری اور اپنی غلامی پر راضی و قانع نہ رہو، بلاشبہ آزادی، کامیابی، فتح و نصرت تمھارے ساتھ ہے۔ اب خواب غفلت سے بیدار ہو اور متحد ہو کر اپنے اندر تنظیم واتحاد پیدا کرو۔ اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے لیس کرو، جو تمھارے لیے ضروری اور کافی ہوں اور پھر اس ظالم و جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو، جس کی غلامی کا کمزور طوق تمھاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔ اس زنجیر غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور اپنے دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو، اس طرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق کو حاصل کرلو۔ ہم ان شاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو تمھارے حقوق کی پوری طرح حفاظت کریں گے۔

اس لیے اب جلدی کرو اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے منہ میں پہنچا دو اور اس سے نفرت و دشمنی کو مظاہرہ کرو۔ ہم تمھاری طرف اعتماد اور بھروسے کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے یہ اچھا موقع ہاتھ سے جانے نہ دو، بددل نہ ہو اور خداوند بزرگ و برتر سے دلی مراد پوری ہونے کی امید رکھو۔

تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا محمود حسن صاحب (جو پہلے دیوبند ہندستان کے مدرسے میں تھے) ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا، ہم اس بارے میں ان سے متفق ہیں اور ان کو ضروری ہدایات دے دی ہیں، ان پر اعتماد کرو۔ اگر تمھارے پاس آئیں تو روپے، آدمیوں سے اور جس چیز کی انھیں ضرورت ہو، اس چیز سے ان کی مدد کرو۔

دستخط غالب (پاشا) والی حجاز

غالب نامہ کے اس اصل متن اور نقش حیات اور ذاتی ڈائری میں نقل کردہ متن میں کچھ فرق ہے، مثلاً اصل خط میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ آفندی کا لفظ نہیں ہے، نیز اس میں ''اس'' اسے کے بجائے ان اور انھیں کے الفاظ ہیں۔

اس غالب نامہ کا متن ظاہر ہے کہ برٹش حکومت کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کے خلاف بغاوت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ شیخ الہندؒ کی ہدایت کے مطابق، خان جہاں پور مظفر نگر کے رہنے والے مولانا ہادی حسن حجاز سے ہندستان لے کر آئے تھے، جب کہ برٹش حکومت کی سی آئی ڈی کی رپورٹ میں ''مولوی محمد میاں'' کا نام تحریر کیا ہے۔

ڈی ڈی دیان کے دستخط کے ساتھ سی آئی ڈی کی رپورٹ میں غالب نامہ کے تعلق سے یہ لکھا گیا ہے کہ: ''محمود حسن نے حجاز کے والی غالب پاشا سے یقیناً غدارانہ ساز باز کی، لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ آخر الذکر نے اس مہم میں اس کی زیادہ ہمت افزائی کی، غالب پاشا نے کہا کہ ترک دوسرے قصوں میں الجھے ہوئے ہیں، وہ نہ تو افغانستان مدد بھیج سکتے ہیں اور نہ ہندستان کو لشکر روانہ کر سکتے ہین، تاہم انھوں نے مولانا کو فرمان جہاد دے دیا، جسے مولوی محمد میاں نے ہندستان بھیج دیا، وہ اس جماعت میں شامل تھے، جو جنوری ۱۹۱۵ء میں لوٹی تھی، کہا جاتا ہے کہ آزاد علاقہ کے کٹر متعصب قبائل کو ہمارے خلاف مقابلے میں لانے کے لیے اسے بڑے موثر طریقہ پر استعمال کیا گیا، اس کی نقلیں کر کے ہندستان میں تقسیم کرائی گئی تھیں۔

یقین کیا جاتا ہے مولوی محمود حسن اور مولوی خلیل احمد دونوں ۱۹۱۶ء میں کسی وقت حجاز میں جمال اور انور سے ملاقات کی تھی، لیکن ان ملاقاتوں کے بارے میں کسی اور تفصیل کا علم نہیں، مولوی خلیل احمد ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہندستان واپس آگئے، جب کہ مولوی محمود حسن اور ان کی جماعت کے چند منتخب اراکین حجاز ہی میں ٹھہرے رہ گئے اور شاید اب بھی مدینہ ہی ہیں۔ کسی وقت مولوی محمود حسن کو خیال ہوا تھا کہ وہ حجاز سے قسطنطنیہ جائے، لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس نے اپنا یہ ارادہ پورا کرلیا ہو، ابھی حال تک وہ مکہ تھا۔

ڈی ڈی دیان کی اس رپورٹ میں جن مولانا خلیل احمد کا ذکر سیاسی منصوبہ بندی کے ذیل میں کیا گیا ہے، وہ تفصیلات کے جائزے کے بعد محض افواہ پر مبنی قرار پاتا ہے۔ مولانا مدنیؒ جو بذات خود معاملہ میں شامل اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے نقش حیات میں اس سلسلے میں تفصیل سے لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب کا یہ سفر بمعیت اہلیہ محترمہ صرف حج و زیارت کے لیے تھا، کوئی سیاسی منصوبہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ مدینہ طیبہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا، ان کے ساتھ جو دیگر حضرات تھے وہ بھی سیاست سے خالی الذہن تھے، ان کو سیاسی پارٹی قرار دینا صحیح نہیں ہے، البتہ بعد کی تحقیقات سے جو تفصیلات

سامنے آئی ہیں ان سے یہ انکشاف ہوتا ہے، سیاسی معاملات میں پختہ تربیت نہ ہونے اور سیاست سے خالی الذہن ہونے کے سبب ریشمی خط غالب نامہ کے افشا میں ایسے حضرات کی بے احتیاطیوں کا دخل ہے، کچھ ایسی تحریریں بھی سامنے آگئی ہیں، جن سے معلومات ہوتا ہے کہ جن حالات میں حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن اور ان کے خصوصی رفقا انگریزوں کے خلاف آزادی ہند کی تحریک چلا رہے تھے، ان سے اتفاق نہیں تھا اور اسے پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے غالبا ریشمی خط کے راز کو چھپائے رکھنے میں جس احتیاط اور پختہ عملی و ذہنی کوششوں کی ضرورت تھی، وہ نہیں کیں، ایسے حضرات میں مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری حضرت شیخ الہندؒ کے عزیز میاں مسعود وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کی صراحت نہیں ملتی ہے کہ غالب نامہ اس وقت انگریزی سی آئی ڈی کے ہاتھ لگ گیا تھا بلکہ کچھ تحریریں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ غالب نامہ یا حضرت شیخ الہندؒ کی دوسری تحریریں اس کی دسترس میں نہیں آسکی تھیں، البتہ غالب نامہ کے متعلق مولانا عبیداللہ سندھی اور ان دیگر رفقا کے خطوط سے معلوم ہوا، یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کے زعفرانی ریشمی کپڑے پر لکھے خطوط اور تحریک سے متعلق اس سے وابستہ دیگر حضرات کے اور تحریک سے متعلق مکتوبات بھی دیے جائیں، ان سے ریشمی رومال تحریک کے افہام و تفہیم میں مدد ملے گی اور دیگر متعلقہ امور پر تنقید و تبصرے میں بصیرت و آسانی پیدا ہوگی۔

## مولانا عبیداللہ کا خط مولانا محمود حسن کے نام

احوال انجمن دیگر (موسوم) بنام حکومت موقتہ ہند

ایک ہندستانی رئیس مہندر پرتاپ ساکن بندرابن جسے آریاؤں کی جماعت سے خاص تعلق ہے اور ہندستانی راجگان سے واسطہ در واسطہ ملتا ہے۔ گذشتہ سال جرمنی پہنچا۔ قیصر سے ہندستان کے مسئلے میں ایک تصفیہ کر کے اس کا ایک خط بنام روساء ہند و امیر کابل لایا۔

حضرت خلیفۃ المسلمین نے بھی قیصر کی طرح اسے اپنا وکیل ہند بنایا اس کے ساتھ مولوی برکت اللہ بھوپالی جو جاپان و امریکہ میں رہ چکے ہیں، برلن سے ہمراہ ہوئے۔ قیصر کے قائم مقام ایک اور سلطان المعظم کے ایک افسر اس کے ساتھ کابل آئے، یہ لوگ میرے کابل پہنچنے سے پہلے سے دس روز قبل پہنچ چکے تھے، انھوں نے ہندوؤں کے فوائد کی تائید میں ہندستانی مسئلہ امیر کے سامنے پیش کیا اور کابل میں دونوں نے ایک انجمن کی بنام مذکورہ بالا بنیاد ڈالی۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ہندستان کے معاملات پر مستقبل میں دول عظمیٰ سے معاہدات کرے۔ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ انھوں نے مجھ سے اس انجمن میں شامل ہونے کی درخواست کی میں نے اسلامی مفادات کی حفاظت کی نظر سے قبول کیا۔

ا. چند روز مباحثات کے بعد اس انجمن نے قبول کر لیا کہ افغانستان اگر جنگ میں شرکت کرتا ہے تو ہم اس کے شاہزدے کو ہندستان کا مستقبل بادشاہ ماننے کو تیا رہیں۔ اور اس قسم کی درخواست امیر صاحب کے یہاں پیش کر دی، لیکن چوں کہ امیر صاحب ابھی شرکت جنگ کے لیے تیار نہیں، اس لیے معاملہ ملتوی کر رکھا ہے۔

۲. اس حکومت کی طرف سے روس میں سفارت گئی، جس میں ایک ہندو اور ایک مہاجر طالب علم تھا جو افغانسان کے لیے مفید اثرات لے کر واپس آئے، اب روس کا سفیر کابل آنے والا ہے۔ روس کی انگریزوں سے برہمی میں جس کے فیصلے کے لیے کچھ جا تا ہوا غرقاب ہوا، ممکن

ہے کہ سفارت مذکورہ کا اثر بھی شامل ہو۔

۳. ایک سفارت براہ ایران قسطنطنیہ اور برلن گئی ہے، اس میں دونوں ہمارے مہاجر طالب علم ہیں، امید ہے حضور میں حاضر ہوکر مورد عنایت ہوں گے۔

۴. اب ایک سفارت جاپان اور چین کو جانے والی ہے۔

۵. ہندستان میں پہلی سفارت بھیجی گئی، وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔

۶. اب دوسری سفارت جارہی ہے۔

۷. تھوڑے دنوں میں ایک دوسری سفارت برلن جانے والی ہے۔

جرمن سفارت سے میرے ذاتی تعلقات بہت اعلیٰ درجے پر ہیں، جس سے اسلامی فوائد میں بہت مدد ملے گی۔ اس حکومت موقتہ میں راجہ پرتاپ صدر ہیں، مولوی برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم اور احقر وزیر ہند۔

فقط والسلام

عبیداللہ

## مولانا عبیداللہ سندھی کا خط بنام شیخ عبدالرحیم

۹ر رمضان یوم دوشنبہ (مطابق ۱۰ر جولائی ۱۹۱۶ء) کابل

سلام مسنون! آپ ضرور، یہ امانت مدینہ طیبہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں کسی معتمد حاجی کی معرفت پہنچادیں، یہ ایسا کام ہے کہ اس کے کے لیے مستقل سفر کرنا نقصان نہیں، اگر آدمی معتمد ہو تو زبانی یہ بھی کہہ دیں کہ حضرت مولانا یہاں آنے کی بالکل کوشش نہ کریں اور مولوی اگر اس حج پر نہ آسکیں تو خیال فرمالیں کہ اس کا آنا ممکن نہیں۔

آپ اس کے بعد خود میرے پاس آنے کی کوشش کریں، کیوں کہ یہاں بہت سے ضروری کام ہیں، ضرور آیئے، اگر خدانخواستہ آپ کو معتمد حاجی نہ مل سکے، اور آپ خود بھی نہ جاسکیں، تو مولوی حمداللہ پانی پت والے سے اس معاملے میں مدد لیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس حج کے موقع پر یہ اطلاعات حضرت مولانا کے پاس پہنچ جائیں اور وہاں سے جو اطلاع ملے، وہ براہ راست نہ ہوسکے تو مولوی احمد لاہوری کی معرفت ضرور ہی ملنی چاہیے۔

عبیداللہ عفی عنہ

اس سلسلے میں تین خطوط کا حوالہ آتا ہے، اس حساب سے مولانا سندھی کا ایک اور مکتوب حضرت شیخ الہندؒ کے نام ہونا چاہیے، لیکن ریکارڈ میں ان کے حوالے سے یہ دو ہی خط ملتے ہیں جن مکتوب میں حضرت شیخ الہندؒ

کے بھیجے غالب نامہ ریشمی خط کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کے نام مولانا سندھی کے خط میں کوئی تاریخ مرقوم نہیں ہے لیکن شیخ عبدالرحیم سندھی کے نام مولانا عبیداللہ سندھی کے تحریر کردہ مکتوب سے ایک دن پہلے ۹ر جولائی ۱۹۱۶ء کو مولانا محمد میاں منصور انصاری نے جو مکتوب مولانا محمود حسن کے نام تحریر کیا ہے، اس میں غالب نامہ اور اس کے متعلق دیگر امور کا حوالہ ملتا ہے۔ اور غالباً تیسرا مکتوب یہی ہے، اس رائے کو تقویت اس بات سے ملتی ہے کہ کچھ تحریروں میں اس کا ذکر ہے کہ یہ بھی ریشمی کپڑے پر لکھا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کا ارسال خط غالب نامہ تو مولانا سندھی اور ان کے دیگر رفقا کے ساتھ اور بھی بہت سے افراد کو مل گیا تھا لیکن اس کا واضح ذکر نہیں ملتا ہے کہ مولانا سندھی کے لکھے خطوط حضرت

شیخ الہندؒ کو ملے یا نہیں، اس تناظر میں مولانا محمد میاں کے مکتوب کی ایک اہمیت ہوجاتی ہے، اس سے ریشمی رومال تحریک کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں، خط کا مکتوب کا متن یہ ہے

## مولانا محمد میاں کا خط حضرت مولانا محمود حسن کے نام

از کابل ۸/رمضان المبارک۔ روز ابتدا

وسیلہ یومی وغدی حضرت مولانا صاحب مدظلہ العالی، آداب و نیاز مسنونہ جدہ کے بعد کا حال یہ ہے۔ بمبئی آرام و بے خطر پہنچے، بندر پر اسباب کی تلاشی میں خدام سے دانستہ اغماض برتا گیا، فللہ الحمد۔ مولانا مرتضیٰ کام کو ناممکن خیال کرتے ہیں، اس لیے ان کو کام میں نہیں لیا گیا، مولوی ظہور صاحب بمبئی استقبال کو پہنچے تھے اور محمد حسین راندیر سے، راندیر میں تحریک چندہ صرف سید صاحب کے خلاف سے ناکام رہی، راندیر خطیب مکر جانے والے تھے نہ معلوم کیا ہوا، قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سرپرستی قبول فرمائی، جماعت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی، اس کام کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک سالہ رخصت لینے کا قصد فرما رہے ہیں، جماعت کا ہر سہ ممبر سرفروشی کر رہے ہیں، مطلوب الگ ہوگیا، سید نور ست، مولانا رائے والے متفق و معاون ہیں، حکیم صاحب پچاس روپے ماہوار مکان پر جا کر خود دیتے رہتے ہیں اور درمیان میں بھی ایک دو بار جاتے رہتے ہیں اور گاہ بگاہ ڈاکٹر صاحب بھی، حنیف کو جماعت، دس روپے جیب خرچ دیتی ہے، وہ مکان پر ہی ہیں، مدرسہ نے ان سے کوئی ہمدردی نہیں کی، مالکان مدرسہ سرکار کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، نمائش کے دربار میں شرکت کا فخر بھی نصیب ہونے لگا۔ امیر شاہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے دستی کام کے لیے پڑا ہے، مولانا مدرسہ سے مرعوب ہیں، مگر خدام کی صفائی فرماتے رہتے ہیں مولوی رامپوری نے بھی تائید سے کنارہ کیا، مسعود بھی شکار ہوگیا۔

بندہ حسرت، آزاد سے ملا، دونوں پیکار ہوچکے ہیں، کیوں کہ بندہ کا لوٹنا حضور تک ممکن نہ تھا، اس لیے آگے بڑھا، غالب نامہ احباب ہند کو دکھا کر حضرات یاغستان کے پاس لایا، حاجی بھی اب مہمند میں ہیں، مہاجرین نے مہمند، باجوڑ، صوات، بینر وغیرہ علاقوں میں آگ لگا رکھی ہے، ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت کا خاص اثر ہوا، اس لیے ضروری ہے کہ حسب وعدۂ غالب مصالحت کے وقت یاغستان کی خدمت کا خیال رکھا جائے۔ ضعف جماعت ہند سے مہاجرین کو کافی امداد نہیں پہنچ سکی۔ بندہ یاغستان ایک ماہ قیام کرکے وفد مہاجرین کے ساتھ کابل پہنچا، مولانا سیف جماعت سے الگ ہوکر یہاں مقیم ہیں، ان کے لیے دولت کی طرف سے کام کی تجویز ہورہی ہے، اعضائے وفد فضلین و عبدالعزیز ہیں۔ مولانا الناظم کی توجہات و حاجی عبدالرزاق صاحب کی عنایات سے وفد کو دربار نصر اللہ میں رسائی کی ابتدائی کامیابی بھی ہوئی، بندہ ان سے الگ باریاب ہوا، حضور کے زیر اثر کام اور اس کے اصول کی تفصیل کی گئی، خاص مقبولیت ہوئی، الحمد للہ اور ان شاء اللہ۔ اس ذیل میں حاضر خدمت ہوں گا۔

یہاں کا حال یہ ہے کہ یہاں فتاویٰ وسفرائے ترک و جرمن پہنچے، ان کا اعزاز پورا ہوا، لیکن مقصد میں ناکام رہے، وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناطرف داری میں ایران و افغانستان سے ان کی ضروریات معلوم کرتا، اس کے پورا کرنے کی سبیل کرتا اور حسب احوال معاہدہ دوستی کرتا، افغانستان نہ بڑی جنگ میں شرکت کا سامان رکھتا ہے اور نہ کوئی بڑی دولت اس کے نقصانات کی تلافی کا ذمہ دار ہے، اس لیے شریک حرب نہیں ہوسکتا، اگر ضروری افسران، انجینئران، اسلحہ، روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبۂ کفر عصمت و اعانت کا عہد نامہ کیا جائے، تو شرکت کے لیے تیار ہیں۔ بااین ہمہ سردار نائب السلطنت، عام سرحدی وزیر آفریدی مہمند، باجوڑ، صوات، بنیر، چکسر، غوربند، کرناہ، کوہستان، دیر، چترال وغیرہ میں اپنا اثر منظم کرتے اور ان سے وکلا طلب کر کے عہد شرکت بصورت جنگ لے رہے ہیں۔ یہ کام ایک حد تک ہوچکا ہے، سفرا جرمن واپس اور ترک مقیم ہیں، مگر بے کار۔ تعجب ہے کہ سفرا خالی ہاتھ آئے حتیٰ کہ کوئی کافی سند سفارت بھی نہ لائے، ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے، مولانا الناظم باعافیت ہیں، دولت میں ایک حد تک اعتماد ہوگیا ہے، انگریز ان کو یہاں جاسوس ثابت کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں، جن کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا ہے۔ مگر الحمد للہ کہ ان کو اب تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

مہاجرین طلبہ انگریزی اور بعض سکھ بھی اب یہاں حاجی عبدالرزاق صاحب کی مدد و نائب کی مہربانی سے آزاد ہیں اور مولانا الناظم کی زیر سرپرستی دیے گئے ہیں، مصارف بذمہ دولت ہیں۔ کوئی سرکاری کام ان کے ذمہ نہیں ہے۔ البتہ مولانا کے خاص کاموں میں بہ ایمائے نائب السلطنت دست و بازو ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

''ایک جمعیۃ ہندستان آزاد کرانے والی اس کا صدر ایک ہندی راجہ مقیم کابل ہے، جو کہ سلطان معظم اور قیصر جرمنی کے اعتماد نامہ کے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ ناظم صاحب ومولانا برکت اللہ اس جماعت کے وزرا ہیں، اس جماعت نے ہندستان میں مراکز و دیگر دول سے معاہدات کرنے کے لیے حرکت کی ہے، جس میں ابتدائی کامیابی ہوئی ہے۔ اس کام میں عضو متحرک طلبہ ہی ہیں۔ ان میں بعض دربار خلافت ہو کر حاضر خدمت ہوں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

دوسری جماعت الجنود الربانیہ۔ یہ فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت ہے، جس کا مقصد اولیہ سلاطین اسلام میں اعتماد پیدا کرنا ہے، اس کا صدر جس کا نام فوجی قاعدہ سے جنرل یا القائد ہے، حضور کو قرار دیا گیا ہے اور مرکز اصلی مدینہ منورہ۔ اس لیے خیال ہے کہ حضور مدینہ منورہ میں رہ کر خلافت علیا سے، افغانستان و ایران کے ساتھ معاہدے کی سعی فرمائیں اور افغانستان کے متعلق، نیز یاغستان کے متعلق تجویز کو خدام تک پہنچا دینا کافی خیال فرمائیں۔

افغانستان شرکت جنگ کے لیے امور مذکورہ بالا کا طالب ہے جسے اولیاء دولت عثمانیہ و خلافت ثانیہ تک پہنچانے کی جلد سے جلد تدبیر کیجیے۔ کیوں کہ ہندستان میں کفر پر کاری ضرب لگانے کی یہی ایک صورت ہے، اہل مدرسہ مولوی محسن، سید نور کے ذریعے سے حضور کو ہند میں لانے کی سعی میں ہیں، کیوں کہ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ حجاز میں بھی کام ہو سکتا ہے، ادھر انگریزوں میں پہلی سی عزت بوجہ عدم ضرورت اب نہیں رہی۔

قاضی صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب، مولانا رائے والے حضور کو مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں، یہ خطرہ بوجہ قصۂ غالب کے علم ہونے کے ذریعہ مطلوب، اب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے، اس لیے ایسی کسی تحریک کو ہرگز ہرگز منظور نہ فرمایا جائے۔

مبلغ عطاء حضور کے مکان پر اور سید نور کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کے سپرد کر دیا گیا، بندہ حصول قدم بوسی کی سعی میں ہے، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کامیاب ہوں گا۔ مولانا الناظم، مولانا سیف، فضلین و عبدالعزیز و جملہ مہاجرین طلبہ سلام عرض کرتے ہیں، والسلام برادر عزیز واحد مولانا حسین، ان کے والد صاحب و برادران، حرمت اللہ و احمد جان صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون۔ مدنی خطوط ہند لہ ڈاک کے حوالہ کر دیے گئے تھے۔ ڈاکٹر شاہ بخش صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ و سید ہادی و خدا بخش و حبیب اللہ غازی کو بھی۔

(۲)

تحریر اینکہ در ریاستہائے یاغستان خدام والا دین اسلام اجزا نمودہ اند۔ نمونہ آن ازین خط و قاصد نواب صاحب دیر وصوات معلوم خواہد شد۔ نواب دیر قوت پنجاہ ہزار فوج دارد بذریعۂ ملا صاحب بابڑہ اورا برائے خلاف انگریز نوشتہ شدہ بود۔ اور زبانی وعدۂ واثق نمودہ است۔ چنانچہ عبدالمتین خان پسر عمرا خان غازی مرحوم از کابل فرار شدہ آمدہ۔ نواب دیر اورا جائے دادہ باوجود سخت سعی انگریز اورا نہ بخشید۔ بر ریاست عمرا خان مرحوم برادر زادہ اش قابض و سخت حامی انگریز است۔ نواب دیر بمقابلۂ وے از فوج و روپیہ امداد عبدالمتین نمودہ قریب این شدہ است کہ بر ریست جندول عبدالمتین خان را قابض نماید۔

امید است کہ در امروز و فردا قبضہ شود، ان شاء اللہ۔

عبدالمتین بخدمت جناب ملا صاحب بابڑ حاضر شدہ بود، سخت دشمن کفار است۔ بعد قبضۂ این باقی رؤسائے یاغستان کہ خان خار دخان جار۔ خان نوی کلی ہستند ان شاء اللہ از دوستی کفار نائب خواہند شد۔ چرا کہ قوت دیر و قوت جندول ہر دو انیقدر قوی است کہ باقی ہمہ خوانین را تابعداری شان لازم است۔ خوانین علاقہ چارمنگ خورد و خان کوٹلی از اوّل دشمنانِ انگریز اند۔ مجموعہ قوۃ ذاتی شان قریباً یک ہزار نفری است۔ و معہ اقوام آزاد چارمنگ (کہ در غزی شریک شان می باشند) تا ۳ ہزار می رسد۔ درین خوانین محمود خان قابل ترین و خادم دین است۔ ان شاء اللہ تعالیٰ از نواب دیر و جندول و غیرہم عرضداشتہا ہمراہ خود خواہم آورد۔ این فقط نمونہ کار و احوال است۔ از دربار خلافت امید است کہ از حقوق این نواح غافل نخواہد بود۔ از احیاء ایشیا و سطے کہ از قوۃ اسلامیہ پرود زیر اثر کفار است چشم پوشی نتوان کرد۔ برائے ترقی و بقائے خلافت علیہ و حفاظت اسلام در خیال بندہ احیائے ایشیائے وسطے علی الخصوص ہندستان از افریقہ کم نیست۔ پس لازم است کہ ما ہمہ وسائل خویش را درین باب صرف نمایم فقط۔

محمد میاں عفی عنہ انصاری ابوایوبی

مقام جائے ملا صاحب بابڑہ (باجوڑ)، یاغستان

۱۵ر شوال المکرّم ۱۳۳۵ھ

## خط مولوی محمد میاں انصاری بنام مولانا حسین احمد مدنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت بابرکت مخدومنا جناب مولانا الشیخ سیّد حسین احمد صاحب مدرس الحرم مع برادران عم فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ بندہ جس وقت ہندستان پہنچا، غوغا تھا کہ حضرت مولانا مدظلہٗ کو مع کل جماعت کے انگریز نے عدن میں قید کردیا۔ اب یہ مشہور ہے کہ شریف مکہ نے خدانخواستہ حضرت مدظلہم کو گرفتار کرکے انگریزوں کو دے دیا۔ خدا تعالیٰ سے اس کی امید نہیں۔ ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں ارسال ہے۔ اگر حامل عریضہ کی حضرت سے ملاقات نہ ہو تو آپ صاحبوں میں سے جو بھی موجود ہوں وہ مہربانی فرماکر میرے عریضہ کا ترکی میں ترجمہ کراکر بذریعہ والی مدینہ منورہ بخدمت حضرت انور پاشا وزیر اعظم خلافت سنیہ روانہ فرمادیں ضروری ہے۔ حاملِ عریضہ کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو اس سے دریغ فرمادیں۔ حضرت والد صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور بچوں کو دعوات پہنچے۔ والسلام مع الاکرام۔

عریضہ محمد میاں عفی عنہ انصاری ابوایوبی

۱۵ر شوال المکرّم ۱۳۳۵ھ

نوٹ: باقی احوال یہ صاحب حاملِ عریضہ زبانی بیان فرمائیں گے، ان کو بھی آپ ترجمہ زبانِ ترکی میں فرماکر بخدمت حضرت عالی انور پاشا روانہ فرمائیں۔ یہ احوال اب معلوم ہوئے ہیں۔ محمد میاں عفی عنہ انصاری

فہرست تحریرات

۱. نمونہ عرضداشت جمعیۃ حزب اللہ یاغستان بخدمت اعلیٰ حضرت سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ۔

۲. نمونہ عرضداشت علمائے خوانین یاغستان بجواب نامہ حضرت غالب پاشا والی حجاز بخدمت اعلیٰ حضرت سلطان المعظم۔

۳. عریضہ بندہ بخدمت حضرت مولانا مدظلہٗ العالی

۴. فہرست مرکز سرحدیہ منظور کردہ دولت افغانستان

۵. عریضہ مولوی فضل ربی صاحب بخدمت حضرت مولانا مدظلہٗ العالی۔

۶. عریضہ نواب دیر بخدمت جناب مُلّا صاحب بابڑہ۔

۷. خط قاضی دیر بنام مولوی فضل ربی صاحب

ان سب کا ترجمہ ترکی میں کراکر اور ایک بڑے لفافہ میں یک جا بند کرکے اس پر حضرت عالی انور پاشا کا پتہ لکھ دیا جائے اور والیِ مدینہ منورہ کی معرفت یا جو صورت احسن آپ کو معلوم ہو اس طریقہ سے حضرت انور میں روانہ فرمائیں۔ رازداری کا نہایت لحاظ رہے اور اصل ترجمہ کی ہمراہ ہو۔ قیصر جرمن کے خطوط ریاست ہائے ہند کے نام راجہ مہندر پرتاپ نے ترکستان سے روانہ فرمائے ہیں۔ ان کے پہنچانے کا جلد انتظام کیا جائے۔ اس ڈاک کا جواب اگر حضرت عالی انور پاشا سے حامل عرائض ہٰذا کے ہاتھ روانہ فرماسکیں تو اس سے یہاں کچھ تحریک پیدا ہوسکتی ہے۔ ورنہ جس افسر ترکی کو لفافہ دیا جائے، اس سے باضابطہ رسید لے کر ضرور روانہ فرمائیں۔ اگر حضرت عالی انور پاشا سے صرف رسید ڈاک حاصل ہوسکے تو نورٌ علیٰ نور۔ یہ امر خوب ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اگر ایرانی راہ یا بصورت صلح روس روسی ریل کے ذریعہ سے کچھ عسکر سلطانی حدود دہرات وغیرہ پہنچ جاویں تو نائب السلطنت امیر کابل سے بغاوت بھی کرکے ہند پر حملہ کرسکتا ہے۔ عسکر سلطانی کے حدود افغانستان پر پہنچنے کی صورت میں لازم ہے کہ اس کی صحیح اطلاع ہم کو یاغستان میں جس طرح ہوسکے پہنچانی چاہیے۔ ہم اس نشان پر اعتماد کریں گے جو ہم سے غالب پاشا نے مقرر فرمایا ہے۔ فقط

محمد میاں عفی عنہ انصاری

مولانا محمد میاں انصاری کے یہ مکتوبات اس حوالے سے اہم ہیں کہ وہ تحریک ریشمی رومال کے کئی پہلو اور امور پر روشنی ڈالتے ہیں، حضرت مدنیؒ کے نام اس مکتوب میں نمبروار جن باتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بیشتر چیزیں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی محنت اور کوششوں سے مجلّہ 'علم و آگہی' کی خصوصی اشاعت تحریکات ملّی میں شائع ہوچکی ہیں، یہ تحریرات خطوط اور عرض داشت وغیرہ کچھ دوستوں کی عنایت سے خاکسار کو مل گئی ہیں، ان کو بھی یہ نقل کردینا مفید مطلب ہوگا، اس سلسلے کی دستیاب دو خاکے ہیں، جن میں تیار کردہ فوج، جنودِ ربانیہ کے منصوبے کا نقشہ ہے، اور دوسرے جنودِ ربانیہ (خدائی لشکر) کے منصب داران کی فہرست ہے۔ (جدول ملاحظہ فرمائیں)

### منصب داران جنود ربانیہ

(الف): **مربی** (۱) سالار المعظم خلیفۃ المسلمین (۲) سلطان احمد شاہ قاچار، ایران (۳) امیر حبیب اللہ خان، کابل

ب: **مردان** (۱) انور پاشا (۲) ولی عہد دولتِ عثمانیہ (۳) وزیر اعظم

دولتِ عثمانیہ (۴) عباس حلمی پاشا (۵) شریفِ مکہ معظّمہ (۶) نائب السلطنت کابل سردار نصراللہ خاں (۷) معین السلطنت کابل سردار عنایت اللہ خاں (۸) نظام حیدرآباد (۹) والیِ بھوپال (۱۰) نواب رام پور (۱۱) نظام بہاول پور (۱۲) رئیس المجاہدین۔

ج: **جنرل یا سالار** (۱) سلطان المعظم حضرت مولانا محدث دیوبندی مدظلہٗ العالی (۲) قائم مقام سالار کابل مولانا عبیداللہ صاحب۔

د: **نائب سالار** (یا لیفٹیننٹ جنرل) (۱) مولانا محی الدین خاں صاحب (۲) مولانا عبدالرحیم صاحب (۳) مولانا غلام محمد صاحب بہاول پور (۴) مولانا تاج محمود صاحب سندھی (۵) مولوی حسین احمد صاحب مدنی (۶) مولوی حمداللہ خان صاحب (۷) حاجی صاحب ترنگ زئی (۸) ڈاکٹر انصاری (۹) حکیم عبدالرزّاق صاحب (۱۰) ملا صاحب بابرا (۱۱) کوہستانی (۱۲) جان صاحب باجوڑ (۱۳) مولوی ابراہیم صاحب کالوی (۱۴) مولوی محمد میاں (۱۵) حاجی سعید احمد انبیٹھوی (۱۶) شیخ عبدالعزیز شادیش (۱۷) مولوی عبدالکریم صاحب نائب رئیس المجاہدین (۱۸) مولوی عبدالعزیز رحیم آبادی (۱۹) مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی (۲۰) مولوی عبداللہ غازی پوری (۲۱) نواب ضمیر الدین (۲۲) مولوی عبدالباری صاحب (۲۳) ابوالکلام (۲۴) محمد علی (۲۵) شوکت علی (۲۶) ظفر علی (۲۷) حسرت موہانی (۲۸) مولوی عبدالقادر قصوری (۲۹) مولوی برکت اللہ بھوپالی (۳۰) پیر اسد اللہ شاہ سندھی۔

ہ: **معین سالار** (میجر جنرل) مولوی سیف الرحمٰن صاحب، مولوی محمد حسن مرادآبادی، مولوی عبداللہ انصاری، میر سراج الدین بہاول پوری، پاچا ملا عبدالخالق، مولوی بشیر رئیس المجاہدین، شیخ ابراہیم سندھی، مولوی محمد علی قصوری، سیّد سلیمان ندوی، عمادی، غلام حسین، آزاد سبحانی، کاظم بے، خوشی محمد، مولوی ثناء اللہ، مولوی عبدالباری، مہاجر وکیل حکومت موقتہ ہند۔

و: **ضابطہ**: (کرنل) شیخ عبدالقادر مہاجر، شجاع اللہ مہاجر نائب وکیل دولت موقتہ ہند۔ مولوی عبدالعزیز وکیل وفد حزب اللہ یاغستان، مولوی فضل ربی، مولوی عبدالحق لاہوری، میاں فضل اللہ، صدرالدین، مولوی عبداللہ سندھی، مولوی ابو محمد احمد لاہوری، مولوی احمد علی نائب ناظم نظارۃ المعارف، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولوی محمد صادق سندھی، مولوی ولی محمد، مولوی عزیز گل، خواجہ عبدالحیٔ، قاضی (محی الدین)، قاضی ضیاءالدین ایم اے، مولوی ابراہیم سیالکوٹی، عبدالرشید بی اے، مولوی ظہور محمد، مولوی محمد مبین، مولوی محمد یوسف گنگوہی، مولوی رشید احمد انصاری، مولوی سیّد عبدالسلام فاروقی، حاجی احمد جان سہارنپوری۔

ز: **نائب ضابطہ**: (لیفٹیننٹ کرنل) فضل محمود، محمد حسن بی اے

## مولوی عبیداللہ کا منصوبہ جنودِ ربانیہ (الجنود الربانیہ یعنی لشکر نجات)

تصویر

## مسلم سالویشن آرمی یا مکتی فوج

| مقصد، اتحادِ دول اسلامی | حلقۂ اثر | مناسب دس قسم ہیں | تعداد ماتحتان مشاہرہ | اختیارات خرچ ماہواری |
|---|---|---|---|---|
| ۱- مرکز اصلی صدر مدینہ طیبہ<br>مقام جنرل<br>۲- مرکز ثانوی صدر: ۱- قسطنطنیہ<br>مقام قائم مقام جنرل ۲- تہران<br>۳- کابل<br>۲- مرکز درجہ سوم صدر جو دول اسلامیہ<br>مقام لیفٹیننٹ جنرل کفر کے زیر اثر ہوں | قسطنطنیہ کا:<br>یوروپ<br>افریقہ<br>تہران کا:<br>وسط ایشیا<br>کابل کا:<br>ہندستان | (۱) مربی (پیٹرن) (۲) مردمیدان (فیڈرل مارشل) (۳) سالار (جنرل) مہتہ جو نائب سالار کسی مرکز ثانوی میں ہو اس کو قائم مقام سالار کہیں گے (یہ سرپرستان الجنود الربانیہ ہیں) (۴) قائم مقام سالار و نائب سالار (لیفٹیننٹ جنرل) (۵) معین سالار (میجر جنرل) (۶) ضابطہ (کرنل) (۷) نائب ضابطہ (لیفٹیننٹ کرنل) (۸) درشہر صد باشی (میجر) (۹) صد باشی (کپتان) (۱۰) پنجاہ باشی (لیفٹیننٹ) | تعداد ماتحتان مشاہرہ<br>افسر کل الربانیہ: ۱۰۰ پونڈ<br>۱۲ ہزار: ۵۰ پونڈ ۴۰ پونڈ<br>۳ ہزار: ۲۰ پونڈ<br>ایک ہزار: ۱۰ پونڈ<br>۵۰۰: ۵ پونڈ<br>۲۵۰: چار پونڈ<br>۱۰۰: ۳ پونڈ<br>۵۰: ۲ پونڈ | ایک ہزار پونڈ<br>۵۰۰ پونڈ ۲۴۰ پونڈ<br>۶۰ پونڈ<br>۲۰ پونڈ<br>۱۰ پونڈ<br>۵ پونڈ<br>۲ پونڈ<br>ا پونڈ |

مہاجر، شیخ عبداللہ بی اے مہاجر، اللہ نواز خاں بی اے مہاجر، رحمت علی بی اے مہاجر، عبدالحمید بی اے مہاجر، حاجی شاہ بخش سندھی، مولوی عبدالقادر دین پوری، مولوی غلام نبی، محمد علی سندھ، حبیب اللہ۔

ح: **میجر**: شاہ نواز، عبدالرحمٰن، عبدالحق۔

ط: **کپتان**: محمد سلیم، کریم بخش۔

ی: **لیفٹیننٹ**: نادر شاہ۔

(نوٹ) ایک اور فہرست میں محمد علی سندھی اور حبیب اللہ کا نام میجر کی فہرست میں درج ہے۔

## نمونہ عرضداشت علماء وخوانین یاغستان

مورخہ یکم رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بتوسط غازی فی سبیل اللہ، سرحلقۂ اہل اللہ، تاج الاصفیاء، سلطان العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب عم فیوضہٗ

بملاحظہ عالی خدام سلطان الدین خاقان البحرین خادم حرمین الشریفین خلیفہ رسول رب العالمین سلطان ابن سلطان اعلیٰ حضرت سلطان محمد خان خامس خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

بعد آداب و نیاز مسنونہ قابل دربار شاہانہ معروض آنکہ ما مسلمانانِ یاغستان علاقۂ مہمند و باجوڑ وغیرہ تا علاقہ آلائی حسب ہدایات خدام حضرت سلطان العلماء مولانا محمود حسن صاحب ہندی دریں جنگ حاضرہ قوت خود را بمقابلہ انگریز برحدود پشاور وغیرہ (ہند) صرف نمودہ یک قوۃ عظیمہ را از مقابلہ افواج قاہرۂ آنحضور اقدس باز داشتہ ایم و تا اختتام جنگ بعونہ تعالیٰ خواہیم داشت۔ علاوہ ازیں دیگر برادرانِ ما در علاقجات تیراہ (آفریدی) و وزیرستان و مسعود ہم دریں زمانہ در جہاد مصروف ہستند۔ چونکہ مایان خدام دربارِ خلافت دشمنی انگریز ظاہر نمودہ بغرض حمایت دین متین خود انگریز را بجنگ وڈاکہ جات بسیار تکلیف دادہ ایم۔ بدیں وجہ انگریز بعد از ختم جنگ ضرور است کہ قوۃ کاملہ خود را در محو کردن ما صرف نماید۔ و ما ہرگز قوۃ مقابلہ با قوۃ کاملہ اس ندا ریم۔

لہٰذا بکمال ادب و امید گزارش است کہ حسب وعدۂ قائم مقام خود حضرت غالب پاشا والی و قائد صوبۂ حجاز شریف اوّل در عہد نامہ دولتی صورۃ حفاظت کل یاغستان نمودہ شود۔ و بعد ازاں ملک ما دا بذریعہ خدام

خویش ترقی دادہ شود۔ باقی احوال از عریضہ جناب مولانا محمد صاحب انصاری ابوایوبی منکشف خواہد شد۔ حق تعالیٰ ملک ما راز زیر سایہ سریر خلافت علیہ عثمانیہ سرسبز و شاداب کند آمین ثم آمین۔ فقط والسلام مع الوفا الاکرام۔

**عریضہ ادب**:

مہر غازی مشہور و معروف جناب ملا صاحب بابڑہ مہر صاحبزادہ فضل قادر صاحب بنوری پیر خانہ خوانین علاقہ چارمنگ و نواب دیر و صوات

مہر مولوی فضل ربی صاحب مہاجر

(مہر) محمود خاں، (مہر) مدار خاں، (مہر) زور آور خان، محمد ایوب خاں

خان چارمنگ خورد، خان چارمنگ خورد ، خان کوٹکی

## خط قاضی دیر بنام مولوی فضل ربی صاحب

فضائل پناہ فواضل دستگاہ جناب مولوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خیریت طرفین نیک نصیب ونعیمی جناب نواب صاحب خواہش میدارد کہ اگر یک مردم دانندۂ کہ عبارت از ہرتال و سرمہ و زرنیخ دگوگرد۔ وسرب وغیرہ نہایت مہربانی خواہد بود۔ و نیز

اگر بکمال سعی وکوشش آں مہرباں توپ ومی شود برائے نواب صاحب نہایت مہربانی خواہد بود ونیز یک مردم کار در سلطانی وخواہ کرام دولت بکوشش آں مہرباں وارد واین علاقجات بعید از عنایت نخواہد امید کہ از کمال سعی وکوشش آں مہرباں کارخانہ ہائے نواب صاحب از آہنگراں و ترکانان (ترکھانان) وغیرہ ماہرین فنون وقواعد سلطانی اباد شود۔ توپ مشین گنج ہر چند قسمت کہ صرف شودادا خواہد کرد۔ واین نیاز مند را از تابعدار حقیقی تصور فرمائید۔ از خدمات لائقہ یا دوشاد میفرموده باشد۔ و دارندۂ خط ہٰذا املا صاحب چوکیاش ہر چہ لسانی بیاں نمود صدق دانید زیادہ خیریت فقط۔

۱۲رشہر رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ خادم شرع نبویؐ قاضی ............مہر

تحریک ریشمی رومال کے ایک مرحلے میں راجہ مہندر پرتاپ کا نام بھی خاصا اہم ہے،اس سلسلے کی تحریروں اور خطوط میں بار باران کا نام بھی آتا ہے۔ان کے تعلق سے کچھ باتیں ملتی ہیں،ان کی خودنوشت سوانح کا ذکر ملتا ہے،مگر وہ راقم سطور کی نظر میں نہیں ہے۔نقش حیات،تحریک شیخ الہند، مقام محمود وغیرہ جیسی متعدد کتابوں میں راجا صاحب کے متعلق مختلف قسم کی تفصیلات ملتی ہیں،سردست ان کی طرف سے تحریر کردہ ایک دونوٹس ملے ہیں،مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نقل کردیے جائیں۔

مہندر پرتاپ آف مرسان (علی گڑھ) صوبہ جات متحدہ کا ایک اہم خط

۵۸۱،سی آئی ڈی شمالی مغربی سرحدی صوبہ کابل کے سراج الاخبار مورخہ ۴رمئی ۱۹۱۶ء سے یہ اقتباس کیا گیا ہے:

ذیل میں ہم ایک خط شائع کررہے ہیں جو ہمیں سراج الاخبار افغانیہ میں شریک اشاعت کرنے کے لیے کنور صاحب مرسان یعنی راجہ صاحب ہاتھرس سے وصول ہوا ہے جو آج کل افغانستان کی مقدس بادشاہت کے مہمان ہیں۔

## ایک بہت اہم مراسلہ

محل باغ بابرشاہ،کابل،مورخہ ۱۵راپریل ۱۹۱۶ء

دوست عزیزم،مدیر سراج الاخبار

میں تکلیف دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ مجھے بعض ہندوؤں میں خواہ مخواہ بدنام کیا گیا ہے۔ میں آپ کے (اخبار) کے ذریعے اس غلط بیانی کی تردید کرنی چاہتا ہوں۔

ان اخبارات نے یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے خودکو ایک بڑا مہاراجہ ظاہر کیا اور اعلیٰ حضرت قیصر جرمنی میں شامل ہوگیا۔ میرے خلاف یہ جھوٹی الزام تراشی ہے۔ میں نے خودکو کبھی مہاراجہ بلکہ راجہ بھی نہیں کہا،نہ میں کسی کے شامل ہوا نہ میں نے کسی کی ملازمت اختیار کی۔

یہ صحیح ہے کہ جنگ چھڑنے پر میں جرمنی گیا تھا،تاکہ وہاں کی صورتِ حال کا مشاہدہ کرسکوں۔حکومت نے مجھ پر عنایت کی اور مجھے اگلی خندقوں سے اور ہوائی جہاز سے جنگ کا مشاہدہ کرنے کا موقع دیا۔مزید یہ کہ معظم قیصر جرمنی نے خود مجھے باریابی کا موقع دیا۔اس کے بعد سلطنت جرمنی سے ہندستان اور ایشیا کا مسئلہ طے کرنے کے بعد اور ضروری تعارف حاصل کرلینے کے بعد مشرق کو واپس ہوا۔ میں نے مصر کے خدیو سے،شہزادوں سے اور وزیروں سے ملاقاتیں کیں اور مشہور آفاق انور پاشا اعلیٰ حضرت خلیفہ سلطان المعظم سے ملاقات اور گفتگو کی۔

میں نے سلطنت عثمانیہ سے مشرق کا اور ہندستان کا مسئلہ طے کیا اور ان سے بھی ضروری تعارفی دستاویز حاصل کیں۔ جرمن اور ترک افسران مولوی برکت اللہ صاحب کو میرے ہمراہ میری مدد کے واسطے رہنے دیا۔ وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہیں۔

ہزاروں مصائب ومشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرکے اور ایک خداترس انسان کی مہربانی سے ہم بغداد و اصفہان ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے۔اعلیٰ حضرت امیر کی غیر جانبداری کے باعث ہم یہاں پڑے رہے۔ گوکہ ہم آپ کی حکومت کے مہمان ہیں اور ہمارے ساتھ بڑے احترام کا سلوک کیا جاتا ہے اور ہمیں ہر قسم کا آرام پہنچایا جاتا ہے۔

میرے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوجانی چاہیے۔اگر وہ شکرگزار نہیں تو بھی انھیں آئندہ یاوہ گوئیں نہیں کرنی چاہیے،میں کسی شخص کا یا کسی قوم کا دشمن نہیں،میں ساری دُنیا کا دوست ہوں۔

ہمارا واحد مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر قوم آزادی کے ساتھ اور آرام کے ساتھ اپنے مکان یا اپنے ملک میں زندگی گزارے اور روئے زمین سے اس قسم کی جنگ وکشاکش کا نشان مٹ جائے۔

جو دنیا کا اور ہندستان کا خادم اور بودھوں، عیسائیوں، ہندو اور مسلمانوں کا دوست ہے،بعض لوگ کنور صاحب مرسان اور بعض لوگ راجہ صاحب ہاتھرس کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ میرے ذاتی نظریات اور

میرے افعال کے لیے کوئی بھی شخص، میرا کوئی دوست یا میرا حقیقی بھائی......مرسان یا میرا رشتہ دار مہاراجہ صاحب جنید یا آرٹ اسکول پریم مہادوتالیہ (بندرابن) مطلق ذمہ دار نہیں۔ دستخط ایم پرتاپ

مذکورہ تفصیلات سے تحریک شیخ الہند کے تناظر میں تحریک ریشمی رومال، افغانستان میں ملی جلی عبوری حکومت اور دیگر قبائلی علاقوں میں انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کا قدرے واضح خاکہ سامنے آجاتا ہے، یہ اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوئی، اور اس کے اثرات ونتائج کیا برآمد ہوئے، اور جو ناکامی ہوئی اس کے اسباب و وجوہ کیا تھے، ان پر آج بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور جہاں تک تحریک ریشمی رومال کی اہمیت کا معاملہ ہے تو اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برٹش سامراج نے اس کی حقیقت جاننے کے لیے اپنی طاقت جھونک دی تھی، اور تحریک کے خدوخال کو اُجاگر کرتے ہوئے اس کے اور اس سے جڑے افراد کی سرگرمیوں سے متعلق ریشمی خطوط کیس کے عنوان سے ایک ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ تیار کر کے مقدمہ بنایا گیا، جس میں کہا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل اشخاص نے یکم جنوری ۱۹۱۳ء اور یکم جنوری ۱۹۱۷ء کے درمیان برطانوی ہند کے اندر اور باہر سازش کی ہے ملک معظم شہنشاہ کی افواج کے خلاف جنگ کرنے کی، جنگ کے لیے کوشش کرنے کی اور جنگ میں مدد دینے کی کوشش کرنے کی یا اس بات کی کوشش کی ہے کہ ملک معظم شہنشاہ کو برطانوی ہند کے اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیں، یہ کارروائیاں، ضابطہ فوجداری ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت مستلزم سزا ہیں، ایسے ملزم اشخاص میں حضرات مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد میاں انصاریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا مرتضیٰ، مولانا عزیر گل، مولانا برکت اللہ بھوپالیؒ، مولانا حسرت موہانی، کالا سنگھ، مہیندر پرتاپ، مولانا ہادی حسن، محمد مسعود، عبدالحق جیسے ۵۹ حضرات شامل ہیں۔ آخر الذکر تینوں اس معنی کر قابل توجہ ہیں کہ مولانا ہادی حجاز سے ریشمی خط غالب نامہ لے کر آئے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے عزیز مسعود حسن کا ذکر دیگر تحریروں کے علاوہ سابقہ نقل کردہ خطوط میں بھی ہے، سے ریشمی خط کا راز افشا ہوا تھا، اور سرکاری گواہ بن گئے تھے اور عبدالحق کے ذریعے مولانا سندھیؒ کی طرف سے لکھے ریشمی خطوط کا معاملہ فاش ہوگیا تھا کہ یہ خطوط انھوں نے اپنی سادہ لوحی سے اپنے قدیم مربی، انگریز نواز، خان بہادر نواز خان کو دے دیے اور خان صاحب نے اپنا اعتبار بڑھانے کے لیے یہ خطوط انگریز افسر سر مائیکل اوڈائر کو پہنچا دیے تھے، ان حضرات کے علاوہ کچھ دیگر اشخاص کے بھی نام خطوط اور آزادی کی سرگرمیوں کے افشاء راز کے سلسلے میں آتے ہیں۔ مثلاً کابل کے امیر حبیب اللہ خان، جس کے سامنے سب کچھ تحریک کے مجاہدین کر رہے تھے، حضرت مدنی کی ''نقشِ حیات'' اور دیگر کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ وہ ساری سرگرمیوں کی اطلاع انگریز کو دے دیا کرتا تھا، حضرت شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو مطلوبہ کامیابی نہیں ملی، تاہم اسے بے اثر اور پوری طرح ناکام نہیں کہا جاسکتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال اور ریشمی رومال تحریک کے درمیان جنگ عظیم کی وجہ سے عالمی سطح پر حالات بدل گئے تو انھوں نے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد طریقۂ کار میں تبدیلی کرتے ہوئے ملک کی اکثریت اور اس کے نمائندوں کے ساتھ غیر مسلح جدوجہد آزادی کا آغاز کیا، اس تناظر میں گاندھی جی کا حوالہ اور نام بہت اہم ہے، آزادی کی وہی اسپرٹ بعد تک جاری رہی، جو تحریک ریشمی رومال کے دوران تھی، لیکن گاندھی عہد میں اس کے داخل ہونے سے قدرے ہیئت اور طریقۂ کار میں تبدیلی آگئی، یہ وقت کا تقاضا بھی تھا، اور ضرورت بھی، عدم تشدد پر مبنی آزادیِ وطن کی جدوجہد سے ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا، تاہم تحریک شیخ الہندؒ اور اس کے اہم ترین مسلح جدوجہد کا مرحلہ، ریشمی رومال تحریک کے اثرات اور آزادی کی تحریک میں اہم رول سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، ریشمی رومال تحریک کے اثرات اور کامیابی، ناکامی کے سنجیدہ مطالعہ سے ہمیں کئی اہم سوالات کے جوابات مل سکتے ہیں، اس حوالے سے تحریک ریشمی رومال کا عطیہ اور رول، ایک مسلم بات ہے، اس پر اب حکومت ہند نے آزادیِ وطن کی جدوجہد میں تحریک شیخ الہندؒ کے رول کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاک ٹکٹ جاری کر کے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس کے اعتراف کا دائرہ مزید وسیع ہوگا اور برادرانِ وطن کو بھی معلوم ہوگا کہ مسلم مجاہدین تحریک کا ملک کو آزاد کرانے میں کیا کیا قربانیاں اور رول رہا ہے۔

❑❑

# ریشمی رومال کے سو سال

**پروفیسر اختر الواسع** (وائس چیئرمین دہلی اُردو اکادمی)

ہندستان میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس دور کے صاحبان نظر کو اس کا ادراک بھی تھا کہ مغل اقتدار کی دیواروں میں دراڑ پڑ چکی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے اقتدار کی اس گرتی دیوار کو بیرونی سہاروں کے ذریعے بچانے کی اپنی سی کوشش بھی کی۔ اس حوالے سے سب سے نمایاں نام ہمیں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے کا ملتا ہے جس نے فکر وعمل دونوں سطحوں پر اسلامیانِ ہند کے وجود اور ان کی شناخت کو بچانے کے لیے پیہم کوششیں کیں۔ اس خانوادے کی مذہبی اور علمی مساعی نے اگر ایک طرف مسلمانانِ ہند میں اصلاح احوال کی ایک نئی طرز ڈالی تو دوسری طرف اس کی سیاسی مساعی نے جذبہ حریت وآزادی کو ہمیشہ کے لیے ان کے دِلوں میں پختہ کر دیا۔ قرآن مجید کے مقامی زبانوں میں ترجمے، علم حدیث کے فروغ و اشاعت کی کوششیں اور اسلامی احکامات و تعلیمات کے اسرار وحکم کی توضیح وتشریح خانوادہ ولی اللّٰہی کے ایسے اقدامات ہیں، جنھوں نے یہ یقینی بنا دیا کہ ہندستان میں مغل حکومت کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، اسلام اور مسلمان یہاں زندہ اور پائندہ رہیں گے۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے سیاسی زوال پر آخری مہر لگ جانے کے بعد اس کی خاکستر سے اٹھنے والی چنگاریوں نے مسلمانوں میں دو طرح کے رجحانات کو فروغ دیا۔ ایک سر سیّد احمد خاں کا، جو انگریزوں کے ساتھ تعامل وتعاون کے ذریعہ اس مقام تک پہنچانا چاہتا تھا جہاں سے وہ آزادی وخود مختاری کا مطالبہ کر سکے۔ دوسرا مولانا قاسم نانوتوی اور دیگر علماء دیوبند کا جو انگریز حکمرانوں سے ہر طرح سے قطع تعلق رکھتے ہوئے انھیں اقتدار سے بے دخل کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے ہر طرح کی سیاسی وسرکاری سرپرستی اور اثر سے آزاد ایک ایسے تعلیمی نظام اور روایت کی داغ بیل ڈالی جس کا پیش خیمہ دارالعلوم دیوبند تھا۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ سیاسی مغلوبیت کے زمانے میں مسلمان ہندستان کے اندر اپنے مذہب اور مذہبی شناخت کو محفوظ رکھ سکیں اور جب تک انھیں سیاسی آزادی نہیں مل جاتی خود کو ان دینی قلعوں میں محفوظ کر لیں۔

بلاشبہ ہمارے مدارس نے مذہب اور اسلامی شعائر کی حفاظت کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں مذہبی قلعوں کی طرح ہی پوری کیں۔ اس سے بھی بڑھ کر مدارس کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حریت و آزادی کے جذبے کو کبھی سرد پڑنے نہیں دیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری جدوجہد آزادی کے بڑے مسلم رہنما ہی نہیں بلکہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کی بہت بڑی اکثریت کا تعلق انھیں بوریہ نشین علماء اور ان کی تعلیمی روایت سے تھا۔ بظاہر سیاسی نہ رہتے ہوئے بھی آزادی کی سیاست کا گڑھ بنے رہنا ہمارے مدارس کی روایت کا امتیاز ہے۔ دیوبند ایک علامتی اصطلاح ہے جو ہندستانی مسلمانوں میں اس رجحان کیلئے استعمال ہوتی ہے جو عرف عام میں انگریز مخالفت اور حصول آزادی کے لیے جدوجہد سے عبارت ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالبعلم تھے۔ بعد میں انھیں دارالعلوم میں مدرسی اور صدر مدرسی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس دوران انھوں نے دارالعلوم دیوبند کو اپنے فکر وعمل کے ذریعے ایک ایسے مرکز میں تبدیل کر دیا جہاں علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کے ساتھ جدوجہد آزادی کے جذبے کی بھی آبیاری کی جاتی تھی۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ذات میں ایک کامیاب معلم، ایک بہترین مربی اور ایک فعال ومتحرک قائد کی تمام خوبیاں اور صفات موجود تھیں۔ دارالعلوم میں تقریباً چار دہائیوں کی تعلیمی وتدریسی خدمات نے نہ صرف یہ کہ ان کی علمی وانتظامی صلاحیتوں کو صیقل کیا بلکہ یہاں ملک اور اطراف وجوانب سے بغرض تعلیم آنے والے طلبہ کی تدریس وتربیت نے انھیں اپنے افکار وخیالات دور دراز علاقوں تک پہنچانے کے مواقع بھی فراہم کر دیئے۔ انھوں نے دارالعلوم میں طلبہ کو صرف کتابوں کا درس ہی نہیں دیا بلکہ انھیں آزادی کا متوالا بھی بنا دیا اور اس حد تک تیار کر دیا کہ ضرورت پڑنے پر ان میں سے ہر فرد اپنی جگہ ایک مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ ثمرۃ التربیت، جمعیۃ الانصار، نظارۃ المعارف اور ریشمی رومال تحریک ان

کی زندگی کے وہ پڑاؤ ہیں جہاں سے رہ روان شوق کو منزل کا پتہ ملتا تھا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن جس زمانے میں جی رہے تھے وہ ۱۸۵۷ء کے واقعے سے بہت دور کا زمانہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی مذہبی علماء انگریز حکمرانوں اور انتظامیہ کے جبر اور ظلم کا خاص نشانہ تھے کیونکہ فکری اور عملی دونوں سطحوں پر جدوجہد آزادی میں ان کی شمولیت سب سے زیادہ تھی۔ دہلی سے پشاور تک نصب سولیوں پر سب سے زیادہ سر علماء کے ہی نظر آتے تھے۔ پھر اسی دوران پہلی عالمی جنگ کا شاخسانہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اس جنگ میں ترکی کے جرمنی کا ساتھ دینے کے فیصلے نے ہندستانی مسلمانوں کی پوزیشن کو اور بھی نازک بنا دیا تھا۔ برطانوی حکومت ہندستانی علماء سے ترکوں کے خلاف فتویٰ حاصل کرنا چاہتی تھی جس سے انکار انھیں قید و بند تک پہنچا دیتا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے نہ صرف دیوبند کی تعلیم کی تحریک کو فروغ و استحکام عطا کیا بلکہ عملاً ایسے اقدامات کیے، اور تسلسل کے ساتھ کیے، جن میں مسلمانانِ ہند کے لیے ان کی فکر مندی ہمیں بہت ہی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ آزادی کی صبح تک مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بیٹھے رہنے اور انتظار کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ میدان عمل میں نکل کر اپنے اعوان و انصار کے ساتھ آزادی جدوجہد کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں اپنا عملی تعاون بھی پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے عام طلبہ سے ہٹ کر اپنے مخصوص شاگردوں کی 'مقصد کے لیے وقف'، ایک ٹیم بھی تیار کی تھی جس کے روح رواں مولانا عبیداللہ سندھی اور عبدالرحیم انصاری وغیرہ تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن کا تعلق جس زمانے اور نسل سے ہے، اس میں ابھی تک جدوجہد جمہوری طریقوں سے آزادی کے حصول کی کوششوں کا چلن عام نہیں ہوا تھا، خاص طور پر پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ لڑے بغیر بھی آزادی مل سکتی ہے۔ ان حالات میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے برطانیہ مخالف ایک تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی جیسے رہنماؤں سے رابطہ قائم کر کے مشورہ کیا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندستان میں رہ کر اس ملک کی سطح پر ہی کوششوں کے ذریعے آزادی کے لیے جدوجہد اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ کوئی بیرونی طاقت ان کا ساتھ دینے کے لیے ہندستان پر حملہ آور نہ ہو اور یہ کام افغانستان کی مدد سے اس وقت تک کی صورت حال میں ترکی اور جرمنی ہی کر سکتے تھے۔ اس کے لیے کابل جانا، وہاں ترکی اور جرمنی کے مشنوں سے رابطہ رکھنا اور افغانستان میں پہلے سے ہی موجود انگریز مخالف ہندستانیوں کو جمع اور منظّم کرنا ضروری تھا۔

تحریک کے آغاز کار کے طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن نے سب سے پہلے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجا۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر کابل میں پہلے سے موجود حریت پسند ہندستانیوں کی مدد سے ۱۹۱۵ء میں ایک عبوری حکومت تشکیل دی۔ یہ کسی بھی غیر ملکی سرزمین پر قائم ہونے والی ہندستان کی پہلی جلاوطن حکومت تھی۔ راجہ مہندر پرتاپ اس پہلی جلاوطن حکومت کے صدر منتخب ہوئے۔ مولوی برکت اللہ بھوپالی اس حکومت میں وزیر اعظم بنائے گئے اور خود مولانا عبیداللہ سندھی وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ شیخ الہند کی تحریک 'حریت و آزادی' جو بعد میں 'ریشمی رومال تحریک' کے نام سے مشہور ہوئی، اپنے پہلے مرحلے کے اندر افغانستان میں بایں طور پر کامیاب رہی کہ جلاوطن حکومت نے کابل میں اپنے فرائض نہایت کامیابی اور خوبی سے انجام دیئے۔ خود شیخ الہند بھی اس کی کارکردگی سے مطمئن تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے بعد تحریک کے دوسرے مقاصد پر توجہ دینی شروع کی۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن ہندستانی مسلمانوں کے حالات کے تجزیے اور مقامی رہنماؤں سے رائے و مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ

**شیخ الہند مولانا محمود حسن جس زمانے میں جی رہے تھے وہ ۱۸۵۷ء کے واقعے سے بہت دور کا زمانہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی مذہبی علماء انگریز حکمرانوں اور انتظامیہ کے جبر اور ظلم کا خاص نشانہ تھے کیونکہ فکری اور عملی دونوں سطحوں پر جدوجہد آزادی میں ان کی شمولیت سب سے زیادہ تھی۔ دہلی سے پشاور تک نصب سولیوں پر سب سے زیادہ سر علماء کے ہی نظر آتے تھے۔**

نہ تو ہندستانی مسلمان تنہا اور نہ ہی تمام ہندستانی اقوام مل کر موجودہ صورت حال میں انگریزوں سے ملک کو آزاد کراسکتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اوّل تو کوشش کی کہ سبھی ہندستانی مل کر آزادی کی لڑائی لڑیں اور اس کے لیے انھوں نے کھل کر ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کی وکالت کی۔ اس کے مظاہر ان کے رفقائے کار میں بھی اور کابل کی جلاوطن حکومت میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شیخ الہند یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس وقت کے حالات میں آزادی کا حصول تنہا ہندستانیوں کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لیے کسی بیرونی حکومت کی انھیں شدید ضرورت ہے۔ چونکہ اس وقت تک پہلی عالمی جنگ شروع ہوچکی تھی اور برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف ترکی جرمنی کے ساتھ جاچکا تھا۔ اس لیے انھیں لگا کہ وہ ترکی اور جرمنی کی مدد سے ہندستان کو برطانیہ کی غلامی سے آزاد کراسکیں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ ایران اور افغانستان ایک دوسرے سے قریب آئیں اور پھر ترکی کی مدد سے ہندستان پر حملہ آور ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے زمین تیار کرنے کی غرض سے اپنے رفقاء کے ساتھ حج بیت اللہ کا قصد کیا تاکہ ایک طرف حج کے موسم میں وسیع پیمانے پر مسلم دنیا سے رابطہ قائم کیا جاسکے تو دوسری طرف ترکی کے حکام کو ہندستانی مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ کیا جاسکے۔

مکہ پہنچ کر شیخ الہند مولانا محمود حسن نے حجاز میں مقیم ترک گورنر غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں، انھیں ہندستان کی صورت حال سے آگاہ کیا اور آزادئ ہند کے لیے اپنا منصوبہ بھی ان کے سامنے رکھا۔ غالب پاشا گورنر حجاز نے شیخ الہند کے خیالات سے اتفاق کیا اور ان کے منصوبے کی حمایت بھی کی۔ اسی دوران شیخ الہند کی ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا سے ملاقات کا انتظام بھی اس طرح ہوگیا کہ وہ انھیں دنوں زیارت کے لیے مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے۔ انور پاشا نے بھی شیخ الہند کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے منصوبے کی تائید و حمایت کی۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف اپنی حکومت کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے انھیں افغانستان کے راستے ہندستان پر ترکی کے حملے کے ارادے سے بھی باخبر کیا۔ شیخ الہند کے لیے یہ خبر بڑی حوصلہ افزا تھی۔ چنانچہ انھوں نے غالب پاشا اور انور پاشا سے اپنی اور اپنے منصوبے کی حمایت میں پیغامات حاصل کرکے خفیہ طور پر ہندستان بھیج دیئے۔

شیخ الہند کے منصوبہ حریت و آزادی کا ایک تیسرا پہلو صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقوں سے متعلق تھا جو شیخ الہند اور ان کے شاگردوں کی کوششوں سے برطانوی حکومت کے لیے مستقل دردسر بنے ہوئے تھے۔ ترک حکام کے پیغامات ان کے لیے مزید مہمیز ثابت ہوئے۔

ایک طرف شیخ الہند مولانا محمود حسن کے منصوبے کو یہ مسلسل کامیابیاں حاصل ہوئیں تو دوسری طرف قسام ازل نے ان کی تحریک کے لیے ایک دوسرا ہی فیصلہ کررکھا تھا۔ چنانچہ جب کامیابی قریب تھی، ایک طرف ترکی کے خلاف حجاز میں شریف مکہ نے بغاوت کردی تو دوسری طرف ایک سادہ لوح کی سادہ لوحی اور ایک عیار سردار کی موقع پرستی نے اب تک خفیہ چلی آرہی ان کی تحریک کا راز فاش کردیا۔ ریشمی پارچہ جات پر لکھے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی کے خطوط انگریزوں کے ہاتھ لگے تو ان کے حواس باختہ ہوگئے اور انھوں نے فوراً سے پیشتر اس تحریک کے خاتمے کے لیے تمام اقدامات جنگی پیمانے پر کرنے شروع کردیئے۔ ملک میں شیخ الہند کے رفقاء اور رجال کار کا جہاں کہیں بھی پتہ لگا انھیں گرفتار کرکے ان پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا۔ شریف مکہ جو برطانوی حکومت کا کارپرواز بن چکا تھا، کے ذریعہ شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرواکر مصر کے راستے مالٹا بھیج دیا گیا۔ جہاں ان پر تمام ممکن مظالم روا رکھے گئے۔ کابل میں بھی برطانوی حکومت کے دباؤ کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء کو قید کردیا گیا۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کامیاب تحریک اور اس کا منصوبہ حصول آزادی چند دنوں کے اندر ناکامی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

**۱۹۱۹ء میں گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے رہنماؤں نے عدم تشدد کے ذریعے حصول آزادی کا جو نسخہ ہندستانیوں کے سامنے پیش کیا، وہ کسی نہ کسی درجہ میں شیخ الہند سے تعلق ضرور رکھتے تھے۔ خود شیخ الہند کو بھی مالٹا کی اسیری کے دوران اور جنگ میں ترکی و جرمنی کی شکست کے بعد یہ ادراک ہوگیا تھا کہ ملک کی آزادی اب مسلح پر تشدد تحریکات کے ذریعہ حاصل نہیں کی جاسکتی**

بظاہر اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں تحریک حریت وآزادی کا ایک عظیم منصوبہ ناکام ہو گیا لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسی ناکامی کی کوکھ سے ہماری جدوجہد آزادی کی تحریک کو ایک نیا خون اور حصول آزادی کا ایک نیا طریقہ کار بھی ملا اور وہ طریقہ کار تھا عدم تشدد کا۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے رہنماؤں نے عدم تشدد کے ذریعے حصول آزادی کا جو نسخہ ہندستانیوں کے سامنے پیش کیا، وہ کسی نہ کسی درجہ میں شیخ الہند سے تعلق ضرور رکھتے تھے۔ خود شیخ الہند کو بھی مالٹا کی اسیری کے دوران اور جنگ میں ترکی وجرمنی کی شکست کے بعد یہ ادراک ہو گیا تھا کہ ملک کی آزادی اب مسلح پرتشدد تحریکات کے ذریعہ حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ بدلے ہوئے حالات میں پرامن آئینی تحریکات کے ذریعہ بھی آزادی اور اس کے مقاصد باہمی اتحاد واتفاق سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے نظر ثانی شدہ موقف کو مولانا محمد یٰسین خان پوری نے قیادت کے سات اصولوں کے تحت اس طرح یکجا کر دیا ہے:

۱- آزادی وحقوق کے لیے پرامن سیاسی جدوجہد۔

۲- مسلمانوں کا اتحاد، مسلکی تعصّبات وفرقہ بندی کی تفرقہ انگیزی سے اجتناب۔

۳- دنیائے انسانیت کی خدمت اور ملکی آزادی کی جدوجہد کے لیے مسلم وغیرہ مسلم کا مشترکہ محاذ۔

۴- مسلمانوں کے لیے سنت نبویؐ اور اسوہ حسنہ کی پیروی، تعلیم دین اور تبلیغ اسلام۔

۵- قدیم وجدید علوم کے اداروں اور ان کے عالموں میں اشتراک عمل، یگانگت وہم آہنگی۔

۶- ملکی اور سیاسی امور کی قیادت کے لیے جمہوریت کی پاسداری۔

۷- اجتہاد فی المسائل۔ اور پھر حضرت شیخ الہند کا آخری پیغام بھی جو انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس (نومبر ۱۹۲۰ء) کے پلیٹ فارم سے موت سے چند دن قبل ہمارے گوش گزار کیا تھا، ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔

''کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہم وطن اور ہندستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریقہ سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتحاد واتفاق کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں، اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو ہندستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر فرنگی کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح وآشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی بڑی طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر واستبداد سے شکست دے سکے گی۔

ہاں میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر پائیدار اور خوش گوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح وآشتی سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو۔

اس طرح شیخ الہند مولانا محمود حسن کی زندگی کے حوالے سے ثمرۃ التربیت سے لے کر ریشمی رومال تحریک کے منصوبہ حصول آزادی کی ناکامی تک اگر ہمیں ایک طرف آزادی کی ایک مسلسل کسک اور خواہش ہر جگہ نظر آتی ہے تو دوسری طرف ہمیں اس میں زمانے اور حالات کے مطابق منصوبہ بندی اور موقف میں تبدیلی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ بلاشبہ اپنے ابتدائی دور میں شیخ الہند بھی ہندستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے خواہاں تھے لیکن کابل میں جلاوطن حکومت کے قیام اور راجہ مہندر پرتاپ کے اس کا صدر بنائے جانے سے ہمیں ان کے اس موقف میں بڑی واضح تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ ہندو مسلم اتحاد اور اشتراک عمل کے بہت بڑے داعی بن کر اُبھرتے ہیں جس کا بھرپور اظہار جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس کے صدارتی خطبے میں ہمیں ملتا ہے۔ □□

# تحریک شیخ الہند اَلمَعرُوف ''تحریک ریشمی رومال''

ڈاکٹر محی الدین انصاری

۱۹۱۲ء کا تذکرہ ہے۔ اہلیانِ ہند دورِ غلامی میں بمشکل سانسیں لے پا رہے تھے۔ ہم خود اپنی سرزمین پر انگریزوں کے رحم وکرم پر تھے۔ شمع آزادی بادِ صرصر کے سامنے چوک چوراہوں پر گو کہ فروزاں نہیں تھی لیکن شرارہ بن کر دلوں میں پیوست تھی۔ بھڑک نہیں رہی تھی لیکن دبیز دھواں بن کر سینے میں گھٹن پیدا کر رہی تھی۔ جذبے معتبر ضرور تھے لیکن وطن کی فضا غیر معتبر تھی۔ پاؤں تھے پر سلاسل سے اُلجھ ضرور رہے تھے لیکن شورِ سلاسل کو پابندِ خاموشی بھی رکھنا تھا۔ خوشبو کو ہواؤں میں بکھیرنا بھی تھا اور حکمت عملی یہ تھی کہ اس کی موجودگی کو پردہ ہائے راز میں بھی رکھا جائے۔ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات بھی دلانا تھا اور ملک کو برطانوی سامراج سے باہر بھی نکالنا تھا۔ احتیاط شرطِ اوّل تھی، راز داری مقدم تھی۔ حالات یوں بھی نہیں تھے کہ پورے ملک کو راز دار بنالیا جائے۔ حالات یوں بھی نہیں تھے کہ ظالم کی بپھری ہوئی طاقت کے آگے منصوبہ بندی کے بغیر سروں کی فصل کٹوادی جائے۔ کچھ تقاضے تھے، کچھ ذمہ داریاں تھیں، کچھ فرائض تھے۔ طاقت بھی کم تھی۔ اپنے خیموں میں غداروں کی موجودگی بھی تھی۔ چنگاری کو آتش بے کراں بنانا تھا۔ فرنگی طاقتوں کو اس آگ سے پھونکنا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں قومی بغاوت آزادی کے حصول میں کارگر نہ ہوسکنے کے سبب پورا ملک انگریزی تسلط میں آچکا تھا۔ اس سے قبل بھی بغاوت برپا ہوئی۔ کسان، کاریگر، آدی واسی، فقیر، سنیاسیوں اور سپاہیوں نے بغاوت کی۔ گجرات، راجستھان اور جنوبی بھارت بھی ان بغاوتوں کا مرکز رہا۔ جنگلی قبائل انگریزوں کے خلاف کھڑے ہوئے۔ چھوٹا ناگپور کے کولام، اڑیسہ کے گونڈ، مہاراشٹر کے کولی، بھیل اور راموشیوں کی بغاوتیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ کولہاپور کے گڈکریوں اور کوکن کے فونڈ سرداروں نے بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی۔

ملک کے طول وعرض میں زمینداروں اور راجے مہاراجے بھی علمِ بغاوت بلند کرتے رہے۔ یہ ساری بغاوتیں علاقائی، انفرادی ومقامی نوعیت کے علاوہ چونکہ غیر منظّم بھی تھیں اس لئے انگریزوں نے اسے بآسانی کچل دیا۔ لیکن ملک کے اندر پنپنے والی ان بغاوتوں اور عوامی بے چینی نے ایک بے مثال اور مسلح بغاوت کا راستہ ہموار کردیا جو ۱۸۵۷ء میں قومی بغاوت کی شکل میں سامنے آئی۔ ہندستانیوں میں عدم تحفظ وخانہ بربادی کا خوف، معاشی وجوہات (محصول، تجارتی پالیسی، بیروزگاری) سماجی وجوہات (رسم ورواج وروایات میں انگریزوں کی دخل اندازی) سیاسی وجوہات (کئی دیسی ریاستوں کا خاتمہ، جبراً انگریزی حکومت سے الحاق اور اودھ، ستارہ، جھانسی، ناگپور میں زبردستی مغل راجاؤں کے وظائف کا بند کیا جانا)، انگریزی فوج میں موجود ہندوستانی فوجیوں سے حقارت آمیز سلوک (کم تنخواہیں، بھتہ میں کمی، بڑے عہدوں پر پابندی) اور چند فوری اسباب (ہندو اور مسلمان فوجیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا) وغیرہ ایسی وجوہات تھیں جن کے سبب اس قومی بغاوت کا نمودار ہونا ممکن ہوسکا۔ گو کہ بغاوت ناکام ہوئی لیکن اس نے برطانوی سامراج کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ قربانیاں ضائع نہیں ہوئیں۔ آزادی کی راہ ہموار ہونے لگی۔ علاقائیت ختم ہوئی۔ جذبہ قوم پرستی نشو ونما پانے لگا۔ منظّم پیش قدمی پر اتفاق رائے ہونے میں مدد ملی۔

۱۸۵۷ء کی مسلح بغاوت کی ناکامی نے عہد مغلیہ کے آخری فرمانروا کو جلا وطن کر کے رنگون میں قید کردیا۔ لال قلعہ کی مرکزیت ختم ہوئی۔ مسلمانانِ ہند چونکہ اپنے علمائے کرام کی قیادت میں زیادہ سرگرم رہے اس لئے تحریک کے فیل ہوجانے کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کے سر آیا۔ گرفتار ہوئے، قید خانوں میں ڈالے گئے، قتل ہوئے، جائیدادوں سے محروم ہوئے، مختلف سرکاری عتابوں کے شکار بنے، لوٹے اور برباد کیے گئے۔ ہزار ہا علماء کرام اور حفاظ پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ مسلمانوں کی آبادی والے شہر برباد کیے گئے، کھنڈر بنائے گئے اور انہیں ہجرت پر مجبور بھی کیا گیا۔ اور یہ سارے ناقابل بیان کرب بس ایک نعرۂ آزادی کے سبب سے تھے۔

آج پھر جشن منایا گیا آزادی کا
کل گھروں پر کئی افراد نہیں ہونے کے

تھانہ بھون وہ شہر ہے کہ جہاں کے ہجرت پر مجبور کئے گئے مسلمان جب دو سال بعد گھر پہنچے تو ایک سوبتیس شہیدوں کی لاشیں درختوں پر جھول رہی تھیں۔ درختوں سے لٹکتے ہوئے ان چراغوں کی لویں ہمارے دلوں میں آتش بن کر آج بھی زندہ ہیں اور ہمارے لہو میں انہی اسباب کے طفیل گرمی بہت ہے۔ انبیہٹہ اور نکڑ جو کہ ضلع سہارنپور کے قریب کے دیہات ہیں، وہاں کے مسلمانوں سے جا کر پوچھئے تو سو سال بیت جانے کے بعد بھی وہ آپ کو بتائیں گے کہ کن درختوں پر کتنے علماء وحفاظ کی لاشیں لٹکی ہوئی تھیں اور اُن کے نام کیا تھے۔ اس ملک کی آزادی میں مسلمانوں کا جتنا لہو بہا ہے اگر سرزمین ہند بطورِ ثبوت اُنہیں اُگل دے تو ہماری وفاداری پر کلام کرنے والے فرقہ پرستوں کاوُجود اس کی گرمی سے خاک ہوجائے۔ یہ سرزمینِ ہند جو آج لالہ زار بنی ہوئی ہے، یقین جانئے اس کی سرخی میں ہمارے شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ وہ آر ایس ایس جو خود کو سب سے زیادہ قوم پرست گردانتی ہے، سچ یہ ہے کہ آزادی کی تمام تر لڑائیوں میں یہ تنظیم یا اس کے نظریئے کے حامل افراد تحریک حریت کو سبوتاژ کرنے کے لئے ہمیشہ انگریزوں کی کمیں گاہوں میں موجود رہے۔ جب ملک آزاد ہوا تو کانگریس میں شامل ہوکر دستارِ فضیلت بھی خود اپنے ہاتھوں اپنے ناپاک سروں میں اُڑس لی۔ تحریک آزادی میں جن کا کردار گھناؤنا تھا، جن کے دامن پر خود کے لہو کا کوئی چھینٹا بھی نہیں، جن کے لباس گرد آلود تک نہیں ہوئے، جن کی لیاقت ایک معمولی سند سے محروم ہے۔ وہ ان قدآور مسلمانوں سے سند اعتبار چاہتے ہیں جن کے لہو کے سبب سرزمین ہند کو اعتبارِ آزادی ملا۔

قومی بغاوت کی ناکامی اور سقوطِ دلی نے اسلامی علوم وفنون کی مرکزیت کو بھی مسخ کردیا۔ وہ دلی کہ گہوارۂ علم وادب تھی، تاراج ہوگئی۔ ان ناگفتہ بہ حالات نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ورفقائے کرام کو اسلام، مسلمانوں اور اسلامی علوم وفنون کی بقاء وترویج کے لئے قدرتی طور پر سوچنے پر مجبور کیا جو کہ مدارس کے اجراء وقیام کی شکل میں بفضل خدا ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کی بنیاد ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو دیوبند کی تاریخی مسجد چھتہ میں ایک عربی مدرسہ کے ساتھ رکھ دی گئی۔ اس مدرسہ کے استاذِ اوّل مُلّا محمود دیوبندیؒ وشاگردِ اول محمود حسن دیوبندیؒ تھے۔ یہ وہ شاگردِ خاص ہیں جنہیں دنیا نے بعد کے وقتوں میں "شیخ الہندؒ" کے لقب سے جانا اور یاد کیا۔ یہ وہ شاگردِ خاص ہیں کہ جن کے جذبہ حب الوطنی اور خداداد بصیرت نے اس ملک میں شمع حریت کی روشنی کو نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں پھیلایا بلکہ جہادِ آزادی کے جذبوں کو اطرافِ ہند تک لے گئے۔

جناب شیخ الہند کے جنونِ حریت نے ملک کو ایک بامقصد تحریک عطا کردی۔ ایک چھوٹا سا عربی مدرسہ رفتہ رفتہ دارالعلوم بن گیا۔ یہ مرکز صرف کتاب وسنت کی تعلیم تک محدود نہ رہ کر تقاضائے وقت کے سبب تحریک آزادی کا مرکز بھی بنا جہاں آزادی کے متوالوں کی تربیت اور ذہن سازی بھی کی جاتی رہی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے سینے میں موجزن یہ جذبہ حریت اپنے اساتذہ کی نظرِ خاص کا مرہونِ منت تھا جس نے ایک باضابطہ تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ اس ملک کی تاریخ آزادی میں یہ تحریک تحریک شیخ الہندؒ یا تحریک ریشمی رومال کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مدارس کے قیام کی حکمت عملی نے حوصلہ پرور امکانات پیدا کردیئے۔ تحریک پھیلتی رہی، زور بھی پکڑتی رہی۔ انگریزی فوج مسلح بھی تھی، منظّم بھی۔ جنگ آسان نہ تھی۔ سازگار حالات درکار تھے۔ وہ برطانوی وسعت پسندی جس نے اپنی شاطرانہ چالوں سے نصف دنیا کو غلام بنا رکھا تھا، اُس سے غیر منصوبہ بند محاذ آرائی خودکشی کے مترادف تھی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ برطانوی افواج پوری دنیا میں اپنے دشمنوں سے برسرپیکار تھیں۔ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا غیر دانشمندی کی دلیل ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں برطانوی فوج پر کرارا حملہ سودمند ہوسکتا تھا۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندستان پر کوئی بیرونی ملک حملہ کردے تاکہ اُس کی آڑ میں اندرونی

**انبیہٹہ اور نکڑ جو کہ ضلع سہارنپور کے قریب کے دیہات ہیں، وہاں کے مسلمانوں سے جا کر پوچھئے تو سو سال بیت جانے کے بعد بھی وہ آپ کو بتائیں گے کہ کن درختوں پر کتنے علماء وحفاظ کی لاشیں لٹکی ہوئی تھیں اور اُن کے نام کیا تھے۔ اس ملک کی آزادی میں مسلمانوں کا جتنا لہو بہا ہے اگر سرزمین ہند بطورِ ثبوت اُنہیں اُگل دے تو ہماری وفاداری پر کلام کرنے والے فرقہ پرستوں کاوُجود اس کی گرمی سے خاک ہوجائے۔**

بغاوت انگریزوں کی کمر توڑ دے۔ حکمت عملی جاری رہی۔ غور و خوض ہوتا رہا۔ منصوبے کی خامیوں کو دور کرنے میں سر جوڑے گئے۔ باہمی مشورے رہنمائی کرتے رہے۔ صادق جذبوں نے حوصلوں کو تازگی عطا کی۔ بگل بجا دیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی خواہش تھی کہ ان جنگی حالات میں ہندوستانی حکومت کے خلاف شمالی مغربی سرحدی قبائل حملہ آور ہوجائیں۔ پیش قدمی سے قبل اپنے پیغامبر کو افغانستان روانہ کیا تاکہ بغاوت کی نوک پلک سنواری جاسکے۔ جرمن اٹلی جنس کی کابل میں موجودگی امید افزا تھی۔ قاصد معتمد شاگرد خاص مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے افغانستان میں کانگریس کمیٹی کے نام سے ایک فعال گروپ کی تشکیل کی۔ اس گروپ کا ہندوستان کی انڈین نیشنل کانگریس سے الحاق کیا۔ حزب اللہ کے نام سے فوجی یونٹ کا قیام بھی کیا۔ اس کے بیشتر مراکز جناب شیخ الہندؒ نے پہلے سے ہی ملک میں بنا رکھے تھے۔ رازداری کے ساتھ لوگوں سے جہاد پر بیعت لی جارہی تھی۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ جو کہ جناب شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد تھے خود اس سرگرمی سے لاعلم تھے۔ وسائل وسہولیات کی کمی، فوری رابطہ میں تاخیر اور جنگی حالات کے سبب افغان فوج کو ہندستان پر حملہ کردینے پر آمادہ نہ کیا جاسکا۔ مجاہدین ہندستان میں بغاوت پر کمربستہ تھے مگر بیرونی حملہ شرط تھا تاکہ فرنگی افواج کو شکست دی جاسکے اور یہ حملہ ممکن نہ ہوسکا۔ افغانسان میں مولانا سندھیؒ سرحدی علاقوں کا دورہ کرتے رہے۔ ایک خدائی فوج کی بنیاد ڈالی۔ کمانڈر اِن چیف کے طور پر حضرت شیخ الہندؒ کا انتخاب ہوا۔ فوجی مرکز مدینہ منورہ کو بنایا گیا۔ قائم مقام کمانڈر مولانا عبیداللہ سندھیؒ بنائے گئے اور ایک عارضی ہندستانی حکومت قائم کردی گئی۔ وزیر اعظم مولوی برکت اللہؒ، صدر اول راجہ مہندر سنگھ پرتاب اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پاس وزارتِ اُمورِ ہند رہی۔ انگریزوں کو ہندوستان بدر کرنے کے لئے تحریک کی وسعت وگیرائی از حد ضروری تھی۔ بیرونی کمک کو یقینی بنانے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ سخت رازداری، خاموشی اور احتیاط کے ساتھ حجاز تشریف لے گئے۔ گورنر حجاز سے ملے۔ ترکی کے وزیر دفاع سے ملاقات کی۔ ہندوستان کی آزادی پر مدد کا تیقن لیا اور پروگرام بہت واضح طور پر اُن کے سامنے رکھا۔ مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہندوستان کے مختلف قبائل کو خطوط روانہ کئے اور یہ ذمہ داری حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے دوست اور معتمد خاص مولانا ہادی حسنؒ کو سونپی جو کہ دیانتداری اور خاموشی سے انجام دی گئی۔ حجاز کے گورنر غالب پاشا کے خطوط جو کہ جناب شیخ الہندؒ نے روانہ فرمائے تھے، انکی نقول مولانا محمد میاں انصاریؒ نے قبائلی سرداروں تک پوری ذمہ داری سے پہنچائیں۔ جیسا کہ پیچھے ذکر موجود ہے کہ افغانستان میں اپنے قیام کے دوران مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے جو گراں قدر خدمات انجام دیں اُن کی تفصیلات سے حضرت شیخ الہندؒ کو باخبر رکھنے کے لئے جو خطوط لکھے گئے وہ ''ریشمی خطوط'' کے نام سے تاریخ کے سینے پر کندہ ہیں۔ یہ سارے خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر مشتمل تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے یہ تینوں خطوط ایک معتبر شخص عبدالحق کے ذریعے روانہ فرمائے تھے جن کی غفلت نے راز افشا کردیئے اور خطوط انگریزوں کے گورنرِ پنجاب مائیکل اڈوائر کے ہاتھ پہنچ گئے۔ جذبہ خلوص، سخت جانفشانی اور ایک طویل مدت سے جاری تحریک حریت دم توڑ گئی۔ حضرت محمود حسن دیوبندیؒ حجازِ مقدس سے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد تک پہنچنے کے ارادے میں تھے کہ والی مکہ شریف حسین جو کہ انگریزوں کا وفادار تھا، اُس نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کردی، غالب پاشا معزول کردیئے گئے۔ جناب شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقائے کار گرفتار کرلئے گئے جنہیں جدہ سے مصر اور مصر سے مالٹا روانہ کردیا گیا۔ جدہ سے ہونے والی اس گرفتاری میں حضرت حسین احمد مدنیؒ بھی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد یہ حضرات جو کہ مالٹا میں ۳۸/ ماہ اسیر رہے۔ ان کی رہائی ۱۳/ جنوری ۱۹۱۷ء میں عمل میں آئی۔ تحریک ریشمی رومال اگر کامیاب ہوجاتی تو ہندوستان ۱۹۴۷ء سے کافی پہلے آزاد ہوجاتا..... مگر صد افسوس خطوط کی ضبطی نے ایک سرگرم تحریک کو سرد کردیا۔

لیکن قید وبند کی صعوبتوں نے حریت کے متوالوں کے جذبوں کو سرد نہیں کیا۔ آتش شوق بھڑکتی رہی۔ ذوق آزادی پروان چڑھتا رہا۔ حضرت شیخ الہند نے جو چراغ عزم جلایا تھا وہ بعد کے وقتوں میں ان کے شاگردوں اور پیروکاروں نے تابندہ رکھا۔ وہ داستان جو کہ محدود تھی، ان جاں نثاروں کے طفیل لامحدود ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء میں ملی آزادی میں مسلمان علماء کرام کی قربانیوں کا جو حصہ ہے، تحریک ریشمی رومال اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ □□

# تاریخ تحریک ریشمی رومال

مولانا محمد شاھد مظاھری (ناظم جامعہ فلاح دارین وصدر جمعیۃ علماء شہر سہارنپور)

تحریک ریشمی رومال ایک انقلابی تحریک تھی جس پر ایک صدی کا عرصہ پورا ہونے والا ہے، جس کی تخم پاشی حضرت شیخ الہندؒ نے فرمائی تھی، جس کی فکر سے ملک کو آزادی نصیب ہوئی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند، جس کے حضرت شیخ الہندؒ فکری رہنما ہیں، اس تحریک کو عوام تک پہنچانے کے لیے مختلف پروگراموں، شیخ الہند کانفرنسوں، جلسوں اور سیمیناروں وغیرہ کا اہتمام کیا اور اب دسمبر ۲۰۱۳ء میں ''امن عالم کانفرنس'' کے عنوان سے ایک سوسالہ تقریبات کا اختتام کرنے جارہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس تحریک کے خدوخال پر روشنی ڈال دی جائے تاکہ ملک کے عوام اس کی اہمیت کو سمجھ کر تحریک ریشمی رومال سے باخبر ہوسکیں کیونکہ فی زمانہ تاریخ کی حقیقت کو چھپایا جارہا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بھی برطانوی حکومت کی طرف سے ہندستانیوں کو تقریر وتحریر کی آزادی حاصل نہیں تھی، حکم زبان بندی عام تھا، برسرعام حکومت کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی اور تنقید برطانوی حکومت کی پیشانی پر غیظ وغضب کی شکن پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم بنگال جیسے اہم مسئلہ پر جن لوگوں نے اپنے دکھ درد کا اظہار کیا واضح لفظوں میں کردیا تھا ان کے لیے سوائے جیل کے اور کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی۔

جن لوگوں کو غلامی کی ذلت، ہندستانی مظلومیت اور بے بسی، تقریر وتحریر کی گلاگھونٹ دینے والی حکومت کا شدت سے احساس تھا ان کے لیے صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی، اور یہ اپنی جانیں دے کر بھی آزادی حاصل کرنے کو غلامی کی ذلت بھری زندگی پر ترجیح دینے لگے تھے ان کا کہنا تھا کہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے اچھی ہے۔ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار دن سے افضل ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیرون ملک میں ہندستانیوں نے آزادی کی شمع جلائی، امریکہ، جرمنی، افغانستان اور ترکی میں ہندستانی جوان پہنچے اور انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ایسے وسائل وذرائع پیدا کیے جن سے کام لے کر وہ آزادی کی راہ میں کوئی مؤثر رول ادا کرنے کی پوزیشن میں آگئے۔

۱۹۱۵ء میں جرمنی نے اپنا ایک وفد افغانستان بھیجا تاکہ افغانستان کو ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرنے یاغستان اور آزاد قبائل کی فوجی تربیت اور اسلحہ کی سپلائی بھی وسائل وذرائع کا پتہ چلائے اور کس طرح ان مقامات میں آزادی کا جذبہ پیدا کرکے جدید اسلحہ کے استعمال وتربیت پر ان کو آمادہ کیا جائے، جرمنی کے اس وفد کے سربراہ ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی تھے اور انھوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کام کو کیا اور وفد کو محفوظ راستے سے لائے اور افغانستان پہنچایا۔ فان ہن تیگ جرمنی، وفد کا سرخیل اور قیصر جرمنی کا نمائندہ تھا، کاظم بے ترکی وفد کا قائد تھا جسے سلطان محمد خامس غنائی نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین اپنا نمائندہ بناکر بھیجا تھا اس وفد کے ساتھ ہندوستانیوں میں ڈاکٹر برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر پرتاپ تھے ان ارکانِ وفد کے علاوہ اس وفد کے ساتھ کچھ فوجی افسران بھی جنھیں یاغستان اور آزاد قبائل میں فوجی ٹریننگ دینے کے لیے ساتھ لیا گیا تھا، فوجی افسران میں ترکوں کے علاوہ پٹھان بھی تھے جو فرانس کے جنگی میدانوں سے بھاگ کر جرمنی پہنچے تھے یا جرمنوں کے ہاتھ میں اسیر ہوگئے تھے۔

جرمنی وفد کا اصرار تھا کہ شاہ افغانستان کو آلات جنگ واسلحہ فوج اور زرومال کی امداد کا زیادہ سے زیادہ یقین دلایا جائے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب افغانستان میں یہ وفد گفتگو کررہا تھا اور افغانستان اور مجاہدین آزادی مقیم یاغستان کو پیش نظر رکھ کر نقشۂ جنگ مرتب کیا جارہا تھا، ہندستان میں برطانوی حکومت کی قوت گیارہ ہزار یا پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں تھی، ان حالات میں اگر افغانوں اور یاغستانیوں کو جدید اسلحہ مل جاتے تو اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات انتہائی روشن تھے۔

ٹھیک یہ وہ وقت ہے جب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی 'ریشمی رومال کی تحریک' وجود پذیر ہوئی، یہ شیخ الہندؒ کی سیاسی تدبر اور ایک بوریہ نشین عالم کے طائر فکر کی بلند پروازی کی روشن اور واضح دلیل ہے، اس تحریک کی تاریخ لکھنے والوں نے ابھی اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا ہے کہ شیخ الہندؒ اور ان لوگوں کا جن کا اس تحریک میں کلیدی رول تھا سرحدی قبائل اور ان مجاہدینِ آزادی سے براہِ راست کیا تعلق تھا؟ جبکہ ایک کی اہمیت وعظمت اور قدر وقیمت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس تاریخی تحریک سے پردہ اٹھایا جائے۔

تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ شیخ الہندؒ نے اپنے معتمد شاگرد مولانا

عبیداللہ سندھیؒ کو ابتدا میں دیوبند میں اپنے پاس رکھا اور پھر کچھ دنوں کے بعد ان کو دہلی لے گئے اور خصوصیت کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ملاقات کرائی اور مولانا سندھیؒ پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار فرما کر مولانا آزادؒ کو مطمئن کر دیا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہر طرح قابل اعتماد اور ہر طرح کے نازک رازوں کے امین اور ان کے مخلص ہونے میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا سندھیؒ کے تعارف کی اتنی اہمیت کیوں تھی؟ اور مولانا آزادؒ کو کیوں مطمئن کیا جارہا تھا۔ دراصل مولانا آزاد کا سرحد کے اندر مجاہدینِ آزادی سے نہ صرف براہ راست تعلق تھا بلکہ وہاں کے مشیر بھی تھے اور بوقت ضرورت ہندستان میں رہ کر ان کو وسائل بھی فراہم کرتے تھے اور سرحدی مجاہدینِ آزادی مولانا آزاد سے مشورے بھی کرتے رہتے تھے گویا ہندستان میں بیٹھ کر وہ مجاہدین سرحد کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

خود مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے دہلی لے جا کر مجھے اپنے حلقہ کے لوگوں سے ملایا اور میرا تعارف کرایا وہ یہی قومی رہنما تھے جو سرحد کے مجاہدین سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ ان کی ہر طرح کی مدد بھی کرتے تھے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شیخ الہندؒ نے اپنی منصوبہ بندی میں ان تمام قومی لیڈروں کو شامل رکھا تھا جو مجاہدین سے براہِ راست روابط رکھتے تھے اور یہ طریقۂ کار مستقبل میں جنگِ آزادی کا جو محاذ کھلنے والا تھا اس کے لیے ضروری بھی تھا کیونکہ شیخ الہندؒ کی تحریک کا ایک اہم ضروری جز تھا کہ سرحد کی طرف سے جب مجاہدین حکومتوں کی راہ میں پڑنے والے تمام بڑے شہروں میں بغاوت کا بگل بجادیا جائے تا کہ انگریز چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں آجائے اور اندرونی نظم میں الجھ کر حملہ آور مجاہدین کا مقابلہ نہ کرسکیں، اس طرح شیخ الہند کی یہ تحریک ایک مکمل اور منصوبہ بند تحریک تھی۔

۱۴؍اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا، ہندستان کے انقلابی لیڈروں کے نزدیک یہ موقع ایسا تھا کہ کسی باہری طاقت کی مدد سے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور برطانوی حکومت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے، شیخ الہندؒ نے اس کی تیاری برسوں پہلے سے شروع کردی تھی اور مولانا عبیداللہ سندھی کو بلا کر کام کا آغاز بھی کردیا تھا ہندستان میں جو سیاسی ماحول اور فضا بن چکی تھی اب مزید عملی اقدامات کا وقت آچکا تھا ۱۹۱۵ء میں جبکہ جنگِ عظیم شباب پر تھی اور برطانوی حکومت انتہائی خطرناک حالات میں گھری ہوئی تھی، اس کی ساری توجہ یورپ میں ہونے والی جنگ کی طرف لگی ہوئی تھی کیونکہ انگریزوں کا وطن دشمنوں کی زد پر تھا، اسی ماحول میں شیخ الہند نے مولانا سندھیؒ کو پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے کابل روانہ کردیا اور خود حجاز پہنچ کر نقشۂ جنگ مرتب کرنے اور ترکی حکومت کی پشت پناہی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔

رولٹ ایکٹ کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں جو رپورٹ مرتب کی ہے اس میں تحریک کی کہانی کچھ اس طرح ہے:

’’یہ ایک تجویز تھی جو ہندستان میں تیار کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو اور ادھر مسلمان اٹھ کر کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ وبرباد کردیا جائے اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبیداللہ نے اپنے تین رفقا محمد اور محمد علی کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا، عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا تھا اور ضلع سہارنپور کے مذہبی مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی تھی وہاں اس نے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے خاص لوگوں کو اور کچھ طلباء کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس نے اس پر اثر ڈالا وہ مولانا محمود الحسن تھا، عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندستان بھر میں ایک اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک جہاد پھیلادے لیکن اس کی تجاویز کے راستہ میں مدرسہ کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سدِ راہ ہوئے۔ انہوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی خدمت سے برخاست کردیا، اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے ہوتے تھے اور اس امر کی اطلاع ملی ہے کہ سرحد کے بھی کچھ آدمی وہاں آتے تھے ۱۸؍اکتوبر ۱۹۱۵ء کو محمود الحسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دو دوستوں کے ساتھ عبیداللہ کی پیروی کی اور شمال کی طرف جانے بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کے لیے ہندستان چھوڑ دیا، روانہ ہونے سے پہلے عبیداللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لے آیا جن میں ہندستان کے مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی تھی اور ان کو جہاد کے لیے آمادہ کیا گیا تھا اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود الحسن بھی شامل ہیں عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا زبردست حملہ ہندستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اس کو تقویت پہنچے۔‘‘

تعجب ہوتا ہے کہ یہ بوریہ نشین علماء کتنی گہرائی سے سوچتے ہیں اور کس

طرح ایک کامیاب منصوبہ بندی کی محیر العقول صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔

شیخ الہند دار العلوم دیوبند جیسے عالمی شہرت کے مالک عظیم ادارہ کی مسند صدارت پر تقریباً پچاس سال فائز رہے اور ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ آپ کی شاگردی میں سند فضیلت لے کر اپنے اپنے علاقوں میں جاتے تھے بلا مبالغہ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے ان کے شاگردوں میں ایک خاصی تعداد ان طلبہ کی بھی ہوتی تھی جو سرحدی علاقوں سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ چونکہ شیخ الہند کی تحریک میں ان سرحدی علاقوں کی بڑی اہمیت حاصل تھی اس لیے خصوصیت کے ساتھ آپ نے اس علاقے کے طلبہ کو اس کے لیے تیار کیا۔ جب ان کی قابلِ اطمینان تعداد ہوگئی تو دیوبند اور دہلی میں تحریک کے لیے فضا ساز گار بنانے کا کام شروع کردیا، شیخ الہندؒ کے گھر خفیہ جلسوں میں سرحد کے کچھ لوگ بھی کبھی کبھی شریک ہوتے تھے، شیخ الہند نے اپنے ایک مخصوص اور قابلِ اعتماد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو جو انتہائی ذہین اور اسکیم ساز ذہن کے مالک تھے بلا کر ہندستان میں آزادی کی جدوجہد کرنے والوں اور بالخصوص ان حضرات سے روشناس کرایا جو خفیہ طور پر ہونے والی جدوجہد سے وابستہ تھے جن میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ شامل ہیں۔

شیخ الہندؒ کی یہ سرگرمیاں ۱۹۰۶ء سے جاری تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک ہندستان گیر نظام کا خاکہ مرتب کیا گیا، مقصد یہ تھا کہ پچھلے دنوں مجاہدینِ آزادی کی متشددانہ کارروائیوں کی وجہ سے انگریز بہت چوکنا ہوگیا تھا۔ خطرہ تھا کہ اگر ذرا سی چوک ہوگئی تو ساری اسکیم فیل ہوجائے گی اس لیے انہوں نے سوچا کہ طریقۂ کار ایسا ہونا چاہئے کہ حکومت کے کان میں اس کی بھنک بھی نہ پہنچ جائے۔

عوام کی بیداری کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی بڑا اجتماع کیا جائے اس کے لیے جمعیۃ الانصار کا مذہبی پلیٹ فارم کام آیا۔ ۱۹۱۰ء میں یہ اجلاس کیا گیا، تیس ہزار سے زائد مسلمان اس اجلاس میں شریک ہوئے اتنا بڑا اجتماع چالیس پچاس برسوں میں کسی جماعت کو نصیب نہیں ہوا تھا، اس اجتماع میں ہر طرح کے لوگ اور ہر مکتبہ فکر کے افراد شریک تھے اس اجتماع میں دیوبند اور علی گڑھ کی ذہنی وفکری دوری کو کم کرنے کے لیے دونوں اداروں کے طلبہ کے تبادلے کی تجویز رکھی گئی۔

تحریک کا مرکز یاغستان کو قرار دیا گیا، یہ وہ علاقہ ہے کہ انگریز بار بار حملہ کرنے کے باوجود اس پر قابو نہیں پاسکا، ہر بار قبائلوں نے نہایت بے جگری سے مقابلہ کرکے انگریزوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا، اس مرکز میں شیخ الہند کے دو نہایت معتمد شاگرد مصروف کار تھے، ان میں ایک مولانا سیف الرحمٰن اور دوسرے حاجی ترنگ زئی تھے۔ اگست ۱۹۰۴ء میں جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو شیخ الہند نے حکم دیا کہ اب سکون سے بیٹھنے کا وقت ختم ہوگیا، شمشیر بہ کف میدان میں آجانا چاہیے، مرکز میں رہنے والوں نے اصرار کیا کہ آپ تشریف لائیں تو آپ کی سرپرستی اور نگرانی میں جدوجہد کی جائے لیکن شیخ الہندؒ نے اطلاع بھیجی کہ اگر میں یہاں سے ہٹ گیا تو مرکز کو جو مالی امداد مل رہی ہے وہ ٹھیک طور پر نہیں پہنچ سکے گی جو کمزوری کا باعث ہوگیا، اور پھر راستہ بھی جنگ چھڑ جانے سے انتہائی مخدوش اور خطرناک ہوگیا تھا۔ شیخ الہندؒ خود ہندستان سے باہر جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ اصل پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوجائے ورنہ تاخیر سے تحریک کو نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیے شیخ الہندؒ نے حکم بھیجا کہ آپ لوگ پروگرام کے مطابق کام کو جاری رکھیں سردست میرا آنا ممکن نہیں ہے۔ انگریزوں کا سرحد پر مجاہدین نے بہادری سے مقابلہ کیا انگریزوں نے اپنے نقصان کو ظاہر نہیں کیا اور بے شمار کمک ان علاقوں میں بھیج دی، سرحدی مجاہدین نے پوری جرأت سے مقابلہ کرکے انگریزی فوج کو نقصان پہنچایا مگر انگریزوں کے جدید ترین اسلحہ نے وہ تباہی مچائی کہ مجاہدین بہت زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کرسکے۔

ایک طرف فوج اور اسلحہ کی کثرت، سامان رسد کی فراوانی دوسری طرف یاغستان کے مفلس اور بے یارومددگار عام باشندے نتیجہ یہ ہوا کہ جب مجاہدین کا سامان ختم ہوگیا تو مورچہ چھوڑ کر جانا پڑا اس لیے مرکز سے شیخ الہندؒ کے پاس اطلاع آئی کہ جب تک کسی حکومت کی منظم پشت پناہی حاصل نہ ہو ہماری شجاعت وجاں بازی بیکار ہے اس صورت حال کے پیشِ نظر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو ۱۹۱۵ء میں کابل بھیجا گیا۔

حکومت سے تعاون کرنے کی کوشش اس دور میں ترکی حکومت نے کی جو خلافت کے نام سے مشہور تھی اس کا بادشاہ اپنے کو خلیفۃ المسلمین کہتا تھا اور عام دنیا کی نگاہوں میں ترکی خلافت کو مذہبی رشتہ سے ایک عظمت وتقدس حاصل تھا اور وہی حجاز پر بھی حکمراں تھی، مکہ مکرمہ مدینہ منورہ کی حفاظت سے ترکی خلافت کی عزت میں چار چاند لگے ہوئے تھے دوسری حکومت افغانستان کی تھی جو مجاہدینِ آزادی کے مرکز سے متصل واقع تھی جہاں سے امداد حاصل کرنا سہل ترین تھا، افغانستان میں مجاہدین کی اکثر آمد ورفت بھی رہتی تھی، اس لیے اگر حکومت افغانستان کو تنہا بھی مجاہدین کی

امداد پر آمادہ کیا جاتا ہے تو ہندستان میں انگریزوں کا ناطقہ بند کردینے کے لیے کچھ کم نہ تھا۔ اس زمانے میں حبیب اللہ خاں، افغانستان کا بادشاہ تھا، اس سے کسی بڑے اقدام کی امید نہیں تھی کہ وہ اس خارزار وادی میں اترنے کی ہمت کرتا البتہ اس کے بھائی نصراللہ خاں کے دل میں انگریزوں سے نفرت تھی اور اس کے دل میں ان کی مخالفت کا جذبہ موج زن تھا۔

مجاہدینِ آزادی کے امیر المجاہدین مولانا محمد بشیر نے اس سے گفتگو کرکے اس کو بڑی حد تک آمادہ کرلیا تھا، مولانا موصوف نے اس سلسلے میں امیر کو مطمئن کرنے کے لیے آزاد قبائل کے سرداروں اور ملاؤں سے بیعت نامے بھی حاصل کرکے پیش کردیے تھے اور اب امید کی جانے لگی تھی کہ امیر المومنین کی مدد کے لیے کوئی بڑا اقدام کیا جاسکتا ہے لیکن جب امیر ہندستان پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوا تو اس نے شرط لگادی کہ ہندستان کے قومی لیڈروں میں سے بعض مشہور لیڈروں سے معاہدہ ضروری ہے تاکہ ہندستان پر حملہ کا فیصلہ کیا جاسکے۔

یہی وہ وقت تھا جب شیخ الہندؒ میدان عمل میں آئے، منصوبے کی یہ پیش رفت بہت حوصلہ افزا تھی، حالات کو سازگار بنانے کی جدوجہد مسلسل جاری تھی مایوسیوں کا اندھیرا چھٹ رہا تھا، مطلع امید پر ظفر مندی کے سورج کے طلوع ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے تو شیخ الہندؒ نے اپریل ۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا تھا لیکن جنگ کی وجہ سے صورتِ حال اتنی پیچیدہ اور خطرناک ہوچکی تھی کہ چار مہینے مسلسل ہندستان میں رہ کر دہلی سے سندھ تک مختلف مقامات پر رکتے ہوئے سرحد سے نکلنے کی تدبیر کرتے رہے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ روپے کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی سیٹھ ہارون سے ملاقات کی، انہوں نے بے تامل پانچ ہزار روپئے پیش کردئے جو مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بطور زادراہ دے دیئے گئے۔ اخراجات کے انتظام کے بعد ایک غیر معروف راستے سے اونٹ کے ذریعہ راتوں رات سفر کرکے بمشکل تمام حدود افغانستان میں پہنچے، یہاں پہنچنے پر موصوف کو جو مشکلات پیش آئیں وہ ان کی خودنوشت ڈائری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا سندھیؒ کابل میں رہ کر ملک کی آزادی کے لیے کوشش کرنے والوں سے ملاقاتیں کرتے رہے، ان کا نقطۂ نظر اور طریقۂ کار معلوم کرکے صحیح لائحۂ عمل بناتے اور مرتب کرتے رہے انہیں دنوں برلن میں جرمنی کی وزارت خارجہ کے تحت ایک انجمن 'انڈین نیشنل پارٹی' بنائی گئی تھی جس میں ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی وغیرہ شامل تھے اس پارٹی کی طرف سے راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ ترکی اور جرمنی افسران کے ساتھ ایک مشن پر افغانستان آئے، مولانا سندھی کا اس مشن سے تبادلہ خیال ہوا۔ اس گفتگو میں مولانا سندھیؒ کے ساتھ لاہور کے مہاجر طلبہ عبدالباری اور شیخ محمد ابراہیم بھی شامل تھے، برلن مشن کے نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے مولانا سندھی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور برلن مشن نے اس کو تسلیم کرلیا، برلن مشن میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر میں کبھی بھی افغانستان صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان دیکھا ہو اور مولانا سندھیؒ کی ساری عمر ہی شمال مغربی ہند میں گزری تھی اس لیے ان کے پاس بہت سی ایسی معلومات تھیں جو کابل میں فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت اہم اور قیمتی تھیں، اس طرح مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کی رائے غالب ہونے لگی اور فریقین ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے۔

شیخ الہندؒ کو کابل اور یاغستان کی اطلاعات برابر ملتی رہیں اور جب یہ اطلاع ملی تو حالات نے مزید انتظار کی مہلت نہیں دی اس لیے آپ نے طے کیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو ہندستان چھوڑ دیں۔ جنگ کی وجہ سے ملک میں حالات تیزی سے بدلتے جارہے تھے پابندیاں بڑھتی جارہی تھیں لیڈروں کی آمدورفت پر نگرانیاں شروع کردی گئی تھیں، پورے ملک میں سی آئی ڈی کا جال بچھادیا گیا تھا بہت سے مسلم لیڈروں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا اور باقی لیڈروں کی گرفتاری کی افواہیں بڑے زوروں پر پھیلی ہوئی تھیں، اس لیے شدید خطرہ تھا کہ شیخ الہندؒ کو بھی گرفتار کرلیا جائے گا، اور شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا مطلب یہ تھا کہ دس سالہ جدوجہد رائیگاں ہوجائے، بغیر لیڈر کے تحریک کیسے چل سکتی ہے؟

۱۹۱۵ء میں شیخ الہندؒ بہ ارادۂ حج نکلے، ان کے رفقاء سفر میں مولانا محمد میاں امبیٹھوی، مولانا عزیر گل پشاوری، حکیم نصرت حسین، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا سہیل بھاگلپوری، حاجی خان محمد، مولوی وحید احمد مدنی شامل تھے۔ مشہور تھا کہ خفیہ پولس والوں کا آٹھ نفری وفد شیخ الہندؒ کے ساتھ جارہا ہے، ممبئی تار دیا گیا کہ مولانا کو گرفتار کرلیا جائے مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ گرفتاری نہ ہوسکی، بعد میں جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی شیخ الہند بخیریت مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

شیخ الہندؒ نے مکہ پہنچ کر مکہ کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، غالب پاشا نے مدینہ کے گورنر نصری پاشا کے نام خط لکھ کردیا کہ مولانا موصوف کی ملاقات انور پاشا اور جمال پاشا سے کرادی جائے، چنانچہ

دورۂ مدینہ کے وقت یہ دونوں فوجی کمانڈر مدینہ آئے شیخ الہندؒ نے ان سے ملاقات کر کے اپنا مقصد بتایا اور اپنے منصوبے کی وضاحت کی۔ دونوں نے خوشی کا اظہار کیا اور چند وثیقے لکھ کر شیخ الہند کو دیئے جن میں آزاد قبائل کو ہر طرح کا تعاون دینے کا یقین دلایا گیا تھا انور پاشا نے شیخ الہندؒ سے کہا کہ آپ خود آزاد قبائل میں پہنچ جائیں اور اپنے پہنچنے سے پہلے یہ تحریریں وہاں کے باشندوں کو پہنچادی جائیں یہ وثیقہ کامل احتیاط کے ساتھ محفوظ کر کے مولانا ہادی حسن کو دیا گیا کہ وہ لے کر سیدھے ممبئی آئے، پولیس تاک میں تھی، تلاشی ہوئی، مگر پولیس کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ کرسکی، وثیقہ صندوق میں محفوظ رہا، ادھر شیخ الہندؒ مدینہ سے مکہ واپس آئے تاکہ غالب پاشا سے آخری ملاقات کر کے استنبول کے لیے روانہ ہو جائیں تاکہ خلیفۃ المسلمین سے براہِ راست ملاقات کر کے فرمان شاہی حاصل کریں۔ ۱۹۱۶ء میں آپ مکہ مکرمہ پہنچے مکہ کا گورنر غالب پاشا طائف گیا ہوا تھا شیخ الہند مکہ سے طائف پہنچے تاکہ فوری ملاقات کر کے ترکی روانہ ہوسکیں۔

شیخ الہندؒ کو زیادہ دیر تک طائف میں رکنا پڑا۔ بالآخر ۳ر شوال ۱۳۱۴ھ کو اپنے تین رفیقوں کو لے کر مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے کسی صورت سے نکلنے کی کوشش کریں اور استنبول پہنچ جائیں۔ آپ کے ایک ساتھی مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری جدہ میں تھے آپ نے جدہ جانا مناسب سمجھا، مگر وہ ہفتہ جدہ میں رہ کر دوبارہ مکہ واپس آنا پڑا، اسی زمانے میں ہندستان سے ایک سی آئی ڈی انسپکٹر بہاؤالدین کو خاص طور پر مکہ بھیجا گیا تاکہ شیخ الہند کی نقل وحرکت کی نگرانی کرتا رہے۔

حجاز میں انگریزوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنہ کا اثر ہندستان پر بھی تھا پورے ملک میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اس بے چینی کو فرو کرنے کے لیے انگریزوں نے خاں بہادر مبارک علی اورنگ آبادی کو خفیہ طور پر مکہ بھیجا کہ ملک کے علماء حرم سے ایک ایسا فتویٰ لائیں جس میں شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب قرار دیا گیا، خان بہادر نے شریف حسن کے چاپلوسی ملاؤں سے ایک استفتا اور اس کا جواب مرتب کرلیا، جس میں ترکی قوم کو مطلقاً کافر لکھا گیا تھا، اور آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا اور شریف حسین کی بغاوت کو درست اور مستحسن قرار دیا گیا تھا شریفی علماء سے دستخط حاصل کر لیے گئے، مگر علمائے حق اس فتویٰ پر دستخط کرنے میں متردد تھے، یہ فتویٰ شیخ الہندؒ کے پاس دستخط کرنے کے لیے لایا گیا تو آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔

یہ استفتا اور فتویٰ دو مقصدوں کے تحت تیار کرلیا گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ ہندستان میں پھیلی ہوئی بے چینی کو کم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ شیخ الہندؒ لازمی طور پر اس سے انکار کریں گے اس لیے ان کو اس بہانے گرفتار کرانے میں سہولت ہوگی، چنانچہ یہی ہوا آپ بھی اس سازش کو سمجھ گئے اور چاہا کہ کسی طرح شریف حسین کی قلمرو سے نکل جائیں لیکن تقدیر کا قلم فیصلہ لکھ کر فارغ ہو چکا تھا، شریف حسین نے گرفتاری کا حکم جاری کر دیا، شیخ الہندؒ اور مولانا وحید احمد کو روپوش کر دیا گیا، مولانا حسین احمد مدنی گرفتار کر لیے گئے مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین کو حراست میں لے لیا گیا اور کہا گیا کہ ان دونوں حضرات کو دو گھنٹے میں حاضر کرو، ورنہ تم دونوں کو گولی ماردی جائے گی۔ شریف حسین نے اپنے حکام سے مغرب کے وقت کہا کہ اگر عشا کے وقت تک لوگوں نے مولانا محمود الحسن کو حاضر نہیں کیا تو ان دونوں کو گولی ماردیں اور مولانا کے مطوفی کو سو کوڑے لگائیں۔

عشا کے وقت یہ باتیں شیخ الہندؒ کو معلوم ہوئیں تو آپ از خود حاضر ہو گئے اور گرفتار ہو گئے حکام نے ایک اونٹنی پر سوار کرا کے اور ساٹھ اونٹوں پر مسلح گارڈ کے پہرے میں جدہ روانہ کر دیا شیخ الہندؒ کو ایک ماہ جدہ میں رکھا گیا کیونکہ کرنل ولسن جدہ سے باہر گیا ہوا تھا واپسی کے بعد اس نے ان لوگوں کو مصر بھیج دیا۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء کو خدیوں آگیوٹ سے ان کو قاہرہ روانہ کیا گیا اور دریائے نیل کے اس پار ان کو قاہرہ شہر کے بالمقابل سیاسی قیدیوں کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا، فوجی عدالت میں مقدمہ ہوا، سب کو یقین تھا کہ پھانسی ہوگی، مگر بہ ظاہری ثبوت فراہم نہ ہوسکا اس لیے پھانسی کی سزا نہ دی جاسکی اور مالٹا کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔

افغانستان میں تختِ حکومت پر یکے بعد دیگرے آنے والوں میں امیر نصراللہ خان کے ذریعہ انگریزوں نے یاغستان میں پانی کی طرح روپیہ بہایا اور بڑے بڑے پیروں اور ملاؤں کو خرید کر اعلان کرایا کہ جب تک امیر کابل اعلان جہاد نہ کریں جہاد کرنا جائز نہیں اس لیے امیر نصراللہ خان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کیا جائے سیکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو روپیہ کا لالچ دے کر اس کا پر لگایا گیا کہ وہ گاؤں جا کر لوگوں سے تحریری بیعت حاصل کریں اور یہ کاغذات امیر نصراللہ خان والی کابل کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ والی کابل تو انگریزوں کا زرخرید ہی تھا اس نے سارے کاغذات بیعت ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیئے مجاہدین جہاد کا انتظار کرتے رہے اور سست ہو گئے اور دوسری مختلف کارروائیوں سے ان کے بھرے ہوئے جذبے کو سرد کر دیا گیا اور کابل گورنمنٹ کے تعاون سے یاغستان میں رہنے والے مجاہدین آزادی کو بے دست و پا بنا کر اس تحریک کو انگریزوں نے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ ◻◻

# ریشمی/غدر تحریک کے سو سال

**ابرار رحمانی** (ایڈیٹر 'آجکل' دہلی)

ہم خوش نصیب ہیں کہ آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اہلِ وطن کو یومِ آزادی مبارک۔ ہر سال کی طرح امسال بھی ہم پورے جوش وخروش سے یوم آزادی منا رہے ہیں۔ کیا ہندو، کیا مسلمان اور کیا سکھ بلا تفریق مذہب وملت اس قومی تہوار کو ہم مل جل کر مناتے ہیں کہ یہ تاریخ ہند کا ایک سنہرا باب ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جائے گا تاریخ ہند کا یہ سنہرا باب مزید سنہرا ہوتا جائے گا۔

ہم ہر سال اس کو بطور تہوار اس لیے مناتے ہیں کہ آزادی کی اہمیت کو ہماری نئی نسل سمجھ سکے اور غلامی کی دو ڈھائی سو سالہ لعنت کو یاد کر کے اس سے نفرت اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر سکے۔ آج ہمارا ملک آزاد ہے لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ تو غلامی کی لعنت کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی آزادی کی قیمت کو۔ ایسے میں ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں اس سے متعارف کرائیں۔ آزادی کے حصول کے لیے ہمارے بزرگوں نے کیا کیا نہ جتن کیے، کیا کیا نہ صعوبتیں جھیلیں، کتنی جانوں کی قربانیاں بھی دیں۔ یہ آزادی ہمیں تحفے میں نہیں ملی ہے۔ ہم نے آزادی کے حصول کے لیے مختلف طرح سے جدوجہد کی، اس کی ساری تفصیل اب تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو چکی ہے۔

جدوجہد آزادی کئی مراحل سے گزرتی رہی۔ کبھی ایسا لگا کہ اب ہم کامیابی سے قریب ہیں اور عنقریب آزادی ہمارے قدم چوم لے گی۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کا انجام سب سے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک صورت حال کے ساتھ ہمارے سامنے آیا اور یہی وہ موڑ ہے جب ہم تقریباً پورے طور پر غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیئے گئے۔ تب سے ۱۸۵۷ء تک محبانِ وطن اپنی آزادی کے لیے ترستے اور تڑپتے رہے۔ اپنے اپنے طور پر اپنی بساط بھر کوششیں کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء آزادیِ وطن کی تاریخ کا وہ ٹرننگ پوائنٹ ہے جب ہمارے دیش واسی دو بہ دو اور رو بہ رو برطانوی حکومت سے دو دو ہاتھ کرتے نظر آئے۔ یہی وہ موڑ ہے جب ہمارے اندر کچھ کر گزرنے کی اُمنگ جاگی۔ ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے چند جوشیلے دیس واسیوں نے دہلی پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن افسوس اس کا انجام ہمارے لیے خوش کن ثابت نہیں ہو سکا۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے ہم نے انگریزوں کو پریشانی میں ڈال دیا اور ان تک یہ میسیج پہنچا دیا کہ ہم محبانِ وطن نچلا بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہیں اور دیر سویر ایک دن ہم تم کو بھگا کر ہی دم لیں گے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے تمام دیس واسیوں اور بطور خاص نئی نسل کے سامنے ایک مثال قائم کر دی۔

> **آزادی کی طویل جدوجہد میں ریشمی رومال تحریک علمائے دیوبند کے ذریعہ ۱۹۱۳ء میں چلائی گئی ایک اہم تحریک ہے۔ آج اس تحریک کو سو سال پورے ہو رہے ہیں یہ تحریک بلاشبہ برطانوی راج کے خلاف چلائی گئی ایک خفیہ تحریک تھی جس سے شاید صرف دیوبند کے علماء واقف تھے۔ اس تحریک کو استحکام بخشنے کے لیے ترکی، جرمنی اور افغانستان کی حکومتوں سے مدد حاصل کی گئی تھی تاکہ اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا جاسکے۔**

۱۸۵۷ء جسے انگریزوں نے غدر سے موسوم کیا تھا، دراصل وہ ایک درخشاں باب ثابت ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو انگریزوں نے بڑی ہوشیاری سے غدر کہہ کر ایک طرح سے ہمیں مجرم ثابت کیا تھا۔ چونکہ ہمارا یہ عمل غیر منضبط تھا اور اس کے پیچھے کوئی پلاننگ نہیں، بس انتشار ہی انتشار تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے اسے غدر کہہ کر یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ ہم نے اپنے اس عمل سے گویا وطن کے تئیں غداری کی ہے۔ جبکہ سچی بات یہ ہے کہ تاریخِ ہند کا یہ باب جدوجہد آزادی سے مزین ہے۔ انگریزوں کو انھی کے لہجے اور ٹون میں جواب دینے کی غرض سے لالہ ہردیال نے نومبر ۱۹۱۳ء میں پہلے اُردو اور پھر پنجابی میں سین فرانسسکو سے 'غدر' کے نام سے ہی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا، جس کے سرنامہ پر لکھا ہوا تھا 'انگریزی راج کا جانی دشمن'

آزادی وطن کے لیے تمام دیش واسی ہمیشہ اپنی اپنی کوششیں کرتے رہے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، ہم آزادی سے قریب ہوتے گئے جدوجہد آزادی کے متعدد واقعات میں تحریک ریشمی رومال بھی ایک اہم واقعہ ہے جو گرچہ ناکام ہوئی لیکن وہ اپنا ایک اثر چھوڑنے میں کامیاب رہی۔

جس تحریک کو ریشمی رومال کے نام سے جانا جاتا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ واقف ہیں لیکن یہ تحریک اصلاً کیا ہے اور کس طرح یہ تحریک چلائی گئی، کن کن کے اذہان کی یہ اُپج تھی اور کب اور کن حالات میں تحریک کو چلانے کی نوبت آئی اور یہ تحریک کتنی مفید اور کتنی کامیاب رہی؟ آیئے ہم اسے پھر سے یاد کریں۔

آزادی کی طویل جدوجہد میں ریشمی رومال تحریک علمائے دیوبند کے ذریعہ ۱۹۱۳ء میں چلائی گئی ایک اہم تحریک ہے۔ آج اس تحریک کو سوسال پورے ہورہے ہیں یہ تحریک بلاشبہ برطانوی راج کے خلاف چلائی گئی ایک خفیہ تحریک تھی جس سے شاید صرف دیوبند کے علماء واقف تھے۔ اس تحریک کو استحکام بخشنے کے لیے ترکی، جرمنی اور افغانستان کی حکومتوں سے مدد حاصل کی گئی تھی تاکہ اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا جاسکے۔

اس تحریک کو حد درجہ خفیہ رکھنے کے باوجود اس وقت پنجاب کے سی آئی ڈی۔ دیوبند کے رہنما عبیداللہ سندھی، جو اس وقت افغانستان میں تھے، ان کے خطوط پکڑ کر اس تحریک کو بے نقاب کردیا۔ یہ خطوط منصوبے کے تحت ایک دوسرے رہنما شیخ الہند محمود الحسن کو لکھے گئے تھے جو اس وقت ایران میں تھے۔ یہ خطوط ریشمی رومال پر لکھے گئے تھے، اس مناسبت سے یہ تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان ہی دنوں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ لیکن علما کی جماعت نے اس کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے منصوبے کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمود حسن اکتوبر ۱۹۱۵ء میں کابل جا پہنچے۔ اسی مقصد کے تحت مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان کے امیر سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کریں۔ ادھر مولانا محمود الحسن نے جرمنی اور ترکی سے درخواست کی۔ پھر مولانا محمود الحسن حجاز (موجودہ سعودی عرب) کے لیے روانہ ہوگئے۔ ٹھیک اسی وقت مولانا عبیداللہ افغانستان کے امیر سے دوستانہ روابط قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ کابل سے اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ مولانا عبیداللہ ترکی کے لیے روانہ ہوگئے تاکہ برطانوی سامراج کے خلاف خلیفہ کے جہاد میں ان کا ساتھ دیا جاسکے۔ عبیداللہ سندھی نے اس جہاد کو تحریکِ آزادی ہند کے پس منظر میں بہتر جانا لیکن اس منصوبہ کا راز فاش ہونے کے بعد دیوبندی علماء گرفتار کرلیے گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو مکہ سے گرفتار کیا گیا اور حضرت حسین احمد مدنی کے ساتھ مالٹا بھیج دیا گیا۔

اس تاریخ ساز تحریک ریشمی رومال کی صدی کے موقع پر جنوری ۲۰۱۳ء میں جمہوریہ پرنب مکھرجی نے اس تحریک اور اس سے جڑے لوگوں کی قربانیوں کی یاد خاص طور پر ایک ڈاک ٹکٹ جاری کرکے انھیں تہنیت پیش کی ہے۔ ◻◻

# تحریک ریشمی رومال اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ

**تحریر: مفتی عبد الخالق آزاد**

۱۸۵۷ء کے بعد انگریز سامراج کے ظالمانہ نظام نے جس طرح جبرو آمریت اور دہشت کا بازار گرم کیا وہ الگ ایک داستان ہے، صرف دس سال کے مختصر عرصہ میں ۵۵ ہزار علمائے حق آزادی کے حصول کے پاداش میں شہید کردیئے گئے، ان کے علاوہ ہندستان بھر کے قومی راہنماؤں کو جس بری طرح تہہ تیغ کیا گیا اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس جبرو آمیت اور دہشت گردی کے ماحول میں ولی اللہی جماعت کے اُن سرکردہ حضرات نے دیوبند میں ایک دارالعلوم قائم کیا، جہاں بظاہر دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کا انتظام تھا، لیکن حقیقت میں آزادی و حریت کے لیے افراد سازی کا عمل منظّم کرنا تھا۔ چنانچہ خانقاہ رشیدی گنگوہ کی سرپرستی میں ان کے تربیت یافتگان حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا اور حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ نے ایک خفیہ تحریک کو منظّم کیا، جس تاریخ میں 'تحریک ریشمی رومال' یا تحریک شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد مشاورت اور راہنمائی کا مرکز گنگوہ سے 'رائے پور' منتقل ہوگیا۔ اور میدانِ عمل کا مرکز دیوبند ہی رہا، یوں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد آزادی کے حصول کے لیے جو تحریک منظّم کی گئی اس کا مرکز گنگوہ کے بعد رائے پور رہا اور حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کی سرپرستی میں اس تحریک کے لیے افرادی قوت کا مہیّا کرنا اور مالی امداد کی سپلائی کو جاری رکھنے کا کام بڑی جرأت وہمّت سے ہوتا رہا ہے۔

چونکہ تحریک ریشمی رومال انگریز کے انتہائی جبرو آمریت اور دہشت کے ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اس لیے خفیہ طور پر اسے چلانے کے لیے اس کے اراکین سے اس کے رازوں کی حفاظت کے لیے تاحیات حلف وفاداری لیا جاتا تھا۔ اس پس منظر میں اس تحریک کی بہت سی تفصیلات ابھی تک پردۂ خفاء میں ہیں۔

اس کے باوجود سرکاری ریکارڈ اور دیگر ذرائع سے جو کچھ ابھی تک سامنے آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کی منصوبہ بندی اور اس کی خفیہ حکمتِ عملی میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے بعد ان کے خلفاء حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت اقدس رائے پور اور حضرت سہارنپوری کا کردار بڑا نمایاں ہے اگرچہ میدانِ عمل میں سرگرمی کا مرکز حضرت اقدس شیخ الہند قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی تھی لیکن ان تمام حضرات کی مشاورت اور راہنمائی کا مرکز 'رائے پور' تھا بالخصوص حضرت شیخ الہند اور حضرت رائے پوری کے ہاں جس طرح آپس میں طبعی مناسبت اور قلبی تعلّق ومحبت موجود تھا، اس کا اندازہ ان دونوں حضرات کے فکروعمل اور جہد وکردار سے بڑا واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ تحریک ریشمی رومال کے ایک اہم راہنما حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے۔

''تحریک ریشمی رومال میں حضرت اقدس عالی رائے پوری کی راہنمائی اور مشاورت حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی پوری جدوجہد میں شامل حال رہی چنانچہ تحریک ریشمی رومال کے اہم ترین کردار امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی اس حقیقت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

**لان الامر (الجهاد) لم يكن مقصوراً علي شيخنا فقط، بل كان معه جماعة من اتباع مولانا محمد قاسم نانوتوی وطائفة من اتباع مولانا رشيد احمد مثل مولانا عبدالرحيم الرائپوری۔**

ترجمہ: تحریک ریشمی رومال کے کام کو صرف ہمارے استاذ حضرت شیخ الہند ہی نہیں چلارہے تھے بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگردوں کی ایک جماعت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور مریدین کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی، جیسے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔''(۸۰)

تحریک ریشمی رومال میں حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا کیا کردار تھا؟ اور اس میں آپ کا اصل مقام اور حیثیت کس درجہ بلند تھا خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

سرپر اس 'کوہ' کو اٹھاتا کون — گردن 'اس' کے لیے جھکاتا کون
دل کے اندر 'اسے' بٹھاتا کون — پڑھ کر یہ روتا اور رلاتا کون

زینت و زیب الف ثانی مرد شاہ عبدالرحیم ثانی مرد

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تحریک ریشمی رومال' کے حوالے سے قومی آزادی کے حصول کی تمام تر سرگرمیاں حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی مشاورت، راہنمائی اور سرپرستی سے منسلک تھیں، آپ کی وجہ سے تحریک کے کام کا مورال قائم تھا اور ساتھیوں کے حوصلے بلند اور کام کرنے کا جذبہ پورے جوبن پر تھا۔ آزادی کے حصول کی جدوجہد میں آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا تھا اس کا احساس بڑی شدّت سے حضرت اقدس شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

ناز فخر دوستان نہ رہا زور بازوئے ہمرہاں نہ رہا
قدر افزائے خادمان نہ رہا لو'خدی خواں کارواں' نہ رہا
زینت و زیب الف ثانی مرد شاہ عبدالرحیم ثانی مرد
سینہ کل تک تھا محشر آمال آج بیٹھے ہیں کیسے فارغ البال
جی میں کوئی ہوس رہی نہ خیال جینا آتا نظر ہے کیوں جنجال
زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مرد

یہی وجہ ہے کہ تحریک ریشمی رومال کے کام کے حوالے سے جب یہ محسوس کیا گیا کہ حضرت اقدس شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ حجاز تشریف لے جائیں تو اس سلسلے میں تحریک کے مرکزی مشاورتی بورڈ کا ایک اہم اجلاس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں ہوا اس اجلاس میں جہاں یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت اقدس شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری تحریک کے سلسلے میں حجاز کا سفر کریں۔ وہاں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ہندستان بھر میں اب عملی ذمہ داریاں بھی حضرت اقدس شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کے سپرد ہوں گی، خفیہ طور پر راہنمائی اور سرپرستی کا عمل تو پہلے سے آپ کر رہے تھے۔ اور عملی ذمہ داریاں حضرت اقدس شیخ الہند قدس سرہٗ پر تھیں، لیکن حجاز جانے کی صورت میں ہندستان کا یہ کام بھی حضرت اقدس رائے پوری کے سپرد کر دیا گیا، اس مشاورتی بورڈ کے فیصلوں کے بارے میں جزوی تفصیلات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل بیان سے ملتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شوال ۱۳۳۳ھ (اگست ۱۹۱۵ء) سے پہلے جب ان دونوں حضرات (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ) کا حجاز کا سفر طے ہو رہا تھا اس زمانہ میں حضرت اقدس شیخ الہند قدس سرہٗ نے ایک ہفتہ مستقل مدرسہ مظاہر العلوم میں قیام فرمایا۔ اور اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا الحاج احمد صاحب رامپوری کا قیام بھی اس زمانہ میں سہارنپور ہی رہا، یہ چاروں حضرات صبح کی چائے کے بعد مدرسہ کے کتب خانہ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ کتب خانہ کا دروازہ ان کی نشست گاہ سے بہت دُور تھا، اس کے اندر کی زنجیر لگ جاتی، اور ان چار حضرات کے علاوہ کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا تھا۔

تین چار دن یہی سلسلہ رہا جو لوگ اجمالاً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے واقف تھے وہ تو اجمالاً سمجھے ہوئے تھے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔

ان ہی ایام میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ذمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی غیبت میں ان کی تحریک کی سرپرستی تجویز ہوئی تھی اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت شیخ الہند کے ساتھ حجاز جانا تجویز ہوا تھا، مگر اس طرح کہ علیحدہ علیحدہ سفر ہو، اس لیے کہ حکومت کی نگاہ میں دونوں مخدوش تھے، خیال یہ ہوا کہ اگر ایک گرفتار ہو جائے تو دوسرا حجاز پہنچ جائے۔'' (۸۱)

حضرت شیخ الحدیث صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جیسے بظاہر غیر سیاسی مدرسہ بھی اپنے اصل اور مرکزی مشن یعنی قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں برابر کا شریک رہا ہے۔ محض خفیہ کام کی وجہ سے تمام مدارس اور خانقاہوں کو غیر سیاسی رنگ دیا گیا، ورنہ بنیادی طور پر سامراج کے ظالمانہ اقتدار کے خلاف ولی اللہی جماعت کے اصول پر کام کرنے والا ہر مدرسہ، ہر خانقاہ اور ہر جماعت اپنی اپنی جگہ کام کیا کرتا تھا۔

عام طور پر حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کا تعلّق تحریک شیخ الہند اور آزادی کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن واقف راز حضرات جانتے ہیں وہ بھی اس تحریک کے رکن رکین تھے جیسا کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب کے بیان سے واضح ہے اسی طرح حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہٗ تحریک ریشمی رومال کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ حقیقت بیان فرماتے ہیں: ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (حضرت اقدس رائے پوری) اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں بڑی یکسانیت تھی، ہمارے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرض الموت کے ایام میں مجھ سے فرمایا کہ حضرت سہارنپوری سے جا کر میری طرف

سے بیعت جہاد کرا اور اپنی طرف سے بھی حالانکہ لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت سہارنپوری ان معاملات میں بالکل نہ تھے مگر جب میں اپنے حضرت رائے پوری کے وصال کے بعد حضرت سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا:

''کہ حضرت رائے پوری نے کچھ فرمایا ہے؟''

میں نے عام باتیں بتائیں تو حضرت سہارنپوری نے عام لوگوں سے الگ ہوکر دوبارہ دریافت فرمایا کہ:

''وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ والے کام کے بارے میں کچھ فرمایا ہو، تو پھر میں سمجھا کہ بڑے میاں کو بھی اس کام میں لگاؤ ہے اس پر میں نے وہ عرض کیا۔'' (۸۲)

اس بیان کے اسلوب سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تحریک کے حوالے سے اہم رازوں کو یہ حضرات کسی طرح بھی زبان پر نہ لاتے تھے، اور اس خفیہ حلف کی پاسداری کرتے تھے جو 'بیعت جہاد' کے وقت ان حضرات سے کیا گیا تھا۔ اس بیان میں حضرت اقدس رائے پوری نے محض اشارے کئے ہیں۔تفصیلات بیان نہیں فرمائیں۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان حضرات نے بڑے صبر آزما ماحول میں پوری استقامت کے ساتھ ہندستان کی قومی آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔اور تحریک ریشمی رومال اس کی ایک زندہ جاوید مثال ہے۔

## ہندستان کی آزادی میں 'تحریک ریشمی رومال' کی اہمیت:

تحریک ریشمی رومال نے انگریز سامراج کے ظالمانہ اور غاصبانہ اقتدار پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی اس کا اندازہ انگریز حکومت کے سی آئی ڈی کے ریکارڈ سے بخوبی ہوجاتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس تحریک کی ظاہری منصوبہ بندی اور جدوجہد کی حقیقت، انگریز حکومت کو جب معلوم ہوئی اور اس کے لیے جو مخصوص خفیہ منصوبہ بندی کی گئی تھی وہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو ہندستان بھر میں انگریزی اقتدار میں کھلبلی مچ گئی حتیٰ کہ برطانوی حکومت بھی اپنی جگہ پر ہل کر رہ گئی، ردِعمل کے طور پر پورے ملک میں گرفتاریوں کا عمل شروع ہوگیا۔گرفتاریوں کے بعد اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے برطانوی حکومت نے رولٹ کمیشن (Rowlett commission) قائم کیا جس نے رولٹ ایکٹ (Rowlett Act) کے نفاذ پر مبنی سفارشات پیش کیں۔اور اس کے بعد برطانوی حکومت نے پورے ہندستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا، جس نے جبر وآمریت کو قانونی شکل دی۔آزادی کے لیے اجتماعات اور جلسہ کرنے پر پابندی لگادی گئی۔اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہی پورے ملک میں انگریز سامراج کے خلاف ایجی ٹیشن (Agitation) شروع ہوا۔اسی دوران امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثۂ جانکاہ پیش آیا، جس نے پورے ہندستان کے طول وعرض میں آزادی کے حوالے سے بیداری کی لہر دوڑادی اور اس کے بعد پورے ہندستان میں سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرگئی۔

یوں ہندستان بھر میں تحریک ریشمی رومال کی خفیہ جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر آزادی کی دبی ہوئی چنگاری کچھ اس طرح بھڑکی، کہ جو آگے چل کر ایک شعلہ جوالہ بن گئی اور پورے ہندستان میں آزادی کے حصول کے لیے عمومی بیداری پیدا ہوئی اور اگلے چند سالوں میں انگریز سامراج کو مجبور کردیا گیا کہ وہ اس خطے کے عوام کو آزادی دے۔

اس طرح اس خطے کی آزادی میں تحریک ریشمی رومال نے تحریکات آزادی کی ایک مسلسل کڑی کے طور پر ایسا لازوال کردار ادا کیا جس کی نظیر دنیا کے دیگر ملکوں میں قومی سطح پر نظر نہیں آتی۔

کسی تحریک کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اس کا نتیجہ فوری کامیابی کی صورت میں جلوہ گر ہو، اس سے بڑی خوش فہمی اور بے عقلی کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی آزادی کے حصول کے لیے انگریز سامراج کے خلاف چلائی جانے والی تمام تحریکات نے جس طرح مسلسل اور پے درپے برطانوی اقتدار پر کاری ضربیں لگائیں ہیں آزادی کا حصول ان تمام تحریکات کے مجموعی عمل کا نتیجہ قرار پائے گا نہ کہ محض چند سالوں کی رسمی کارروائیوں اور کسی ایک تحریک کے ذریعے آزادی کا حصول ممکن ہوا ہے۔

برعظیم پاک وہند میں برطانوی سامراج اور اس کے اقتدار کے خلاف چلائی جانے والی تمام تحریکات آزادی میں ولی اللہی جماعت کے تربیت یافتگان نے جس طرح عدم تعاون کے اصول پر قومی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھایا وہ یقیناً انھی علماء ربانیین کی خلوص پر مبنی بے ریاء زندگی کا عظیم شاہکار ہے۔اس خطے کے تمام لوگ ہمیشہ ان حضرات کی قربانیوں اور لازوال جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں گے۔اس ریجن کے لیے ان حضرات نے قومی زندگی کی نئی تشکیل وتعمیر کے لیے جس طرح سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر جدوجہد کی وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوکر رہ گئی ہے۔فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ خیر الجزاء۔□□

# تحریک ریشمی رومال کے مضمرات واثرات

تحریر: ڈاکٹر مولانا سعید الدین قاسمی (دہلی)

۱۹۱۷ء میں مولانا محمود حسنؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے جو شیخ الہند کے نام سے جانے جاتے ہیں ایک تحریک مرتب کی تھی جو پھول بوٹوں کی طرح ریشم کے رومالوں پر کشیدہ کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ والی ترکی انور پاشا سے سازش کرکے ان رومالوں کے ذریعہ خط وکتابت کی جائے اور والیٔ ترکی سے مدد حاصل کرکے ہندستان پر فوج کشی کی جائے اور ادھر اندر سے بغاوت ہو۔ لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی اور کسی نے مخبری کردی جس کی وجہ سے اس جہاز کو جس میں یہ رومال جارہے تھے سمندر ہی میں رُکوا کر تلاشی لی گئی۔ مولانا عبیداللہ سندھی اپنے رفقاء مولانا عبداللہ، مولانا فتح محمد اور مولانا محمد علی کو لے کر جارہے تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ پہلے ہی مدینہ پہنچ کر ترکی حکومت کے وزیر جنگ سے ملاقات کرکے اس کا فرمان حاصل کرچکے تھے سارا پروگرام مرتب ہوچکا تھا۔ عارضی حکومت کا قیام بھی عمل میں آ گیا تھا جس کے صدر راجا مہندر پرتاپ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی طے ہوگئے تھے اس کی فوج خدائی فوج اور صدر مقام مدینہ طیبہ مقرر ہوا تھا، سپہ سالار اعظم شیخ الہند تھے دوسرے مقامی ہیڈ کوارٹرس قسطنطنیہ، کابل اور طہران مقرر ہوئے تھے۔ اس میں تین سرپرست بارہ فیڈ مارشل اور بہت سے اعلیٰ فوجی افسروں کی فہرست بھی تھی۔

شیخ الہند محمود حسنؒ اور ان کے چار ساتھیوں مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ، حکیم نصرت حسینؒ اور عبدالوحیدؒ کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کرکے مالٹا کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح یہ تحریک اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ سکی۔ اپنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے یہ تحریک اگرچہ فی الوقت کامیاب نہ ہوسکی تاہم اس کے مضمرات اور اثرات نے مسلمانوں اور ہندستانیوں میں بیداری کی وہ روح پھونک دی جس نے ۳۰ سال کے عرصہ میں انگریزوں کا ناک میں دم کرکے رکھ دیا اور تیس سال کی تاخیر سے ہی سہی ان کو ہندستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ لہٰذا جو لوگ شیخ الہند کی تحریک کو ناکام بتاتے ہیں وہ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ شیخ الہند محمود حسنؒ ایک جید عالم تھے جن کا شجرہ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے جاکر ملتا ہے اور جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے اور پھر دارالعلوم کے مدرس بن کر درس وتدریس کے اعلیٰ مقام پر پہنچے جن کے شاگرد اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئے۔ آپ کے ممتاز تلامذہ میں مولانا اشرف علیؒ تھانوی، علامہ محمد انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ دہلوی، مولانا اصغر حسینؒ دیوبندی، مولانا عبیداللہؒ سندھی، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا حبیب الرحمٰنؒ عثمانی اور مولانا عبدالسمیعؒ جیسے مشاہیرِ علم وفضل شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ہولناک تباہی کے بعد تقریباً چوتھائی صدی سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک ملک میں خوفناک سناٹا اور سمندر جیسی خاموشی چھائی رہی غلامی کی ذلت کو اپنا مقدر سمجھ کر لوگ خاموش ہوگئے تھے۔ لال قلعہ کے تخت پر بیٹھتے ہی انگریزوں کو اپنی حکومت کے استحکام کی فکر ہوئی اور سب سے زیادہ خطرہ علماء کے طبقہ سے تھا جنھوں نے ان کی چولیں ہلادی تھیں۔ اس لیے ان کا نام بلیک لسٹ کردیا تھا اور جب بھی موقع آیا ان کی گرفتاری کا جال بچھا دیا گیا۔ ان پر مقدمات چلائے گئے۔ کالا پانی بھیجا گیا۔ ان تمام حالات میں بھی اگر کوئی اُمید کی کرن تھی تو وہ انھی کفن بردوش اور سرفروش علماء کی جدوجہد تھی

> **علماء نے اپنی بے سروسامانی اور بے بسی اور آزادی کے جذبہ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی سرگرمیوں کا رُخ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور آنے والے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے ہندستان میں مسلمانوں کے ایمان اور شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مذہبی مدارس کے قیام کی جانب مبذول کردیا۔**

جو سرحد پار مسلمانوں اور مجاہدین کی جماعت برابر مصروف جہاد تھی۔

علماء نے اپنی بے سروسامانی اور بے بسی اور آزادی کے جذبہ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی سرگرمیوں کا رُخ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور آنے والے خطرات کو محسوس کرتے ہوئے ہندستان میں مسلمانوں کے ایمان اور شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مذہبی مدارس کے قیام کی جانب مبذول کردیا۔

ماضی کے ان تمام حالات کا جائزہ لے کر شیخ الہند محمود حسنؒ نباضِ قوم نے تیسری اور آخری تحریکِ آزادی کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر پہلو پر غور وخوض کیا۔۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ میں ترکی کے جرمنی کے حلیف بن جانے کی وجہ سے اتحادیوں کی طرف سے پہنچنے والا نقصان بھی آپ کے سامنے تھا انھوں نے ملک کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہندستان اور مغربی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں وسطیٰ ایشیا، کا کینیا، مصر، ایران، افغانستان اور ان تمام سے بڑھ کر ترکی جیسے اسلامی ممالک جو اسلام کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہندستان اور ایشیائے کوچک درمیانی ممالک کو مربوط کرنے کی جانب ایک کڑی تھے۔ یورپ کی موجودہ صورتِ حال سیاسی اسیری سے ایشیا کی نجات اور مغرب سے معاشی غلامی سے آزادی کی نشان دہی کررہی تھی برطانیہ نے ترکی کے بارے میں ہندستانیوں سے کئے گئے وعدہ کو پورا نہ کرکے اسے تتر بتر کردیا تھا جس سے ہندستان کے مسلمان اور ہندستانی ناراض تھے۔

دراصل شیخ الہند انگریزوں کی جعل سازی سے اچھی طرح واقف ہوچکے تھے اور آپ عسکری بنیادوں پر مسلمانوں کو منظم کرکے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس بناء پر آپ نے ۱۹۱۷ء کو ریشمی رومال تحریک کو شروع کیا جس کے ناکام ہونے کے بعد تحریکِ آزادی کی بنیاد مضبوط ستونوں پر قائم ہوکر سرگرم تحریک میں تبدیل ہوگئی اور اس کے اثرات آئندہ کے حالات پر اس طرح پڑے۔

جب شیخ الہند مالٹا کی قید پوری کرکے ہندستان آئے اس وقت ملک میں سیاسی بیداری کی لہر تیز ہوچکی تھی۔ جلیانوالہ باغ میں نہتے عوام نے سینوں پر گولیاں کھا کر جان دے دی تھی۔ کانگریس میں دو طرح کے خیالات کے لوگ پیدا ہوگئے تھے ایک گاندھی جی کے اہنسا (عدم تشدد) کے نظریہ کے ساتھ چلنا چاہتے تھے دوسرے وہ جو طاقت کے ذریعہ انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے علماء چونکہ دونوں راستوں سے واقف تھے۔ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اور مدنی زندگی دونوں سے سبق حاصل کیا تھا اس لیے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کی بنیاد ڈالی گئی اس کی باقاعدہ نشست نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جس میں حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ کو صدر، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو نائب صدر اور مولانا احمد سعید کو ناظم بنایا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد فتح یاب اتحادیوں نے دولت عثمانی کے ٹکڑے کرکے اس کے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا۔ ہندستانی مسلمانوں کو ترکی سے بہت لگاؤ تھا انگریزوں کے خلاف ان کے اس عمل سے مزید نفرت پھیل گئی اور خلافت تحریک کا آغاز ہوا اور ادھر گاندھی جی کی قیادت میں ترک موالات (نون کوآپریشن) تحریک کا آغاز ہوچکا تھا۔

**دراصل شیخ الہند انگریزوں کی جعل سازی سے اچھی طرح واقف ہوچکے تھے اور آپ عسکری بنیادوں پر مسلمانوں کو منظم کرکے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے۔ اس بناء پر آپ نے ۱۹۱۷ء کو ریشمی رومال تحریک کو شروع کیا جس کے ناکام ہونے کے بعد تحریکِ آزادی کی بنیاد مضبوط ستونوں پر قائم ہوکر سرگرم تحریک میں تبدیل ہوگئی اور اس کے اثرات آئندہ کے حالات پر اس طرح پڑے۔**

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علماء نے ترک موالات کے حکمِ شرعی ہونے کا فیصلہ صادر کیا ۴۷۴ علماء کے دستخطوں سے جاری فتویٰ میں کہا گیا انگریز حکومت کی معاونت کرنا، ملازمت میں رہنا، فوج میں بھرتی ہونا وغیرہ سب حرام ہے۔

عدم تعاون کی تحریک کے سات نکاتی پروگرام میں یہ بھی شامل تھا کہ ان تمام تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے جنھیں حکومت کی سرپرستی یا مالی امداد میسر ہے۔ اس سلسلہ میں قومی رہنماؤں کا پہلا قدم علی گڑھ کی جانب اٹھا اور علی برادران کے مشورہ پر گاندھی جی نے طلبہ کے والدین کے نام

ایک اپیل جاری کرتے ہوئے ان سے حکومت کے تئیں عدم تعاون کی درخواست کی محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کے انتظامیہ نے اس کی زبردست مخالفت کی اور عدم تعاون کی تجویز کے خلاف قرارداد پاس کر کے صورت حال کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انجام کار ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کالج سے ذاکر حسین کی قیادت میں باہر نکل آنے والے طلبہ پر مشتمل جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آگیا اور کالج کی مسجد میں تحریک ریشمی رومال کے محرک، اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوگیا۔ حکیم اجمل خاں امیر جامعہ، مولانا محمد علی جوہر شیخ الجامعہ، حاجی موسیٰ خاں معتمد اعزازی اور تصدق احمد خاں شیروانی اس کے نائب معتمد مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۲۵ء میں جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔

ریشمی رومال تحریک کی سیاسی بیداری نے ملک میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ کونسلوں کے مقاطعہ کی پاس شدہ جمعیۃ علماء کی تجویز کو خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں نے قبول کرلیا۔ ۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد تھا اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جارہی تھی جس طرح علی برادران اور جمعیۃ علماء تحریکِ خلافت کے روحِ رواں تھے اسی طرح گاندھی جی تحریک سول نافرمانی کی قیادت کررہے تھے دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں کیونکہ دونوں کا نشانہ برطانوی سامراج تھا۔ گورکھ پور کے موضع چوری چورا میں عوام نے ایک پولیس اسٹیشن کو آگ لگادی۔ اس واقعہ سے نالاں ہوکر گاندھی جی نے اچانک عدم تعاون تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ گاندھی جی کی اجتہادی غلطی تھی جس سے عوام نے ناراضگی اور مایوسی کا اظہار کیا۔

**کوئٹ انڈیا (بھارت چھوڑو) تحریک:**

پہلی عالمی جنگ کے بعد شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور ان کی گرفتاری نے ملک میں تحریک آزادی کو جلا بخشی تو دوسری عالمی جنگ ۱۹۴۲ء کے بعد ریشمی رومال تحریک کے مضمرات واثرات نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس اور کوئٹ انڈیا، کا خطرناک فیصلہ کرنے کے لیے ممبئی منعقد ہونے والا تھا۔ ایک طرف کانگریس اس کو کامیاب بنانے کی فکر میں تھی تو دوسری طرف حکومت اسے ناکام کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ۹/اگست ۱۹۴۲ء جو صبح پورے ملک میں یہ خبر گونج گئی کہ ہندستان کے تمام لیڈر گرفتار کر لیے گئے جس کے ردعمل میں عوام نے غصہ میں آکر حکومت کے سارے نظام کو تہس نہس کر دیا۔ ریلوے لائن اکھاڑ دیں۔ اسٹیشنوں کو آگ لگادی۔ تار کاٹ دیئے۔ تھانے جلادیئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے اور شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی تحریک کی سلگتی چنگاری شعلہ جوالہ بن گئی ہے۔ اور ہر ہندستانی انگریزوں کے خلاف دیوانہ ہوگیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد ملت جو ممبئی کانگریس کے اجلاس میں شریک تھے کسی طرح بچ کر دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے انھوں نے ۲۸/اگست ۱۹۴۲ء کو دہلی میں جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بلائی جس میں کانگریس کے اقدام کی حمایت کی گئی۔

**ریشمی رومال تحریک کی سیاسی بیداری نے ملک میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ کونسلوں کے مقاطعہ کی پاس شدہ جمعیۃ علماء کی تجویز کو خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں نے قبول کرلیا۔ ۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد تھا اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔**

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی پہلے ہی گرفتار ہوچکے تھے ان کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید، مولانا سیّد محمد میاں مولانا نورالدین بہاری، مولانا عبدالماجد، مفتی نسیم الدین لدھیانوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل سنبھلی، قاری عبداللہ مرادآبادی، مولانا عبدالوہاب بستوی، مولانا شاہد میاں فاخری الہ آبادی، مولانا منیر الزماں اسلام آبادی، مولانا عبدالباری عباسی، مولانا منظور النبی سہانپوری وغیرہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیئے گئے۔

بالآخر شیخ الہند محمود حسنؒ کے جانشینوں کی ان قربانیوں کے نتیجہ اور ریشمی رومال تحریک کے اثرات سے عاجز آکر ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوگیا اور غاصبوں کو یہاں سے جانا پڑا۔ □□

# تحریک آزادی ہند کا ایک روشن باب تحریک ریشمی رومال

تحریر: مولانا علی حسن مظاہری (بانی وناظم دارالعلوم امدادیہ گڑھی، یمنا نگر، ہریانہ)

ایمان واسلام کی طاقت ایک مسلمان کو اس قدر جری اور شجاع بنادیتی ہے کہ وہ کبھی بھی غیر اسلامی افکار ونظریات سے خائف ومرعوب نہیں ہوتا، اگر زمانہ کی نیرنگیوں اور حالات وحوادث کے پیش نظر کبھی اسلام اور مسلمانوں پر افتاد پڑی بھی ہے اور غیر اسلامی طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کو زیرنگیں اور اپنا دست نگر کرنا چاہا ہے تو اسلام اور حامیان اسلام کی طرف سے اس کی بھرپور مخالفت ہی نہیں بلکہ اس کا منھ توڑ جواب دیا گیا ہے، اسلامی عقائد ونظریات کے سلسلہ میں چونکہ علماء اور دین کی صحیح فکر رکھنے والے حضرات اساطین علم بڑے متشدد ہوتے ہیں اور دینی تصلب کی بنا پر کسی بھی صورت، کسی بھی حال میں، کسی سے بھی اسلامی مذہبی وذاتی آزادی کے سلسلہ میں سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں اس لئے کہ الاسلام یَعْلُو وَلَا یُعْلیٰ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت پر تاریخی شواہد موجود ہیں۔

سرزمین ہند جو ایک طویل عرصہ سے دین اور علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت اور تدوین وترویج کی ایک شاندار روایت اور تاریخ کی حامل تھی جب انگریز نے اپنی سیاسی بازی گری سے یہاں اپنا اقتدار پھیلانا شروع کیا، اور ہندستانیوں کو ذہنی طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہی راسخ العقیدہ علماء کرام اور حضرات اساطین علم وفضل نے صحیح اسلامی اصولوں کی روشنی میں اس کی مخالفت کا آوازہ بلند کیا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نے انگریزوں سے مقابلہ اور استخلاص وطن کے عظیم الشان مقصد کے پیش نظر جس طرح متعدد جماعتیں، ثمرۃ التربیت، جمعیۃ الانصار، نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے قائم فرمائی تھیں، اسی طرح کی ایک بھرپور اسکیم جس کا نام بعد میں ''تحریک ریشمی رومال'' مشہور ہوگیا، تیار کی تھی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بیرونی ممالک ترکی، ایران، افغانستان سے فوجی اور اقتصادی اعانت وامداد حاصل کرکے برطانیہ کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔

**تحریک کی منصوبہ بندی:** حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی تحریک ریشمی رومال کی منصوبہ بندی اور اس کے بعض مخفی گوشوں پر اپنی معلومات اور مشاہدات کے حوالہ سے روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

شوال ۱۳۳۵ھ (جولائی ۱۹۲۰ء) سے قبل جب ان دونوں حضرات (شیخ الہند ومولانا خلیل احمد) کا اس تحریک کے سلسلہ میں سفر حجاز وحرمین شریفین طے ہو رہا تھا تب حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے متواتر ایک ہفتہ جامعہ مظاہر علوم میں قیام فرما کر یہاں کے تین اراکین شوریٰ سرپرستان یعنی مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی اور مولانا الحاج احمد رامپوری کی معیت ومشاورت میں اس تحریک کی مکمل منصوبہ بندی فرمائی اور اس ایک ہفتہ کے قیام میں اپنے عملی پروگرام کے تمام پہلوؤں پر بھرپور غور وفکر فرمایا''۔ حضرت شیخ اس اجتماعی مشورہ اور منصوبہ بندی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ چاروں حضرات صبح چائے کے بعد جامعہ مظاہر علوم کے کتب خانہ میں تشریف لے جاکر بطور تخلیہ اندر سے کواڑ بند کرلیا کرتے تھے ان چار حضرات کے علاوہ کوئی اور شخص اندر نہیں جاسکتا تھا ساڑھے گیارہ بجے حاجی مقبول احمد کھانے کے لیے تقاضا شروع کرتے اور آواز دے کر بار بار کہتے کہ حضرت کھانا آگیا ہے ٹھنڈا ہو رہا ہے اوپر سے شروع شروع میں تو جواب ہی نہیں ملتا تھا دو چار مرتبہ کے بعد مولانا احمد رامپوریؒ جواب دیتے تھے کہ ابھی آتے ہیں، ابھی آتے ہیں، چنانچہ اذانِ ظہر کے قریب یہ حضرات اپنا مشورہ چھوڑ کر نیچے تشریف لاتے اور جلدی جلدی کھانا کھا کر نماز ظہر سے فارغ ہوکر دوبارہ کتب خانہ پہنچ کر باہمی مشورہ میں مصروف ہوجاتے اذان عصر پر یہ مشورہ ختم ہوتا، جو لوگ اجمالاً حضرت شیخ الہند کی تحریک سے واقف تھے ان کو تو معلوم تھا کہ کیا امور زیر غور ہیں اور کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے، باقی دیگر لوگوں کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہ انتہائی خفیہ مشورہ کن معاملات پر ہو رہا ہے، چنانچہ اس طویل مشورہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے لیے یہ طے ہوا کہ وہ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز پر روانہ ہونے کے بعد اس تحریک کی بھرپور سرپرستی ونگرانی فرمائیں گے اور اسی مشورہ میں

یہ بھی طے ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب حضرت شیخ الہند کی معیت میں حجاز تشریف لے جائیں گے، مگر اس طور پر کہ دونوں حضرات علیحدہ علیحدہ سفر کریں گے تاکہ اگر ایک حکومت انگریز کی گرفت میں آجائے تو دوسرا بحفاظت حجاز پہنچ کر عملی اقدامات میں لگ جائے''۔

**انگریزوں کی حمایت میں دہلی سے ایک استفتاء:**

ان طے شدہ تجاویز اور منصوبوں کے مطابق ابھی سفر حجاز شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ حکومت کی ایما و خواہش پر دہلی سے ایک استفتاء حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے پاس جامعہ مظاہر علوم بھیجا گیا یہ وقت وہ تھا کہ ترکی اور برطانیہ میں زبردست جنگ ہو رہی تھی، برطانیہ کو یہ خطرہ تھا کہ ہندستانی مسلمانوں میں کوئی غصہ اور ہیجان نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اس استفتاء میں ترکی کے مسلمانوں سے اس جنگ کے جواز پر فتویٰ چاہا گیا تھا دراصل انگریز یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانان ہند کے اُس رشتۂ اخوت و محبت کو جو اُن کو مسلمانان ترکی کے ساتھ ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب جیسی عوامی شہرت رکھنے والی مشہور و معروف علمی و روحانی شخصیت کے فتویٰ سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے لیکن جب یہ فتویٰ حضرت مولانا کے سامنے آیا تو آپ نے اس پر تائیدی دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے خواص و اہل تعلق سے فرمایا کہ اگر حکومت کی یہ دھمکی صحیح ہے اور وہ ہمیں مجبور کرتی ہے کہ شریعت اسلامیہ کے خلاف فتویٰ دیں تو پھر ہندستان میں نہ رہنا جائز ہے اور نہ یہ ملک دارالامان ہے اس لیے یہاں سے ہجرت کرنا فرض ہوگا۔ اپنے اس فیصلہ کی وضاحت اور انکار دستخط کے بعد آپ وسط شوال ۱۳۳۲ھ (آخر اگست ۱۹۱۵ء) میں سہارنپور سے روانہ ہو کر حرمین شریفین پہنچ گئے۔

**ہند سے حجاز تک نگرانی اور خفیہ پولیس:**

مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی لکھتے ہیں کہ: ''آپ کے لیے (حرمین شریفین میں قیام کا) یہ وقت اتنا نازک تھا کہ آپ کے ساتھ خفیہ پولیس کی نگرانی تھی جو ہر حرکت و سکون کو نوٹ کرتی رہتی تھی، اور ادھر گورنمنٹ ترکی کو ان حضرات کی طرف سے برطانوی رعایا ہونے کی بنا پر بدگمانی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے دوران تفتیش حکومت ترکیہ کے ایک اعلیٰ افسر سے یہاں تک فرمادیا کہ عجیب بات ہے برطانوی حکومت ہم کو بحیثیت مسلمان ترکی کا خیر خواہ سمجھ کر بدگمان ہے اور ترکی حکومت ہمارے ہندستانی ہونے کی وجہ سے ہم پر مطمئن نہیں ہے اس لیے اب مسلمان اپنی مذہبی زندگی عافیت کے ساتھ گزارنے کے لیے کس ملک میں جائے۔ حکومت ترکیہ کا یہ اعلی افسر آپ کے ان احتجاجی جملوں کو سن کر خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا''

**حضرت شیخ الهند اور مولانا خلیل احمد کی انور پاشا سے ملاقات:**

بہرحال طے شدہ منصوبہ کے مطابق حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی روانگی کے بعد ۳۰ر شوال ۱۳۳۳ھ (۱۱ر ستمبر ۱۹۱۵ء) میں حضرت شیخ الہندؒ بھی حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں ان حضرات نے حکومت ترکیہ کے نامزد گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے مسلمانان ہند کے نام ایک تحریر حاصل کی جس میں ان کو کہا گیا تھا کہ وہ ہندستان کی آزادی کامل سے کم پر کسی بھی طرح راضی نہ ہوں اور ہم موقعہ بموقعہ ان کی بھرپور حمایت کریں گے۔ مسلمانان ہند کے نام ملنے والی یہ تحریر بعد میں غالب نامہ سے مشہور ہوئی۔ غالب پاشا سے اس ملاقات کے بعد ان حضرات کی رازداری اور تخلیہ کے ساتھ دوسری ملاقات مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ہوئی، یہ دونوں حکومت ترکیہ کے بڑے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب سے یہ ملاقات حسب تحریر حضرت شیخ الاسلام مدنی بعد مغرب تنہائی میں بند کمرہ میں ہوئی تھی، اس تخلیہ میں غالب پاشا کا خط ان کو دکھلایا گیا اور ہندستان کی کامل اور مکمل آزادی کا پورا نقشہ اور خاکہ ان کو بتلایا گیا، یہ دونوں اصحاب بقول حضرت شیخ الاسلام ''بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور و اطمینان سے سنیں'' اور پھر وعدہ کیا کہ ہم ملک شام پہنچ کر ترکی، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں آپ حضرات کے لیے مفید

**۱۹۴۷ء میں ہندستان سے انگریزی اور سامراجی اقتدار کا خاتمہ ہوا لیکن انگریزوں کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عناد و تعصب کی ہمیشہ سے ایک تاریخ رہی ہے، شاطر انگریزوں نے ہندستان سے جاتے جاتے اپنی اسی اسلام اور مسلمان دشمنی کا ایک گھناؤنا کھیل کھیلا اور ملک کو دو حصوں میں تقسیم کا نظریہ چھوڑ گئے، نتیجہ میں ہندو مسلم فسادات کی ایک نہایت اندوہناک تاریخ سامنے آئی**

مطلب تحریرات تیار کرا کر بھیجیں گے، چنانچہ یہ تحریرات لکڑی کے صندوق میں تختے اندر سے کھود کر اس میں رکھ کر ہندستان روانہ کی گئیں۔ مولانا ہادی حسن رئیس خاں جہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش سندھی یہ صندوق لے کر ہندستان آئے، بمبئی میں جہاز پر انگریز، سی، آئی، ڈی بڑی تعداد میں موجود تھی، لیکن کسی کو اس کا پتہ نہ چل سکا، اور پھر یہ کاغذات بحفاظت حاجی امیر احمد مرزا فوٹو گرافر تک پہنچے انھوں نے اس کی بہت سی فوٹو کاپیاں تیار کرائیں۔

**تحریک کا انجام:**

یہ انتہائی خطرناک کام بڑی رازداری اور کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کہ اس عرصے میں اس تحریک میں شامل ایک ذمہ دار شخص کو گرفتار کیا گیا ان کو یہ راز اپنی تفصیلات کے ساتھ معلوم تھا، اور وہ انھوں نے انگریزوں کے جبر وتشدد سے مجبور ہو کر ظاہر کر دیا۔

**شیخ الہند کی گرفتاری اور مالٹا کی اسیری:**

مشیت الٰہیہ کے فیصلے کے مطابق شریف حسین نے حکومت ترکیہ کے خلاف بغاوت وغداری کرتے ہوئے انگریزوں سے ہاتھ ملالیا جس کے نتیجہ میں حجاز وعرب میں نہ صرف ترکوں پر سخت مظالم ہوئے، بلکہ ۲۴رصفر ۱۳۳۵ھ (۲۰ردسمبر ۱۹۱۶ء) میں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء گرفتار کر لیے گئے، انگریز ان کو پہلے جدہ وہاں سے مصر اور پھر مالٹا لے گئے، تین سال اور سات ماہ وہاں قید وبند کی زندگی گذار کر ۲۰ر رمضان ۱۳۳۸ھ (۸رجون ۱۹۲۰ء) میں آپ بمبئی اور ۲۶ر رمضان/۱۳رجون میں دیوبند تشریف لائے۔ پانچ یوم بعد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب آپ سے ملاقات اور اندرونی حالات سننے سنانے کے لئے دیوبند تشریف لے گئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی (جو اس سفر میں ساتھ تھے) ملاقات کی تفصیل آپ بیتی میں اس طرح لکھتے ہیں! "۲۶ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہائی کے بعد جب دیوبند پہنچے تو ۲رشوال المکرّم (۱۴رجون ۱۹۲۰ء) میں حضرت مولانا خلیل احمد کی معیت میں حضرت شیخ الہند سے ملاقات کے لیے دیوبند جانا ہوا وہاں پہنچ کر ان دونوں اکابر کی ملاقات ومعانقہ کا منظر نیز حضرت شیخ الہند کا نہایت مسرت کے ساتھ یہ فرمانا کہ مولوی حسین احمد مولانا کے لیے سبز چائے بناؤ اور اس پر شیخ الاسلام مولانا مدنی کا نہایت مسرت کے لہجہ میں یہ جواب دینا کہ حضرت ابھی لاتا ہوں خوب یاد ہے۔

بہرحال یہ تحریک اپنی کامیابی کی منزلوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مشیت ایزدی کے مطابق کامیاب تو نہ ہوسکی لیکن الحمدللہ اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے اور انگریزوں کو اس بات کا شدید احساس ہوگیا کہ مسلم علماء ہمارے راہ کی سب سے بڑی دیوار ہیں لہٰذا اب انگریزی سامراج کی تمام تر توجہ اس جانب مبذول ہوگئی کہ کسی طرح سے ہندستان سے دین اور علم دین کے ان مراکز کو ختم کیا جائے اور پھر اس کے لئے منصوبہ بند طریقے سے علماء کا قتل عام، مساجد ومدارس کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کی کوششیں، یہاںتک کہ ہندستان کے بعض علاقے علم دین اور مسلمانوں سے اس طرح خالی کردیئے گئے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد وہاں اسلام اور دین کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں بچا، تاریخی شواہد کی بناء پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انگریزی سامراجی فکر سے سب سے زیادہ متأثر ہونے والا علاقہ ہریانہ اور پنجاب کا ہی رہا ہے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ہندستان سے انگریزی اور سامراجی اقتدار کا خاتمہ ہوا لیکن انگریزوں کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے عناد وتعصب کی ہمیشہ سے ایک تاریخ رہی ہے، شاطر انگریزوں نے ہندستان سے جاتے جاتے اپنی اسی اسلام اور مسلمان دشمنی کا ایک گھناؤنا کھیل کھیلا اور ملک کو دو حصوں میں تقسیم کا نظریہ چھوڑ گئے، نتیجہ میں ہندو مسلم فسادات کی ایک نہایت اندوہناک تاریخ سامنے آئی، ان ناگفتہ بہ حالات میں ہندستان کا جو علاقہ سب سے زیادہ متأثر ہوا وہ ہریانہ اور پنجاب کا علاقہ ہے، بہت ساری مساجد ویران ہوگئیں، انہیں مندروں میں تبدیل کردیا گیا، مدارس وخانقاہ کا وجود تک نہیں رہا، مختصر یہ کہ یہ علاقہ ہر طرح کے اسلامی تشخص اور اسلامی نشانیوں سے خالی ہوگیا، جو بچے کھچے مسلمان تھے ان کے عقائد اور دینی نظریات بھی بدلنے لگے اور غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط نے ان کی مذہبی شناخت تک چھین لی، ایسے حالات میں اللہ رب العزت کی بخشی ہوئی توفیق اور مدد کے سہارے چند غیور علماء دین نے ان علاقوں کے مسلمانوں کی دینی تربیت اور اسلامی عقائد سے روشناسی کے لئے بیڑہ اُٹھایا اور رفتہ رفتہ پورے علاقہ میں علم دین کی روشنی آنے لگی، صوبہ ہریانہ کے مسلمانوں کی دینی پستی اور مذہبی انحطاط کو دیکھتے ہوئے، زوال پذیر ملت اور قوم کو از سرنو اسلامی اور روحانی غذا فراہم کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوا۔ وقت کے اکابر اور مشائخ سے

مشورہ کیا اور ۱۸؍صفر المظفر ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۸؍جولائی ۱۹۹۴ء کو اسی علاقہ میں شیخ طریقت حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دامت برکاتہم صاحبزادۂ محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور دیگر اعیانِ علم وفضل کے دست مبارک سے دارالعلوم امدادیہ کی بنیاد رکھدی، یہ کام چونکہ محض دینی حمیت اور ملی مفاد کے پیش نظر اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ شروع کیا گیا تھا اس لیے توفیق الٰہی دستگیر ومعین رہی، راستے ہموار ہوتے گئے اور پندرہ سال کی قلیل مدت میں یہ ادارہ صوبہ ہریانہ کا نامی گرامی ادارہ بن گیا اور اس کی تعلیمی وتعمیری ترقیات میں اضافہ ہوتا گیا۔ دینی تعلیم اور اسلامی اندازِ تربیت کے ساتھ ملی اور فلاحی کاموں کی ضرورت بھی اس غربت زدہ علاقہ میں شدت سے محسوس کی جارہی تھی چنانچہ دارالعلوم امدادیہ نے اس سمت بھی اقدام کیا اور دیہی اور پس ماندہ علاقوں میں وہاں کی مسلم شخصی وملی ضروریات کے تکفل کا حتی المقدور بیڑہ اُٹھایا۔ مسلم نادار یتیم بچوں کی کفالت، بیواؤں کی خبرگیری، غریب بچیوں کی شادی وغیرہ میں اس ادارہ نے خوب خدمات انجام دی ہیں اور الحمد للہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

سرزمین ہریانہ وپنجاب آزادی سے پہلے مسلم آبادی اور اسلامی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے ہندستان کا ایک ممتاز ترین علاقہ اور خطہ رہا ہے، یہاں کی علمی، تہذیبی اور ثقافتی خدمات کے انمٹ نقوش آج بھی لوح تاریخ پر محفوظ ہیں لیکن ملک کی آزادی کے بعد یہاں کی عوام دینی اور اسلامی عقائد کی پختگی کے اعتبار سے نہایت کمزور اور معاشی اعتبار سے انتہائی مفلوک الحال، اللہ رب العزت جس نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے اس نے اس علاقے میں اپنے دین کی حفاظت وصیانت کا انتظام فرمایا اور وقت کے جلیل القدر علماء اور رجال کار کو اس جانب متوجہ فرمایا ان حضرات نے اللہ کی بخشی ہوئی توفیق اور مدد کے سہارے اس علاقے میں دینی استحکام اور اخلاق وکردار کی پختگی کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں، اور شروع ہی سے جمعیۃ علماء ہند کی خصوصی توجہ کا یہ علاقہ مرکز رہا، گذشتہ اپریل ۲۰۱۰ء میں ہریانہ، پنجاب، ہماچل، چنڈی گڑھ کے علماء کرام اور عوام نے مل کر مجھ ہیچمداں فرد کا جمعیۃ علماء ہریانہ، پنجاب، ہماچل، چنڈی گڑھ کی صدارت کے لئے انتخاب فرمایا۔ صدر جمعیۃ علماء ہریانہ، پنجاب، ہماچل، چنڈی گڑھ کی زیر صدارت رفاہِ عام اور عوام کی معاشی بدحالی دور کرنے کے جتنے کام ہوئے یہ موقع ان کو شمار کرانے کا نہیں ہے بس میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالی ان خدمات کو قبول فرمائے اور ہماری ہر طرح سے مدد اور نصرت فرمائے

چنانچہ جمعیۃ علماء صوبہ پنجاب ہریانہ ہماچل اور چنڈی گڑھ کے پلیٹ فارم سے رفاہ عام اور مسلمانوں کے مفلس ونادار افراد کی معاشی خوشحالی کے لئے بھی بہت سارے اقدامات کئے جارہے ہیں، گذشتہ ایک سال کے اندر اندر غریب اور مفلس لڑکیوں کی اسلامی انداز میں شادی اور نکاح کا نظم کیا گیا جس پر تقریباً تین لاکھ پینتیس ہزار روپے کا صرفہ آیا، اسی طرح قریب کے مختلف دیہاتوں میں کھانے پینے کی اشیا کے پیکٹ معتد بہ تعداد میں تقسیم کرائے گئے جن پر تقریباً ایک لاکھ پینتالیس ہزار روپئے کا صرفہ آیا، کچھ علاقوں میں پانی کے نظم کے لئے ٹیوب ویل لگوائے گئے جن پر تقریباً تین لاکھ پندرہ ہزار روپئے کا خرچ آیا، موسم کے لحاظ سے گرم کپڑے اور لحاف بھی غرباء میں بانٹے گئے جن کا تخمینی صرفہ ایک لاکھ تیس ہزار روپئے ہے۔

اسی طرح دارالعلوم امدادیہ جس علاقہ اور خطہ میں واقع ہے وہاں مکاتب دینیہ کے قیام کی اشد ضرورت تھی اسی لئے اس سلسلہ کو ایک تحریک کی شکل میں اپنا کر دیہی علاقوں میں جہاں علم دین کی روشنی یا تو بالکل نہیں ہے یا اگر ہے تو بڑی مدھم ہے، قیام مکاتب کا بابرکت سلسلہ شروع کیا گیا ہے، الحمد للہ اس سمت میں کئی سال سے اقدام کیا جارہا ہے اور اب تک دارالعلوم امدادیہ کی زیر نگرانی 175 مکاتب ہریانہ پنجاب، چنڈی گڑھ اور ہماچل کے مختلف علاقوں میں قائم ہو چکے ہیں، جن میں ۸۷۲۰ طلبہ وطالبات دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم سے آراستہ ہورہے ہیں جملہ مکاتب کے معلّمین کو ماہانہ وظیفہ، مکاتب کی اسٹیشنری کی ضروریات، تپائیوں اور دریوں وغیرہ کا انتظام خود دارالعلوم امدادیہ کرتا ہے اور سال میں دو مرتبہ جملہ مکاتب کے معلمین کے لئے ماہر اساتذہ کی نگرانی میں دارالعلوم امدادیہ میں تربیتی کیمپ قائم کیا جاتا ہے۔

اسی طرح مسلم بچیوں کو دینی تعلیم اور اسلامی ذہن سازی کے لئے سال گذشتہ ایک ادارہ جامعہ فاطمۃ الزہراء کے نام سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں الحمد للہ قائم ہے جس میں اسلامی اصولوں اور شرعی تقاضوں کی روشنی میں عالمیت کے مکمل کورس کا نظم ہے اور اس وقت ۲۶۵ بچیاں زیر تعلیم ہیں۔ □□

# تحریک ریشمی رومال اور اس کا پس منظر

محمد شمشیر الحسنی (خادم جامعہ دعوت الحق معینیہ چر رہو، رام پور منیہاران، سہارنپور)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ عالم اسلام کی وہ مایہ ناز عبقری شخصیت تھی جن کی فکروں نے وطن عزیز کو آزادی جیسی اہم دولت سے ہمکنار کرایا، جن کے خیالات اور افکار سے ہندستان ایک بڑی طاقت بن کر اُبھرا ہے، آپ کی شجاعت و بہادری نے بارہا ظالم انگریز کو بانگ دہل للکارا، آپ کی قوتِ ارادی عزم واستقلال کے سبب بڑی بڑی سپر طاقتیں منہ کے بل زمین پر گھسٹنے کے لیے مجبور ہوئی، کوئی اعلیٰ منصب مال وزر آپ کے عزمِ صمم اور مقصود اصلی سے ہٹا نہ سکا، آپ سرفروشانِ اسلام کی اس جماعت کے سپہ سالار تھے، جن کی آبیاری شیخ المشائخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسی مقدس اور متبرک شخصیتوں کے ذریعہ عمل میں آئی، حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے شجر تناور تھے، جن کے فیوض و برکات سے زمانہ تا قیامت فیض پاتا رہے گا، حضرت شیخ الہند ہندستان کی تاریخ آزادی کے نہ صرف روشن باب ہیں بلکہ ایسا جزو ہیں جن کی حقانیت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، آپ محض ایک شخصیت نہیں، ایک تحریک، نہ صرف سیاست، بلکہ علم دنیا میں بھی آپ کے عظیم کارناموں نے آپ کی شخصیت کی گوناگوں صفات کو اُجاگر کیا۔

آپ کی ولادت باسعادت دیوبند کے مشہور و معروف عثمانی خاندان میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب عثمانی کے یہاں ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی ابن شیخ فتح علی دیوبندی اس وقت بریلی کالج میں پروفیسر تھے اور وہیں پر مقیم تھے، عثمانی خاندان دیوبند کا معروف ذی وجاہت تعلیم تعلم مزاج، اہل اللہ کا قدر شناس رہا ہے، والد ماجد نے آپ کا نام محمود حسن رکھا، ۶ رسال کی عمر میں آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور ابتدائی تعلیم معروف بزرگ میانجی منگلوری سے حاصل کی، اور ابتدائی اور اُردو، فارسی، عربی کی کتابیں شیخ عبداللطیف صاحب اور اپنے چچا مولانا مہتاب علی سے پڑھی۔ ۱۵ رمحرم الحرام ۱۲۸۳ء کو جب دارالعلوم قائم ہوا، تو حضرت شیخ الہند اس کے پہلے طالب علم ہوئے۔ اولین مدرس ملاّ محمود دیوبندیؒ مقرر ہوئے، کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتابیں اپنے مخصوص استاذ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے پڑھیں، جنھوں نے اپنی تمام تر توجہات اور نگاہ اپنے اس چہیتے شاگرد، ہونے والے جنگِ آزادی کے عظیم قائد پر مرکوز رکھی، سفر وحضر میں بھی تربیت حاصل رہی، آپ کی تربیت اور خصوصی توجہ نے مولانا محمود الحسن کے دل میں مذہب اسلام سے محبت اور آزادیٔ وطن کے جذبات کو مزید برآں اضافہ کردیا، دارالعلوم کے قیام کے سات سال بعد ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم کا پہلا جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا، جس میں چار فضیلت پانے والے طالب علموں کے سروں پر اکابر علماء کے ہاتھوں دستارِ فضیلت باندھی گئی، ان فضلاء میں مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا عبدالحق صاحب پر قاضویؒ اور حضرت شیخ الہند دیوبندیؒ تھے، حضرت شیخ الہند اپنی تعلیم کے آخری دو سالوں میں اوقاتِ خارجی میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ ۸۹-۱۲۸۸ھ میں آپ جب دیوبند میں ہوتے تو طلبہ کی کئی جماعتوں کو بڑی کتابیں پڑھاتے، چونکہ علمی استعداد اللہ رب العزت نے بڑی پختہ عطا فرمائی تھی، شیخ الہند جلسۂ دستارِ فضیلت کے بعد کچھ عرصہ اپنے مادرِ علمی اساتذۂ کرام کے فیوض و برکات سے بہرور ہونے کے لیے گزارا۔ شیخ الہندؒ کو اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ سے عقیدت وارادت درجۂ عشق تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان کی رفاقت کو اپنے لیے سعادت اور ان کی معیت کو اپنی خوش قسمتی تصور فرماتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے ۱۲۹۴ھ میں سفرحج کا ارادہ فرمایا، تو حضرت شیخ الہند نے بھی یہ خبر سنتے ہی فوراً سفر کا ارادہ فرمالیا، اکابرین و مشائخ عظام کے ساتھ جن میں حضرت نانوتویؒ کے علاوہ حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ سمیت ایک سو سے زائد مشاہیر ہند جلیل القدر علما اساتذۂ مدارس کا یہ قافلہ زیارتِ نبوی کے شوق میں سفرحج کے لیے روانہ ہوا، اور وہاں اپنے شیخ حضرت نانوتویؒ کے ایماء پر علوم معرفت، علم باطنی کے حصول کے لیے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے دست کریم پر بیعت کا شرف حاصل

کیا۔ حضرت شیخ الہند کو اپنے استاذِ کامل حضرت نانوتویؒ سے انتہائی عشق اور خلوص ومحبت تھا، آپ ہی کے حکم سے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر ذکر الٰہی کے ذریعہ قرب خدا کے لیے جدوجہد فرمائی، حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شیخ الہند کے کمالِ علم اورفن کے قائل تھے، ایک مرتبہ حاضرین کی مجلس میں امام ربانی نے فرمایا کہ محمود حسن تو علم کا کھٹلا ہے، جس کو اسٹروک کہا جاتا ہے، شیخ الہند کی تواضع خاکساری اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ شیخ کے سامنے سر اٹھا کر نہیں بیٹھتے اور نہ مجلس میں کسی نمایاں جگہ پر بیٹھتے، جب سلوک ومعرفت میں درجۂ کمال حاصل ہوگیا، تو امام ربانی حضرت گنگوہیؒ نے اپنے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کو تحریر فرمایا کہ مولوی محمود الحسن اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ حضرت کی طرف سے ان کو اجازت و خلافت عنایت فرمادی جائے جب تک حضرت حاجی صاحب حیات تھے آپ بالعموم خود اجازت وخلافت دینے کی بجائے آپ سے سفارش فرماتے تھے، اور حضرت حاجی صاحبؒ اجازت وخلافت کی تحریر بھیج دیتے تھے، پھر اس کے بعد اپنی طرف سے اجازت وخلافت دیتے، حضرت شیخ الہند کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔ سفرحج کے دوران شیخ الہند نے حضرت حاجی صاحبؒ سے مکہ مکرمہ میں مل کر اوران کی خدمت میں کچھ دنوں رہ کر تعلیم بھی حاصل کی، ۱۳۰۵ھ میں دارالعلوم کے اوّلین استاذ ملاّ محمود دیوبندی کے انتقال کے بعد اراکین دارالعلوم نے اتفاق رائے سے صدر مدرس مقرر فرمایا۔

شیخ الہند اپنے محبوب ترین استاذ حضرت نانوتویؒ سے بہت قریب رہے ہیں، ان کی عملی زندگی اور فکری رجحانات سے واقف اور اس سے متاثر تھے، ابتدا ہی میں اپنے استاذ کے فکری سانچہ میں ڈھل جانے کا ان میں جذبہ تھا، وہ اس کے بارے میں تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں مدرس چہارم ہوتے ہی سوچنے لگے تھے، اور اس کے لیے کوئی عملی شکل اختیار کرنے اور خاکہ بنانے پر غور کرنے لگے تھے۔ ۱۲۹۲ھ میں جب تدریسی زندگی سے وابستہ ہوئے، دوسرا سال تھا، اور حضرت استاذ کا سایہ آپ کے سر پر تھا، اور وہ دارالعلوم کی سرپرستی فرمارہے تھے، انھیں دنوں میں حضرت شیخ الہند نے اپنی مخصوص نقطۂ نگاہ کے مطابق عملی اقدام کا آغاز کیا، دارالعلوم کے استحکام اور ترقی کے ہر ممکن وسائل اختیار کرنے اور فضلاء دارالعلوم کو متحد کرنے اور ان کا ذہنی وفکری رشتہ ایک کرنے کی غرض سے ۱۲۹۲ھ میں ثمرۃ التربیت نامی ایک تنظیم حضرت نانوتویؒ کی رہنمائی میں قائم کی۔ جس کے ارکان دارالعلوم سے فارغ التحصیل طلبہ سے رابطہ کر کے ان کو بنایا گیا، اس طرح فضلاء دارالعلوم میں ایک ذہنی اور فکری رشتہ پیدا ہوگیا، حضرت شیخ الہند نے جب اس تنظیم کا خاکہ حضرت نانوتویؒ کو پیش کیا تو آپ نے مسرت کا اظہار فرمایا، اور آپ نے ہی ثمرۃ التربیت نام تجویز فرمایا۔

۱۹۰۵ء میں حضرت گنگوہیؒ کے حادثۂ وفات کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند کا سربراہ اعلیٰ بنا دیا گیا، آپ نے اپنے علم وفضل، احساس فرض شناسی اور محنت جانفشانی سے اس ادارہ کو ایک مرکزی دانش گاہ بنایا، آپ علم حدیث کے مسلم الثبوت عالم تھے۔ شہرت کے ساتھ آپ کی ملّی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں، کیونکہ آپ کے قلب میں خون کے مانند آزادئ ہند کی تڑپ سرایت کر چکی تھی، آپ کے درس سے ہزاروں طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلے۔ ان میں امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند جیسے مؤقر علماء وصلحاء شامل ہیں۔ اللہ رب العزت نے حضرت شیخ الہند کو وسعت نظری، وسعت قلبی اور ذکاوت کا خاص قیمتی سرمایہ عطاء فرمایا تھا، عموماً پوری دنیا کے اہم مسائل اور معاملات پر گہرائی سے نظر رکھتے تھے، درس وتدریس کی مصروفیت اور ملّی جدوجہد کے باوجود آپ نے تصنیفی میدان میں بھی آپ کی تقریباً آٹھ جامع تصانیف منظر عام پر آئیں۔

شیخ الہند نے دورِ اہتمام ۱۳۳۶ھ میں انجمن جمعیۃ الانصار قائم فرمائی، اس جمعیۃ کا مقصد ملک کے اندر ایسی فضا بنانا، جس سے فضلاء دارالعلوم پر عوام کا اعتماد مستحکم ہوجائے اور اپنے علاقوں میں ان کی آواز مؤثر بن جائے، تاکہ مستقبل میں دین کی سربلندی اور اسلام کی عظمت کو بحال کرنے میں مدد ملے۔ اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجائے، چنانچہ اس نقطۂ نگاہ سے تنظیم کو بہت ہی متحرک رکھا گیا، اس تنظیم کا سکریٹری ونگراں شیخ الہند نے اپنے معتمد مولانا عبیداللہ سندھی کو مقرر فرمایا۔ انجمن کی تیز سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ طبقہ میں کھلبلی مچ گئی اور شک وشبہ کی فضا بن گئی۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو شیخ الہند نے دلی جانے کا حکم فرمایا۔ حضرت کے حکم سے مولانا سندھیؒ نے دلی میں ایک ادارہ نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم فرمایا، اس ادارہ کا مقصد کالج میں

پڑھنے والے ان مسلم طلباء کو جو عیسائی اسکول میں زیر تعلیم تھے، ان کے شکوک وشبہات کو دُور کرنے کے لیے اور ذہنِ فاسد کو ختم کرنے کے لیے قائم فرمایا، اس پوری تحریک سے خود مولانا سندھیؒ بھی واقف نہیں تھے۔ خود مولانا سندھیؒ کا بیان ہے، ایک دن شیخ الہند نظارۃ المعارف میں تشریف لائے اور فرمایا جب کہ انگریزی حکومت کا اقتدار ہندستان میں قائم ہے، تو جس مدت تک تم اس تعلیم سے اور اس مدرسہ سے ۱۰-۲۰؍ افراد صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے۔ اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنادیں گے۔ (نقشِ حیات ج ۲؍ صفحہ ۱۴۰)

شیخ الہند کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا تمھارا کام دین کی مکمل حفاظت کا اس ہندستان میں ذریعہ نہیں بن سکتا، کیونکہ حکومت کی تمام تر توانائی اس میں صرف ہورہی ہے، کہ کس طرح مسلمانوں کو ختم کیا جائے۔ ہمیں انگریز کی اس ظالم وجابر حکومت کو ختم کردینا چاہیے، کیونکہ جب تک یہ حکومت قائم ہے، اسلام کا تحفظ دشوار سے دشوار ہوتا جائے گا۔ لیکن یہ سارا منصوبہ بغیر کسی حکومت کے اشتراک کے تکمیل ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ آپ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں انصاریؒ اور مولانا سیف الرحمٰن وغیرہ کو کابل (افغانستان) کے لیے روانہ فرمایا، یہ حضرات حلیہ اور بھیس بدل کر غیر معمولی دشواریاں برداشت کرکے اپنے اپنے مرکزوں پر پہنچ کر سرگرم عمل ہوگئے، اسی سلسلہ میں حضرت شیخ الہند نے بھی بنفس نفیس یاغستان اور ترکی جانے کا ارادہ فرمایا لیکن اچانک حکومت برطانیہ کو شیخ الہند کے منصوبوں کا علم ہوگیا، اور حکومت آپ کی گرفتاری کے فراق میں پڑگئی، آپ متفکر ہوئے اور احباب سے مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ یہاں سے حجازِ مقدس کا سفر کیا جائے۔ چنانچہ بڑی راز داری سے یہ پروگرام مرتبہ ہوا، حکومت کی طرف سے حجاز روانگی سے قبل ہی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوچکا تھا، لیکن حضرت کی زیارت کو امڑے ازدھام کے سبب انگریز پولیس شیخ الہند کو گرفتار کرنے کی ہمت نہ کرسکی۔ چنانچہ آپ ممبئی سے بذریعہ بحری جہاز حجاز کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی، اور اپنی تحریک کے طرز طریق ان کے سامنے پیش فرمائے۔ شیخ الہند کے ایماء پر گورنر حجاز نے غالب نامہ بھی تحریر فرمایا۔ چنانچہ مکرمہ میں شریف حسین کی بغاوت کے سبب حضرت شیخ الہند کو انگریز حکومت نے گرفتار کرلیا، اس طرح حضرت شیخ الہند نے اس ظالم وجابر حکومت سے ٹکرلی، جو یوں کہتے تھے کہ ہماری حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا، ایک بوریا نشین عالم دین جس نے ۴۵ سال تک تعلیم اور تدریس میں زندگی بسر کی، جلسہ وجلوس اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے کوئی سروکار نہ رکھا، جسمانی اعتبار سے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ جو نہ خطیب، نہ شعبہ بردان قلم کار، ایسے شخص کے بارے میں جب دنیا نے سنا کہ اس نے ایسی ظالم وجابر قوم کی حکومت کا تختہ پلٹنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، تو دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور فلاسفر اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر رہے۔ تحریکِ آزادی کے لیے جہاں بہت سے اسباب اور ذرائع اختیار کئے گئے وہیں پیغام رسانی کے لیے ریشمی رومال تحریک بہت اچھا اور نہایت کامیاب ترین ذریعہ تھا۔

بہرحال ریشمی رومال تحریک شباب پر تھی، بیرون اور اندرون ملک یہ تیز تر کام میں مصروف تھی، اسی دوران حکومت ہند کے ہاتھ کچھ ریشمی خطوط لگ گئے، اور اس تحریک راز فاش ہوگیا، اگر یہ خطوط انگریزوں کے ہاتھ نہ آتے تو ہندستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، ریشمی رومال پر یہ لکھے ہوئے تین خطوط مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بھیجے ہوئے تھے، ان خطوط کا مقصد اساتذۂ کرام کو اپنی کارگزاری اور ملک میں درپیش مسائل اور نکات کا تذکرہ تھا، اور کچھ اہم امور پر مشورہ بھی طلب تھا۔

پہلا خط شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے نام تھا، ۶؍ انچ لمبے اور ۵؍ انچ چوڑے ٹکڑے پر لکھا گیا تھا۔

دوسرا خط حضرت شیخ الہند کے نام تھا، جو ۱۰؍ انچ چوڑے ٹکڑے پر لکھا گیا تھا۔

تیسرا خط ۱۵؍ انچ لمبے اور ۱۰؍ انچ چوڑے ٹکڑے پر لکھا گیا تھا۔

اس تحریک کا راز فاش ہونے کے بعد ملک میں وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کا منصوبہ ان کا جنگی منصوبہ تھا، جو انھوں نے ہندستان سے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کے لیے بنایا تھا، یہ ایک منظّم پلان تھا، جس کی شاخیں ملک کے باہر بھی پھیلی ہوئی تھیں، منصوبہ یہ تھا کہ جرمنی، ترکی اور افغانستان سے مدد لے کر ہندستان کی شمال ومغربی سرحد پر آزاد قبائل کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اس کے ساتھ ہندستان میں بھی عام بغاوت کا بگل بجادیا جائے۔ جس بناء پر اندرونی اور بیرونی بغاوت پر قابو پانا انگریز کے لیے مشکل ہوجائے گا۔ نتیجتاً اسے ہندستان چھوڑنا پڑے گا۔

□□

# ریشمی رومال تحریکِ حرّیت

تحریر: مولانا محمد افضال الحق جوھر قاسمیؒ

یہ تحریک حضرت مولانا کا عجیب وغریب کارنامہ ہے کہ ایک گوشہ نشین درویش اور ایک عالم دین بزرگ نے آج سے ۶۵ برس پہلے برطانوی سامراج کا جنازہ نکالنے کے لیے سلطنت عثمانی، افغانستان، روس اور ہندستان کے تمام اہم مراکز کو تیار کر کے جنگِ آزادی کا بگل بجادیا تھا۔

**ذھنی انقلاب:**

ہندستان میں علما اور مشائخ اور مدرسہ وخانقاہ کی کمی کبھی نہیں تھی۔ مگر علما اور بزرگوں کے ہاتھوں میں تلواریں دے کر میدانِ جنگ میں لے آنا حضرت شاہ ولی اللہؒ کا عظیم الشان انقلابی کارنامہ تھا چنانچہ ان کے خانوادے سے مولانا احمد شہید کی قیادت میں ۱۸۳۱ء میں علما اور مشائخ نے اُٹھ کر دہلی سے پشاور تک ہلچل ڈال دی تھی۔ اس کے بعد جب انگریزوں کے قدم جمنے لگے تو پھر علماء اٹھے اور حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کی قیادت میں ۵۷ء کا جہاد کیا اور شاملی کے میدان میں مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب رحمہم اللہ نے دو بدو جنگ فرمائی اور ان کے چھکّے چھڑا دیئے مگر کسی مرکزیت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ انقلاب کامیاب نہیں ہوسکا تھا اس لیے سب لوگ منتشر ہوگئے۔

**حوصلہ بخشی:**

ان دونوں تحریکات کی ناکامی کے باوجود ہندستان کے علما ومشائخ کا یہ گروہ خاموش نہیں ہوا۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ کی ذہنی تربیت نے جو جرأت و دوررسی پیدا کردی تھی وہ کسی صاحبِ علم کو اپنے مقصد پر قربان تو کرسکتی ہے، کسی ناکامی سے مایوس نہیں کرسکتی۔ اس لیے جو حضرات باقی رہ گئے تھے۔ انھوں نے جنگ کا رُخ بدل دیا چنانچہ اس انقلاب میں ناکامی کی تلافی کے لیے دس برس ہی میں مولانا قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا گروہ پھر میدانِ عمل میں کود پڑا۔ اور ۱۸۶۷ء میں مدرسہ دیوبند کی جو بنیاد ڈالی گئی تھی اُسے بہت جلد انقلابی کارکنوں کی چھاؤنی بنادی گئی۔ اور اس میں ایسے مجاہدین تیار کئے جانے لگے جن پر علم دین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں اور اندر اندر جہاد کا خون جوش مار رہا تھا۔

**سمت سفر:**

مجاہدینِ آزادی کی یہ علمی چھاؤنی اس وقت اپنے شباب پر آگئی، جب مولانا محمود حسن دارالعلوم کے مدرس بن گئے اور انھوں نے اپنے استاد محترم مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی اس سمت سفر کو طے کرنا شروع کردیا۔ جو مکمل آزادی ملک کی منزل کے لیے انھوں نے مقرر کردی تھی اور ۱۸۵۷ء میں چند قدم کا فاصلہ بھی طے کر گئے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

**آغاز کار:**

مولانا محمود حسنؒ کو ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم میں درس کے لیے منتخب کرلیا گیا تو انھوں نے سب سے پہلے ثمرۃ التربیت کی اس انجمن کو زندہ و متحرک کردیا جس کو طلباء کی ذہنی تربیت کے لیے وہ پہلے سے قائم کر چکے تھے ان کی یہ تحریک آگے بڑھی اور اتنی بڑھی کہ ۱۳۳۵ھ میں ریشمی رومال تحریک بن کر اپنے انجام کو پہنچی۔

**اسباب بغاوت:**

سوال یہ کہ تحریک کے اسباب کیا تھے اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ اس کے چار اسباب تھے۔

اول: یہ کہ مولانا محمود حسنؒ نے ان بزرگوں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی تھی جو انقلاب ۵۷ء کے کمانڈر تھے اور ان کی ناکامی کی کسک محسوس کر رہے اور تھک کر بیٹھ جانے کی بجائے سرگرم عمل بن گئے تھے اس لئے تھے اس لئے کہ حضرت مولانا کی رگ وپے میں انقلابی خون دوڑ رہا تھا انھیں بے چین سرگرم اور متحرک رکھتا تھا۔

**نظریاتی جنگ:**

دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں اور علما دیوبند کی جنگ ملکی اور غیر ملکی کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ نظریاتی جنگ تھی، انگریز مغل حکومت ختم کرنے کے بعد مسلمانوں کی ملی خصوصیات اور ان کی اسلامی انفرادیت کو ختم کرنے کے لئے مختلف قسم کی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اور اس کے لیے ان کے پادری ان کے مشن اور ان کے خزانے کھلے ہوئے تھے جس سے عوام وخواص

سراسیمگی پیدا ہو رہی تھی اور اسلامی اصول سرعام مجروح ہو رہے تھے۔

**بربریت:**

تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج کے بے پناہ مظالم اور مسلم دشمنی میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد زبردست اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے ہندستان کی تمام آبادیاں خونِ ناحق سے شرابور ہو گئیں۔ ہزاروں درختوں کو پھانسی کا پھندا بنا دیا گیا اور لاکھوں آدمیوں کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا اور یہ سب کچھ اس طرح لیا گیا کہ عدالت اور قانون بھی انھیں انصاف نہیں دلا سکتا تھا یہ ایک بے پناہ خونی سیلاب تھا جس میں اہل علم و اہل دین اور ان کی آبادیاں جل تھل ہو رہی تھیں اور انگریزوں اور ان کے کاسہ لیسی دور و نزدیک سے ان کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور تالیاں بجا کر جشن فتح منا رہے تھے مگر غیرت مند طبیعتیں خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔

**سیاسی بدحالی:**

چوتھی وجہ یہ تھی کہ بنگال تقسیم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہاں کی مسلم اکثریت سخت پریشان تھی اور سارا ملک انگریزوں کی اس حماقت سے چراغ پا تھا اور اسے ان کی غلط ڈپلومیسی قرار دے کر نفرت کر رہا تھا اس طرح کے بہت سے نظریاتی، واقعاتی اور سیاسی سنگین حالات تھے جو انسانی غیرت و حمیت کو مہمیز کر رہے تھے اور اسی جوان مرد کو تلاش کر رہے تھے جو اس اندھیرے کو اپنی جدوجہد سے روشن کرے اور برطانوی ڈپلومیسی اور ان کا احساس فتح مجاہدین کے زخموں پر مرہم لگانے کی جگہ اپنی غلط اندیشی سے اس زخم پر نمک چھڑکتا چلا جا رہا تھا۔ ملک میں بہت سے اہل علم، اہل سیاست اور ارباب اقتدار تھے اور انھیں حالات کے تقاضے جھنجھوڑتے بھی تھے مگر برطانوی اقتدار سے مقابلہ کرنا اور ان کی بیخ کنی کی ہمّت کرنا اچھے اچھوں کا پتہ پانی کر دیتا تھا اس لیے فضا میں کبھی کبھی ارتعاش ضرور پیدا ہوتا تھا مگر وہ سیلاب عظیم جو ایک مرد درویش نے اُبھار دیا کسی شخص کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔

**پہلا اقدام:**

ان حالات میں مولانا محمود حسنؒ نے اپنی سرگرمیاں اس وقت تیز کر دیں جب وہ دارالعلوم کے صدر مدرس بن گئے۔

سب سے پہلا اقدام انھوں نے یہ فرمایا کہ ثمرۃ التربیت نامی تنظیم کو زندہ کر کے اُسے آگے بڑھایا اور طلبہ کی ذہنی تربیت دے کر جہاد کے لیے انھیں تیار کرنے کی طرح ڈال دی مگر یہ انجمن بچند وجوہ زیادہ نہیں چل سکی۔ پھر بھی اس کا جلایا ہوا چراغ جلتا رہا بجھ نہ سکا۔

**دوسرا اقدام:**

دوسرا اقدام یہ فرمایا کہ ۱۳۲۸ھ میں جب دارالعلوم کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں فارغ طلبہ کی دستار بندی کی گئی تھی اس اجلاس میں آپ نے جمعیۃ الانصار نامی تنظیم قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور اُسے حضرت مولانا کی دُور اندیشی نے اس قدر اہمیت دی کہ سندھ سے مولانا عبید اللہ سندھی کو بلا کر انھیں اس کا ناظم مقرر کر دیا۔ مولانا سندھی نے اس کا سبب سے پہلا اجلاس مراد آباد میں کیا۔ جس میں دس ہزار سے زیادہ کا مجمع تھا۔ اس کے بعد میرٹھ وغیرہ کے اجلاسوں میں انھوں نے جو قواعد ضوابط اور مقاصد مرتب فرمائے تھے اس کا نشانہ تین چیزیں تھیں۔

> **انگریزوں اور علما دیوبند کی جنگ ملکی اور غیر ملکی کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ نظریاتی جنگ تھی، انگریز مغل حکومت ختم کرنے کے بعد مسلمانوں کی ملی خصوصیات اور ان کی اسلامی انفرادیت کو ختم کرنے کے لئے مختلف قسم کی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے اور اس کے لیے ان کے پادری ان کے مشن اور ان کے خزانے کھلے ہوئے تھے جس سے عوام و خواص سراسیمگی پیدا ہو رہی تھی اور اسلامی اصول سرعام مجروح ہو رہے تھے۔**

(۱) فضلائے دارالعلوم کی تنظیم (۲) جدید تعلیم یافتہ افراد اور فضلا دینیات کی ہم آہنگی کی کوشش (۳) عوامی کارکنوں کی تیاری۔

**مقاصد جمعیت:**

مولانا نے اس جمعیۃ الانصار کو اِک انقلابی تحریک کی شکل دے دی جہاں رہنما اور کارکن دونوں ہی تیار کیے جاتے تھے۔ مگر یہ تنظیم انگریزوں کی نگاہ میں بہت جلد آ گئی۔ اس لیے مولانا سندھی کے خلاف طرح طرح کے طوفان اٹھائے اور آخر کار حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا سندھی کو دیوبند سے دہلی منتقل کر دیا اس طرح وہ جمعیۃ الانصار کی تحریک سے علیحدہ ہو گئے اور تحریک نے دم توڑ دیا۔

**درسِ قرآن:**

تیسرا اقدام یہ فرمایا کہ نظارۃ المعارف کا اِک تبلیغی ادارہ قائم فرمایا اور اس کا دفتر دہلی میں قائم کر دیا اور مولانا سندھی کو اُسے چلانے کی ذمّہ داری سونپ دی۔ مولانا سندھی نے وہاں پہنچ کر سب سے اہم یہ کام کیا

کہ مسجدِ فتح پوری میں درسِ قرآن شروع کردیا اور قرآن کو ایک زندہ کتاب کی طرح عوام وخواص کے لیے آسان کردیا۔ جس میں فرد، جماعت مذہب اور زندگی وغیرہ بننے بگڑنے اور سب کی اصلاح وفساد کے تمام گوشے سامنے آتے رہتے تھے۔ اس لیے دہلی میں اِک زبردست ذہنی انقلاب سر اٹھانے لگا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا سندھی شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک کے نہ صرف امین بلکہ ترجمان تھے۔ اور اُن کے اس ترجمانی سے دہلی جاگ اٹھا۔ اس تحریک کا عجیب اثر یہ بھی ہوا کہ حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری وغیرہ ایسے نظارۃ المعارف کے اِرد گرد جمع ہوگئے جو ملک کی سیاست میں اہم مقام کے مالک تھے۔

**مراکز جہاد:**

چوتھا اقدام یہ فرمایا کہ جس طرح ذہنی تربیت کے لیے مختلف کوششیں کررہے تھے۔ اسی طرح انقلابی تربیت کے لیے مختلف شہروں میں اپنے مراکز قائم کیے اور ان سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ کسی نہ کسی اہم کارکن کو ذمہ دار قرار دیا۔

اس قسم کے انقلابی مراکز دہلی سے سرحد تک ہر بڑے شہر میں قائم تھے۔ اور حاجی ترنگ زئی، خان عبدالغفار خاں جیسے لوگ جان کی بازی لگا کر حضرت مولانا کے ہر حکم کے لیے منتظر رہتے تھے۔ ان مراکز پر کارکن، گولہ بارود اور اسلحہ جنگ سب کا انتظام تھا اور یہ انتظام انتہائی خفیہ تھا جس کا کسی کو کانوں کان علم نہیں ہوسکتا تھا۔

**بین الاقوامی تحریک:**

پانچواں اقدام یہ فرمایا کہ افغانستان، ترکوں کی عثمانی سلطنت اور روسیوں کا برطانیہ سے ٹکرانے کے لیے فضا پیدا کی اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دہلی سے کابل روانہ کردیا۔ مولانا سندھی جب وہاں پہنچ گئے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا محمود حسنؒ کے آدمیوں نے پوری فضا تیار کررکھی ہے صرف ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو تمام کوششوں کو منظّم کرسکے یہ دیکھ کر انھیں حضرت الاستاد کی کارکردگی اور ہمہ گیر جدوجہد پر حیرت ہوگئی۔

**مولانا کی شخصیت:**

چھٹا اقدام یہ فرمایا کہ ۱۳۳۳ھ میں خود حجاز تشریف لے گئے اور وہاں اپنے شاگرد مولانا حسین احمد کے ذریعہ ترکی حکومت سے رابطہ پیدا کیا۔ اور انھیں تعاون کے لیے آمادہ کرلیا۔ چنانچہ ان سے ضروری خطوط لے کر ذمہ داران عثمانی حکومت کو خفیہ خفیہ روانہ فرمادیئے اور وہاں اس کی تعمیل کا انتظام کیا گیا۔

اس طرح مولانا محمود حسنؒ نے دیوبند جیسی گمنام جگہ بیٹھ کر ایسا منصوبہ تیار کیا۔ پھر اسے عملی شکل دے دی تھی کہ مصر میں جب مقدمہ پیش ہوا اور جج نے فرد جرم سنائی تو اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دُرویش اور غریب بوڑھا آدمی کس طرح اتنی زبردست تحریک چلاسکتا ہے۔ اور آج بھی کون باور کرسکتا ہے کہ برطانوی امپائر کے خلاف پڑوسی ملکوں، سرحدی قبائل اور ترکی سلطنت کو کھڑا کرنے کے لیے ایک عالمِ دین کا دماغ اس طرح چل سکتا ہے مگر واقعہ ہے کہ حضرت مولانا نے ایسی زبردست تحریک پیدا کی تھی۔ اور ایسے ایسے جانباز کارکن تیار کردیئے تھے جن کو جان پر کھیل جانا کوئی اہم کام نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بیرونی طور پر جنگ چھڑ جائے اور اندرونی طور پر سرحد سے دہلی تک سخت خلفشار اور خانہ جنگی شروع ہوجائے جس میں انگریزوں کو نشانہ بنا کر ختم کردیا جائے اور برطانوی حکومت کا جنازہ اُٹھ جائے۔ ملک مکمل طور سے آزاد ہوجائے۔

**ناکامی:**

یہ ساری اسکیم جب تیار ہوگئی تو اہم رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ ترکی حکومت انگریزوں سے شکست کھاگئی اس لیے انگریزوں کے دباؤ سے حضرت مولانا محمود حسنؒ عرب میں گرفتار کرلیے گئے اور مصر میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا کر انھیں مالٹا میں نظر بند کردیا گیا۔ ادھر ہندستان میں وہ خطوط پکڑ لیے گئے جس میں ۱۹/فروری ۱۹۱۶ء کو انقلاب لانے کی تاریخ مقرر کردی گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے ان تمام کارکنوں کو جو اس تحریک میں کسی طرح کام کررہے تھے گرفتار کرلیا، بہت سے مقامات پر چھاپے ڈالے گئے اور پوری طاقت سے اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ دوسری طرف کارکنوں میں سراسیمگی اس لیے پیدا ہوگئی کہ حضرت شیخ گرفتار ہوچکے تھے۔ اور ان کی رہنمائی کے لیے ہندستان میں کوئی جماعت موجود نہیں تھی جو کچھ تھے وہ حضرت مولانا تھے۔

**تحریک کے آثار:**

اس طرح یہ ریشمی رومال تحریک کامیاب نہیں ہوسکی مگر اس نے اتنی بڑی بین الاقوامی تحریک چلا کر ملکی انقلاب کی رہنمائی فرمائی اور مسائل کے حل کرنے کے لیے ہزاروں افراد کو آمادہ کرکے جو راستہ دکھایا تھا وہ راستہ آج تک کھلا ہوا ہے۔ □□

# تحریک ریشمی رومال میں غازی پور کا حصہ

محمد اسجد صدیقی
مدرسہ دینیہ غازی پور

شمالی ہند کی مشہور دینی درس گاہ اور اصلاحی تحریکات کے مرکز مدرسہ دینیہ غازی پور کا ۵۷ سالہ جشن تعلیمی نومبر ۲۰۰۵ کی ۲۵ر تا ۲۸ر تاریخ کو ہوا تھا۔ اس کا موضوع اور مقصد صرف تاریخ کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ تاریخ کی کڑیوں کو باہم مربوط و مضبوط کرنا بھی تھا نیز غازی پور اور ادارۂ دینیہ اور علمائے حق کی روشن خدمات اور سوانح کا تذکرہ بھی پیش نظر تھا۔

ضلع غازی پور عظیم تاریخی ورثہ کا مالک ہے، استخلاص وطن کی تحریکات میں بھی اس کا حصہ رہا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحریک ریشمی رومال میں اس ضلع کے مشہور تاریخی قصبہ یوسف پور کے خاندانِ انصاری کا جو رول رہا ہے اس کو کیسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ مدرسہ دینیہ نے بتاریخ ۶ر تا ۷ر نومبر ۲۰۰۵ ضلع کے تیرہ مقامات کے دورے کا پروگرام بنایا اور اس کو 'کاروانِ اتحاد' کا نام دیا۔ اس کاروان میں مدرسہ کے مہتمم اور صدر مدرس صاحبان کے علاوہ متعدد اصحاب شامل تھے۔ ۶ر نومبر کو کارواں نے موضع بازید پور سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے ۷ر نومبر کی شام میں یوسف پور پہنچا۔ اس موقع پر بازید پور میں ایک جلسہ عام بھی ہوا جس میں کارواں کے مقاصد بیان کیے گئے اور یہ بھی بتایا گیا کہ جب ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ مالٹا کے قید خانے سے رہا ہوئے تو دیوبند سے آپ نے پہلا سفر غازی پور کا کیا اور تھوڑی دیر کے لیے بازید پور بھی تشریف لے گئے، اس لحاظ سے اس چھوٹے سے گاؤں کی تاریخ میں شیخ الہند کی تشریف آوری کی وجہ سے بڑی اہمیت ہے اسی لیے مدرسہ دینیہ نے بازید پور سے کارواں نکالنے کا فیصلہ کیا اور اس کا اختتام یوسف پور پر کیا گیا کہ یوسف پور کے خاندانِ انصاری کے افراد (حکیم نابیناؒ، حکیم عبدالرزاقؒ اور ڈاکٹر انصاریؒ) نے ریشمی رومال کی تحریک میں زبردست تعاون کیا تھا، اور تینوں بھائیوں نے شیخ الہند کے سفر حج کے موقع پر بمبئی اور بمبئی سے مکہ تک کے اخراجات برداشت کیے تھے نیز مکہ کے قیام کے دوران ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی تھی۔ شیخ الہند کا یہ سفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔ خفیہ پولیس کے ریکارڈ میں تینوں بھائیوں کو باغی قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ ملزم نمبر ۶۴ حکیم نابینا، ڈاکٹر انصاری کا بھائی اور مولانا محمود حسنؒ کا پکا مرید ہے اور مولانا محمود حسنؒ کے سفر کے انتظامات اس نے کیے اور (معذوری کے باوجود) ان کو پہنچانے بمبئی تک گیا۔ شیخ الاسلامؒ کی خودنوشت 'نقشِ حیات' میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

**عجیب اتفاق:**

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دریائے گنگا کے کنارے جس جگہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا قافلہ لنگر انداز ہوا تھا، وہیں ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا قافلہ بھی اترا تھا، اور ایک بڑے مجمع نے آپ کا استقبال کیا تھا۔ اس موقع پر اہلِ شہر نے شیخ الہندؒ کی سواری کے گھوڑے کھول دیئے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر قیام گاہ تک لائے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ سفر وہ تاریخی سفر ہے جو اسارتِ مالٹا سے رہائی کے معاً بعد پیش آیا تھا اور اس موقع پر آپ شہر سے چند کلومیٹر کی دوری پر واقع موضع بازید پور بھی تشریف لے گئے تھے جہاں یوسف پور کے خاندان انصاری کے عمائد نے جن کا شیخ الہندؒ کے سفر حجاز اور ریشمی رومال تحریک میں زبردست حصہ تھا۔ آپ کا والہانہ استقبال کیا اور بڑی تعداد میں مردوں اور عورتوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

> **شیخ الہندؒ نے مالٹا سے واپسی کے بعد ارشاد فرمایا تھا کہ: "میں مالٹا سے نیا عزم لے کر آیا ہوں اور ملک کو آزاد کرانے کے علاوہ مسلمانوں کے قرآن سے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے اور ان کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا رہوں گا، اسی لیے مدرسہ دینیہ نے اپنے کارواں کو 'کاروانِ اتحاد' کا نام دیا اور شیخ الہند کے عزم کو پورا کرنے کی کوشش کی۔**

شیخ الہندؒ نے مالٹا سے واپسی کے بعد ارشاد فرمایا تھا کہ: "میں مالٹا سے نیا عزم لے کر آیا ہوں اور ملک کو آزاد کرانے کے علاوہ مسلمانوں کے قرآن سے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑنے اور ان کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا رہوں گا، اسی لیے مدرسہ دینیہ نے اپنے کارواں کو

'کاروانِ اتحاد' کا نام دیا اور شیخ الہند کے عزم کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا محمود حسنؒ ہندستان کے مایہ ناز عالم حدیث، شیخ طریقت، مفسرِ قرآن اور عظیم المرتبت مجاہد حریت تھے۔ آپ نے بڑھاپے اور معذوری کے عالم میں دنیا کی سب سے بڑی ظالم قوم انگریز کو ہندستان سے بے دخل کرنے کا جو منصوبہ بنایا اور جو قربانیاں دیں وہ تحریک آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں ہندستان کی آزاد حکومت جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی بنائے گئے تھے، اس کی منصوبہ بندی آپ ہی نے کی تھی، اس کے بعد اسی سال آپ نے ریشمی رومال کے نام سے باضابطہ تحریک کا آغاز کیا جس کے منصوبے میں تھا کہ افغانستان کے راستے سے ترکی کی فوجیں برطانوی ہند پر حملہ کریں گی اور ۱۹/فروری ۱۹۱۷ء کو بیرونی حملے کے ساتھ ساتھ اندرون ملک بھی بغاوت ہوگی اور ملک کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑا لیا جائے گا مگر تحریک کا راز فاش ہوگیا اور ۱۹۱۶ء میں جب کہ آپ مکہ معظّمہ میں قیام فرما تھے برطانیہ نے گورنر مکہ شریف حسین کو سازش میں شریک کر کے شیخ الہند کو گرفتار کرا لیا اور جزیرہ مالٹا میں لے جا کر مقید کر دیا جہاں آپ اپنے رفقاء شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ، حکیم نصرت حسینؒ اور مولانا وحید احمد مدنیؒ وغیرہ کے ساتھ چار سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ادھر ہندستان میں تحریک کو کچلنے کے لیے برطانوی حکومت نے تحریک کے ۲۲۳ ذمہ داروں کو گرفتار کر لیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا منصور انصاری جلاوطن کیے گئے۔ یوسف پور (غازی پور) کے خاندان مجاہدین کے افراد حکیم نابینا وغیرہ نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

یادش بخیر مشہور عالم حدیث حافظ عبد اللہ محدث غازی پوریؒ بھی اس تحریک میں دل و جان سے شریک تھے۔ شیخ الہندؒ کی قائم کردہ تنظیم 'جنودِ ربانیہ' سے ان کے تعلق اور اشتراک کا پتہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ برٹش گورنمنٹ کے محکمہ خفیہ کی رپورٹ کے فائل سے ہوتا ہے۔ مولانا سید محمد میاںؒ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۵ء) نے اس رکارڈ کا اردو میں ترجمہ کر کے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں 'تحریک شیخ الہند: ریشمی رومال سازش' کے نام سے شائع کیا تھا۔

**ایک غلط فہمی کا ازالہ:**

کچھ لوگ ریشمی رومال تحریک کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اندرون ملک بغاوت پیدا کرنا اور غیر ملکی طاقتوں سے ہندستان پر حملہ کروانا غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا اور ملک سے غداری تھی۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ مجوزہ حملہ برطانوی ہند پر تھا یا ہندستانی قوم پر؟ اگر یہ تحریک غلط تھی یا ۱۹۱۴ء میں کابل میں ہندستان کی آزاد حکومت کا قیام اور ترکی اور افغانستان کی حکومتوں سے برطانوی ہند پر حملہ کروانا اور اندرونِ ملک برٹش سرکار کے خلاف بغاوت کرنا غلط تھا تو نیتا جی سبھاش چندر بوس کا جاپان کی مدد سے ہندستان کی عارضی حکومت قائم کرنا کیسے درست قرار پا سکتا ہے؟

**مشہور عالم حدیث حافظ عبد اللہ محدث غازی پوریؒ بھی اس تحریک میں دل و جان سے شریک تھے۔ شیخ الہندؒ کی قائم کردہ تنظیم 'جنودِ ربانیہ' سے ان کے تعلق اور اشتراک کا پتہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ برٹش گورنمنٹ کے محکمہ خفیہ کی رپورٹ کے فائل سے ہوتا ہے۔ مولانا سید محمد میاںؒ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۵ء) نے اس رکارڈ کا اردو میں ترجمہ کر کے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۶ء میں 'تحریک شیخ الہند: ریشمی رومال سازش' کے نام سے شائع کیا تھا۔**

**شیخ الہند کا الہامی منصوبہ:**

آپ نے مالٹا سے واپسی کے بعد فرمایا تھا کہ: ''میں نے مالٹا کے طویل قیام کے دوران غور کیا کہ ساری دنیا میں مسلمان ہی کیوں تباہ حال ہیں تو سمجھ میں آیا کہ ان کی تباہی و بربادی کے دو اسباب ہیں: (۱) ان کا قرآن سے رشتہ توڑ لینا (۲) آپس میں لڑنا جھگڑنا''

پھر آپ نے فرمایا کہ: ''میں نے طے کیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا قرآن کو لفظاً و معناً عام کروں گا اور مسلمانوں کا قرآن سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی کوشش کروں گا اور ان کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا رہوں گا۔''

مدرسہ دینیہ نے اپنے کارواں کے ذریعہ ہر جگہ یہی پیغام سنایا اور ایک تاریخ ساز فیصلہ طلبہ مدرسہ دینیہ نے یہ کیا کہ 'شیخ الہند بریگیڈ' کے نام سے اپنی ایک تنظیم بھی قائم کی اور شیخ الہند کی کلیدی خدمات سے لوگوں کو واقف کرانے اور شیخ الہند کے پیغام کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔□□

# تحریک ریشمی رومال

## جس نے آزادی کی تحریک کو ایک روشنی عطا کی

مولانا محمد اعجاز (خادم دارالسلام لاٹھر دیوہ شیخ)

۱۴۹۸ء میں پرتگال (یوروپ) کے ملاحوں نے پہلی مرتبہ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور ساحلی مقام کالی کٹ میں اپنی تجارتی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ پھر اسی بہانے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر قدم جمانے شروع کیے۔ بحرِ ہند میں قزاقی اور لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ بحری سفر پر خطرہ بن گیا۔ جس علاقے میں انھیں اقتدار حاصل ہوا وہاں انھوں نے جبراً لوگوں کو عیسائی بنالیا اور لوگوں پر بہت ظلم کیے۔ پرتگالیوں کی دیکھا دیکھی یوروپ کے دیگر ممالک بھی حرص وطمع سے مغلوب ہوکر دولت سمیٹنے کے لیے سونے کی چڑیا کہے جانے والے ہندستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ انگلستان کے ایک سو ایک تاجروں نے تیس ہزار پونڈ کا سرمایہ جمع کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک کمپنی بنائی۔ یہیں سے ہندستان میں انگریزوں کی آمد شروع ہوئی اور تجارت کی آڑ میں وہ اپنی فوجی طاقت بھی رفتہ رفتہ ہندستان میں منتقل کرتے رہے۔ اس دوران یہ لوگ شاہانِ مغلیہ کے دربار میں جا پہنچے اور اپنے کو محض تاجر ظاہر کرکے بادشاہ سے پروانۂ امن حاصل کیا اور رفتہ رفتہ اپنے کو مضبوط کرتے رہے۔ تجارت کی آڑ میں وہ ہندستان کی جڑوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء تک مغلیہ حکومت مضبوط ہونے کی وجہ سے انگریز کو باقاعدہ کوئی کامیابی نہ مل سکی۔ اورنگ زیبؒ کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے بال و پر نکالنے شروع کردیئے، جس کا پہلا افسوسناک واقعہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں رونما ہوا اور نواب سراج الدولہ کی فوجیں اپنوں کی درپردہ سازش کا شکار ہوکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مٹھی بھر منظّم فوج کے مقابلے میں شکست سے دوچار ہوگئیں اور اس طرح بنگال میں کمپنی کی حکمتِ عملی کا راستہ صاف ہوگیا۔

اس دور میں کمپنی کے اربابِ حل وعقد نے بنگال کے ہنرمندوں پر جو مظالم ڈھائے وہ ہندستان کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ پھر بتدریج کمپنی کی حکومت کا دائرہ بڑھتا رہا۔ اکثر امرا اور نواب اپنی آپسی چپقلش کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے مصالحت پر مجبور ہوگئے اور آخر میں صرف ایک بہادر اور نڈر جرنیل سلطان ٹیپو رہ گیا تھا، مگر وہ بھی جب ۱۷۹۹ء میں انگریز کے مقابلے میں یہ کہتے ہوئے شہید ہوگیا کہ ''شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے'' تو برطانوی جرنیل ہارس کا نعرہ یہ تھا کہ ''آج سے ہندستان ہمارا ہے۔''

۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ستارہ عروج پر تھا۔ کمپنی کی فوجیں تقریباً پورے ہندستان پر غلبہ پاچکی تھیں۔ مغلیہ حکومت بے جان ہوچکی تھی۔ مغلیہ حکومت کے اختیارات صرف لال قلعہ تک محدود ہوکر رہ گئے تھے۔ اس وقت لوگوں کو یہ یقین ہونے لگا تھا کہ وطن کی غلامی کے بعد اب شاید مذہب بھی خطرہ میں پڑسکتا ہے۔ اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف تحریکات میں شدت پیدا ہوئی۔ اس درمیان علمائے اسلام کے جہاد کی طرف عوام کو ترغیب دلانے اور جہاد کو فرض عین قرار دیئے جانے کے فتوے نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ لوگ جوق در جوق جنگ میں شرکت کرنے کے لیے آتے رہے، لیکن یہ ساری جمعیت انگریز کی منظّم اور مسلح فوج کے مقابلے میں بہرحال کمزور تھی۔ اس کے باوجود یہ لوگ اپنی جانبازی کا جوہر دِکھاتے ہوئے چار مہینے تک پورے حوصلے کے ساتھ مغلیہ حکومت کے تحفظ کی کوشش کرتے رہے، مگر انگریز فوج نے اگست ۱۸۵۷ء میں دلّی کا محاصرہ کرلیا۔ ۲۰ رستمبر کو باقاعدہ لال قلعہ پر قبضہ کرلیا اور قلعہ پر سے حکومت کا جھنڈا اُتار کر برطانیہ کا یونین جیک لہرایا گیا۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد دردمند علماء نے ۱۸۶۶ء میں دیوبند کے اندر دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ یہ محض ایک ادارہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک مضبوط اسلامی قلعہ تھا۔ چنانچہ اس کے قیام کو ابھی دس سال کا عرصہ گزرا تھا کہ ایک تحریک تشکیل دی گئی اور اس تحریک کے روحِ رواں دارالعلوم کے سب سے بڑے فرزند شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ تھے جن کے دل میں نوعِ انسانی کا درد تھا، جو حق کو پسند کرتے تھے، انصاف کے حامی تھے، شرافت کی قدر کرتے تھے، ملک اور قوم کے لیے بہت جذباتی تھے۔ شیخ الہندؒ کی اس تحریک کو تحریک ریشمی رومال بھی کہا جاتا ہے۔ وجہ

اس کی یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ کو اس خفیہ تحریک کا علم بعض ریشمی رومالوں سے ہوا تھا، جن پر تحریک سے متعلق ضروری معلومات تحریر تھیں۔ اس لیے انگریز نے اسے تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور کر دیا۔ چونکہ ہندستان کے حالات سازگار نہیں تھے اور کوئی بھی قابلِ اعتبار شخص نظر نہیں آتا تھا لہٰذا حالات کے مدنظر اس تحریک کو خفیہ طریقے سے انجام دیا جاتا رہا تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ (چونکہ بغیر تشدد کے) ہندستان سے انگریزوں کو نکالنا اور وطنِ عزیز کو آزاد کرانا ممکن نہیں ہے اور اس طرح کے انقلاب کے لیے محفوظ مرکز اور مرکز کے علاوہ اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں، بنابریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں اس لیے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انھیں سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔''

یاغستان (آزاد قبائل) کی ریاست باجوڑ کے موضع زنگی کو مرکز بنا کر حضرت شیخ الہندؒ کے خدام و مخلصین نے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کی شروعات کر دی۔ کچھ دنوں تک جہاد بہت کامیابی سے جاری رہا لیکن بعد میں اوّلاً رسد کی کمی اور پھر انگریزوں کے حامیوں کے مخالفانہ پروپیگنڈے کے باعث رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ انگریز کے آدمی قبائلی علاقوں میں جا کر لوگوں کو بہکاتے اور کہتے تھے کہ یہ جہاد چونکہ بغیر امید کے ہو رہا ہے اس لیے شرعاً درست نہیں ہے اور تمہارا امیر والیِ یاغستان ہے، وہ جب جہاد کا حکم دے تب جہاد کیا جائے۔ اس سے بڑا نقصان ہوا اور بڑی رخنہ اندازی پیدا ہونے لگی۔ ان حالات کے پیشِ نظر قائدِ تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا تاکہ دولتِ افغانیہ کے اراکین سے مل کر تحریک کے لیے ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور خود خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے انگریز سے جہاد کے پیغامات اور بوقت ضرورت فوجی امداد کے سلسلے میں راہ ہموار کرنے کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ وہاں سے انگریز کے خلاف مسلمانانِ ہند کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کو تحریراً جہاد کا پیغام مل گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے حالات درست نہ ہونے کی وجہ سے وہ پیغام دوسروں کے ذریعہ سے ارسال فرمایا۔ ان لوگوں نے انگریزوں کی طرف سے سراغ رسانی کی انتھک کوششوں کے باوجود قبائلی علاقوں میں بحفاظت وہ پیغام تقسیم کرا دیا اور اس پیغام نے قبائلی علاقوں میں جہاد کا غیر معمولی جوش وخروش پیدا کر دیا۔ وہ لوگ اپنی جانوں کی بازی لگا کر میدانِ کارزار میں سربکف ہو کر آ گئے اور اس طریقہ سے یہ تحریک پھلنے اور پھولنے لگی لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ترکی حکومت کی طرف سے مجاہدین کی حمایت ونصرت کا جو وعدہ کیا گیا تھا حقیقتاً بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا اور وہ حمایت کرتے۔ مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا، کیونکہ جس وقت خلافتِ عثمانیہ نے مسلمانانِ ہند کے نام فرمان جاری کیا تھا اس وقت ترکی، جرمنی اتحاد کی فتوحات جاری تھیں۔ لیکن بعد میں جب امریکہ نے برطانیہ اور روسی اتحاد کی حمایت میں اپنی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار پیش کر دیئے اور دوسری طرف انگریز کی سازش سے شریفِ مکہ نے ترکی حکومت سے بغاوت کر دی تو جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ خاص کر عرب علاقوں میں ترکوں کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خلافتِ عثمانیہ پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھروسہ کیا جب وہی ناکام ہوگئی تو اب حضرت شیخ الہندؒ کے کامیاب ہونے کے راستے مسدود ہوگئے اور حضرت حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا راز حکومتِ برطانیہ پر فاش ہوگیا۔ اسی وجہ سے حضرت کی یہ غیر معمولی انتھک کوشش مکمل طریقے سے کامیاب نہ ہوسکی، لیکن اس سے جو چنگاری اُٹھی اس نے پورے ہندستان کو جگا دیا اور آزادی کے لیے جدوجہد کی مہم نے شدت اختیار کر لی۔ □□

**شیخ الہندؒ کی اس تحریک کو تحریک ریشمی رومال بھی کہا جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ کو اس خفیہ تحریک کا علم بعض ریشمی رومالوں سے ہوا تھا، جن پر تحریک سے متعلق ضروری معلومات تحریر تھیں۔ اس لیے انگریز نے اسے تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور کر دیا۔**

# تحریک ریشمی رومال اور مدرسہ عربیہ رحمانیہ روڑکی

**اظہر الحق قاسمی** (مدرس مدرسہ عربیہ رحمانیہ روڑکی)

اپنے لہو سے روشن کردیں گلیاں اس ویرانے کی
ورنہ تنگ بہت تھیں راہیں شہرِ وفا تک جانے کی
جان تھی اِک سووہ بھی دے دی پھر بھی رہے شرمندہ سے
اہلِ دل خود ہی لکھ لیں گے کہانی اس افسانے کی

یہ ایک تاریخی حقیقت وشہادت ہے کہ وطنِ عزیز کو انگریزوں کی سامراجی حکومت سے رہائی دلانے کے لیے سب سے پہلے مسلمانوں نے میدانِ جہاد میں اُتر کر تلواروں کے سایہ میں سجدۂ جہاد ادا کر کے دادِ شجاعت دی اور پھر تقریباً ایک صدی بعد ۱۸۵۷ء میں مشترکہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے جنگ آزادی لڑی، جس میں عام ہندستانیوں خصوصاً مسلمانوں کا شکست کے نتیجہ میں بے شمار جانی اور مالی نقصان ہوا۔ جو قوم کبھی صاحبِ ثروت وحیثیت تھی اس کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی آ گیا اور رہی سہی قوت واجتماعیت میدانِ شاملی کی خوں ریز جنگ میں زمیں دوز ہوگئی۔ ایسے نازک حالات و ماحول میں اسی خانماں برباد قوم کے چند خدارسیدہ نفوسِ قدسیہ اور علمائے ربانیین نے جو فراست وبصیرت اور عزم استقلال کی دولت سے مالا مال تھے، جنھوں نے شاملی کے معرکہ میں انگریزوں سے دوبدو نبرد آزمائی میں قائدانہ کردار اور ہراول دستہ کا نمایاں رول ادا کیا تھا، جن کے ذہن رسا اور نگاہِ دوربیں میں صرف ماضی اور حال کی ہی تباہیوں کا منظر نہیں تھا بلکہ مستقبل میں انگریزوں کی ناپاک سازش کے خدشات وخطرات بھی آئینہ کی طرح عیاں اور روشن تھے، انھیں روشن ضمیر اور اہلِ فکر ونظر بزرگوں اور پاسبانِ ملّت نے عہد گزشتہ کے نقصانات کی تلافی، امت کے انتشار کی شیرازہ بندی، ملّی شناخت و پہچان کی بحالی، عظمت رفتہ کی بازیابی اور پھر دوبارہ ملک کی آزادی کے لیے جانباز سپاہیوں کی کھیپ تیار کرنے کے لیے باشارۂ غیبی اور منامی الہامی و بشارت کی بنیاد پر قیام دارالعلوم دیوبند کا منصوبہ بنایا اور ۳۰ رمئی ۱۸۶۶ء میں مسجد چھتہ کے درختِ انار کے سایہ تلے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ اور ان کے پاکباز رفقائے گرامی کے مقدس ہاتھوں علم وعرفان کے شجرۂ طوبیٰ کا ایک ننھا سا پودا لگایا گیا جو دیکھتے ہی دیکھتے اتنا شاداب وتناور اور گھنیرا سایہ دار درخت بنا جس کے نیچے بیٹھ کر بے چین انسانیت کو سکون وراحت اور بے راہوں کو راہِ منزل ملی۔ اسی مینارۂ نور اور دانش کدۂ علمی کے سب سے پہلے مرحلے کے فارغ التحصیل حضرت الامام النانوتویؒ کے خاص شاگرد پیر طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ اور قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی برداللہ مضجعہٗ کے روحانی تربیت یافتہ، سیاسی افکار وخیالات میں اپنے استاذ اور پیرومرشد کے امین و جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ ہیں جن کی ہمہ گیر و ہمہ جہت کوششوں کے نتیجہ میں شکستہ خاطر اور مفلوک الحال ہندستانیوں کو دوبارہ انگریزوں کے خلاف صفِ جہاد درست کر کے میدانِ کارزار گرم کرنے کا حوصلہ ملا۔

آپ کی انھیں عالمگیر کوششوں اور جہدِ مسلسل کے ایک حصہ کو 'تحریک ریشمی رومال' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے حریت پسند مجاہدین اور بیرونِ ملک کی انگریز مخالف حکومتوں، عرب، افغانستان، جرمن اور آسٹریلیا وغیرہ کی مدد سے انگریز غاصبوں پر ایسا حملہ کیا جائے کہ ان کے ناپاک وجود سے ملک پاک ہوجائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی اس تحریک سے وہ تمام مدارسِ اسلامیہ مربوط و منسلک تھے جو دارالعلوم کے منہج وطرز پر قائم ہوئے تھے۔ ان مدارس میں مدرسہ عربیہ رحمانیہ روڑکی کا نام بہت واضح ہے۔ چونکہ اس ادارہ کے بانی حضرت مولانا خلیل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے پیر بھائی ہیں اور آپ دونوں کے پیرومرشد قطب الاقطاب حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ میدانِ شاملی میں امیر جہاد تھے، آپ کی امارت و قیادت میں اکابر دیوبند نے انگریزوں کے خلاف جنگ و جہاد کیا۔ اس رشتہ وتعلق سے مدرسہ رحمانیہ کے خمیر وبنیاد میں انگریز دشمنی شامل ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا ظہور احمد خان صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین مدرسہ رحمانیہ حضرت شیخ الہندؒ کے فدائی اور تحریک ریشمی رومال کے سرگرم اور انتہائی فعال رکن تھے۔ مشن کی ممبر سازی اور فراہمی مالیات میں بہت لگن اور دلچسپی کے ساتھ زندگی بھر کام انجام دیتے رہے۔ جب تحریک والوں کی داروگیر ہونے لگی تو آپ بھی گرفتار کر کے

الہ آباد لے جائے گئے جہاں آپ پر سی آئی ڈی کے دفتر میں بہت سختیاں کی گئیں تاکہ آپ راز کھول دیں۔ راز سے پردہ اُٹھانا تو درکنار آپ نے زبان تک نہیں کھولی۔ بہ تکلف گونگے بہرے بنے رہے۔ گویا آپ نے یہ عہد کرلیا تھا

زندگی بھر زباں نہ کھولیں گے
تم پکاروگے اور ہم نہ بولیں گے

آخرکار پولیس نے تنگ آکر چھوڑ دیا مگر روڑکی واپسی پران سختیوں اورسزاؤں کا اثر ظاہر ہوا۔ آپ سخت بیمار ہوگئے، خون کی الٹیاں ہوئیں اورآپ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے بزرگ بطلِ حریت حضرت مولانا عزیرگل پشاوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو مولانا ظہور احمد خان صاحب کے بعد مدرسہ رحمانیہ کے صدرالمدرسین بنے۔ آں موصوف حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور خادم خاص تھے۔ تحریک میں ابتدا ہی سے شریک رہے۔ تحریک کے اہم اور خطرناک کام آپ کے سپرد ہوئے۔ پہاڑی اور سرحدی علاقوں میں ہدایات وخطوط آپ کے ذریعہ بھیجے جاتے۔ سی آئی ڈی مستقل پیچھے لگی رہتی لیکن آپ بھیس بدل بدل کر آتے جاتے رہے۔ گرفتار نہ ہوسکے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے سفرحجاز اور مالٹا کی جیل میں ساتھ رہے۔ الحمدللہ آج بھی مدرسہ عربیہ رحمانیہ روڑکی کا وہ تہہ خانہ جس میں سرفروشانِ وطن اور مجاہدینِ آزادی کے مشورے ہوتے تھے، یادگار کے طور پر محفوظ و باقی رکھا گیا ہے۔ ◻◻

(گورنر حجاز شریف)

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفہ رسول رب العالمین، امیر المومنین دام اقبالہ۔ یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عمومی گذشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رُخ کیے ہوئے ہے۔ روس، فرانس اور انگریز (دشمنانِ اسلام) ممالک عثمانیہ پر برّی و بحری حملہ کررہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسہ پر جہاد مقدس کا اعلان کردیا ہے۔ جس کے جواب میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے۔ اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین کی تعداد دشمنانِ اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے۔ اور انھوں نے دشمنوں کی قوت کو مادی اور اخلاقی طور پر کمزور کردیا ہے۔

چنانچہ روسیوں کی فوج کا ایک بڑا حصّہ قفقازیہ میں تباہ کردیا گیا ہے۔ اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوجی اور ان کے جنگی جہاز درہ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کردیئے گئے ہیں۔ ترکوں، جرمنوں اور آسٹریلیوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامانِ جنگ پر قبضہ کرلیا ہے۔ اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنالیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہوکر جنگ میں شامل ہوگیا ہے۔ اور اُس نے سربیا کے علاقہ میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دے دی ہے۔ اس لیے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ اُن مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جو ان حکومتوں کی غلامی ابوایوبی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اس عرضداشت کے پیش کرنے کا محرک بنا ہے۔ فقط

| | |
|---|---|
| مہر جناب حاجی صاحب ترنگ زئی مہاجر غازی فی سبیل اللہ صدر جمعیۃ حزب اللہ | مہر غازی معروف جناب ملا صاحب باڑہ صدر انصار جمعیۃ حزب اللہ |
| مہر مولوی فضل ربی مہاجر رکن جمعیۃ حزب اللہ | مہر مولوی عبدالعزیز صاحب رکن جمعیۃ حزب اللہ |

# فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت الجنود الربانیہ

**الجنود الربانیہ** فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت ہے جس کا مقصد اولیہ سلاطین اسلام میں اعتماد پیدا کرتا ہے اس کا صدر جس کا نام فوجی قاعدہ سے جنزل یا القائد ہے حضور کو قرار دیا گیا ہے اور مرکز اصلی مدینہ منورہ۔اس لیے خیال ہے کہ حضور مدینہ منورہ میں رہ کر خلافت علیا سے، افغانستان وایران کے ساتھ معاہدہ کی سعی فرمائیں۔اور افغانستان کے متعلق، نیز یاغستان کے متعلق تجویز کو خدام تک پہنچادینا کافی خیال فرمائیں۔

افغانستان شرکت جنگ کے لیے امور مذکورہ بالا کا طالب ہے جسے اولیا دولت عثمانیہ وخلافت ثانیہ تک پہنچانے کی جلد سے جلد تدبیر کیجیے۔ کیونکہ ہندستان مگر ندام کی صفائی فرماتے رہتے ہیں۔مولوی رامپوری نے بھی تائید سے کنارہ کیا۔مسعود بھی شکار ہوگیا۔

بندہ حسرت آزاد سے ملا۔دونوں بیکار ہو چکے ہیں کیونکہ بندہ کا لوٹنا حضور تک ممکن نہ تھا۔اس لیے آگے بڑھا۔

غالب نامہ احباب ہند کو دکھا کر حضرت یاغستان کے پاس لایا۔ حاجی بھی اب مہمند میں ہیں۔مہاجرین نے مہمند باجوڑ صوات نبیر وغیرہ علاقوں میں آگ لگا رکھی ہے۔ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت کا خاص اثر ہوا۔اس لیے ضروری ہے کہ حسبِ وعدہ غالب مصالحت کے وقت یاغستان کی خدمت کا خیال رکھا جائے۔ضعف جماعت ہند سے مہاجرین کو کافی امداد نہیں پہنچ سکی۔بندہ یاغستان ایک ماہ قیام کر کے وفد مہاجرین کے ساتھ کابل پہنچا۔مولانا سیف جماعت سے الگ ہوکر یہاں مقیم ہیں۔ان کے دولت کی طرف سے کام کی تجویز ہورہی ہے اعضائے وفد فضلین وعبدالعزیز ہیں۔مولانا الناظم کی توجہات وحاجی عبدالرزاق صاحب کی عنایات سے وفد نے دربار نصراللہ میں رسائی کی ابتدائی کامیابی بھی ہوئی۔بندہ ان سے الگ باریاب ہوا۔حضور کے زیر اثر کام اور اس کے اصول کی تفصیل کی گئی۔خاص قبولیت ہوئی۔الحمدللہ اور انشاءاللہ اس ذیل میں حاضر خدمت ہوں گا۔

یہاں کا حال یہ ہے یہاں فتاویٰ وسفرائے ترک وجرمن پہنچے ان کا اعزاز پورا ہوا۔لیکن مقصد میں ناکام رہے۔وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناطرفداری میں ایران وافغانستان سے ان کی ضروریات معلوم کرتا۔اس کے پورا کرنے کی سبیل کرتا۔اور حسبِ احوال معاہدہ دوستی کرتا۔افغانستان نہ بڑی جنگ میں شرکت کا سامان رکھتا ہے۔اور نہ کوئی بڑی دولت اس کے نقصانات کی تلافی کی ذمہ دار ہے۔اس لیے شریک حرب نہیں ہوسکتا۔اگر ضروری افسران انجینئران اسلحہ روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبہ کفر عصمت واعانت کا عہد نامہ کیا جائے تو شرکت کے لیے تیار ہیں۔ بااین ہمہ سردار نائب السلطنت عام سرحدی وزیر، آفریدی، مہمند، باجوڑ، صوات، نبیر، چکپسیر، غوربند، کرناہ، کوہستان، دیر، چترال وغیرہ میں اپنا اثر منظّم کرتے اور ان سے وکلا طلب کر کے عہد شرکت بصورت جنگ لے رہے ہیں۔یہ کام ایک حد تک ہو چکا ہے سفرا جرمن واپس میں کفر پر کاری ضرب لگانے کی یہی ایک صورت ہے۔ اہلِ مدرسہ مولوی محسن سیّد نور کے ذریعہ سے حضور کی ہند میں لانے کی سعی میں ہیں۔کیونکہ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ حجاز میں بھی کام ہوسکتا ہے۔ادھر انگریزوں میں پہلی سی عزّت بوجہ عدم ضرورت اب نہیں رہی۔

قاضی صاحب حکیم صاحب ڈاکٹر صاحب مولانا رائے والے حضور کی مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں۔خطرہ بہ وجہ قصّہ غالب کے علم ہونے کے بذریعہ مطلوب اب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔اس لیے ایسی کسی تحریک کو ہرگز ہرگز منظور نہ فرمایا جائے۔

مبلغ عطا حضور کے مکان پر اور سیّد نور کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کے سپرد کردیا گیا بندہ حصول قدم بوسی کی سعی میں ہے۔اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ کامیاب ہوں گا۔مولانا الناظم مولانا سیف فضلین وعبدالعزیز وجملہ مہاجرین طلبا سلام عرض کرتے ہیں۔والسلام برادر عزیز واحد مولانا حسین ان کے والد صاحب وبرادران وحرمت اللہ واحمد جان صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون۔ مدنی خطوط ہند کی ڈاک کے حوالے کردیئے گئے تھے۔ڈاکٹر شاہ بخش صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔وسیّد ہادی وخدا بخش وحبیب اللہ غازی کو بھی۔

### منصب داران جنود ربانیہ:

الف: مربی: (۱) سالار المعظم خلیفۃ المسلمین (۲) سلطان احمد شاہ قاچار، ایران (۳) امیر حبیب اللہ خاں، کابل۔

ب: مردان: (۱) انور پاشا (۲) ولی عہد دولت عثمانیہ (۳) وزیر اعظم دولت عثمانیہ (۴) عبّاس حلمی پاشا (۵) شریف مکہ معظّمہ (۶) نائب

السلطنت کابل سردار نصراللہ خاں (۷) معین السلطنت کابل سردار عنایت اللہ خاں (۸) نظام حیدرآباد (۹) والی بھوپال (۱۰) نواب رام پور (۱۱) نظام بھاولپور (۱۲) رئیس المجاہدین۔

ج: جنرل یا سالار: (۱) سلطان المعظم حضرت مولانا محمد دیوبندی مدظلہٗ العالی۔(۲) قائم مقام سالار کابل مولانا عبیداللہ صاحب۔

د: نائب سالار (یا لیفٹیننٹ جنرل): (۱) مولانا محی الدین خاں صاحب (۲) مولانا عبدالرحیم صاحب (۳) مولانا غلام محمد صاحب بھاولپور (۴) مولانا تاج محمد صاحب سندھی (۵) مولوی حسین احمد صاحب مدنی (۶) مولوی حمداللہ صاحب حاجی صاحب ترنگ زئی (۷) ڈاکٹر انصاری (۸) حکیم عبدالرزاق صاحب (۹) ملا صاحب بابرا (۱۰) کوہستانی (۱۱) جان صاحب باجوڑ (۱۲) مولوی ابراہیم صاحب کالوی (۱۳) مولوی محمد میاں (۱۴) حاجی سعید احمد انبیٹھوی (۱۷) مولوی عبدالعزیز رحیم آباد (۱۸) مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی (۱۹) مولوی عبداللہ غازی پوری (۲۰) نواب ضمیرالدین احمد (۲۱) مولوی عبدالباری صاحب (۲۲) ابوالکلام (۲۳) محمد علی (۲۴) شوکت علی (۲۵) ظفر علی (۲۶) حسرت موہانی (۲۷) مولوی عبدالقادر قصوری (۲۸) مولوی برکت اللہ بھوپالی (۲۹) پیر اسداللہ شاہ سندھی۔

ہ: معین سالار (منیجر جنرل) مولوی سیف الرحمٰن صاحب، مولوی محمد حسن مرادآبادی، مولوی عبداللہ انصاری۔ (میر سراج الدین بھاولپوری پاچا لا عبدالخالق، مولوی بشیر رئیس المجاہدین شیخ ابراہیم سندھی، مولوی محمد علی قصور، سیّد سلیمان ندوی، عمادی غلام حسین آزاد سبحانی، کاظم بے، خوشی محمد، مولوی ثناء اللہ، مولوی عبدالباری مہاجر وکیل حکومت موقتہ ہند)

و: ضابطہ (کرنل) شیخ عبدالقادر مہاجر، شجاع اللہ مہاجر نائب وکیل دولت موقتہ ہند مولوی عبدالعزیز وکیل وفد حزب اللہ یاغستان، مولوی فضل ربی، مولوی عبدالحق لاہوری، میاں فضل اللہ، صدرالدرین، مولوی عبداللہ سندھی، مولوی ابومحمد احمد لاہوری، مولوی احمد علی نائب ناظم نظارۃ المعارف، شیخ عبدالرحیم سندھی، مولوی محمد صادق سندھی، مولوی ولی محمد، مولوی عزیر گل، خواجہ عبدالحیٔ، قاضی ضیاء الدین ایم.اے، مولوی ابراہیم سیالکوٹی، عبدالرشید بی.اے. مولوی ظہور محمد، مولوی محمد مبین، مولوی محمد یوسف گنگوہی، مولوی رشید احمد انصاری، مولوی سیّد عبدالسلام فاروقی، حاجی احمد جان سہارنپوری۔

**ز: نائب ضابطہ لیفٹیننٹ کرنل:**

فضل محمود، محمد حسن، بی اے مہاجر، شیخ عبداللہ بی اے مہاجر، ظفر حسن بی اے مہاجر، اللہ نواز خاں بی اے مہاجر، رحمت علی بی.اے مہاجر عبدالحمید بی.اے. مہاجر، حاجی شاہ بخش سندھی، مولوی عبدالقادر، دین پوری، مولوی غلام نبی، محمد علی سندھ، حبیب اللہ۔

ح: منیجر: شانواز، عبدالرحمٰن، عبدالحق۔

ط: کپتان: محمد سلیم، کریم بخش۔

ی: لیفٹیننٹ: نادر شاہ۔

(نوٹ) ایک اور فہرست میں محمد علی سندھی اور حبیب اللہ کا نام منیجر کی فہرست میں درج ہے۔

**تتمہ:**

اس فہرست میں ان لوگوں کے نام دیئے گئے ہیں جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یا تو مولانا محمودالحسن کے جہاد کے پروپیگنڈے کی تائید کی یا اُس میں مدد دی۔ اس فہرست کو مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ فہرست میں شامل بعض لوگ اس سازش سے بالکل بے خبر ہوں گے۔ اور ان کا نام صرف مولانا محمودالحسن سے عقیدت کی وجہ سے اس فہرست میں شامل کرلیا گیا ہوگا۔

۱- علی گڑھ: ........ مولوی انیس احمد
۲- ٹکالی دیوریا ........ مولوی احمد میاں
۳- میرٹھ شہر: ........ خواجہ عبدالحیٔ
۴- // ........ مولوی حافظ کفایت اللہ
۵- // ........ مولانا عاشق الٰہی
۶- // ........ مولانا احمد علی
۷- // ........ مولانا عبدالمومن
۸- // ........ حافظ فصیح الدین
۹- // ........ حاجی وجیہ الدین
۱۰- // ........ شیخ رشید احمد
۱۱- // ........ مولوی محمد ابراہیم
۱۲- // ........ لال کرتی کا ایک قصائی معرفت مولانا احمد علی
۱۳- سورت: ........ مولانا غلام محمد
۱۴- // ........ مولانا محمد حسین
۱۵- // ........ شاملات: مولانا محمد احمد، مولانا محمد احمد
۱۶- // ........ مولانا محمد اعظم

۱۷- // ........... قاری محمد شفیع آف کیرانہ مدرس مدرسہ سملک
۱۸- کلکتہ:.................... مولانا مرتضیٰ حسن
۱۹- // ........... حافظ محمد اسماعیل مرچنٹ (بھتیجا پیش امام مرغی ہٹہ مسجد)
۲۰- // ........... نواب عبدالستار
۲۱- // ........... حاجی اللہ بخش وحبیب بخش
۲۲- // ........... ہاشم مصطفیٰ
۲۳- // ........... مولانا نذیر حسن
۲۴- // ........... ابوالکلام
۲۵- // ........... عبدالرحیم ولد بخش الٰہی مرچنٹ
۲۶- گیا ........... مولوی ولایت علی
۲۷- // ........... مولوی رحمت اللہ
۲۸- // ........... ولایت حسین صاحب
۲۹- رنگون:........... مولوی محمد ابراہیم
۳۰- کٹیہار:........... حکیم محمد اسحاق
۳۱- مظفر نگر:........... سیّد نور الحسن رئیس رتھیڑی
۳۲- // ........... مولوی حافظ عبدالحئی
۳۳- گنج پورہ:........... مولوی مشتاق آف انبیٹھہ
۳۴- ضلع کرنال:........... ملازم نواب صاحب
۳۵- دلّی:........... مولانا کفایت اللہ
۳۶- // ........... مولوی محمد امین الدین
۳۷- // ........... حافظ نسیم الدین
۳۸- // ........... مولوی احمد علی ناظم نظارۃ
۳۹- // ........... حاجی احمد الدین اہل حدیث
۴۰- // ........... ڈاکٹر انصاری
۴۱- // ........... حسن نظامی
۴۲- // ........... حکیم عبدالرزاق
۴۳- // ........... مولوی امیر الدین
۴۴- پرتاب گڑھ:........... مولوی محمد یعقوب (سفیر)
۴۵- لکھنؤ:........... مولوی محمد علی وصغیر
۴۶- // ........... مولوی مطلوب الرحمٰن کے دوست
۴۷- // ........... مولوی وارث حسن پیر
۴۸- دربھنگہ:........... عبدالحفیظ
۴۹- // ........... عبدالوہاب
۵۰- // ........... مولوی پہلوان
۵۱- نگینہ، بجنور:........... مولوی بشیر احمد
۵۲- // ........... مولانا شوکت علی
۵۳- // ........... مولوی انوار الحق
۵۴- // ........... مولوی محمد الدین صاحب یا مجید الدین
۵۵- // ........... حکیم جمیل الدین
۵۶- // ........... مولوی محمد یٰسین
۵۷- بجنور:........... حکیم رحیم اللہ
۵۸- // ........... حافظ مشیت اللہ
۵۹- پٹنہ:........... حاجی عبدالرحیم اہل حدیث
۶۰- شملہ:........... مولوی احمد حسن آف کیرانہ پیش امام
۶۱- اجمیر:........... مولوی عزیز احمد صاحب سیکریٹری اسکول
۶۲- // ........... قاسم جی محمد جمال مرچنٹ
۶۳- // ........... ملا کریم اللہ
۶۴- // ........... مولوی قمر الدین صاحب
۶۵- پیاور:........... حاجی شمس الدین وقاضی عبدالحئی
۶۶- علی گڑھ:........... مولوی انیس احمد ومولوی احمد میاں
۶۷- نہٹور، بجنور:........... مولوی حامد حسین
۶۸- // ........... رحمت اللہ
۶۹- قصور:........... مولوی برکت اللہ
۷۰- کیرت پور:........... حافظ علی حسن (البہرا)
۷۱- بمبئی:........... مولوی بسم اللہ (مدرس مدرسہ مسجد زکریا)
۷۲- // ........... مولوی محمد عیسیٰ (مدرس مدرسہ مسجد زکریا)
۷۳- // ........... مولوی ظہور (مدرس مدرسہ مسجد زکریا)
۷۴- // ........... حکیم اجمیر محلّہ خیر علی
۷۵- سہارنپور:........... حافظ محمد یعقوب آف نگینہ
۷۶- // ........... حاجی احمد جان مرچنٹ
۷۷- رائے پور:........... مولانا عبدالرحیم
۷۸- // ........... ملا جی
۷۹- // ........... شاہ زاہد حسن
۸۰- انبیٹھہ:........... پیر جی ظہور احمد

۸۱- // ............................ حافظ مشیت اللہ
۸۲- // ............................ مولوی احمد رئیس
۸۳- سیالکوٹ: ............ ماسٹر غلام نبی وغلام حبیب کنٹریکٹر
۸۴- مرادآباد: ............ قاضی محی الدین
۸۵- انبالہ شہر: ............ حافظ محمد صدیق دیبانجی
۸۶- مرادآباد: ............ حاجی محمد اکبر صاحب مرچنٹ
۸۷- پشاور: ............ مولوی عبدالرحیم
۸۸- // ............................ صاحبزادہ صاحب
۸۹- // ............................ مولوی غلام رسول صاحب
۹۰- بھاگلپور: ............ مولوی سہول صاحب
۹۱- // ............................ مولوی شایق
۹۲- لاہور: . مولوی عبدالحق صاحب (مولوی حمداللہ وغیرہ معرفت گاڑی والا)
۹۳- حیدرآباد سندھ: ............ مولوی محمد ابراہیم
۹۴- // ............................ پیر جھنڈا صاحب
۹۵- پوسٹ ویراول: ............ مولوی محمد ابراہیم صاحب
۹۶- خورجہ: ............ عبداللہ خاں
۹۷- // ............................ عبدالرحمٰن خاں صاحب
۹۸- // ............................ حافظ مشیت اللہ
۹۹- // ............................ عبداللہ
۱۰۰- // ............................ حکیم اللہ خاں صاحب انسپکٹر
۱۰۱- چکوال جہلم: ............ مولوی احمد صاحب
۱۰۲- جودھپور: ............ مولوی عبدالحئی
۱۰۳- // ............ ایک اور آدمی (مولوی عبدالغنی اہل حدیث)
۱۰۴- // ............................ مولوی محمد ابراہیم صاحب
۱۰۵- بھوپال: ............ مولوی سعید الدین صاحب
۱۰۶- // ............................ مولوی سعید احمد صاحب
۱۰۷- // ............................ مرزا عبدالصمد صاحب
۱۰۸- رُڑکی: ............ حافظ امداد حسین
۱۰۹- // ............................ مولوی حافظ اسماعیل
۱۱۰- // ............................ نائب مدرس تحصیلی
۱۱۱- سرونج، ٹونک: ............ مولوی مہر علی
۱۱۲- // ............................ عبدالکریم
۱۱۳- // ............................ مرزا صاحب
۱۱۴- // ............................ صاحبزادہ عبدالرحیم
۱۱۵- // ............................ مفتیان ریاست ٹونک
۱۱۶- پیپڑ جودھپور: ............ مولوی ظہور احمد (تجلی آفتاب منزل)
۱۱۷- گنگوہ: ............ حافظ محمد یعقوب صاحب
۱۱۸- // ............................ مولانا حکیم مسعود احمد شاہ

(مزید سات اشخاص کے نام دوسرے لوگوں کے ساتھ اس فہرست میں آئے ہیں، اس طرح ناموں کی تعداد ۱۲۵ ہوجاتی ہے)

# تحریک ریشمی خطوط میں حصہ لینے والے حضرات

**اس فہرست میں ان لوگوں کے نام دیئے گئے ہیں جو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں عملاً شریک تھے اور یا پھر وہ حضرتؒ کی تحریک آزادی کی تائید کرتے تھے۔**

| نمبر شمار | نام |
|---|---|
| ۱ | آزاد سبحانی |
| ۲ | ابراہیم شیخ آف سندھ |
| ۳ | ابراہیم صاحب مولوی کاوی |
| ۴ | ابوالکلام آزاد |
| ۶ | ابومحمد احمد مولوی آف سیالکوٹ |
| ۷ | احمد جان |
| ۸ | احمد جان مولوی |
| ۹ | احمد حسن مولوی آف کیرانہ |
| ۱۰ | احمد حسین مولوی آف کیرانہ |
| ۱۱ | احمد علی مولوی ناظم نظارۃ المعارف |
| ۱۲ | احمد میاں مولوی |
| ۱۳ | اسداللہ شاہ پیر سندھی |
| ۱۴ | اسمس |
| ۱۵ | اسماعیل |
| ۱۶ | اسماعیل حافظ |
| ۱۷ | اصطفیٰ کریم بی اے آف قیصر باغ لکھنؤ |
| ۱۸ | اللہ نواز خاں |
| ۱۹ | امداد حسین حافظ |
| ۲۰ | امیر شاہ |
| ۲۱ | انصاری ڈاکٹر |

| نمبر | نام |
|---|---|
| ۲۲ | عزیزالدین |
| ۲۳ | عبدالعزیز مولوی ساکن رحیم آباد |
| ۲۵ | عبدالعزیز شاوش شیخ |
| ۲۶ | عبدالباری مولوی فرنگی محل لکھنؤ |
| ۲۷ | عبدالباری مولوی مہاجر |
| ۲۸ | عبدالحئی خواجہ |
| ۲۹ | عبدالحامد مہاجر |
| ۳۰ | عبدالحق مولوی آف لاہور |
| ۳۱ | عبدالحق شیخ |
| ۳۲ | عبدالحسن مولوی آف جون پور |
| ۳۳ | عبدالکریم سرونج |
| ۳۴ | عبدالکریم نائب رئیس المجاہدین |
| ۳۵ | عبدالخالق |
| ۳۶ | عبداللہ انصاری مولوی |
| ۳۷ | عبداللہ ہارون حاجی |
| ۳۸ | عبداللہ عمادی |
| ۳۹ | عبداللہ مولوی آف غازی پور |
| ۴۰ | عبداللہ مولوی آف سندھ |
| ۴۱ | عبداللہ شفیع مہاجر |
| ۴۲ | عبداللطیف |
| ۴۳ | عبداللطیف حاجی پانی پتی |
| ۴۴ | عبداللہ ٹنڈا مولوی |
| ۴۵ | عبدالمجید |
| ۴۶ | عبدالمجید خاں مہاجر |
| ۴۷ | عبدالقادر آزاد سبحانی |
| ۴۸ | عبدالقادری مولوی ساکن دین پور |
| ۴۹ | عبدالقادری مولوی ساکن قصور |
| ۵۰ | عبدالقادر شیخ مہاجر |
| ۵۱ | عبدالرحمٰن مولانا |
| ۵۲ | عبدالرزاق صاحب حاجی |
| ۵۳ | عبدالسلام فاروقی سیّد مولوی |
| ۵۴ | عبدالوحید |
| ۵۵ | عبدالرحیم مولوی عرف محمد بشیر عرف محمد نذیر |
| ۵۶ | عبدالرحیم ساکن عظیم آباد |
| ۵۷ | عبدالرحیم مولوی ساکن رائے پور |
| ۵۸ | عبدالرحیم شیخ صاحب ساکن حیدرآباد سندھ |
| ۵۹ | عبدالرحمٰن |
| ۶۰ | عبدالرحمٰن |
| ۶۱ | عبدالرحمٰن ساکن جالندھر |
| ۶۲ | عبدالرحمٰن شیخ |
| ۶۳ | عبدالرشید |
| ۶۴ | عبدالرزاق صاحب حکیم |
| ۶۵ | عبدالسلام |
| ۶۶ | علی محمد |
| ۶۷ | انیس احمد مولوی بی اے |
| ۶۸ | انور شاہ مولوی |
| ۶۹ | عزیز گل |
| ۷۰ | عزیز الرحمٰن |
| ۷۱ | بابر ملا |
| ۷۲ | برکت اللہ مولوی بھوپالی |
| ۷۳ | دارالرشاد (الٰہیات مدرسہ) |
| ۷۴ | فقیر شاہ |
| ۷۵ | فتح محمد سندھی |
| ۷۶ | فضل الٰہی مولوی |
| ۷۷ | فصلین |
| ۷۸ | فضل محمود عرف مولوی محمود |
| ۷۹ | فضل ربی |
| ۸۰ | فضل اللہ میاں |
| ۸۱ | فضل الرحمٰن مولوی |
| ۸۲ | غالب |
| ۸۳ | غالب نامہ |
| ۸۴ | غلام حسین |
| ۸۵ | غلام محمد کشمیری |
| ۸۶ | غلام محمد صاحب مولانا آف بہاولپور |
| ۸۷ | غلام نبی |
| ۸۸ | غلام رسول مولوی |
| ۸۹ | حبیب اللہ غازی |
| ۹۰ | حبیب الرحمٰن مولوی |
| ۹۱ | ہادی حسن سیّد |
| ۹۲ | حاجی صاحب ترنگ زئی |
| ۹۳ | حکیم جمیل |
| ۹۴ | حکیم صاحب |
| ۹۵ | حمد اللہ مولوی آف پانی پت |
| ۹۶ | حنیف مولوی |
| ۹۷ | حرمت اللہ |
| ۹۸ | ہرنام سنگھ عرف ارجن سنگھ |
| ۹۹ | ہاشم |
| ۱۰۰ | حسرت موہانی |
| ۱۰۱ | حزب اللہ |
| ۱۰۲ | حضرات یاغستان |
| ۱۰۳ | حسین حیدر |
| ۱۰۴ | حسین |
| ۱۰۵ | حسین احمد مدنی |
| ۱۰۶ | عمادی |
| ۱۰۷ | جلیل |
| ۱۰۸ | جماعت |
| ۱۰۹ | جمعیۃ الانصار (انجمن طلبہ قدیم) دیوبند |
| ۱۱۰ | جمیل الدین حکیم |
| ۱۱۱ | جان صاحب باجوڑ |
| ۱۱۲ | کالا سنگھ عرف گوجر سنگھ |
| ۱۱۳ | کریم بخش |
| ۱۱۴ | قاسم المعارف |
| ۱۱۵ | کاظم بے |
| ۱۱۶ | خلیل احمد مولانا |
| ۱۱۷ | خان محمد حاجی |
| ۱۱۸ | خدا بخش |
| ۱۱۹ | خدام |
| ۱۲۰ | خوشی محمد مہاجر |
| ۱۲۱ | کوہستانی ملا |

| | |
|---|---|
| ۱۲۲ | مدرسہ |
| ۱۲۳ | مدرسہ صولتیہ |
| ۱۲۴ | محبوب خاں ساکن سہارنپور |
| ۱۲۵ | مہندر پرتاپ راجہ |
| ۱۲۶ | محمود حسن صوفی |
| ۱۲۷ | محمود الحسن مولانا |
| ۱۲۸ | مسعود |
| ۱۲۹ | متھرا سنگھ ڈاکٹر |
| ۱۳۰ | مطلوب |
| ۱۳۱ | مطلوب الرحمٰن |
| ۱۳۲ | مولانا سیف |
| ۱۳۳ | مولوی احمد چکوالی |
| ۱۳۴ | مولوی احمد ساکن رامپور |
| ۱۳۵ | مولوی محمود |
| ۱۳۶ | مولوی شائق |
| ۱۳۷ | مظہر الدین مولوی |
| ۱۳۸ | محی الدین خاں مولانا |
| ۱۳۹ | محی الدین نواب |
| ۱۴۰ | محی الدین قاضی |
| ۱۴۱ | محسن مولوی |
| ۱۴۲ | مہاجر |
| ۱۴۳ | محمد عبداللہ انصاری اناوی |
| ۱۴۴ | محمد احمد حافظ شمس العلماء |
| ۱۴۵ | محمد اکبر حاجی |
| ۱۴۶ | محمد علی |
| ۱۴۷ | محمد علی بی اے قصور |
| ۱۴۸ | محمد علی آف سندھ |
| ۱۴۹ | محمد اسلم |
| ۱۵۰ | محمد حنیف مولوی |
| ۱۵۱ | محمد حسن بی اے |
| ۱۵۲ | محمد حسن مولوی آف مراد آباد |
| ۱۵۳ | محمد حسن مہاجر |
| ۱۵۴ | محمد حسن خیاط |

| | |
|---|---|
| ۱۵۵ | محمد حسین |
| ۱۵۶ | محمد الٰہی ریل کی پٹریاں جمانے والا |
| ۱۵۷ | محمد اسماعیل خاں حکیم سیّد اجمیری بمبئی |
| ۱۵۸ | محمد اسماعیل شہید دہلوی |
| ۱۵۹ | محمد مسعود مولوی |
| ۱۶۰ | محمد میاں مولوی عرف منصور انصاری |
| ۱۶۱ | محمد محسن مولوی |
| ۱۶۲ | محمد مبین مولوی |
| ۱۶۳ | محمد صادق مولوی آف سندھ |
| ۱۶۴ | محمد سہول مولوی |
| ۱۶۵ | محمد سعید مولوی |
| ۱۶۶ | محمد سلیم |
| ۱۶۷ | محمد طرزی |
| ۱۶۸ | محمد یوسف مولوی گنگوہی |
| ۱۶۹ | مجاہدین |
| ۱۷۰ | منیر وبے |
| ۱۷۱ | مرتضٰی حسن مولوی |
| ۱۷۲ | مرتضٰی مولوی |
| ۱۷۳ | مشتاق احمد مولوی |
| ۱۷۴ | نادر شاہ |
| ۱۷۵ | نصیر احمد حافظ دہلوی |
| ۱۷۶ | نظارۃ المعارف القرآنیہ |
| ۱۷۷ | ناظم مولانا |
| ۱۷۸ | نذیر احمد کاتب |
| ۱۷۹ | نعمت اللہ |
| ۱۸۰ | نور الحسن سیّد |
| ۱۸۱ | عبیداللہ |
| ۱۸۲ | باچا ملا |
| ۱۸۳ | پشاور جہادی پارٹی |
| ۱۸۴ | پیر بخش |
| ۱۸۵ | قاضی صاحب |
| ۱۸۶ | رب نواز خاں خان بہادر |
| ۱۸۷ | رحمت علی مہاجر |
| ۱۸۸ | رائے والا مولوی |

| | |
|---|---|
| ۱۸۹ | رام پوری مولوی |
| ۱۹۰ | رمضان آف پانی پت |
| ۱۹۱ | رشید احمد انصاری مولوی |
| ۱۹۲ | رشید اللہ پیر جھنڈے والا |
| ۱۹۳ | رئیس المجاہدین |
| ۱۹۴ | رضوان شاہ |
| ۱۹۵ | صدر الدین |
| ۱۹۶ | سیف الرحمٰن مولوی صاحب |
| ۱۹۷ | سیّد نور |
| ۱۹۸ | سلیم خاں |
| ۱۹۹ | ثناء اللہ مولوی |
| ۲۰۰ | شبیر احمد مولوی |
| ۲۰۱ | شفیق الرحمٰن حکیم ساکن رام پور یوپی |
| ۲۰۲ | سیف الدین مولوی ساکن بجنور یوپی |
| ۲۰۳ | شاہ بخش حاجی ڈاکٹر سندھی |
| ۲۰۴ | شاہ نواز خاں |
| ۲۰۵ | صادق احمد مولوی |
| ۲۰۶ | شوکت علی مولوی |
| ۲۰۷ | شجاع اللہ مہاجر |
| ۲۰۸ | سراج الدین میر ساکن ریاست بہاولپور |
| ۲۰۹ | سلیمان سیّد ندوی |
| ۲۱۰ | سیّد احمد ہادی ساکن انبیٹھہ |
| ۲۱۱ | سیّد ہادی |
| ۲۱۲ | تاج محمد مولانا ساکن سندھ |
| ۲۱۳ | وحید |
| ۲۱۴ | ولی احمد مولوی |
| ۲۱۵ | ولی محمد مولوی |
| ۲۱۶ | یار محمد ساکن کابل |
| ۲۱۷ | ظفر علی |
| ۲۱۸ | ظفر حسن مہاجر |
| ۲۱۹ | ظفر محمد مولوی |
| ۲۲۰ | ظہور صاحب مولوی |
| ۲۲۱ | ضمیر الدین احمد نواب |
| ۲۲۲ | ضیاء الدین احمد قاضی |

# گوشۂ شیخ الہندؒ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ تحریک ریشمی رومال کے روحِ رواں اور عظیم مجاہد آزادی تھے۔ اگلے صفحات میں ان پر تحریر کردہ اہم مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

# شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ کمالات کے آئینہ میں

تحریر: شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ

کسی کامل کے کمالات وہی پہچان سکتا ہے۔ جو خود بھی کامل ہو:

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہ جوہری حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین صادق شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ آپ نے بچپن میں حضرت شیخؒ کو جانا، جوان ہوئے تو حلقہ درس میں حاضر رہ کر حضرت شیخؒ کو پہچانا۔ پھر مدینہ کو پہچانا۔ پھر مدینہ طیبہ سے مالٹا تک، اور مالٹا سے دیوبند تک اور دیوبند میں یعنی حیات مبارکہ کے آخری ایام تک، ہر ایک لمحہ کی زندگی اور زندگی کے ہر ایک رُخ کو پرکھا۔ اس جوہری کی ایک جامع تحریر ملاحظہ فرمایئے۔

اس میں سیاست سے بالا ہوکر پہلے حضرت شیخؒ کی روحانی عظمت کی طرف اشارے ہیں پھر علما کے کمالات کی جانب یہی دو کمالات جو حضرت شیخؒ کے حقیقی کمالات تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات ہیں جو بالا ہوگا۔ اس کے اخلاق بھی ایسے ہی بالا ہوں گے۔ اس تحریر سے اخلاقی بلندی کی بھی ایک جھلک آپ کے سامنے آئے گی۔ تقاضائے جامعیت یہ ہے کہ یہ بلندی ہری بھری ہو، تازگی لیے ہوئے ہو۔ یہ شعر و سخن کی تازگی ہے جس نے حضرت شیخؒ کی زندگی کو خزاں زدہ نہیں رکھا، بلکہ گلشن سدابہار بنا دیا تھا۔ تحریر کے آخری فقروں میں اس شادابی کا بھی تذکرہ ہے۔

جن حضرات نے مولانا مرحوم کو دیکھا ہوگا اور ان کے اخلاق لائف پر نظر ڈالی ہوگی، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا کو قدرت کی فیاضیوں نے ایک ایسا دل دیا تھا۔ جس کی وسعت سات سمندروں سے کہیں زیادہ تھی۔ اقالیم سبعہ اس کے ایک زاویہ میں بھی اپنا پتہ بتلا نہ سکتی تھیں۔

اس نے بحر امدادی سے فیوضات حاصل کیے۔ مگر ڈکار نہ لی۔ اس نے قاسمی نہریں پی ڈالیں مگر ہضم کرگیا۔ اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دھار بادلوں کو چوس لیا۔ مگر کبھی بے اختیار نہ ہوا۔ دعویٰ نہ کیا۔ شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا، شربت کو نہ چھوڑا عشق میں گھل کر لکڑی ہوگیا۔ مگر دم نہ مارا:

در کفے جان شریعت در کفے سندان عشق

ہر سنا کے نداند جام و سنداں باختن

روحانی کی بھینی بھینی بادِ صبا اس کے سویدا اور دماغ میں گونجتی ہوئی مخمور کرتی رہتی تھیں۔ مگر وہ دائرہ تمکین سے باہر نہ ہوتا تھا۔ نسبت چشتیہ صابریہ کی روشن اور اغیار سوز بجلی اس کے اطراف و جوانب اور اعضائے رئیسہ کو سوخت کرتی رہتی تھی مگر مثل شمع سوزاں کبھی اُف نہ کرتا تھا۔ طریقت کے خوش آئندہ احوال اس پر متجلی ہوتے رہتے تھے۔ مگر کبھی ان کی آواز ادنیٰ لوگوں کو سننے نہ دیتا تھا۔

اس نے فقط باطنی فیوضات کے لیے ہر قسم کے ضبط سے کام نہیں لیا۔ بلکہ علوم ظاہریہ میں بھی باوجود مجدد حدیث و فقہ و امام تفسیر و کلام وغیرہ ہونے کے کبھی اپنے آپ کو دفتر علما میں شمار نہ ہونے دیا۔ اس کی کسی حالت اور کسی عملی کارروائی سے کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ اپنے آپ کو عالم اور ہادی خلق، یکتائے زمانہ شمار کرتا ہے۔ اس نے جس فروتنی اور کسر نفسی سے اپنی زندگانی گزاری ہے وہ اہل اللہ میں بھی صرف خاص خاص لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم نے مولانا کے معاصرین اور اساتذہ کو دیکھا ہے۔ بلکہ خود ان کے ان معاصرین کو جنھوں نے مولانا کے اکثر بلکہ جملہ اساتذہ اور مشائخ کو دیکھا تھا۔ کہتے ہوئے سنا کہ فروتنی اور کسر نفسی میں تو مولانا اپنے زمانہ کے جملہ علما تو درکنار اپنے جملہ اساتذہ سے بھی سبقت لے گئے۔ پھر جبکہ کوئی فردِ بشر اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ مولانا مرحوم کی جملہ حرکات و سکنات للّٰہیت اور اخلاص پر مبنی تھیں۔ اغراض و نفسانیت کا ان میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ تو حسبِ قاعدہ نبویہ:

"من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ"۔ (جس نے اللہ کے لیے فروتنی اختیار کی۔ اس کو اللہ تعالیٰ بلند کرے گا)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کیسی اور کتنی علوشان کا بارگاہ رب العزت میں پتہ چلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ

کو حاصل ہوا وہ سب کچھ حضرت مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہما ہی کا فیض تھا۔ مگر حسن قابلیت اور مبدا فیاض کے کرم نے نہایت ہی عجیب وعدیم النظیر شگوفہ بنادیا تھا۔ اللّٰھم ارض عنہ و ارضہ و امرنا بامدادہ ۔ آمین اس قلب کو جس طرح خداوند کریم نے وسعت عطا فرمائی تھی۔ اسی طرح تحمل اور حوصلہ اس قدر عطا فرمایا تھا کہ واقف احوال دنگ رہ جاتا تھا۔ لوگوں کے وہ عیوب و اخلاق جن کو بڑا حلیم الطبع دیکھ کر آپے سے باہر ہوجائے، مولانا کی جبیں پر تغیر بھی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ معصیت خداوندی میں تو دوسری حالت تھی۔ مگر غیر معصیت اور اصلاح خلق میں اور علیٰ ہذا القیاس تکالیف و آزار کے برداشت کرنے میں تو وہ ایک نہایت بلند مضبوط پہاڑ تھے کہ جن کو نہ زلزلہ ہلاسکتا ہے۔ نہ بجلی گراسکتی ہے۔ اس تحمل اور قصد اصلاح کی بنا پر بسا اوقات کوتاہ نظروں اور ضعیف الحوصلہ لوگوں کو مولانا مرحوم کی نسبت لفظ مداہنت وغیرہ کے کہہ دینے کی بھی نوبت آئی۔ مگر جبکہ انجام اور مولانا کے دیگر احوال پر ان کی نظر پڑی تو دم بخود رہ گئے اور اپنی خطا پر مقرر ہوئے۔

فطرت نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دل و دماغ کو ذکاوت اور حفظ کا بھی وہ اعلیٰ درجہ عنایت فرمایا تھا۔ جس کی نظیر وہ آپ ہی آپ تھے۔ جن لوگوں نے مولانا کے حلق درس میں کچھ زمانہ گزارا ہوگا۔ اور پھر دوسرے علما زمانہ کی تحقیقاتیں اور علمی قابلیتوں کی سیر کی ہوگی۔ وہ خوبی جانتے ہیں کہ یہاں پر بے شبہ یہ شعر صادق آتا ہے:

وما شبہ علما البریۃ منکمو
الاالھر من اسدالشری

(سارے عالم کے علما کی مثال آپ کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے۔ جیسے گربہ اور شیر بیشہ)

خداوند کریم کے کمالات کی جس طرح کوئی حدونہایت نہیں، اسی طرح ان کی فیاضیوں کی بھی کوئی حدونہایت نہیں:

لیس علی اللّٰہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

(اللہ تعالیٰ کی قدرت کے لیے یہ عجیب بات نہیں کہ وہ سارے عالم کو شخص واحد میں سمیٹ دے)

جب کبھی کسی نے شعروسخن میں مولانا سے مذاکرہ کیا ہے تو اس قدر اُردو، فارسی، عربی کے اشعار اس کو سننے پڑے ہیں کہ اس کو سوائے حیرانی کے اور کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ قدرت نے موزونیت طبع وہ عطا فرمائی تھی کہ کھرے اور کھوٹے کو خوب پہچانتے اور اس میں تمیز کامل فرماتے تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے اشعار تالیف فرماتے تھے کہ طبقہ علما تو درکنار حذاق شعرا بھی عش عش کرجاتے تھے۔

قدرت کی فیاضیوں میں سے ایک یہ بھی بڑی فیاضی تھی کہ مولانا کے قلب و دماغ میں اسلامی ہمدردی اور انسانی غیرت، مذہبی حمیت، قومی جذبات کوٹ کوٹ کر بھردیئے گئے تھے۔ وہ فقط مدرسہ نشین یا خانقاہی بزرگ حضرات کی سی ہمّت پر اکتفانہ کرسکتے تھے۔ وہ فقط مدرسہ نشین یا خانقاہی بزرگ حضرات کی سی ہمّت پر اکتفانہ کرسکتے تھے۔ ان کی ہمّت مردانہ ان کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ ان کو قومی جذبات ہروقت بے قرار رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی حمیت ان کے لیے تمام مصائب سہل کرتی تھی۔ ان کی انسانی غیرت اغیار سے جوڑتی اور نااہل اپنوں سے توڑتی رہتی تھی۔ ان کی اسلامی اور وطنی ہمدردی ان کو کبھی اپنے سن وسال، ضعیف العمری اور امراض مزمنہ کا خیال بھی نہ لانے دیتی تھی۔ ان کو اس راہ میں نہ عزّت کا خیال تھا نہ راحت کا نہ عزیز واقارب کی فکر تھی۔ نہ مال و دولت کی۔ (سفرنامہ اسیر مالٹا، ص۳ تا ۵)

حضرت مدنیؒ کی اس تحریر میں تفصیل نہیں ہے صرف اشارے ہیں۔ حقائق بیشک ہیں مگر ان کے شواہد نہیں پیش فرمائے گئے۔ شواہد کے لیے سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے۔

ایک دوسرے جوہری ہیں حضرت مولانا سیّد اصغرحسین صاحب عرف حضرت میاں صاحب فقیہ، محدث، متوکل علی اللہ، درویش باخدا، زاہد باصفا، مرشد کامل جن سے طلبہ دارالعلوم اور ان کے علاوہ بہت سے بندگان خدا نے سالہاسال علمی اور روحانی استفاضہ کیا۔ وہ سیاسیات سے الگ رہے۔ مگر حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کو ہر دور میں پہچانتے اور پرکھتے رہے۔ 'حیات شیخ الہندؒ' آپ ہی کی تصنیف ہے۔ جو حضرت شیخ الہندؒ کی وفات سے کچھ دنوں بعد ہی شائع ہوگئی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے روحانی، علمی اور اخلاقی کمالات کے متعلق کچھ شواہد اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے جہاں تک اس تحریر کا تعلّق ہے جو آپ کے پیش نظر ہے۔ تو یہ سلسلہ 'مسلم محبانِ وطن' کی پہلی کڑی ہے۔ اس کا موضوع مخصوص ہے۔ یعنی سیاسی کارنامے اور سیاسی خدمات۔

اس سلسلہ میں آپ کا کمال وہ ہمّت عالی اور وہ بلند حوصلہ ہے جس

کی نظیر نایاب ہے۔ درس نظامی کا ایک سادہ مدرس ایک مدرسہ میں چٹائی پر بیٹھا ہوا غریب اور شکستہ حال طلبا کو پڑھا رہا ہے۔ نہ عظمت ہے نہ شان وشوکت، مگر اس کی نظر دنیا کے گوشہ گوشہ پر ہے۔ اس کے دل میں ہر پسماندہ قوم کا درد ہے۔ جگر میں شعلہ ہے جو ہر ایک سامراج کو جھلسا دینا چاہتا ہے۔ وہ نہتا ہے غیر مسلح جنگ کا کوئی سامان اس کے پاس نہیں مگر وہ اس برطانیہ عظمیٰ کی مسلح فوجوں سے ٹکرا رہا ہے، جس کی شہنشاہیت کی حدود میں آفتاب نہیں چھپتا۔ اس کا نصب العین۔ وطن عزیز کا مکمل استخلاص ہے۔ آزادی کامل سے نیچے آزادی کا کوئی بھی درجہ اس کے لیے جاذب توجہ نہیں ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سیاست قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔

"کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله." (یعنی کتنی ہی بار یہ ہو چکا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب ہو جاتی ہے۔

خود اس کا ماحول اس کی تصدیق کر رہا ہے کہ مٹھی بھر انگریز کروڑوں ہندستانیوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ اور صرف تقریباً چار صدی پہلے کی یہ بات ہے کہ اقوام یورپ کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں نکلیں اور سُرخ ہندستان (امریکہ) اور پھر اصل ہندستان پر چھا گئیں۔ وہ نہ خدا پرست تھیں نہ ہمدرد، انسانیت ان کا نصب العین دولت تھا۔ مگر وہ راز ان کو معلوم ہو گیا تھا اور اسی کو انھوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ جس سے اقلیت، اکثریت پر غالب ہو جایا کرتی ہے۔ وہ راز ہے نصب العین کے لیے ایثار یعنی نصب العین کی ایسی لگن کہ اس کے لیے ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان بھی ہنسی خوشی قربان کی جا سکے۔

حضرت شیخ الہندؒ ہندستانی تھے۔ ہندستان ان کا وطن عزیز تھا اس کو آزاد کرانا اور اس کو ترقی دینا ان کا اپنا فرض تھا۔ دوسرے ساتھ ہیں تو یہ ان کی فرض شناسی ہے نہ ساتھ ہوں تب بھی وہ اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ان پر اپنا فرض ادا کرنا بہر حال فرض ہے۔ اسی احساس نے حضرت شیخ کو آمادہ عمل کیا۔ اور یہی احساس تھا کہ جب مالٹا سے رہا ہو کر ہندستان پہنچے۔ اور یہاں انھوں نے برادرانِ وطن کو بھی دیکھا کہ وہ جنگِ آزادی میں شریک ہو گئے ہیں۔ تو مسرت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واتحاد کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں۔ اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔

حوصلہ کی اس بلندی کے ساتھ بصیرت اور فراست دیکھ کر مولانا محمد علی جوہر کا مقولہ مشہور ہے کہ ہمارے خیال وگمان میں بھی وہ بات نہیں ہوتی جس کو سوچ سمجھ کر حضرت رائے قائم کر لیتے ہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی تو بڑی خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ ترکوں اور جرمنوں کی فتح ہو رہی ہے اور اتحادی (فرانس، روس اور برطانیہ) جگہ جگہ شکست کھا رہے ہیں۔ حضرت شیخ بھی خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر آپ نے شروع ہی میں فرما دیا تھا کہ خطرہ ہے امریکہ اتحادیوں کی مدد کرے گا۔ اور کامیابی کا نقشہ بدل جائے گا۔ واقعہ یہی ہوا۔ حضرت شیخ کو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ آخر میں امریکہ نے ہتھیار فوج اور بے حد وحساب سامان جنگ سے اتحادیوں کی مدد کر کے جرمن اور ترکوں کی فتح کو بدترین شکست سے بدل دیا۔

طائف جاتے ہوئے مکہ معظّمہ کے چند روزہ قیام میں آپ نے حالات کا کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔ طائف پہنچے تو رفقا مطمئن تھے کہ شریف مکہ ترکوں کا وفادار ہے۔ طائف میں خلفشار کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر حضرت شیخ طائف کے قیام پر مطمئن نہ تھے۔ روانگی کا اصرار کر رہے تھے۔ اچانک شریف نے ترکوں سے بغاوت کر دی۔ اور شریف کے دباؤ سے بدوؤں نے طائف پر حملے شروع کر دیئے۔ طائف پر سب طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ تب رفقا کو احساس ہوا کہ روانگی کے لیے حضرت شیخ کے اصرار کا سبب یہ مستقبل تھا۔ جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اور حضرت شیخ اس کو دیکھ رہے تھے۔ آپ کا یہی حوصلہ، یہی فہم وفراست اور یہی تدبر تھا کہ اس وقت کے وہ سیاسی رہنما جو نہ صرف اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے بعد بھی ان جیسے رہنماؤں سے ہندستان خالی ہے۔ مثلاً حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبیداللہ سندھی، آپ سے باقاعدہ بیعت تھے یا آپ کے ارادت مند تھے۔ اور ریشمی خطوط سازش کیس مرتب کرنے والوں کا یقین تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے علاوہ خان عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی بھی اس سازش میں شریک تھے۔ □□

# شیخ الہند مولانا محمود حسن زندہ ہیں زندہ رہیں گے

مولانا عزیز الرحمٰن (مہتمم مدرسہ جامعہ رحیمیہ ڈکی، پشاور، پاکستان)

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک عظیم محدث، عظیم مفسر، عظیم متکلم، عظیم صوفی اور عظیم مجاہد تھے، جنھوں نے انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھ ڈالی، غلام قوم کو آزادی اور حریت کا درس دیا، مصیبتیں جھیلیں، جیلیں کاٹیں، جلاوطنی برداشت کی، دوست و دشمن کی اذیتیں خندہ پیشانی سے جھیلیں، جس کی بدولت ہندستان کی قسمت کی کایا پلٹی۔

انگریز ہندستان سے بھاگا، غلامی نے فرار کی راہ اختیار کی، اور ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور آئی، اور آج ہم ایک آزاد ملک میں آزاد قوم کی حیثیت سے ملک کے اسی عظیم محسن شیخ الہند مولانا محمود حسن کو گلہائے عقیدت پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا منصوبہ یہ نہیں تھا کہ فقط ہندستان آزاد ہو، بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان تمام ممالک کو آزادی کی نعمت میسر ہو جو کہ انگریز سامراج کی غلامی میں نیم مردنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ان کو یقین تھا کہ ہندستان کی آزادی سے انگریز کی گرفت بہت ڈھیلی پڑ جائے گی، دوسرے اسلامی ممالک معمولی سا دھکہ دے کر نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، چنانچہ ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ہندستان کے آزاد ہونے کے بعد انگریز کو تمام مقبوضات سے دست بردار ہونا پڑا اور پاؤں گھسیٹتے گھسیٹتے برطانیہ لوٹ جانے پر مجبور ہوا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی بیسویں صدی کی تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس نے سب سے پہلے مکمل آزادی کو نصب العین ٹھہرایا اور بہانگ دُہل کہا انگریزو ہندستان چھوڑ دو، یہاں سے نکل جاؤ، چنانچہ آزادی کی یہ جنگ ہندستان کے ۱۶ صوبوں میں لڑی گئی، بازاروں اور گلی کوچوں میں، مساجد اور خانقاہوں میں، مدرسوں، کالجوں اور اسکولوں میں، جدہ، مصر، مالٹا، مراد آباد، دہلی اور کراچی کی جیلوں میں لڑی گئی۔

آزاد قبائل مہمند، اتمان، خیل، افریدی، وزیر، مسعود اور بونیر سوات کے سنگلاخ اور فلک بوس پہاڑوں میں لڑی گئی۔

جس کی ابتدا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ہاتھوں ہوئی۔ اور فتح و کامرانی اس کے تمام محاسن و کمالات کے سچے اور حقیقی وارث اور جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہاتھوں مقدر تھی، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد مولانا عبیداللہ کا افغانستان جانا، ریشمی خطوط کا سلسلہ، افغان جرنیل نادر خان کا پاڑہ چنار کے راستہ سے انگریزوں پر حملہ آور ہونا۔ ٹل اور ہنگو کے قلعوں کو فتح کرنا۔ حاجی صاحب ترنگ زی کی بونیر کو ہجرت، اور سب سے پہلے اقوام بونیر کو بونیر کے پہاڑوں سے انگریزوں کے خلاف جہاد پر لے آنا۔

پھر علاقہ مہمند میں مستقل سکونت اختیار کر کے لگاتار جہادوں کا سلسلہ جاری رکھنا اور آزاد قبائل باجوڑ کے 'رنگیے' مقام کو شیخ الہند کے حکم کے مطابق فخر افغان مولانا فضل محمود مخفیؒ علاقہ 'دیر سیند' والے کی وساطت سے جہاد کا مرکز ٹھہرانا تاریخ کے انمٹ اور درخشاں نقوش ہیں۔

صوبہ سرحد کے اندر بابائے افغان باچاخان کی قیادت اور علمائے حق کی سرپرستی میں قصہ خوانی بازار پشاور شہر میں گورکوں کی گولیاں پٹھان سینوں پر کھاتے رہے اور بڑے بلند حوصلے، جرأت و ہمّت اور مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

ہزاروں حرّیت پرستوں کے جتھے انگریزوں کے گھوڑوں کے آگے دراز ہو کر ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندے گئے، سخت جاڑے کے زمانے میں جبکہ پانی یخ بستہ تھے جنگِ آزادی کے جوانوں کو آزادی کی جنگ لڑنے کے جرم میں انگریزوں اور ان کے حاشیہ برادروں کے ہاتھوں اس میں غوطے کھانے پڑے۔

جلیانوالا باغ کے سبزہ زار میں جنگِ آزادی کے جوانوں پر گورکھوں اور انگریزوں نے باڑ چلایا تو وہ سبزہ زار سُرخ فرش میں تبدیل ہو گیا۔

سالہا سال کی یہ دلخراش جدوجہد آزادی، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھ پر بیعتوں، تربیتوں کا نتیجہ تھی، شیخ الہند کی مثال ایک تناور درخت

کی ہے جس کی بڑی بڑی شاخیں پھیل کر جہاں پر سایہ فگن ہو، اور لوگ بلاتفریق مذہب وملّت اس کے برگ وبار سے محفوظ ہوتے ہوں، چنانچہ اس تناور درخت کی شاخوں کو شمار میں لانے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ مفتی ہند مولانا مفتی کفایت اللہؒ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا میاں عزیر گل صاحب کاخیل مولانا عبدالرحیم پوپلزی پشاور شہر، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی وغیرہ جیسے برگزیدہ عظیم شخصیتوں کے مالک، مدقق ومحقق علما کرام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قدآور شخصیت کے عکس جمیل ہیں جن کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں فیض یافتہ تربیت یافتہ شاگرد اور خلفا ہیں جو کہ دنیا بھر کے لیے باعث رحمت وہدایت ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کے خلفا مجاز اور شاگردوں کی تعداد سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تنہا ان کے خلفا جنھیں چاروں طریقوں چشتیہ نقشبندیہ قادریہ سہروردیہ میں بیعت کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ ۱۶۷ ہیں اور شاگردوں کی تعداد تو ۳۸۵۶ ہیں پھر یہ تعداد دارالعلوم کے تلامذہ کی ہے مدینہ منورہ اور سلہٹ کے مستفدین اس کے علاوہ ہیں۔ اس سے شیخ الہندؒ کے دوسرے شاگردوں اور خلفا کا اندازہ لگائیں اور پھر خلفا کے خلفا اور شاگردوں کے شاگرد تو یقیناً لاکھوں سے تجاوز کرتے ہوں گے۔

چنانچہ اہل حق کا یہ قافلہ آج بھی اپنے مرشد واستاذ کے نقش قدم پر پورے استقامت ومتانت کے ساتھ رواں دواں ہے، اور ہر باطل کے مقابلہ میں مضبوط چٹان کی طرح اس کا ہر فرد ڈٹا ہوا ہے، مرزائیت ہو، دہریت ہو، نیچریت ہو آغاز خانیت ہو، مودودیت ہو، الغرض کوئی بھی گمراہ فرقہ ہو ان سب کے مقابلے میں علماحق کی یہ جماعت سینہ سپر ہے۔

غرض آج دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی حق کی کسی بھی شکل میں کوئی صحیح خدمت ہورہی ہے تو وہ انھیں بزرگان دین اور علمائے حق کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ضرور ہوگی، اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ہی کے برگ وبار اور فیض یافتہ ہوں گے اس لیے ہم اس دعویٰ میں صادق ہیں کہ شیخ الہندؒ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ □□

# ترانۂ ملک و ملّت

## مولانا محمد راشد اعظمی

اُٹھو اہلِ چمن کلیوں کو پھر وہ بانکپن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

زباں اپنی رہے گی آہ محروم فغاں کب تک
گریں گی آشیانوں پر ہمارے بجلیاں کب تک
ہمارے خون سے کھیلیں گے ظالم ہولیاں کب تک
لٹے گی عفتِ مریم بتا اے آسماں کب تک

اُٹھو پھر سازِ دل کو نغمۂ دار و رسن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

اُٹھو پھر آج دل میں جذبۂ سوزِ دروں لے کر
پہاڑوں کو بھی دہلاتی ہوئی شانِ جنوں لے کر
رگوں میں موجزن اسلاف کا اپنے وہ خوں لے کر
خزاں آغوش گلشن میں بہارِ لالہ گوں لے کر

بچا کر ملک وملت سب کو پیغام امن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

خروشِ جذب دل عزم جواں تحریکِ طوفاں سے
گزر جانا ہے بے خوف وخطر دیوارِ زنداں سے
یہ حق تلفی، جفا کیشی وفا کاروں کے ارماں سے
یہ اندازِ ستم آئینِ جمہوری کے عنواں سے

اُٹھو ہر ظلم کے ناپاک ماتھے کو شکن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

ہمارا اسعدِ مدنی امیرِ کاروانِ دل
زعیمِ ملک و ملت اور وفا کا پیکرِ کامل
عروجِ آدمِ خاکی ہے جس کی وسعتِ منزل
وہ آپہنچا ہے طوفانوں سے ٹکرانے لبِ ساحل

اسی کے ہاتھ میں اپنا ہر اِک تارِ کفن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

نگاہِ باغباں کرتی ہے کیوں بے آبرو ہم کو
چمن میں کیوں نہیں ملتا نہالِ آرزو ہم کو
مساوات و اخوت کی ہے پیہم جستجو ہم کو
وطن کی گود میں رہنا ہے راشد سرخرو ہم کو

دلوں کی تنگیوں کو وسعتِ چرخِ کہن دے دیں
گلوں کو تازگی کانٹوں کو پھولوں کا چلن دے دیں

# شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ

مولانا مختار احمد فاروقی (صدر جمعیۃ علماء احمد آباد)

۱۸۵۷ء میں ہندستان کی جنگ آزادی لڑی گئی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا، اس سے قبل اسلامی علوم اور فنون کا بڑا سرچشمہ شاہ ولی اللہ تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے دوران یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور علمی حلقے منتشر ہوگئے۔ ۱۸۶۶ء میں خاندانِ شاہ ولی اللہ کے علمی وروحانی جانشینوں نے اس سلسلے کو زندہ کیا اور ہندستان میں دینی تعلیم کی نشاۃِ ثانیہ کے امام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے رفقائے کار تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مشورے سے اسلامی دنیا کے مشہور ومعروف علمی مرکز دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس دینی ادارے کے بارے میں اکابرین کی بشارتیں اس کے قیام کے پہلے اوراس کے قیام کے بعد بہت ہیں۔ بلاشبہ اس بارے میں سبھی بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ علامرکز قیامت تک اِن شاءاللہ قائم رہے گا۔

اسی دارالعلوم کے اوّلین مایہ ناز طالب علم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تھے جو ملک وقوم کی خدمت میں زندگی بھر لگے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے لائحۂ عمل اور طرزِ فکر کا منبع حضرت مولانا محمود حسن کی ذاتِ گرامی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی پیدائش ۱۸۶۷ء کی جہادِ آزادی سے سات سال پہلے ۱۸۵۱ء میں ہوئی تھی۔ قدرتی طور پر آپ اس وقت کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

**تعلیم و تربیت:**

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد ہیں جنھوں نے سب سے پہلے استاذ ملا محمود کے سامنے کتاب کھولی۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا ذوالفقار تھا جو سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ اس لیے آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی۔ وہ بھی ایک مشہور عالم دین تھے۔ قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آ گیا اور آپ اس میں آ گئے۔ پھر اسی دارالعلوم کے طلبا کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی۔ آپ نے اپنے علم کا فیضان جن دوسرے لوگوں تک پہنچایا ان میں حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا منصور انصاریؒ، حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ جیسے نامور علما شامل تھے۔

**سیاسی زندگی:**

ابھی انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی کہ مادرِ وطن کے اس سپوت کے ذہن پر انقلابی اثرات نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔ آپ کی فکر بلند، قلب فراخ اور نظر وسیع تھی۔ آپ فکر وعمل کی متوازن علامت تھے اور مسلمانوں کے لیے آبرومندانہ زندگی چاہتے تھے۔ جب جنگ طرابلس اور بلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے ہندستان سے برطانوی حکومت کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی۔ آپ کی ملت پروری کے جذبات نے آپ کو سب سے زیادہ پریشان اُس وقت کیا جبکہ بلقان کی جنگ ہو رہی تھی اور ہندستان سے طبّی وفد ترک سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہ مسندِ درس وتدریس پر ہوتے ہوئے بھی تڑپ اُٹھے۔ شیخ الہندؒ نے بیک وقت دینی اور سیاسی تعلیم وتربیت میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا اور یہ ذمہ داری آپ نے بحسن وخوبی نبھائی۔

مولانا رسول میر تحریر فرماتے ہیں: میرے مطالعے اور غور وفکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی زندگی کے آغاز میں ہی ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے عملی لباس پہنانے کی کوششیں آپ نے اُس وقت شروع کر دی تھیں جب ہندستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے، مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی اور ثریا سے تحت الثریٰ جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریقۂ عمل پر گامزن ہوں۔ اپنے احباب بہت کم نظر آتے تھے، جن کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکے اور جو پیشِ نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتیٰ الامکان محفوظ رکھیں۔

بہرصورت آپ نے یہ نقشہ تیار کیا کہ ۱۸۵۷ء کے تجربات کی روشنی میں سردست کوئی عملی جنگ تو لڑنا دشوار ہے تاہم یہ لڑائی ذہنوں کے ذریعہ ضرور لڑی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اسلامی درسگاہوں کا جو جال بچھایا گیا اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ان مدارس کے ذریعے ایسے افراد تیار کیے جاسکیں جو ملک کو آزاد کرانے میں بیش قیمت خدمات انجام دے سکیں۔ ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کے قیام کے بعد سہارنپور، بجنور، مرادآباد اور متعدد مقامات پر دینی مدارس کا ایک جال پھیلا دیا گیا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ کی گہری نظر واقعاتِ عالم بالخصوص ہندستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے حالات اور ہندستان میں انگریزوں کے مظالم نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ نتائج سے بے پرواہ ہوکر آپ کو میدانِ انقلاب میں آنا پڑا۔ اس دوران پہلی جنگ یوروپ سے شروع ہوگئی۔ دو تین ماہ بعد ترک انگریز کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان بھیجا تاکہ امیر حبیب اللہ خان کو خدمتِ اسلام کے لیے آمادہ کیا جاسکے۔ حاجی ترنگ زئی، مولانا سیف الرحمٰن، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل محمود اکبر، حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد تھے۔ ہندستان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا آزاد، مولانا محمد جوہر علی، حکیم اجمل خان اور متعدد دیگر ارکان ان کے مشیر اور معاون تھے۔ حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون سے مولانا آزاد کی معرفت پانچ ہزار روپے لے کر مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ مولانا سندھیؒ سی آئی ڈی کی نظروں سے بچ کر بہاولپور اور سندھ گئے اور پھر وہاں سے افغانستان پہنچے۔ مولانا نے ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچ کر امیر حبیب اللہ خان اور ان کے فرزند سردار غیاث الدین خان سے ملاقاتیں کیں اور سب سے پہلے افغانستان میں ایک ایسی قومی حکومت تیار کی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے۔

مولانا سندھیؒ نے کابل سے ریشمی رومال پر ایک خط لکھ کر مختلف واسطوں سے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں بھیجا مگر یہ خط راستے میں خان بہادر نواب کے ہاتھ آگیا اور انھوں نے یہ خط پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈائر کو دے دیا۔ حکومت کو اس بات کا پتہ چل گیا اور حضرت شیخ الہندؒ کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ شروع میں گرفتاری سے بچنے کے لیے آپ باہر چلے جانا چاہتے تھے تاکہ جیل کی زندگی میں اوقات ضائع نہ ہوں۔ اگرچہ مولانا آزاد کی رائے یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے بلکہ گرفتاری قبول کرلینی چاہیے۔ مگر حضرت شیخ الہندؒ حجاز چلے گئے۔ ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کے گورنر تھے اور چاہتے تھے کہ تمام ہندستانیوں کو کامل آزادی دلانے پر آمادہ کرلیا جائے اور ہم بھی ہندستان کی آزادیِ کامل کی حمایت کریں گے۔

شریف حسن نے انگریزوں سے خفیہ معاہدہ کرلیا اور حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرادیا۔ حضرت کو مالٹا میں نظر بند کردیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے محض تحریکِ آزادی میں تنہا حصہ نہ لیا بلکہ ایک ایسا طائفہ تیار کیا جو آپ کے کام کو آگے بڑھا سکے۔ آپ نے ۱۸۷۸ء میں 'ثمرۃ التربیت' کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس میں آسمانِ سیاست کے روشن شاگردوں کو شامل کیا گیا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی کا نام نامی سب سے اوّل ہے۔ دیگر حضرات میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا عزیرگلؒ، مولانا عبدالرحیمؒ شامل تھے۔ ان کی معیت میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی وغیرہ سیاست کے میدان کے شہسوار بنے۔ ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار کا قیام عمل میں آیا کیونکہ حضرت شیخ الہندؒ دینی و سیاسی دونوں طرح کی تعلیم و تربیت کی ضرورت محسوس کررہے تھے۔

۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دلّی میں 'نظارۃ المعارف القرآنیۃ' کے نام سے ایک مرکز قائم کیا۔ آپ دلّی میں نوجوانوں کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہ کام مولانا سندھیؒ نے ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کے توسط سے انجام دینے کی کوشش کی۔

### افکار و خیالات:

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ: ''میں خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درماں ہوسکتا ہے، اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم و دائم جوش کی، نہایت صابرانہ ثبات قدم کی، دلبرانہ مگر عاقلانہ طریق پر عمل کی، اپنے نفس پر قابو پانے کی اور ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش محمدی بننے کی۔''

آگے چل کر آپ نے فرمایا کہ: ''موقع کہ متکلم اور مخاطب کے دل

میں سعی جمیلہ کا جذبہ اس کے اخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح میں قوتِ عمل، اس کے ارادوں میں پختگی اور چستی نہ ہو محض گرم جوشانہ تقریریں کسی ایسی کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کرسکتیں۔ کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دِکھائی دیا ہے۔'' آپ نے تلقین فرمائی کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوند قدیر کی امداد کے سامنے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ آپ نے کہا کہ میں یہاں اپنی ایک گمشدہ متاع کو پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اُٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔ آپ نے کہا کہ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یوروپ کو اپنا شاگرد بنادیا۔

**حضرت شیخ الہندؒ کی جمعیۃ علماء سے وابستگی:**

مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت شیخ الہند ہندستان پہنچے۔ ملک گیر پیمانے پر مداحوں اور قوم پرستوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے جذبۂ حریت سے اثر لیا۔ غالباً اسی جذبۂ حریت نے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ڈالی۔ ہندستان آنے پر حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ آزادیِ وطن کی تحریک میں شرکت کی۔ حضرت شیخ الہندؒ جب بمبئی میں جہاز سے اُترے تو ان کو لینے کے لیے مولانا محمد علی شوکت اور خلافت کمیٹی کے دوسرے ارکان موجود تھے۔ لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور احمد آباد سے گاندھی جی ان کو لینے آئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے کہنے پر برطانوی حکومت کے خلاف ترکِ موالات کا فتویٰ دیا گیا جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہوگیا۔ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس دوم کے لیے جو ۱۹/۲۰/ اور ۲۱/ نومبر ۱۹۲۰ء کو دلّی میں ہوا تھا، دیئے گئے خطبۂ صدارت میں آپ نے فرمایا کہ: ''وہ کون سے واقعات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اس قدر بے چین ومضطرب کردیا ہے اور کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے بیرونِ ہند کے رہنے والے بھائیوں سے ہمدردی اور ان کی اعانت فرض ہوگئی ہے۔ اس کا جواب سننے کے لیے پتھر کا دل اور فولاد کا کلیجہ درکار ہے۔ برطانوی مدبرین نے اپنی مسلم رعایہ کی تسلی کے لیے وقتاً فوقتاً چند اعلان شائع کیے جن میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا کہ ان کے مقاماتِ مقدسہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اگرچہ مسلمانوں کا ان وعدوں پر یقین کرکے مطمئن ہونا ایک سخت غلطی تھی لیکن مسلمان اس وعدہ پر مطمئن ہوگئے اور سلطنت برطانیہ کی جانی و مالی امداد کرکے شاندار فتح ہونے کے باعث بنے۔ شاطرین برطانیہ نے ہوا کا رُخ موافق دیکھ کر مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کرلیا۔ قسطنطنیہ کو فوجی قبضہ میں دبوچ لیا۔ سمرنا پر یونانیوں کو قبضہ دلادیا، عرب کو لالچ دے کر خلیفۃ المسلمین سے باغی کردیا۔ ترکی فوجوں سے ہتھیار رکھوالیے اور ذلت آمیز شرائط پر صلح کرنے پر مجبور کردیا۔ ان لڑائیوں میں شام، عراق، عرب، سمرنا اور ترکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے۔ لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے، لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے، ہزاروں کلمہ گو خاندان ویران ہوکر وطن بھاگ نکلے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

یہ ہیں وہ روح فرسا جاں سوز واقعات جنھوں نے تمام عالم کے مسلمانوں کو بے چین کردیا جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان باقی ہو وہ سیماب اور بے قرار ہے اور اپنا شرعی، اخلاقی اور قانونی حق سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت واعانت کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ فریضہ تو اپنے مسلمان بھائیوں کی اعانت اور امداد کے متعلق تھا مگر انسانی ہمدردی اور اخلاقی مروّت کے باعث غیر مسلم بھی مسلمانوں کے دوش بدوش کام کررہے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہندستانی مسلمانوں کو ان کے فرائض کی طرف احساس دلاتے ہوئے فرمایا:

''اب سوال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے ان فرائض کے ادا کرنے کی کیا سبیل ہے۔ نہ صرف ہندستان بلکہ اقصائے عالم میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو ان فرائض کی واقفیت سے منکر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک تلاطم برپا ہے۔ ہر شخص بے چین اور مضطرب ہے۔ خلافت کمیٹیوں کی کثرت اور عام جلسوں اور مظاہروں کی نوعیت اس کی بین دلیل ہے مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی خوف کی وجہ سے ان کے دلوں پر مسلط

ہوگیا ہے۔ اس فریضہ کے عائد ہونے میں طرح طرح کے شبہات نکالتے ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ علمائے ہند کی کثیر جماعت یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ چونکہ ہندستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعتِ اعدا کے مادّی اسباب نہیں۔ توپیں، ہوائی جہاز، بندوقیں ان کے ہاتھ میں نہیں، لیکن انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک برطانیہ کے وزرا اسلامی مطالبات تسلیم نہ کرلیں اُس وقت تک تمام ہندستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہنچے، اس اخلاقی جنگ کا نام ترکِ موالات ہے۔

برطانیہ کی مسلمانوں سے مذہبی لڑائی تھی کیونکہ ترک کے ساتھ صرف ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ تمام ناانصافیاں روا رکھی گئیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو یونانیوں کے مظالم سے ہزاروں مسلمان سمرنا سے گھر بار چھوڑ کر بھاگے۔ قسطنطنیہ کے بہت سے معززین کو مالٹا بھیج دیا گیا لہٰذا اب کسی مسلمان کو برطانیہ کے ساتھ ترکِ موالات کے حرام ہونے میں شبہ نہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ اگر آج مسلمان کے ایمان پختہ ہوجائیں اور خدا تعالیٰ کے وعدۂ نصرت پر بھروسہ ہوجائے اور تکالیف کے برداشت کرنے میں صبر و استقامت سے کام لیا جائے تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ برادرانِ وطن نے تمھاری اس مصیبت میں جس قدر تمھارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کررہے ہیں وہ اخلاقی مروّت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام احسان کا بدلہ احسان قرار دیتا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ تمام اسلامی مدارس کو ایک سلسلے میں منسلک کرنا بھی علما کے فرائض میں داخل ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے یہ بھی فرمایا کہ برطانیہ کا یہ دعویٰ کہ وہ کسی کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتی۔ آپ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندستان کے مسلمان اپنے مذہبی امور پر آزادی کے ساتھ عمل کرسکتے ہیں۔ آج مولوی ظفر علی، مولوی لقاء اللہ، صوفی اقبال احمد، مولوی محمد فاخر اور اسی طرح دوسرے فرزندانِ ہند کس جرم میں قید خانوں میں بند ہیں۔ کیا انھوں نے مذہبی احکام کی تبلیغ کے سوا اور کوئی گناہ کیا تھا؟

حضرت شیخ الہندؒ کے ایک آخری تحریری بیان میں جو جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دلّی میں پڑھ کر سنایا گیا، کہا گیا ہے:

''اگر ہم تجاویز پاس کر کے اور صرف چند ساعات کی گرمیِ محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہوگئے تو ہماری مثال ٹھیک اُس مریض کی سی ہوگی جو اکسیرِ شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا رہے لیکن اس کا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔''

جو لوگ آج آزادی کے مزے لے رہے ہیں ان کو یہ جاننے کی مطلق پرواہ نہیں کہ یہ آزادی کن لوگوں کی قربانیوں کے نتیجے میں ہم تک آئی ہے۔ سامراجی طاقت کا شیرازہ بکھیرنے اور ملک وقوم کی خدمات انجام دینے میں جمعیۃ علماء ہند نے جس طرح سے سر اور دھڑ کی بازی لگائی وہ آج تاریخ سے محو کیا جارہا ہے۔

ہمارے میڈیا اور اخبارات نے ان بزرگوں کی خدمات کو یکسر فراموش کردیا جو کہ ہندستان کی آزادی کے اصل بانی ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا شمار انھیں چند ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندستان کی آزادی کی داغ بیل اُس وقت ڈال دی تھی جب ایسا کرنا تو کجا سوچنا بھی محال تھا۔ اس سلسلے میں کتنی بار مسلح جنگیں کرنی پڑیں۔ کتنے مقدمات لڑنے پڑے، کس قدر عدالتوں کی سرگردانی کرنی پڑی، یہ سب داستانِ پارینہ بن چکی ہے۔ پرچمِ آزادی کو لہرانے سے قبل کس قدر قربانیاں دینی پڑیں، کاروانِ آزادی کو کس کس طرح سے سازشوں کا شکار بنایا گیا، اسے آج کا نوجوان جانتا ہی نہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا رسمی طور پر اگرچہ ۱۹۱۹ء میں قیام عمل میں آیا لیکن یہ تحریک شاہ ولی اللہؒ کے سلسلے سے نہ صرف ہندستان بلکہ عالمِ اسلام میں اسلامی روایات اور فرائض وسنن کے تحفظ کے لیے شب وروز کام کرتی رہی اور آج بھی یہ خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس کے بہت سے شاندار کارنامے رازداری کی ضرورت کے تحت آنکھ سے اوجھل ہیں۔ چنانچہ تحریک شیخ الہندؒ ریشمی رومال خطوط سازش کیس کا بہت سا شاندار ریکارڈ زمانہ کی دست برد کی نذر ہوگیا اور آج حالت یہ ہے کہ تاریخ کا کوئی طالب علم مشکل ہی سے اس عظیم المرتبت شخصیت کے نام سے واقف ہوگا

چہ جائیکہ وہ کارنامے جنھوں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس سے بہت پہلے افغانستان کی جلاوطن حکومت کے ذریعے سے ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔

آپ نے ترکِ موالات پر نہایت دیانت داری سے عمل کرنے کی تلقین کی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ تحریک ترکِ موالات کو موجودہ حالت میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیے جو نقصِ امن کی موجب ہو۔ اس کو دانتوں سے پکڑ لیا جائے، ورنہ فائدہ کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا کہ اپنے مدارس اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی اپنی حسیات اور قومی خصائل پر اس کا نظام قائم کیا جائے۔

چنانچہ یہی وہ بنیادی اصول تھے جن کو جمعیۃ علماء ہند نے اپنے سامنے رکھا اور اس طرح جمعیۃ علماء ہند حضرت شیخ الہندؒ کی وابستگی کے بعد ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور بنیادی عناصر کو آگے بڑھاتی رہی اور آج بھی اس نے اکابرین کے نقشِ قدم کو اپنی کامیابی کے لیے بنیاد مانا ہے۔

**علمی و دینی خدمات:**

غرض کہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی شخصیت اپنے علم و نقوش، سیاسی سوجھ بوجھ، اخلاق و سیرت، ملّی، دینی اور قومی خدمات کے لحاظ سے جامع کمالات ہے۔ شیخ الہندؒ پر جو کام ہو چکے ہیں ان کا سرسری تذکرہ بھی ضروری ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے سوانح اور قید و بند کے حالات پر مشتمل ۲۴ صفحات کا ایک رسالہ ۱۹۱۸ء میں دلّی پرنٹنگ ورکس سے شائع ہوا تھا جسے صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام دلّی نے چھپوایا تھا۔ بظاہر یہ کام حضرت شیخ الہندؒ کی اپنی حیات میں ہی انجام پا گیا تھا اگرچہ اس پر کسی مصنف کا نام نہیں۔

دیوبند کے صاحبِ نسبت بزرگ حضرت میاں سیّد اصغر حسین نے 'حیاتِ شیخ الہندؒ' کے نام سے پہلی سوانح تصنیف کی جو شیخ الہندؒ کی وفات یعنی ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کے چند ماہ بعد شائع ہوگئی تھی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے 'سفرنامہ شیخ الہند' مرتب کیا جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کی وطن سے روانگی سے شروع ہوتا ہے اور حجاز پہنچنے، وہاں پیش آنے والے حالات اور وہاں سے مصر اور مالٹا کے سیاسی قیدی کی حیثیت سے زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ 'علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے' مولانا سیّد محمد میاں کی تصنیف ہے۔ اس میں منجملہ دیگر علماء کے شیخ الہندؒ کے حالات اور آپ کے مجاہدانہ کارناموں کا بھی ذکر ہے۔ شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے 'نقشِ حیات' کے دونوں حصوں میں جگہ جگہ شیخ الہندؒ کا ذکر فرمایا ہے اور مالٹا کی اسارت کے دنوں کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ یہ ایک مستند ماخذ ہے۔ 'تحریک ریشمی رومال' از مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ مرتب مولانا عبدالرحمٰن، یہ کتاب ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور 'نقشِ حیات' نیز 'سفرنامہ شیخ الہند' کی تحریروں پر مبنی ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے 'تذکرہ شیخ الہند' لکھا۔ ۳۶۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں مدنی دارالتالیف بجنور سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر اقبال حسین خان نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان 'شیخ الہند مولانا محمود حسن: حیات اور علماء کے کارنامے' بنایا۔ اس میں دینی علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور عملی کاموں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

مولانا سیّد محمد میاں کی ایک اور گرانقدر تصنیف 'تحریک شیخ الہند' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ریشمی خطوط سازش کیس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کون کیا تھا اور محفوظ سرکاری ریکارڈ کا اُردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کے قلم سے پیش لفظ لکھا گیا ہے۔ فدائے ملت حضرت مولانا اسعد مدنیؒ نے لکھا کہ اس ریکارڈ سے ریشمی خطوط سے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ کچھ افراد کی جدوجہد کا بھی علم ہوتا ہے مگر حضرت شیخ الہندؒ کی پوری تحریک کے متعلق پوری معلومات میسر نہیں آتیں۔

مولانا سیّد محمد میاں کی ایک اور کتاب جو اس موضوع سے متعلق ہے 'اسیرانِ مالٹا' کے نام سے ہے۔ اس میں شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا سیّد وحید احمد مدنیؒ اور مولانا حکیم سیّد نصرت حسینؒ کے حالات لکھے ہیں۔

جنوری ۱۹۸۶ء میں دلّی میں شیخ الہندؒ پر ایک سیمینار ہوا اور ان مقالات کو 'مقامِ محمود' کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے۔

یوں تو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں، لیکن دینی اعتبار سے جو محنت ان کو بلند مقام عطا کرتی ہے، وہ ان کا ترجمہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی چند اور مشہور تصانیف ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

ادلہ کاملہ، اظہار الحق، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ فی

توضیح اوثق العریٰ، التلمیع مفاسد التجمیع، الجھد المقل فی تنزیہ المعزو المزل ،مقدمہ ترجمہ قرآن شریف اور الابواب والتراجم۔ان کے علاوہ آپ کے خطبات وتقاریر پر مشتمل بہت سے رسالے اور کتابیں بھی موجود ہیں۔ ان میں 'مقالاتِ شیخ الہند'، 'افاداتِ محمودیہ' اور 'خطباتِ شیخ الہند' خاص طور پر مشہور ہیں۔

**شاعری کا ذوق:**

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے شاعری بھی کی ہے۔حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب نے حضرت کے منظوم کلام کو جمع کر کے شائع کرایا۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی وفات پر حضرت نے ایک مرثیہ لکھا تھا۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری نے 'شیخ الہند مولانا محمود حسن: ایک سیاسی مطالعہ' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب نے 'مکتوباتِ شیخ الہند' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔حضرت شیخ الہندؒ کے فتاویٰ کو بھی مرتب کیا گیا ہے۔فتاویٰ نویسی کی تاریخ،نوعیت اور حیثیت کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔

مولانا آزاد خود نابغۂ روزگار تھے، مگر حضرت شیخ الہندؒ کے علمی کارناموں سے متاثر تھے اور آپ کی بزرگی اور علم وتقویٰ کا اعتراف بھی کیا ہے۔

جنگ عظیم کے خاتمہ پر حضرت شیخ الہندؒ کو مالٹا سے ہندستان آنے کی اجازت ملی۔ ۲۰/رمضان المبارک ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۸ھ کو آپ بمبئی آئے۔ مالٹا میں صعوبتیں اُٹھاتے اُٹھاتے آپ کی صحت کمزور ہوگئی تھی اور بڑھاپے کے آثار واضح ہوگئے تھے، مگر آپ نے پھر بھی سیاسی کاموں میں شرکت کی۔ جب بیماری نے گھیرا تو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے یہاں دلّی علاج کرنے کی غرض سے لایا گیا۔حکیم اجمل خاں بھی شریکِ علاج تھے،مگر وقت موعود آچکا تھا اور ۱۸/ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء کی صبح اس دارِفانی سے دارِبقا کے لیے سدھار گئے۔ جنازہ دیوبند لایا گیا اور حضرت نانوتویؒ کی قبر کے قریب یہ گنجینۂ جامع کمالات دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

تاریخِ انسانی میں یہ فخر اسی سرزمین کو حاصل ہے کہ یہاں مختلف فرقوں، مذاہب،ثقافت اور روایتوں کے لوگ شیر وشکر کی طرح مل جل کر رہتے چلے آئے ہیں۔ کثرت میں وحدت کے اس قابلِ فخر گلستان کی اپنی خصوصیت کے باعث ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ یہاں آئے اور ہمیشہ کے لیے یہاں کے ہوکر رہ گئے۔

یہاں آریہ آئے، یونانی آئے، یہاں پارسی آئے، یہاں عرب آئے، یہاں افغانی آئے، یہاں ترک آئے اور ایرانی آئے۔مادرِوطن نے سب کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ماں کا پیار دیا۔اس ماں کو اس بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ ان کے بچوں کا مذہب کیا تھا۔ وہ سناتن مذہب کو مانتے ہیں یا بدھ مت کو،جین ہیں یا سکھ،مسلمان ہیں یا پارسی یا عیسائی ہیں۔ وہ صرف یہ جانتی تھیں کہ وہ سب اس کے بچے ہیں اور اس کے ہی بچوں نے ہمیشہ ہر مذہب کا احترام کیا ہے۔ ہر مذہب کے بزرگوں کو یکساں عزت دی۔ ہر مہاتما کے گن گائے ہیں خواہ اس کا دھرم یا مذہب کچھ بھی رہا ہو۔حد تو یہ ہے کہ یہاں لامذہب کو بھی عزت دی گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس ملک کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنیں۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔انھیں قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ ہم نے اس سرزمین کو اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا قیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری چودہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا تو اسلام بھی چودہ سو برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ چودہ سو برس پہلے ہندو زندگی واپس لائے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں ہے۔□□

# اسیرِ مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن

**تحریر: مولانا محمد رفیق بڑودوی** (صدر جمعیۃ علماء گجرات)

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد بعدہٗ اسی دارالعلوم کے صدر مدرّس، جنھیں 'شیخ الہند' کے لقب سے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، مولانا محمود حسن دیوبندی ہیں۔ آپ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء کو بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی بوجہ ملازمت مع اہل وعیال مقیم تھے۔ وہ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے اور دیوبند، ضلع سہارنپور کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی کے مشہور عربی کالج میں آپ نے مولانا محمد مملوک علی سے تعلیم پائی۔ آپ عربی زبان کے مشہور ادیب تھے۔ 'دیوان الحماسہ'، 'دیوان المتنبی' اور 'سبعہ معلقات' کی مفید اُردو شرح حسب ترتیب 'تسہیل الدرایہ'، 'تسہیل البیان' اور 'التعلیقات علی السبع المعلقات' ان کی بہترین علمی یادگاریں ہیں۔ 'قصیدہ بردہ' اور 'قصیدہ بانت سعاد' کی شرح میں 'عطر الوردہ' اور 'الارشاد' اُن کے علم وفضل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ علم معانی و بیان میں انھوں نے اُردو زبان میں 'تذکرہ البلاغت' نامی کتاب لکھی جسے اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب سمجھا گیا۔ مولانا محمود حسنؒ کے جدامجد یعنی دادا شیخ فتح علی تھے۔ آپ کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

اوّل: مولوی حامد حسن: جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گزرا۔

دوم: مولانا حافظ حکیم محمد حسن: مدرس وطبیب دارالعلوم دیوبند۔ یہ علم حدیث میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۹۰۵/۱۳۲۳ھ) کے اور دیگر علوم میں اپنے بھائی مولانا محمد حسن کے اور طب میں عبدالحکیم خان کے شاگرد تھے۔

سوم: مولوی حافظ محمد محسن۔

حضرت شیخ الہندؒ نے چھ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا۔ ناظرہ قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا۔ بقیہ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتب میاں جی مولوی عبداللطیف سے پڑھیں۔ جس زمانے میں قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے، اُسی زمانے میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو حضرت شیخ الہندؒ اس کے سب سے پہلے طالب علم تھے اور اس وقت آپ کی عمر پندرہ سال تھی۔ اجرا کے وقت وہاں ۲۱ طالب علم موجود تھے اور وقت امتحان تک ۷۸ طلبہ ہو گئے تھے۔

عجب اتفاق ہے کہ دارالعلوم میں جسے پہلے استاذ ہونے کا شرف حاصل ہوا، ان کا نام بھی محمود تھا — مولانا ملا محمود۔ انھیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۸۰ء/۱۲۹۷ھ) کی تجویز پر بمشاہرہ پندرہ روپیہ رکھا گیا تھا۔ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنزالدقائق، میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا۔ ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ اور مقاماتِ حریری پڑھیں۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں آپ نے کتب صحاحِ ستہ اور بعض دیگر کتابیں مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم سے پڑھیں اور سفر وحضر میں بھی ان کے ہمراہ رہے۔ ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ میں تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے اور حضرت نانوتوی کے دست مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ دستارِ فضیلت سے ایک سال قبل آپ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں بطور 'معین مدرس' تدریسی فرائض انجام دے چکے تھے۔

۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں جب دارالعلوم کو کثرت سے طلبہ کے باعث کسی مستقل استاذ کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو ہی مدرّس رکھا گیا۔ آپ دارالعلوم کے چوتھے مدرّس تھے۔ آپ کو مولانا رفیع الدین کی تجویز پر پندرہ روپے ماہوار مشاہرہ پر رکھا گیا تھا، جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۸۹۰ء میں آپ صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے اور تادم زیست اسی منصب پر فائز رہے۔ گویا تینتیس سال مدرّس رہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۶ء/۱۲۸۳ھ میں آپ نے ترمذی، مشکوٰۃ اور ہدایہ کا درس دیا اور ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ میں آپ نے الصحیح البخاری کا درس دیا۔

۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں آپ اکابر علماء ومشائخ کی معیت میں پہلے فریضۂ حج اور زیارتِ حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ جن اکابرین کے ہمراہ تھے ان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ)، مولانا رفیع الدینؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور مولانا محمد یعقوبؒ جیسے لوگ موجود تھے۔

اس زمانے میں شہرۂ آفاق محدث شاہ عبدالغنی مجددی (۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ) دہلی سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ مقیم تھے اور ساری دنیائے

اسلام کواپنے علم وفضل سے مستفیض فرمارہے تھے، جن کی سند حدیث شاہ محمد اسحاق (۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ) کے واسطے سے شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ) تک منتہی ہوتی ہے۔مولانا محمود نے ان سے اجازت وسند حدیث لی اور مکہ معظمہ سے واپس آ کر حاجی امداداللہ مہاجر مکی (۱۸۲۹ء/۱۳۱۰ھ) سے بیعت ہوئے بلکہ خلافت واجازتِ بیعت سے بھی مشرف ہوئے۔گوتحریری اجازت نامہ انھیں بعد میں ہندستان بھجوایا گیا۔ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں آپ کی دارالعلوم واپسی ہوئی۔آپ کی غیر موجودگی میں تقریباً چھ ماہ مولانا عبدالعلی ان کی جگہ کام کرتے رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپے تھا،مگر آپ نے پچاس روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا۔بقیہ پچیس روپے دارالعلوم کے چندے میں شامل فرمادیتے تھے۔آپ کے زمانے میں طلبہ کی تعداد دوسو سے بڑھ کر چھ سوتک پہنچ گئی تھی جو ہندستانیوں کے علاوہ افغانیوں، ترکوں اور انڈونیشیائیوں پر مشتمل تھی۔آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلبہ نے درسِ حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی۔

مشاہیر طلبہ کے نام یہ ہیں:

۱- مولانا سیّد محمد شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۹۳۴ء/۱۳۵۳ھ)
۲- مولانا عبیداللہ سندھیؒ (متوفی ۱۹۴۴ء/۱۳۶۳ھ)
۳- مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۹۵۷ء/۷۷-۱۳۷۶ھ)
۴- مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۹۵۳ء/۷۲-۱۳۷۱ھ)
۵- مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (متوفی ۱۹۴۹ء/۱۳۶۸ھ)
۶- مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ)
۷- مولانا منصور انصاریؒ
۸- مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ
۹- مولانا سیّد فخرالدین احمدؒ
۱۰- مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ
۱۱- مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ
۱۲- مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی
۱۳- مولانا احمد علی لاہوریؒ (متوفی ۱۹۶۲ء/۱۳۸۱ھ)
۱۴- مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ)
۱۵- مولانا حبیب الرحمٰن (معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت شیخ الہند کے تلامذہ وطلبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد رقم طراز ہیں:

''جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ) کی عظمت وجلالت اور خصوصاً جامعیت کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں، اسی طرح چودھویں صدی ہجری کے مجدد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت وجامعیت کے مظہر کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔''

حضرت شیخ الہندؒ کے درس کی نمایاں خصوصیت جمع بین الاقوال الفقہا والا حادیث تھی اور یہی شاہ ولی اللہ کے خاندان کا طرزِ تعلیم تھا۔گوحضرت مولانا نانوتویؒ کے درس میں طلبہ کسی قسم کا سوال نہیں کرسکتے تھے جبکہ آپ کے درس میں معاملہ برعکس تھا۔بلکہ کبھی کبھی تو حلقۂ درس، حلقۂ مناظرہ بن جاتا۔حضرت کوالزامی جواب دینے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔گاہے گاہے تحقیقی جواب بھی مرحمت فرماتے تھے۔

آپ کی سند حدیث مختلف واسطوں سے شاہ ولی اللہ سے ہوتی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں چند حوادث ایسے پیش آئے کہ حضرت شیخ الہندؒ کو سیاست میں عملاً شریک ہونا پڑا۔جن دنوں جنگ طرابلس وبلقان کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان پھیلا ہوا تھا آپ نے ہندستان سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا، جو مسلح انقلاب کے ذریعے برطانوی راج کا تختہ اُلٹ دینے سے عبارت تھا۔آپ نے ترکوں کی امدادواعانت کے لیے اپنے قابلِ اعتماد شاگردوں کے ہمراہ مختلف مقامات کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو ترکوں کی مدد کے لیے تیار کیا۔گویا اس کام کے لیے دارالعلوم بھی چندروز کے لیے بند کرنا پڑا مگر آپ نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ آپ نے دارالعلوم میں انجمن ہلالِ احمر کی شاخ قائم کی اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ استنبول بھجوایا۔آپ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بیدار مغز مسلم سیاست داں بھی تھے۔آپ کی نظر واقعاتِ عالم پر گہری تھی۔آپ ہندستان اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کے حالات کو عالمی تناظر میں دیکھتے تھے۔مولانا عبیداللہ سندھیؒ (۱۹۴۴ء/۱۳۶۳ھ) اور مولانا سیف الرحمٰن کو آزاد قبائل (یاغستان) میں تبلیغِ جہاد کے لیے، آپ ہی نے روانہ کیا تھا اور حاجی ترنگ زئی (۱۹۳۷ء/۱۳۵۶ھ) کو بھی تحریکِ جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔اس تحریک کا مرکز یاغستان قرار پایا جہاں سے سرحد پر حملہ ہونے لگے تھے۔

۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے مولانا

عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا کہ وہ امیر حبیب اللہ خان کو جہاد پر مائل کرسکیں لیکن وہ (یعنی امیر حبیب اللہ) متذبذب رہے اور کوئی مدد نہ کرسکے تاآنکہ امیر امان اللہ خان نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اسی اثنا میں ترکوں کے خلاف سات آٹھ محاذِ جنگ کھل چکے تھے اور ان پر روسیوں اور انگریزوں کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ ترکوں کی حمایت کے الزام میں ہندستان میں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء/ ۱۳۷۸ھ) نظر بند کیے جاچکے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری بھی متوقع تھی۔ چنانچہ آپ نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری (متوفی ۱۹۳۶ء/ ۱۳۵۵ھ) کے مشورے سے براہِ حجاز استنبول پہنچنے کا ارادہ کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ ماہ شوال ۱۳۳۳ھ/ اگست ۱۹۱۵ء کو عازمِ حج ہوئے اور براستہ بمبئی جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ انہی ایام میں آپ نے مفتی مدینہ کی وساطت سے ترکیہ وزیر جنگ انور پاشا (متوفی ۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۹ھ) سے بند کمرے میں ملاقات کی جو جمال پاشا کے ہمراہ شام اور سویز کے جنگی محاذوں کے معائنے کے بعد روضۂ نبیﷺ کی زیارت کے لیے مدینہ آرہے تھے۔ آپ نے اپنی ملاقات میں انھیں غالب پاشا (گورنر مکہ) کا خط پیش کیا اور ہندستان کی تحریک آزادی میں امداد واعانت کی درخواست کی جسے انھوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ حضرت کے بے حد اصرار پر امداد واعانت کے مضمون کی تحریر ترکی، عربی اور فارسی زبانوں میں لکھ دیں تاکہ یہ تحریر ہندستان بھجوائی جاسکیں۔

رولٹ ایکٹ کمیٹی کے مطابق مولانا محمد میاں انصاری، حیدرآباد سندھ کے نومسلم شیخ عبدالرحیم (آچاریہ کرپلانی، سابق جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے برادرِ بزرگ) کی وساطت سے ریشمی پارچات پر خفیہ پیغامات لکھ کر حضرت شیخ الہندؒ کو بھیجا کرتے تھے۔ اس خط وکتابت کو انھوں نے 'ریشمی رومال کی سازش' (Slken Letters Conspiracy) کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

اس تحریک کا حال یہ ہے کہ اس میں زیر زمین کام ہوتا تھا۔ برطانوی راج میں تو یہ باتیں منظر عام پر آنہیں سکتی تھیں لیکن اب اس تحریک کے متعلق تمام حالات شائع ہوگئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انڈر گراؤنڈ کام شروع کردیا تھا جہاں باقاعدہ اسلحہ سازی بھی ہوتی تھی اور باقاعدہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ جو لوگ آپ کے ہم خیال تھے اور آپ کے مشن سے تعاون کرتے تھے آپ نے ان سے عہد و پیمان لیا اور وہ سب آپ کی ہدایت پر خفیہ طور پر اس دعوت اور مشن کے لیے کام کرتے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے خاص الخاص اور معتمد علیہ حضرات یہ تھے: (۱) مولانا عبیداللہ سندھیؒ (۲) مولانا محمد میاں انصاری (۳) مولانا سیف الرحمٰن (۴) مولانا ابوالکلام آزاد۔

رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۶۴ میں درج ہے:

اگست ۱۹۱۶ء/ ۱۳۳۴ھ میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا کہ یہ ایک منصوبہ تھا جو اس خیال سے ہندستان میں تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدوں کو ڈسٹرب کرے اور دوسری طرف ہندستانی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کردیا جائے۔ (رولٹ بل کے آٹھ نکات کے لیے دیکھیے: قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، ص ۸۱-۸۲، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، دوسرا ایڈیشن۔)

مولانا محمد علی جوہر (۱۹۳۰ء/ ۱۳۴۹ھ) نے بارہا فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ تو اس تحریک میں ایسے مقامات پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچے تھے۔

بہرحال آپ کا ارادہ تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان پہنچ جائیں، مگر روسی اور انگریزی جہازوں نے بحری راستہ روک رکھا تھا، پھر آپ نے یہ ارادہ کیا کہ کسی طرح بحری راستے سے سفر کیا جائے اور بمبئی کے بجائے بلوچستان کی کسی بندرگاہ پر اُتر کر یاغستان میں داخل ہوجائیں مگر ایسا نہ ہوسکا۔ آپ مکہ معظّمہ پہنچے تو شاہ حسین (شریف مکہ) نے ترکوں کی خلاف بغاوت کردی تھی۔ ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء کی آخری تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظّمہ نے ایک محضر نامہ تیار کیا، جس میں ترکوں کو کافر، غاصب اور خائن ٹھہرایا گیا تھا۔ دوسرے علما کے علاوہ یہ محضر آپ کی خدمت میں تصدیق اور تصویب کے لیے پیش کیا گیا، مگر آپ نے محضر نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا جس کی پاداش میں آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس گرفتاری میں انگریزوں کا مشورہ بھی شامل تھا۔ آپ کے ساتھ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (۱۹۵۷ء/ ۱۳۷۷ھ)، مولانا عزیر گلؒ، حکیم نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔

بہرحال آپ کو ۲۲ر صفر ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء کو حراست میں لے کر جدہ پہنچا دیا گیا اور وہاں انگریز حکام کے حوالے کردیا گیا اور پھر جدہ سے سویز

اور قاہرہ روانہ کر دیا گیا۔ قاہرہ میں آپ سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ بالآخر ۱۵ر فروری ۱۹۱۷ء/ ۱۳۳۵ھ کو مالٹا بھیج کر آپ نظر بند کر دیے گئے، جو برطانوی قلم رو میں جنگی مجرموں کے لیے محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔

آپ نے مالٹا میں قید و بند کا زمانہ نہایت عزم و ہمت اور صبر و استقلال سے گزارا۔ آپ کا بیشتر وقت عبادت میں گزرتا رہا۔ آپ نے یہیں قرآن مجید کا اُردو ترجمہ مکمل کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شاید مالٹا میں محبوس ہی اس لیے فرمایا تھا کہ آپ ترجمہ قرآن پورا کریں۔

اسی اثنا میں آپ کی رہائی کے لیے ہندستان میں تحریک جاری تھی۔ آخر کار آپ قریب قریب تین برس کی نظر بندی کے بعد مالٹا سے ۸ر جون ۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۸ھ کو رہا کر دیئے گئے۔

۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ اسیری سے رہائی پا کر واردِ ہند ہوئے تو آپ نے کمال ضعف و نقاہت اور شدتِ مرض و علالت کے باوجود چھ ماہ کے مختصر عرصے میں تین اہم کام انجام دیئے:

۱- اپنے تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کی کہ اپنی تمام توجہات کو خدمتِ قرآن پر مرکوز کر دیں جس کا مظہر اتم آپ کا خطبہ دیوبند ہے۔ (بروایت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع، ۱۹۷۶ء/ ۱۳۹۶ھ)

۲- قدیم و جدید تعلیم اور قومی، ملّی و دینی اور مذہبی تحریکوں کے مابین فصل و بعد کو کم کرنے کی کوشش کی جس کا سب سے بڑا مظہر آپ کا سفرِ علی گڑھ اور تاسیسِ جامعہ ملیہ ہے۔

۳- علم جہاد بلند کرنے کے لیے ایک عوامی تحریک کے آغاز کے لیے کسی صاحبِ دعوت و عزیمت اور حاملِ فہم و فراست بالخصوص موجودہ زمانے کے سیاسی و عمرانی ظروف و احوال سے کماحقہٗ واقف شخص کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی تعیین جس کے ضمن میں حضرت شیخ الہندؒ کے اضطرار و احرار کا مظہر آپ کا یہ قول ہے کہ "میری چارپائی اسٹیج پر لے جائی جائے تاکہ میں خود بیعت کرلوں، اس لیے کہ میں دنیا سے بغیر بیعت کے رخصت ہونا نہیں چاہتا۔" (روایت بالمعنی)

آپ کے زمانۂ اسیری میں ترکوں کو عربوں کی غداری کی وجہ سے شکست ہو چکی تھی۔ قسطنطنیہ، بغداد اور بیت المقدس پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ حجاز پر اگرچہ شریف حسین کا قبضہ تھا لیکن حکم انگریز کا چلتا تھا۔ غرض کہ عالمِ اسلام اس وقت نزع کے عالم میں تھا۔ ہندستان کے مسلمانوں نے تحفظِ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے تحریکِ خلافت جاری کی ہوئی تھی۔ جلیانوالہ باغ (امرتسر) کے خونیں واقعہ اور مارشل لاء کے حوادث کی وجہ سے ہندستان کے تمام باشندے حکومت سے برگشتہ ہو رہے تھے۔ آپ بھی آتے ہی دل و جان سے تحریک خلافت میں شامل ہو گئے۔ مجلس خلافت نے آپ کو 'شیخ الہند' کا خطاب دیا۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے آپ سے ترکِ موالات (Non-Cooperation) کا فتویٰ حاصل کر لیا جس کا مضمون یہ تھا:

۱- تمام مسلمان اعدائے اسلام سے تعاون ترک کر دیں۔

۲- سرکاری اعزازات و خطابات واپس کر دیں۔

۳- ملکی مصنوعات کا استعمال کریں۔

۴- ملک کی کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دیں۔

۵- سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچے نہ داخل کرائیں۔

یہ فتویٰ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں آپ کے دستخط سے جاری ہوا۔ اس کے بعد یہی فتویٰ جمعیۃ علماء ہند کے متفقہ فتوے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخطوں سے شائع ہوا۔

غرض یہ کہ اس تحریک اور اس فتوے کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی تاسیس ہوئی جس کا افتتاح ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۹ھ کو حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھوں ہوا۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس دوم منعقدہ دہلی کی غائبانہ صدارت کی۔ اس میں انگریزوں سے ترکِ موالات اور تحفظ خلافت پر زور دیا گیا تھا۔

آپ وجع المفاصل اور بواسیر کے پرانے مریض تھے۔ نیز آپ کو کثرتِ بول کی شکایت بھی تھی۔ کثرتِ کار اور بڑھاپے کی وجہ سے یہ امراض عود کر آئے۔ اسی اثنا میں آپ کی اہلیہ محترمہ نے انتقال کیا۔ ان ایام میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ لرزہ کا بھی زور تھا۔ حضرت نے بیماری کی حالت میں علی گڑھ اور دہلی کے سفر کیے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۹۳۶ء/ ۱۳۵۵ھ) نے دہلی میں قیام کے دنوں نہایت توجہ اور دلسوزی سے آپ کا علاج کیا۔ حکیم اجمل خان (۱۹۲۷ء/ ۱۳۴۶ھ) بھی شریکِ علاج تھے مگر آپ کی طبیعت سنبھل نہ سکی اور آپ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۹ھ کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی میّت دہلی سے دیوبند لائی گئی اور آپ کو حضرت نانوتویؒ (۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۷ء) بانی دارالعلوم دیوبند کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ آپ کے انتقال پر مولانا محمد علی جوہرؔ (۱۹۳۰ء/ ۱۳۴۹ھ) دیوبند تشریف لائے اور رو رو کر کہنے لگے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ بنیادی طور پر مصلح، عالم اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کا اصل کام درس وتدریس اور تزکیہ وتربیت تھا۔ لیکن حالات اور قومی ضروریات کے تحت عملی سیاست میں آپ کو حصہ لینا پڑا۔ آپ نے برطانوی استعمار کے خلاف علماء کو آمادہ کیا۔ انھیں مسجد کے حجروں اور دروس کے حلقوں سے باہر نکالا۔

عملی سیاست نے آپ کو وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیا تھا۔ آپ معاصر علماء کے قدردان تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم غافل تھے، لیکن 'الہلال' (کلکتہ) کی دعوت نے ہمیں آمادۂ عمل کیا۔ علی برادران، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان سے آپ کے خصوصی تعلقات تھے اور آپ سیاسی معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آپ کو جدید تعلیم یافتہ حضرات سے بھی بڑی محبت تھی۔ آپ کا یہ مشہور قول ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں قبولِ حق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ آپ کی یہ بڑی آرزو تھی کہ دیوبند اور علی گڑھ میں جو فکری اور نظری فاصلہ ہے اسے کم کیا جائے اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے مگر اس وقت کے ہنگامہ خیز حالات میں یہ تجویز شرمندۂ عمل نہ ہوسکی۔

**تصانیف:**

۱- ترجمہ قرآن مجید: قرآن مجید کا عام فہم اُردو ترجمہ مع مفید حواشی، سورۃ المائدہ تک حواشی آپ نے خود لکھے تھے اور بقیہ حواشی وفوائد مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۹۴۹ء/ ۱۳۶۹ھ) نے لکھ کر پورے کیے۔ یہ ترجمہ برصغیر پاک و ہند میں بے حد مقبول ہوا اور ہند (مدینہ پریس بجنور) و پاکستان (تاج کمپنی لاہور) ومغربی جرمنی (ہمبرگ) اور سعودی عرب میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ حکومت افغانستان نے یہ ترجمہ مع حواشی فارسی میں کرا کر کابل سے شائع کیا۔

۲- تقریر ترمذی (عربی): یہ تقریر ترمذی شریف کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے اور مقبولِ خاص وعام ہے۔

۳- حاشیہ سنن ابی داوٗد (عربی): مطبوعہ دہلی، ۱۹۰۰ء/ ۱۳۱۸ھ

۴- تراجم ابواب بخاری: مطبوعہ دیوبند۔ صحیح بخاری کے تراجم کی مناسبت اور تشریحات میں ہے (غیر مکمل)۔ آخر میں ابوابِ بخاری کی نہایت مفید فہرست ہے۔

۵- حاشیہ مختصر المعانی: سعد الدین التفتازانی کی شرح تلخیص المفتاح پر مفید حاشیہ ہے۔ کئی بار چھپ چکا ہے۔

۶- ایضاح الادلہ: فقہ کے بعض اختلافی اور نزاعی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آپ نے حنفی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۸ء/ ۱۲۹۵ھ کو معرضِ تحریر میں آئی۔ تکمیل کتاب تک آپ اپنی یہ کتاب اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو بھی سناتے رہے۔ ان دنوں حضرت نانوتویؒ کا قیام دارالعلوم میں ہی تھا۔

۷- شرح اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ: یہ کتاب دیہات میں نمازِ جمعہ کے عدم جواز میں ہے۔ یہ دراصل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۹۰۵ء/ ۱۳۲۳ھ) کی کتاب کی شرح ہے۔

۸- جہد المقل فی تنزیہ المعز والمبذل: اس میں حضرت شاہ اسماعیل شہید (۱۸۳۱ء/ ۱۲۴۶ھ) کا دفاع کیا گیا ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

قبل ازیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ایامِ اسیری میں حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، اس ترجمے کے حوالے سے یہ بات یقیناً قابلِ ذکر ہے کہ آپ کی معاونت مولانا محمد میاں انصاری نے کی۔ موصوف نے دارالعلوم معینیہ اجمیر میں بعہدہ صدر مدرّس تک کام کیا۔ اس کے بعد آپ کی خدمت میں اعانت ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دینے کے لیے مقرر کیے گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دُنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ الفاظ دیگر حضرت کے ترجمہ کو شاہ صاحب کے ترجمہ کی تسہیل کا عنوان بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر ان دونوں تراجم کی یکسانیت اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت نے اپنے ترجمہ میں کوئی نیاپن، جدت طرازی اور تحقیقی اسلوب اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اپنے اسلاف کے فکر ونظر کی آئینہ داری کی ہے۔□□

# اسیرِ مالٹا حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

**مولانا معزالدین**

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی ایک عظیم محدث ، بے مثال مفسر، جلیل القدر شیخ ، بلند پایہ عالم، مدبر قائد اور تحریک حریت وانقلاب کے امام تھے۔علم وفضل ، زہد وتقوی ، اخلاص وللّٰہیت ، جرأت وہمت ، استقامت وعزیمت ، تدبر وذکاوت ، جوشِ جہاد، جذبہ حریت اور ایثار وقربانی میں اپنی پوری صدی میں یگانہ روزگار تھے۔ بلا شبہ آپ چودھویں صدی ہجری کے عظیم انسان تھے۔شیخ الہند ہی نہیں ؛ بلکہ شیخ العالم تھے۔

آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں بریلی میں ہوئی جہاں آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۱۹۰۴ء) بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔نشو ونما اور تعلیم دیوبند میں ہوئی، جو آپ کا وطن اصلی تھا۔ ابتدائی تعلیم ایک معمر دیندار بزرگ میاں جی منگلوریؒ اور میاں جی عبداللطیفؒ سے حاصل کی، اور فارسی کی تمام کتابیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے چچا مشہور عالم مولانا مہتاب عالمؒ سے پڑھیں۔

۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، اس وقت آپ ''قدوری'' اور'' شرح تہذیب'' پڑھ رہے تھے۔آپ اس عظیم ادارہ کے اولین طالب علم ہوکر داخل ہوئے۔اور مدرسہ دیوبند کے اول استاذ ملا محمود دیوبندیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ وغیرہ سے اکتساب علوم وفنون کیا۔۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں 'کنز الدقائق'، 'میبذی' اور 'مختصر المعانی' کا امتحان دیا، ۱۲۸۵ھ میں 'ہدایہ'، 'مشکوٰۃ' اور 'مقامات حریری' کے امتحان میں شریک ہوئے۔۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء میں اپنے فخر زمانہ استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے کتب صحاح ستہ ودیگر کتابیں میرٹھ اور دہلی میں رہ کر پڑھیں۔۱۲۸۸ھ میں فارغ ہوئے اور اسی سال مدرسہ کے معین مدرس بنادیے گئے۔۱۹ر ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ (۸ر جنوری ۱۸۷۴ء) کو آپ کی دستار بندی ہوئی۔۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں مدرس چہارم بنادیے گئے۔

۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) یعنی تقرری کے دوسرے سال 'ترمذی'، 'مشکوٰۃ' اور 'ہدایہ' وغیرہ جیسی نو کتابوں کا درس دیا۔۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) سے 'بخاری شریف' کا درس شروع کردیا۔۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں آپ صدر مدرس بنادیے گئے۔آپ نے ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲) سے ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) تک تقریبا پچاس سال علم نبوت کی اشاعت فرمائی، آپ کی صدارت تدریس کے دور میں ۸۶۰ طلبہ نے دورہ حدیث کی تکمیل کرکے فراغت حاصل کی جب کہ آپ کے چشمہ فیض سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ آپ کے حلقہ تلامذہ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ، امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، استاذ العلماء مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، رئیس التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث مولانا فخرالدین مرادآبادیؒ اور مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے صدہا اساطین فضل وکمال و نابغہ روزگار شخصیات شامل ہیں، آپ کے دور صدارت میں دارالعلوم دیوبند کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔

۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں پہلے سفر حج کے موقع پر اپنے استاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حکم سے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، اسی سفر میں حضرت حاجی صاحبؒ نے سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت تحریر فرما کر عنایت فرمادی، بعد ازاں حضرت نانوتویؒ نے ابھی اجازت بیعت وخلافت سے نوازا۔ حضرت نانوتویؒ کے وصال کے بعد قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرلیا۔آپ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں ہر ہفتہ اس طرح حاضر ہوتے کہ جمعہ کے دن صبح کو پیدل گنگوہ پہنچ جاتے اور وہاں سے جمعہ کی نماز کے بعد واپس ہوجاتے۔واضح رہے کہ دیوبند سے گنگوہ تقریبا ۲۰ میل یعنی ۳۰ کلو میٹر ہے۔ دربار رشیدی سے بھی سلاسل اربعہ میں اجازت بیعت وخلافت حاصل ہوئی مگر جب تک حضرت گنگوہیؒ حیات رہے آپ نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔اس کے بعد بھی اکثر وبیشتر دیگر اکابر کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتے۔بدرجہ مجبوری اور بہت ہی اصرار پر بیعت فرماتے، اس لیے آپ کے خلفاء کی تعداد زیادہ نہیں، مولانا ضرغام الدین مظفرنگریؒ، مولانا صوفی محمد اکرام پنجابیؒ، مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوریؒ، مولانا وارث حسن کوڑہ جہان آبادیؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں آپ نے خرقہ خلافت سے نوازا۔

تحریک آزادی ہندمیں آپ کی خدمات عدیم النظیر اور کارنامے بے مثال ہیں، آپ کی جدوجہد آزادی کا زمانہ بڑا طویل ہے، آپ نے آزادی کی جدوجہد اس وقت شروع کردی تھی جب کہ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں بھی نہ آئی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں استاذ محترم حضرت نانوتویؒ کے ایما پر ُانجمن ثمرۃ التربیت' قائم کر کے جدوجہد کا آغاز کیا۔ مورخ تحریک آزادی مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ اس انجمن کے مقصد تاسیس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ثمرۃ التربیت سے صرف فضلاء و منتسبین دارالعلوم کی تنظیم مقصود نہیں تھی؛ بلکہ دراصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھی جو قیام دارالعلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلہ میں کام کرسکیں'' (اسیران مالٹاص:۱۲)

انجمن کے قیام کے دوسال بعد ہی حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوگیا اس لیے اس انجمن کی باضابطہ سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں تاہم حضرت شیخ الہندؒ اپنے شاگردوں کی ذہن سازی کرتے رہے اور کم وبیش ۳۰ سال نہایت رازداری کے ساتھ انجمن کے مقصد کی تکمیل کے لیے آبیاری کرتے رہے۔

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں حضرت شیخ الہندؒ نے ازسرنو تنظیم کے لیے جمعیۃ الانصار کی تشکیل فرمائی اور اس کی نظامت کے لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو سندھ سے بلاکر دیوبند کے مرکز میں کام کرنے کا حکم دیا۔ جمعیۃ الانصار کا پہلا اجلاس ۱۵/۱۶/۱۷/اپریل ۱۹۱۱ء کو مرادآباد میں زیر صدارت مولانا احمد حسن امروہویؒ منعقد ہوا۔ دوسرا اجلاس ۱۹۱۲ء میں میرٹھ میں ہوا جس کی صدارت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمائی۔ تیسرا اجلاس ۱۹۱۳ء میں شملہ میں ہوا جس میں افغانستان کے شیخ الاسلام نے شرکت کی تھی۔ اس جمعیۃ کی بڑھتی مقبولیت نے حکومت برطانیہ کے کان کھڑے کردیے اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم کے تحفظ کی خاطر مولانا سندھیؒ کو دیوبند سے دہلی منتقل کردیا۔

۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) میں دہلی میں ُنظارۃ المعارف القرآنیۃ' کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا جس کی سرپرستی میں آپ کے ساتھ حکیم اجمل خانؒ اور نواب وقارالملک بھی شریک تھے۔ اس ادارہ کا مقصد عوام وخواص کی ذہن سازی تھا، بقول مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ: ''یہ ادارہ دردمندان حریت کے لیے جائے اطمینان اور آزادی کی مساعیوں کے لیے خفیہ مشورہ گاہ تھا'' اس ادارہ کا دفتر مسجد فتح پوری میں تھا۔ بڑے بڑے انقلابی لیڈروں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے مولانا سندھیؒ کا تعارف یہیں رہ کر ہوا۔ دوسال مولانا سندھیؒ اس ادارہ کو چلاتے رہے اور تحریک آزادی کے لیے افرادسازی کے منصوبے کی تکمیل میں سرگرداں رہے۔

۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں جب جرمنی اور برطانیہ میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور حالات دھماکہ خیز ہوگئے اور یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ برطانیہ کو نقصان پہنچایا جائے اس سلسلہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے مختلف اقدامات کیے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو افغانستان روانہ کیا تاکہ حکومت افغانستان سے تحریک کے لیے ہمدردیاں حاصل کی جائیں خود حجاز مقدس کا سفر فرمایا تاکہ خلافت عثمانیہ سے فوجی امداد کی راہ ہموار کی جاسکے۔ آپ کے خدام ومخلصین نے یاغستان میں مولانا سیف الرحمٰن کابلی اور حاجی صاحب ترنگ زئی کی سرکردگی میں انگریزوں سے باقاعدہ جنگ شروع کردی جو کچھ دنوں تک بہت کامیابی سے لڑی جاتی رہی۔

۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو آپ مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفا وعظمۃ پہنچے اور وہاں کے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کر کے ہندوستان کی صورت حال سے مطلع کیا، غالب پاشا نے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے کیا جس میں مسلمانوں کو ظالم انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل تھی۔ اس پیغام کو ُغالب نامہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ُغالب نامہ' مولانا سید ہادی حسن رئیس خانجہاں پور مظفرنگر کے توسط سے ہندوستان پہنچایا انھوں نے حسب حکم اس کی نقلیں کر کے مولانا محمد میاں منصورانصاریؒ تک پہنچادیں اور انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کے فرمان کے مطابق آزاد قبائلی علاقہ تک پہنچادیا۔ انگریز کی طرف سے سراغ رسانی کی انتھک کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس غالب نامہ نے آزاد قبائلی علاقوں میں جہاد حریت کا پورا ماحول تیار کردیا۔ اور علاقہ کے تمام خوانین اور بااثر علماء منتظر تھے کہ وسائل مہیا ہوتے ہی وہ اپنی قوم کے ساتھ مردانہ وار میدان جہاد میں کود پڑیں، برطانیہ کے آتش ظلم کو سرد کرنا جنھوں نے اپنا نصب العین قراردے کر خلیفہ وقت کو ایک عرض داشت بتوسط حضرت شیخ الہندؒ روانہ کی جو بدقسمتی سے انگریز کے ہاتھ لگ گئی۔

سفر حجاز سے قبل حضرت شیخ الہندؒ نے امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل روانہ فرمایا، وہاں پہنچ کر مولانا سندھیؒ نے دوکام نہایت اہم کیے، ایک تو یہ کہ ہندوستان کی جلاوطن حکومت ُحکومت مؤقتۃ ہند' میں شرکت کی، جس کے صدر مہاراجہ پرتاپ سنگھ اور وزیراعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔ دوسرا اہم کام یہ ہوا کہ جنود ربانیہ کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی گئی جس کا اصل مرکز مدینہ منورہ اور سالار اعظم حضرت شیخ الہندؒ قرار پائے۔

مولانا سندھیؒ نے ضروری خیال کیا کہ تحریک کے سلسلہ میں کابل میں

ہونے والی سرگرمیوں سے حضرت شیخ الہندؒ کو باخبر کر کے مفید مشورے اور آیندہ کے لیے لائحہ عمل طے کیا جائے، چنانچہ مولانا سندھیؒ نے انتہائی راز دارانہ طریقہ پر ایک خط ریشمی رومال پر تحریر کیا اور ایک خط مولانا محمد میاں منصور انصاری نے لکھا جس میں 'حکومت مؤقتہ' اور 'جنود ربانیہ' کی تفصیلات درج تھیں جن میں ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اراکین تحریک کے اسماء بطور منصب وار ذکر کیے گئے تھے۔ نیز مولانا سندھیؒ کا ایک خط شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے نام تھا جس میں انھیں تاکید تھی کہ وہ مذکورہ تحریرات بحفاظت مدینہ منورہ پہنچادیں۔ یہ تینوں تحریریں مولانا سندھیؒ نے عبدالحق نامی ایک نومسلم کو دیں کہ وہ انھیں شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کو پہنچادے؛ لیکن نہ معلوم کیا سبب ہوا کہ اس قاصد نے یہ تحریریں شیخ عبدالرحیم سندھیؒ کے بجائے اپنے سابق شناسا رب نواز کے حوالے کردیں جو انگریزوں کا ایجنٹ اور کاسہ لیس تھا، چنانچہ اس نے یہ سب خفیہ دستاویزات ملتان ڈویژن کے کمشنر کو پہنچادیے، کمشنر کے واسطے سے یہ تفصیلات سی آئی ڈی تک پہنچیں، جس سے حکومت برطانیہ تحریک کی ہمہ گیری سے آگاہ ہوگئی اور اس کے بعد پورے ملک میں تحریک سے وابستہ افراد کی گرفتاریاں اور ان پر سختیاں شروع ہوگئیں۔ یہ خطوط ۹/۸ رمضان المبارک ۱۳۳۴ھ مطابق ۹/۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو تحریر کیے گئے اور اگست ۱۹۱۶ء میں حکومت تک پہنچ گئے۔

تحریک کے راز فاش ہونے کے وقت حضرت شیخ الہندؒ حجاز میں مقیم تھے، وہاں آپ کے سامنے ایک فتوی پیش کر کے دستخط کے لیے کہا گیا، جس میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی، آپ نے دستخط سے انکار کردیا، جس کو بہانہ بنا کر شریف مکہ نے جدہ میں مقیم کرنل ولسن (معتمد برطانیہ) کے حکم پر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا آرڈر جاری کردیا۔ چنانچہ ۲۳/صفر ۱۳۳۵ھ اتوار کی شب آپ کو اور آپ کے ساتھ مولانا وحید احمد فیض آبادیؒ مولانا عزیر گلؒ اور مولانا حکیم سید نصرت حسنؒ کو مکہ معظمہ سے گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا، جب کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ایک روز قبل انگریزی حکومت کو برا کہنے کے پاداش میں مکہ معظمہ کے جیل خانہ میں بھیج دیا گیا تھا۔ آپ نے کوشش کر کے اپنے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کے پاس جدہ پہنچایا، ۱۷/ربیع الاول ۱۳۳۵ھ تک جدہ میں رہے۔

۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۵ھ (۱۲/جنوری ۱۹۱۷ء) کو اسیران فرنگ کے اس مختصر قافلہ کو مصر روانہ کیا گیا جہاں جیزہ کے سیاسی قیدخانہ میں تقریباً ایک ماہ رکھا گیا، فرداً فرداً نہایت سختی سے تفتیش کی گئی اور الگ الگ کال کوٹھریوں میں تقریباً ایک ہفتہ رکھا گیا، ان دنوں ہر ایک کو پھانسی کا اندیشہ تھا۔

۲۴/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۱۶/فروری ۱۹۱۷ء) کو جیزہ سے مالٹا روانہ کیے گئے جہاں ۲۹/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۲۱ فروری ۱۹۱۷ء) کو پہنچے اور روگیٹ کیمپ کے خیموں میں پہنچادیے گئے۔

مولانا حکیم سید نصرت حسنؒ اسارت مالٹا کے ۱۹/ماہ بعد ذی قعدہ ۱۳۳۶ھ کو چند ماہ بیمار رہ کر واصل بہ حق ہوئے اور شہید مالٹا ہوگئے۔ اور بقیہ حضرات یعنی شیخ الہندؒ و دیگر رفقاء ۳/سال ۱۹/دن مالٹا کی اسیری گزار کر ۲۲/جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ (۱۲/مارچ ۱۹۲۰ء) بروز جمعہ رہا ہوئے اور تقریباً ۳/ماہ کے سفر کے بعد ۲۰/رمضان ۱۳۳۸ھ (۷/جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی کے ساحل پر پہنچے جہاں ہزار ہا افراد نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا۔ استقبال کرنے والوں میں مہاتما گاندھی، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبندؒ جیسے مشاہیر شامل تھے۔ بمبئی میں دو دن قیام رہا، خلافت کمیٹی کی طرف سے استقبالیہ جلسہ کیا گیا، اس کے بعد دہلی ہوتے ہوئے ۲۷/رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۴/جون ۱۹۲۰ء) کو دیوبند پہنچے۔ راستہ میں ہر اسٹیشن پر زبردست ہجوم تھا، میرٹھ، مظفر نگر، دیوبند میں انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد کوڑہ جہان آباد، مرادآباد، امروہہ، علی گڑھ وغیرہ کے اسفار کیے۔ ۱۹/جولائی ۱۹۲۰ء کو آپ نے ترک موالات کا فتوی جاری کیا اور انگریز سرکار کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اسی فتوی کو تشریح کے بعد مولانا ابوالمحاسن سجادؒ نے مرتب فرمایا اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس دوم میں ۴۷۴ علماء کے دستخطوں سے شایع کیا گیا۔ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کا سفر فرمایا اور وہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حریت پسندوں کے آزاد ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔

۱۹/تا ۲۱/نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس دہلی میں حضرت شیخ الہند کی صدارت میں عظیم الشان پیمانے پر ہوا۔ آپ شدید ضعف وعلالت اور بے پناہ نقاہت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کی کوٹھی پر تشریف فرما رہے، آپ کی طرف سے مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ نے خطبہ صدارت تحریر فرما کر پیش کیا اور آخری اجلاس میں آپ کی انتہائی درمندانہ تقریر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پیش کی اس اجلاس کے صرف ۹/دن بعد ۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء کو قافلہ حریت کا عظیم قائد بلکہ امام کارواں رخصت ہوگیا اور دیوبند لے جا کر اس گنجینہ علم وسیاست کو دفن کردیا گیا۔ ◻◻

# شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ — ایک عالمگیر شخصیت

تحریر: مفتی ظفرالدین احمد (صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی)

**پیدائش اور علمی سرگرمیاں:** آپ کی پیدائش ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی۔ یہ وہ دَور تھا جب ہندستان میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو اس ملک میں انگریزوں نے خاص طور سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس ملک میں دین وایمان اور مذہب اسلام کی حفاظت اور بقا کے لیے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ آپ اس مدرسے کے پہلے طالب علم تھے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دیگر اساتذۂ عالی مقام سے دیوبند اور میرٹھ میں رہ کر حدیث و تفسیر اور دیگر علوم دینیہ کا فیض حاصل کیا۔ آپ ایک عظیم محدث، بے مثال مفسر، بلند پایہ عالم اور تحریکِ حریت و انقلاب کے امام تھے۔ بلاشبہ آپ چودھویں صدی ہجری کے سب سے عظیم انسان تھے۔ آپ صرف حضرت شیخ الہند ہی نہیں بلکہ شیخ العالم تھے۔ قرآن کریم کا ترجمہ آپ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جو رہتی دُنیا تک آپ کی علمیت کی داد وصول کرتا رہے گا۔ آپ کا ترجمہ مع فوائد عثمانی ایک عرصے تک سعودی حکومت کی طرف سے شائع ہوتا رہا۔

**شیخ الہندؒ اور تحریک ریشمی رومال:**

جنگِ آزادی کی ایک عظیم اور خفیہ تحریک آپ کی یادگار ہے جو تاریخ کے اوراق پر سنہرے حرفوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ ریشمی رومال کی تحریک تھی جو ۱۹۰۵ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے راز کے فاش ہوجانے کی وجہ سے یہ کامیابی سے ہمکنار تو نہ ہوسکی مگر اس تحریک سے حضرت شیخ الہندؒ کی فہم و فراست اور آپ کی قائدانہ بصیرت کا گہرا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے اُن سبھی قومی لیڈروں کو اپنی تحریک میں شامل کرلیا تھا جو مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے اور طاقت کے بل بوتے پر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ حضرت کا منشا یہ تھا کہ سرحد کی طرف سے مجاہدین انگریزی فوج پر حملہ کردیں اور عین اُسی وقت ملک کے بڑے بڑے شہروں سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی جائے۔ اس طرح انگریزوں کو چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پیس دیا جائے۔ اس تحریک کی کامیابی کے لیے بہت سارے اقدامات کیے گئے۔ مختلف اسفار کیے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں کابل میں مجاہدین کا ایک مرکز مولانا عبدالکریم کی امارت میں بنایا گیا تھا، وہاں سے اس تحریک کی پشت پناہی کی گئی۔ ۱۹۱۵ء میں جب پہلی عالمی جنگ بڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھی حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو تحریک کی کامیابی کے لیے کابل بھیج دیا اور آپ خود حج پر جاکر جنگ کا نقشہ تیار کرنے اور ترکی حکومت سے مدد لینے کے لیے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ مکہ کے سفر کو نکلے، مگر مکہ معظّمہ پہنچنے سے پہلے آپ کی خفیہ تحریک کا راز افشا ہوگیا۔ انگریز خفیہ پولیس نے ایک تار ممبئی اور ایک تار جہاز کے کپتان کو مولانا اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے حکم کے ساتھ بھیجا مگر حضرت شیخ الہندؒ کسی طرح مکہ معظّمہ پہنچ گئے اور جنگ کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

**اسیر مالٹا:** اچانک پہلی جنگ عظیم میں عربوں کی بغاوت اور جرمنی کی ہار کی وجہ سے آزادی کی تحریک مدھم پڑ گئی اور انگریز تحریک میں حصہ لینے والوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ۱۵۹/اشخاص کے خلاف ریشمی رومال کی تحریک کے جرم میں گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے گئے اور دوسو افراد کی تفتیش کی گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ تو روپوش ہوگئے مگر مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے حضرات گرفتار کرلیے گئے۔ مکہ کا حاکم شریف حسین جو انگریزوں سے مل گیا تھا اور ترکی حکومت کے خلاف بغاوت پر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ کسی بھی طرح حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کروانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے پھر حکم دیا کہ اگر حضرت شیخ الہندؒ کو مغرب سے عشا کی نماز تک حاضر نہیں کیا گیا تو انھیں تلاش کرنے والوں کو سو سو کوڑے لگاکر گولی ماردی جائے گی۔ جب حضرت شیخ الہندؒ کو اس غدارِ قوم کے بے رحمانہ حکم کا علم ہوا تو آپ فوراً سامنے آگئے اور گرفتار ہوگئے۔ ۱۷/ستمبر ۱۹۱۶ء کو آپ کی گرفتاری ہوئی اور آپ کو مالٹا بھیج دیا گیا۔ وہاں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم کی انتہا کردی گئی۔ حکیم نصرت حسین کو اتنی اذیتیں دی گئیں کہ جیل میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کے جسم کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا اور انگریزوں کے حق میں فتوے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا تو آپ کا جواب ہوتا تھا ''میں بلالؓ کا وارث ہوں، میری چمڑی اُدھڑ سکتی ہے مگر انگریزوں کے حق میں فتویٰ نہیں دے سکتا۔''

**وفات:** ۲۰/مئی ۱۹۲۰ء کو آپ کو مالٹا کی جیل سے رہا کیا گیا۔ مدتِ اسیری میں آپ پر ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے گئے تھے جس کی داستان سن کر رُوح تک کانپ اُٹھتی ہے۔ چار سال کی مدت میں کافی ضعف آگیا تھا۔ رہائی کے بعد آپ دیوبند تشریف لائے۔ ضعف کے باوجود مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام بھی آپ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آخر کار ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء کو یہ مردِ مجاہد اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کرگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میری آواز روح کو پھر سے قید جسم مت کرنا
بڑی مشکل سے کاٹی ہے سزائے زندگی میں نے

# شیخ الہندؒ کی قائدانہ بصیرت اور ملّی اتحاد

تحریر: پروفیسر شکیل قاسمی (صدر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی)

عالمی شہرت یافتہ شیخ الہند مولانا محمود حسن، جن کا کئی حوالوں سے احترام کے ساتھ نام لیا جاتا ہے، جن کے شاگردوں میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا احمد لاہوریؒ، مولانا عزیز گل وغیرہم کا شمار ہوتا ہے، جن کے قدردانوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، بانی تبلیغی جماعت مولانا الیاسؒ اور مولانا حسرت موہانی کا ذکر جمیل ہوتا ہے، جو علمائے امت، دانشورانِ ملت، قائدین ملک، دینی وعصری دانش گاہوں کے ذمہ داران اور سیاسی حضرات کے درمیان یکساں مقبول اور لوگوں کی عملی زندگی کے لیے مشعل راہ ہو، ایسی نابغہ روزگار شخصیت کی حیات و خدمات پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے ماضی کی اس روشن تاریخ سے موجودہ حالات میں کچھ رہنمائی مل سکے۔

مولانا محمود حسن کی پیدائش ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ وہ مولانا ذوالفقار علی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے صاحبزادہ تھے۔ یہ اولین پانچ طلبہ میں سے ایک تھے جنھیں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھیں ۹رجنوری ۱۸۷۴ء میں سند اور دستار فضیلت عطا ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں ''ثمرۃ التربیت'' نامی ایک تنظیم قائم کی، مولانا دارالعلوم میں استاد بنائے گئے، صدر مدرس بنے اور پھر ۱۹۰۵ء میں سربراہ مقرر کیے گئے۔ ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو اس کی نگرانی سپرد کی۔ ۱۹۱۰ء میں جلسہ دستار بندی کا انعقاد کیا جس میں تیس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی، اس موقع پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ علی گڑھ انگریزی پڑھنے جایا کریں اور اسی طرح علی گڑھ کے گریجویٹ دینی تعلیم کے لئے دیوبند آئیں۔ اس طرح دونوں اداروں میں قربت بڑھی اور ارتباط کی عملی شکل سامنے آئی۔

۱۵راپریل ۱۹۱۱ء کو جمعیۃ الانصار کی پہلی کانفرنس مرادآباد میں منعقد ہوئی۔ اٹلی اور ترکی کے درمیان جب جنگ طرابلس کا آغاز ہوا تو مولانا چند دنوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کو بند کر کے اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ فراہمی مالیات کے لئے نکلے اور ترکوں کی مدد کے لئے ایک لاکھ روپے جمع کر کے ترکی روانہ کیا۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ایک ادارہ مسجد فتح پوری دہلی میں قائم کیا جس کے سرپرستوں میں وقارالملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری تھے۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد عصری اداروں کے فارغ اور زیر تعلیم طلباء کو قرآن اور دینیات سے واقف کرانا تھا اس تحریک میں مولانا آزاد اور حسرت موہانی بھی شامل تھے۔

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو مولانا نے انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کا اسے بہتر موقع سمجھا اور ہندستان کے باہر بھی انگریزوں کے خلاف ماحول بنانے پر مولانا کی توجہ ہونے لگی۔

۱۹۱۵ء کے اوائل میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ (جو مولانا کے حد درجہ قابل اعتماد تھے) کو افغانستان بھیج دیا۔ مولانا سندھی ۱۵راگست ۱۹۱۵ء کو حدود افغانستان اور ۱۵راکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ مولانا سندھیؒ کے افغانستان پہنچ جانے کے بعد شیخ الہندؒ نے ۱۸رستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے لئے رخت سفر باندھا۔ فریضہ حج ادا کیا، اس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کے گورنر تھے۔ شیخ الہندؒ نے غالب پاشا سے تین تحریریں حاصل کیں: (۱) مسلمانانِ ہند کے نام (۲) مدینہ منورہ کے گورنر بصری کے نام (۳) غازی انور پاشا کے نام۔ غالب پاشا نے ہندستان کے لیے آزادی کامل کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک تحریر مئی ۱۹۱۶ء میں لکھ کر شیخ عبدالحق کے حوالہ کی کہ وہ اسے شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی (سندھ) کو پہنچا دیں تاکہ جب وہ حج پر جائیں تو شیخ الہندؒ کے حوالہ وہاں حجاز میں کر دیں۔ یہ خط جو راز و نیاز کا تھا غلط ہاتھوں میں چلا گیا، جس کی وجہ سے ادھر عبداللہ سندھیؒ اپنے ۲۰-۲۵ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے اور اُدھر حجاز میں شیخ الہند ۷رد سمبر ۱۹۱۶ء کو اپنے ساتھیوں مولوی عزیز گل، مولوی وحید احمد اور مولوی نصرت کے ساتھ گرفتا

رکر لئے گئے اور انھیں مالٹا کے لیے روانہ کردیا گیا جہاں وہ ۲۱؍فوری ۱۹۱۷ء کو پہنچے۔ (اس تفصیل کو تحریک ریشمی رومال کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے) ادھر ہندستان میں شبہ کی بنیاد پر گرفتاری شروع ہوئی، گرفتاری اور نظر بند ہونے والوں میں ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی بھی شامل تھے۔

ہندستان میں مولانا کی رہائی کے لیے تحریکیں جاری رہیں، قراردادیں منظور کی گئیں، مولانا محمد علی جوہر جب خلافت کے وفد کے قائد کی حیثیت سے انگلستان گئے تو انھوں نے براہِ راست برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''دیوبند کے مولانا محمود حسن صاحب ہندستان کے بہت بڑے مذہبی پیشوا ہیں، وہ ایماندار اور پاک ضمیر رکھنے والے شخص ہیں، ہندستان کے تمام مسلمان اس برے رویہ پر احتجاج کر رہے ہیں اور مولانا کی جلد رہائی نہیں ہوئی تو اس کے نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔''

حضرت تین سال دو ماہ مالٹا میں اسیر رہنے کے بعد ۸؍جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے جہاں ہزاروں لوگ آپ کے استقبال کے لئے موجود تھے جن میں اکابر دارالعلوم دیوبند اور مختلف رہنماؤں کے علاوہ گاندھی جی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی موجود تھے۔ گاندھی جی نے حضرت کو ہندستان کے سیاسی حالات سے آگاہ کیا، خلافت کمیٹی کے استقبالیہ جلسہ میں جو منارہ مسجد بمبئی میں منعقد کیا گیا تھا مولانا نے شرکت کی۔ سپاسنامہ کے ساتھ ان کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ''شیخ الہند'' کا خطاب بھی پیش کیا گیا جو ان کے نام کا لائق احترام لازمی حصہ بن گیا۔

شیخ الہندؒ نے علالت کے باوجود ملک کے مختلف مقامات کا دورہ شروع کیا، ان اسفار سے ہندو مسلم اتحاد کو فروغ حاصل ہوا۔ اور آزادی کی تحریک مضبوط ہوتی گئی، مختلف مکتبۂ فکر کے افراد شیخ الہند کی وسعت نظری کی وجہ سے یکجا ہونے لگے، علماء اور دانشوروں کے ارتباط اور تعلق سے وحدت فکر پیدا ہوئی۔ اس لحاظ سے اگر غور کریں تو شیخ الہند کا کارنامہ اس قدر عظیم ہے کہ اس کو چند صفحات میں مقید کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں شیخ الہند کی کوشش و کاوش کو ہم مشعل راہ بنا سکتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم اور شیخ الہند، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور شیخ الہند، جمعیۃ علماء اور شیخ الہند، تحریک ریشمی رومال اور شیخ الہند، اس طرح کے موضوعات پر تحریروں کو آنا چاہئے۔ موقع ملا تو آئندہ ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

۳۰؍نومبر ۱۹۲۰ء کو ہندستان کا یہ عظیم مجاہد آزادی، جلیل القدر عالم دین اور صاحب نظر مفکر اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

## اگر آج بھی ہم خوابِ غفلت سے نہ جاگے تو...

### ہمارے لیے یہ آخری موقع ہوگا جس کو ہم اپنے ہاتھ سے کھوئیں گے

**حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نوراللہ مرقدہ کی جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس دوم دلّی کی اختتامی تقریر کا ایک اقتباس**

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہم وطنوں کو اس پاک مقصد (حصولِ انصاف) میں آپ کا موید بنادیا ہے اور میں ان دونوں کے اتحاد کو بہت مفید اور ضروری سمجھتا ہوں۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر جو کوشش اس اتحاد کے سلسلہ میں فریقین نے کی ہے، اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہوگی تو وہ ہندستان کی آزادی کو ناممکن بنادے گی اور ظالم حکومت کا پنجہ روز بروز اپنی گرفت سخت کرتا رہے گا۔ اگر ہندستان کی آبادی کے کل عناصر صلح اور محبت سے رہیں گے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اور کوئی قوم چاہے وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اپنے ظلم و جبر سے اس کو شکست دے سکے۔''

# گوشۂ مولانا عبیداللہ سندھیؒ

مولانا عبیداللہ سندھیؒ جماعت شیخ الہندؒ کے ایک جانباز سپاہی حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد خاص اور تحریک ریشمی رومال کے حقیقی راز دار تھے۔ تحریک ریشمی رومال کی کوئی بھی کڑی ہو مولانا سندھیؒ اس سے پوری طرح وابستہ اور واقف تھے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ تحریک ریشمی رومال نمبر میں ان کا تذکرہ بھی شامل کردیا جائے۔

# حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

## حالاتِ زندگی ایک نظر میں

ولادت: ........................ ۱۰/ مارچ ۱۸۷۲ء

اظہارِ اسلام: ........................ ۱۵/ اگست ۱۸۸۷ء

حافظ محمد صدیق صاحب بھر چونڈی والوں سے بیعت ........................ ۱۸۸۶ء

دار العلوم دیوبند میں داخلہ: ........................ اکتوبر ۱۸۸۸ء

مدرسہ کانپور اور مدرسہ عالیہ رامپور میں ........................ عرصہ سات ماہ

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ صاحب اور مولانا شیخ الہند صاحب سے تلمذ ........................ ۱۸۹۰ء

معاودت سندھ ........................ فروری ۱۸۹۱ء

مولانا تاج محمود صاحب امروٹ ضلع سکھر کی خدمت میں ........................ آخر ۱۸۹۷ء

گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدر آباد) میں مدرسہ دار الرشاد کا قیام ........................ ۱۹۰۱ء

دیوبند میں واپسی اور جمعیت الانصار کی تاسیس: ........................ ۱۹۰۹ء

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی بنیاد ........................ جنوری ۱۹۱۳ء

کابل میں آمد ........................ اکتوبر ۱۹۲۲ء

ماسکو میں قیام ........................ ۱۰/ نومبر ۱۹۲۲ء تا ۲۳؍ جولائی ۱۹۲۳ء

ترکی کو روانگی ........................ انقرہ میں چار پانچ ماہ

استنبول میں قیام ........................ اواخر ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۶ء

مکہ معظّمہ میں آمد ........................ اگست ۱۹۲۶ء

معراجعت ہندستان ........................ ۷/ مارچ ۱۹۳۹ء

رحلت ........................ ۲۲/ اگست ۱۹۴۴ء

# حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ — زندگی اور شخصیت

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ (سابق ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند)

دنیا میں جو لوگ کسی عقیدہ پر ایمان رکھتے یا کسی مذہب کو سچا مانتے ہیں وہ ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک قسم تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے عقیدہ پر محض اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انھوں نے اس عقیدہ پر ایمان رکھنے والے گھرانے میں جنم لیا ہے۔ اس عقیدہ کو سچا ماننے والے لوگوں کی گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اور ایک ایسی سوسائٹی اور ایسے ماحول میں ذہنی تربیت و تعلیم کے مختلف مدارج طے کیے ہیں جو اس عقیدہ کا یقین رکھتے ہیں اس قسم کے لوگوں کا ایمان 'ایمان کامل' سہی، لیکن اگر وہ صرف اسی پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں تو ان میں اس بات کی صلاحیت کم ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کی سچائی اس کے مخالفوں اور دُشمنوں سے بھی منوا سکیں۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس عقیدہ کا بلند نظری، وسعت فکر اور تعمق خیال سے خود اپنے یا اپنے زمانہ کے طرزِ فکر کے ماتحت پوری طرح جائزہ لیتے ہیں، عقل و فراست کی کسوٹی پر اس کو خوب اچھی طرح پرکھتے اور اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کے دل و دماغ اپنی تمام بیداریوں کے ساتھ اس عقیدہ کی صحت کا متفقہ اور قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں تو اب وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں اور خوش قسمتی سے قوت نظری کے ساتھ ان کی قوت عملی بھی تندرست اور پُر جوش و سرگرم ہوتی ہے، اب یہ لوگ عقیدہ اور عمل کی پختگی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں کہ پہلی قسم کے لوگوں سے بمراحل آگے نکل جاتے ہیں اور صداقت پرستی کے درجات و مراتب میں ان کا مرتبہ سب سے اونچا اور بلند ہوتا ہے۔

نبوت کی زبان حقیقت ترجمان نے: ''خِیَارُکُمْ فِی الْجَاھِلِیَۃِ خِیَارُکُمْ فِی الْاِسْلَامِ۔'' (جو تم میں جاہلیت میں سب سے بہتر ہے وہ اسلام میں بھی سب سے بہتر ہے) فرما کر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی 'فاروقیت' کا راز بھی اسی ایک نکتہ میں پنہاں ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ اسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسلام جس کو ربّ السمٰوٰتِ والارض کی بارگاہِ اقدس سے رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ کا طغرائے امتیاز وافتخار حاصل ہے۔ عقائد و اعمال کا ایک ایسا دلنواز و روح پرور مجموعۂ خوبی ہے کہ اس کو جس جہت سے دیکھیے حسن ہی حسن نظر آتا ہے، اور اگر دیکھنے والا آئینۂ ضمیر سے دیکھے تو ناممکن ہے کہ اس کی نظر تجسّس اس کی جلوہ پاشیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائے:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی وجہ ہے کہ عرب کے سادہ طبیعت مشرکین و اہل کتاب اسلام کی سادہ تعلیمات سے متاثر ہوئے اور حلقہ بگوش کلمۂ توحید بنے۔ عجمیوں کو ان تعلیمات کے اخلاقی اور عملی اثرات و نتائج نے رام کیا اور وہ اس کے صید زبوں ہوئے، فلاسفہ کو اسلام نے کھینچا۔ بہادروں کے سخت دلوں کو عمرو خالد (رضی اللہ عنہما) کی جانبازیوں نے موم بنایا۔ سلاطین و امراء۔ اسلام کے سکندر دماغ فقیروں اور درویشوں کی شان بے نیازی و استغنا کو دیکھ کر اس کے آستانۂ عقیدت و ارادت پر بے ساختہ جھک پڑے اور دنیا کے مظلوم و مجبور اور بے کس و مقہور انسان جن کے جسموں پر قیصریت و کسرویت کے دیو جان شکار نے اپنے دندان حرص آواز جمار کھے تھے۔ انھوں نے اسلام کی زبان سے انسان حقوق کے احترام اور مساوات و برابری کا نعرہ سنا تو وہ سب اس کے جھنڈے نیچے جمع ہو گئے اور انھوں نے دعوت ربانی کو لبیک کہتے ہی اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں اور لاغر و نحیف جسموں میں ایک ایسی طاقت محسوس کی کہ انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے قیصریت و کسرویت کے ناپاک جامہ ظلم و ستم کی فضائے آسمانی میں دھجیاں اُڑا دیں، غرض یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر جماعت نے اسلام کی صداقت کو اپنے اپنے نقطۂ فکر اور رجحان ذہنی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے، اور اس کی سچائی پر ایمان لائی ہے۔ راہیں گو مختلف ہوں۔ منزل بہر حال ایک ہی ہے۔ عنوانات فہم و تعبیر میں رنگارنگی و گونا گونی ہے لیکن معنوں میں یکسانیت ہے۔

## عبارا تنا شتی وحسنک واحد

تاریخ اسلام کے ہر دَور میں یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ تاریخ انسانی کے طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کا طریق فکر اور اس کا اندازِ فہم وتدبر بھی ترقی پذیر ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اسی طریق فکر کی روشنی میں ہر حقیقت کا جائزہ لیتا ہے۔ اسلام چونکہ عالم گیر اور آخری دین حق ہے اس لیے اس کو کوئی انسانی جماعت خواہ کسی طریق فکر سے جانچے۔ بہر حال اگر فطرت میں سلامتی ہے تو وہ ضرور اس کی صداقت کا اعتراف کرے گی۔ اسی بنا پر متکلمین کے نام سے علماء اسلام میں جو جماعت، ہر دَور میں رہی ہے اس نے اسی بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کا پیغام اپنے زمانہ کے لوگوں تک ان کی استعداد فہم وفراست اور طریق فکر وتدبر کے مطابق ہی پہنچائیں۔

آج کل اسلامی قدامت پرستوں کا ایک عجیب وغریب شعار یہ بھی ہوگیا ہے کہ اب متکلمین اسلام کی ان مخلصانہ کوششوں کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، اور ان کے کارناموں کی وقعت کو کم کرنے کے لیے سرے سے عقلیت ہی کی مخالفت شروع کردی گئی ہے۔ حالانکہ اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا تو امام شافعی اور دوسرے علماء ایک مرتبہ علم کلام کی تحصیل کے متعلق عدم جواز کا فتویٰ دینے کے بعد پھر اس کے وجوب کا حکم نہ دیتے۔

ظاہر ہے کشتی میں جیتنے نہ جیتنے سے کسی مذہب کی صداقت کا کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود 'رُکانہ' نامی ایک عرب پہلوان نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑنے کی فرمائش کی اور اس میں جیت جانے کو اس نے دلیل صداقت قرار دیا تو آپؐ اس پر بھی رضامند ہوگئے اور رُکانہ کو پچھاڑ کر اس سے اپنی نبوت کا اقرار کرایا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ قبیلہ تمیم کے ایک وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مفاخرت یعنی فخر میں مقابلہ کرنے کی دعوت دی تو آپ اس پر رضامند ہوگئے، اور آپ نے وفد کے خطیب کے مقابلہ میں اپنے خطیب ثابت بن قیس کو اور ان کے شاعر کے مقابلہ میں اپنے شاعر حسان بن ثابت کو اشعار پڑھنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران تمیم نے خطبہ اور اشعار سن کر کہا۔ بیشک آپ نبی اور موید من اللہ ہیں، اور پھر سب مسلمان ہوگئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی صداقت کو ثابت کر دکھانے کے لیے ایک مبلغ کو اپنے زمانہ کے تمام آلات اور ساز وسامان سے مسلح ہونا چاہیے، اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل سراسر اسلامی ہے۔ نہ کہ 'تجدد'۔''

ہمارے زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اسی نوع کے متکلم اسلام تھے۔ مزید برآں آپ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ متکلم ہونے کے ساتھ عملاً عظیم وجلیل مجاہد بھی تھے۔ ہونا یہی چاہیے۔ لیکن بدنصیبی سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ناآشنا ہونے کے باعث دینِ قیم کی نسبت اجارہ دارانہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے، جاگیر دارانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کو نئے عنوان وتعبیر کا اختلاف بھی ناقابل برداشت ہے۔ اور یہ کسی ایسی چیز کو کبھی گوارا نہیں کرسکتا جو ان کے اپنے محدود نقطۂ فکر سے ذرا بھی منحرف ہو۔ چنانچہ ان حضرات سے مولانا عبیداللہ سندھی کا اجتہادی فکر گوارا نہ ہوسکا اور انھوں نے مولانا مرحوم کی زندگی میں ہی تحریروں اور تقریروں میں اس کا اعلانیہ اظہار شروع کردیا تھا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ساتھ ان حضرات کا یہ معاملہ تاریخ اسلام کا کوئی انوکھا اور نادر واقعہ نہیں ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔

غور کیجیے امام احمد بن حنبل کو، ''اَلْقُرْآنُ کَلَامُ اللّٰہِ غَیْرُ مَخْلُوْق'' کہنے کے جرم میں کن لوگوں نے دُرّے لگوائے تھے۔ امام مالک بن انس کو طلاق المکرہ لیس بواقع کا اعلان کرنے کی پاداش میں کن حضرات نے ذلیل ورسوا کرایا۔ پھر ابن رُشد پر جو تباہی آئی وہ کن کے فتاویٰ کا صدقہ تھا۔ امام ابن تیمیہؒ کو قید وحبس کی جو تکالیف برداشت کرنی پڑیں ان کے لیے سندِ جواز کا سامان کن حضرات کی تکفیر نے مہیا کیا۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی نسبت جہانگیر ایسے عادل بادشاہ کے اپنے تزک میں حد درجہ ناشائستہ الفاظ اور ان کو گوالیار کے زندان میں محبوس کرنا کس ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی 'بدعت ترجمہ قرآن' پر علمائے کرام کے ایک طبقہ نے کیوں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ یہاں تک کہ مسجد فتح پوری میں ان کے قتل تک کا پروگرام بنالیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ اصحابِ عقل ونقل اور اربابِ اجتہاد وتنقید میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے اور سب آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہے ہیں۔ اس بنا پر اگر آج بھی ایسا ہو تو اس میں نہ کوئی برا ماننے کی بات ہے اور نہ جائے حیرت واستعجاب ہے۔

چونکہ ہر کلام کے سمجھنے میں متکلم کی شخصیت کو سمجھ لینے سے بڑی مدد ملتی ہے اس لیے مناسب ہے کہ مولانا سندھیؒ کے افکار و آرا پر گفتگو کرنے سے پہلے موصوف کی شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے۔

مولانا کے افکار پڑھتے وقت بنیادی طور پر اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ افکار ایک ایسے شخص کے ہیں جو پیدائشی مسلمان نہیں تھا۔ ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ دنیوی اعتبار سے اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اس نے مذہبی صداقت کی جستجو شروع کی اور جب اسلام کی صداقت اس پر روشن ہوگئی تو اب اس کے قبول کرنے اور اس کے اظہار و اعلان میں اس نے کسی کی ذرّہ بھر پرواہ نہ کی۔ اسلام اس کو اتنا عزیز تھا کہ اس کی خاطر اس نے بوڑھی ماں کو چھوڑا، بہن اور ماموں سے منہ موڑے، کنبہ، قبیلہ کو الوداع کہاں یہاں تک کہ اپنا وطن بھی ترک کر دیا۔ پھر اس نے صرف مسلمان ہونے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسلام کی اصل روح، اس کی تعلیمات اور اس کے اصول و فروع میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے اس نے علومِ دین کی تحصیل شروع کی اور اسی سلسلہ میں وہ دیوبند آیا۔ یہاں اس نے علوم عقلیہ و نقلیہ میں کمال درک پیدا کیا۔ ذہن بیدار تھا اور ذوقِ جستجو صادق، استاذ حضرت شیخ الہندؒ جیسا ملا جو پیتل کو سونا اور خاکِ سیاہ کو ہیرا بنا دے۔ پھر کمی کس چیز کی تھی، اس نومسلم نوجوان نے وہ آب و تاب پیدا کی کہ اپنے ساتھیوں سے گویا سبقت لے گیا۔ اس کے علم و عمل، اخلاص و دیانت اور فہم و فراست کے ثبوت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اہم کاموں میں اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کا معتمد ترین دست و بازو بنا جو اپنے عہد کے صرف ایک نامور محدث نہیں تھے بلکہ عالمِ اسلام کے بلند پایہ مفکر بھی تھے اور جن کا دل و دماغ اسلام کو دُنیا کی عظیم ترین طاقت بنانے اور ہندستان میں ایک اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ اسی غایت اعتماد کا نتیجہ تھا کہ استاذ نے اپنے اس نوجوان شاگرد کو اپنے سینہ کے رازہائے سربستہ کو کا محرم و امین بنا کر کابل بھیج دیا۔ کابل میں چندسالہ قیام کے بعد آپ ماسکو آئے۔ یہاں اپنی آنکھ سے زار کی حکومت کے کھنڈروں پر سوویت روس کی جدید عمارت کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہاں ایک سال قیام کرنے کے بعد آپ ترکی آئے۔ پھر حجاز پہنچے اور بارہ تیرہ سال یہاں کی خاک میں بسر کرنے کے بعد ہندستان آئے اور پانچ سال بعد بالآخر یہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کر کے راہیِ عالمِ بقا ہوئے۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ ظاہر ہے کہ مولانا ہندستان سے کابل حضرت شیخ الہندؒ کے بھیجے ہوئے تھے اور ان کے ایک خاص مشن کے سفیر و مبلغ بن کر، پھر وہاں کیا حالات پیش آئے کہ مولانا کو آخر کار افغانستان کی اقامت بھی ترک کرنی پڑی؟ اس سلسلہ میں ایک بات بالکل ظاہر ہے اور خود مولانا نے بھی اپنی تقریروں اس کا بارہا ذکر کیا کہ ان کو قیامِ افغانستان کی طویل مدت میں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس اسلامزم کی بنیاد پر اسلام کی نشأۃ کی عمارت قائم کرنا چاہتے تھے وہ اب حالات زمانہ کی وجہ سے خواب و خیال ہو کر رہ گیا اور جن سے توقع تھی کہ وہ مسلمانانِ ہند کی خستگی اور جراحتِ دل کی داد دیں گے۔ وہ غریب خود ہندستان کے بدنصیب مسلمانوں سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم ہیں اور سب کے سب اپنے اپنے ملکی و وطنی معاملات و مشکلات کے حل کرنے میں اس درجہ سرگرداں و پریشان ہیں کہ انھیں اپنے کسی دوسرے ملک کے برادرانِ ملت کے معاملات پر غور کرنے اور ان سے دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ مولانا نے ترکی کے عزل خلافت سے پہلے ہی اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح محسوس کرلیا تھا، لیکن بعد کے تجربات نے خود ہندستان کے بھولے بھالے مسلمان کو بھی آخر کار اس حقیقت کا یقین دلایا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہایت درد و کرب سے محسوس کیا کہ انھوں

**مولانا عبیداللہ سندھی جس ذہن بیدار، دماغ روشن اور ہمت بلند کے مالک تھے اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان مایوسیوں میں ولولہ و عزم کار کے شعلوں کو سرد کر کے بیٹھ جاتے اور دل کو تسلی دینے کے لیے کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گردانی پر قناعت کرلیتے۔ ایک سپاہی کا کام یہ ہے وہ ایک مورچہ پر شکست کھاتا ہے تو اپنے لیے دوسرا مورچہ پسند کرلیتا ہے۔ اس کا اگر ایک ہتھیار کند اور ناکارہ ہوجاتا ہے تو وہ جھٹ دوسرے ہتھیار سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔**

نے ترکوں کی محبت میں اپنا سب کچھ کس طرح بے دریغ لٹایا اور خرچ کیا، لیکن ترکی کے نوجوانوں نے اس کا کیا جواب دیا، یہاں تک کہ ان فیاضیوں، قربانیوں اور ایثار وفداکاری کے جواب میں ان غریبوں نے خود غلامی کے طعنے سنے اور ان کو بصد حسرت وافسوس کہنا پڑا:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

مسلمانانِ ہند کے اس تلخ احساس کو ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم نے مصر میں تقریر کرتے ہوئے ایک نہایت بلیغ فقرہ میں ظاہر کیا تھا۔ مولانا نے فرمایا: ''اے مصر وادیِ نیل کے مسلمانو! خوب یاد رکھو، تمھاری سرزمین کو فرعون سے بھی نسبت ہے اور حضرت موسیٰ سے بھی۔ پس اگر تم کو حضرت موسیٰ پر ناز ہے تو تم ہمارے بھائی ہو، لیکن اگر تم فرعون کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے ہو تو ہم کو تم سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی جس ذہن بیدار، دماغ روشن اور ہمت بلند کے مالک تھے اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ ان مایوسیوں میں ولولہ و عزم کار کے شعلوں کو سرد کر کے بیٹھ جاتے اور دل کو تسلی دینے کے لیے کسی خانقاہ میں بیٹھ کر تسبیح گردانی پر قناعت کر لیتے۔

ایک سپاہی کا کام یہ ہے کہ وہ ایک مورچہ پر شکست کھاتا ہے تو اپنے لیے دوسرا مورچہ پسند کر لیتا ہے۔ اس کا اگر ایک ہتھیار کند اور ناکارہ ہو جاتا ہے تو وہ جھٹ دوسرے ہتھیار سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہد مسلسل کا ہی نام ہے اور موت سکون کے سوا اور کچھ نہیں۔

مولانا سندھیؒ کو قدرت نے جو دیدۂ بینا اور چشم حقیقت نگر عطا فرمائی تھی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ دریا میں طغیان وسیلاب کا تموج دیکھ کر لبِ ساحل آنکھیں بند کیے بیٹھے رہنا اور پسر نوح کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر بھروسہ کرنا قرینِ دانشمندی اور شیوۂ مصلحت شناسی نہیں ہے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ جنگِ عظیم نے دُنیا کی تہذیب وتمدن کے نقشے بدل دیئے ہیں۔ ایشیا پر یورپ کے سیاسی اقتدار کا پنجہ مضبوطی سے جم گیا ہے۔ نظاماتِ کہن کی قبا پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ پرانا فلسفہ، پرانی روایات اور پرانا اندازِ تخیل سب انقلاب کی طوفانی موجوں میں خس وخاشاک کی طرح بہتے چلے جارہے ہیں۔

مولانا کی زندگی کا مشن صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور دینِ حق کی سربلندی وسرفرازی تھا اور اسی مقصد کو لے کر وہ ہندستان سے روانہ ہوئے تھے، لیکن یہ مقصد حاصل ہو تو کس طرح؟ اس کا جواب آسان نہیں تھا۔ البتہ ایک بات بالکل صاف طور پر واضح ہوگئی تھی کہ اگر مادّیت کے اس بے پناہ فروغ کے وقت مسلمانوں نے پرانا مورچہ بدل کر کوئی نیا مورچہ نہیں بنایا تو ان کی موت یقینی ہے۔ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے: ان **اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیر و اما بانفھسم** یعنی:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قدرت کا یہ فیصلہ سب کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے۔ اس میں مسلمان، یہودی، عیسائی اور پارسی کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ وحسنہ بھی آپ کے سامنے تھا کہ کس طرح آنحضرتؐ نے تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے اور وہاں مقیم ہو کر وہاں کے بااثر قبیلوں سے معاہدہ کر کے اسلام کی مخالف طاقتوں سے جنگ کی اور اس طرح مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا کہ کوئی عقیدہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور اس پر ایمان رکھنے والے کتنے ہی مخلص اور فداکار ہوں بہرحال اس کو دُنیا میں زندہ رکھنے اور طاقتور بنانے کے لیے پہلی شرط حسن تدبیر ہے۔ اگر کام حسن تدبیر کے ساتھ کیا گیا ہے تو پھر بدر وحنین کے معرکوں میں فرشتے بھی آئے ہیں اور جماعت حقہ کی مدد کرتے ہیں اور اگر تدبیر میں فروگزاشت ہو جائے تو غزوۂ اُحد کی طرح اس کا خمیازہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس بنا پر مولانا نے اس بات کا تو فیصلہ قطعی طور پر کر لیا کہ اب پرانے مورچوں پر جما رہنا عقل ومصلحت اور خود اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لامحالہ دوسرا مورچہ بنانا ہے اور اس پر کھڑے ہو کر اسلام کی تمام مخالف طاقتوں کو دعوتِ مبارزت دینا ہے۔ لیکن یہ دوسرا مورچہ کیا ہو؟ اور اس کی تشکیل کس طرح پر کی جائے؟ اس کے لیے ضرورت تھی کہ پہلے اسلام کی مخالف طاقتوں کا پوری حاضر حواسی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان تمام عوامل و مؤثرات کا دیدہ وری کے ساتھ مشاہدہ ومطالعہ کیا جائے، جنھوں نے ان مخالف طاقتوں کے میگزین میں جادو کی سی تاثیر پیدا کر دی ہے اور جن کی وجہ سے وہ تمام دنیا پر چھائی جارہی ہیں اور ان کے بالمقابل عراق و ہمدان کا

مسلمان غریب، نوائے سوختہ درگلو اور پریدہ رنگ ورمیدہ ہوکر رہ گیا ہے۔

مولانا نے ان چیزوں سے واقفیت کے لیے آج کل کے ہمارے عام مفکرین و متکلمینِ اسلام کی طرح صرف اخبارات اور کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی نہیں خیال کیا، اور نہ ان کی ہمّت مردانہ کبھی اس کو گوارا کرسکتی تھی۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ خود ان ملکوں میں جا کر جہاں نئے مادی فکر کے اسلحہ ڈھل رہے تھے، قریب سے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ان مادی افکار و نظریات کی ساخت میں کتنے اجزائے صالحہ ہیں جن کو خود ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ اور کتنے اجزائے فاسدہ ہیں جن کو کاٹ کر ہم اپنے لیے امن و حفاظت کا سامان مہیّا کرسکتے ہیں، مسلمانوں نے تاریخ کے گزشتہ ادوار میں یہی کیا ہے، اور اسی طرح وہ اپنی ہستی کو مختلف احوال وشئون میں برقرار رکھنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ حقیقتوں سے آنکھ بند کرلینا اور اپنے خیالات کی تنگ اور محدود کوٹھری کو ہی کائنات کی وسیع فضا سمجھ لینا زندگی نہیں بلکہ موت کا پیغام ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

لیکن یہ وہ نکتہ ہے جو اسلام کی نسبت جاگیر دارانہ ذہنیت رکھنے والوں اور سبحہ و سجادہ کو ہی عین اسلام سمجھنے والوں کے دماغ کی رسائی سے بہت بلند ہے۔ مسلمانوں نے پہلے بھی 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر عمل کیا ہے اور اب بھی اگر وہ اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس پر عمل کرنے سے مفر نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ جذبہ تھا جس نے مولانا کو افغانستان جانے پر مجبور کیا اور آپ یہاں سے روانہ ہوکر ماسکو آئے۔ ترکی پہنچے اور دوسرے یورپین ملکوں میں کچھ دن رہے۔ ماسکو میں اس وقت انقلاب کے ہاتھوں سے ایک نئے نظام فکر و تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ یہاں رہ کر ایک دیدہ ور مفکر اسلام کو غور کرنا تھا کہ وہ کیا کیا خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو زار کی شہنشاہیت کو گرد و غبار بنا کر لے اُڑیں؟ اور وہ کیا اسباب وعوامل ہیں جن کی وجہ سے انقلاب کامیاب ہوا؟ نیز یہ کہ اس انقلاب کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ اور دنیا کے مختلف گوشوں پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اس کے محاسن کیا ہیں اور معائب کیا؟

پھر اس مفکر نے اس پر بھی غور کیا کہ اس طرح کا اگر کوئی اسلامی انقلاب کسی ملک میں پیدا کیا جائے تو اس کی صورتِ حال کیا ہونی چاہیے۔ اور بنیادی طور پر اس کا خاکہ کیا ہوگا؟ اس مقصد کے لیے مولانا نے ماسکو کا قیام ایک سال تک کے لیے وسیع کردیا، اور اس مدت میں وہاں کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ جو لوگ اس انقلاب کے امام تھے ان سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے افکار و خیالات سے واقف ہوکر اس انقلاب کے پس منظر کا علم حاصل کیا۔ ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ اس کا کھرا کھوٹا معلوم کیا۔ عصری رجحان ذہنی کا بکمال دانشمندی جائزہ لیا۔ اور سب سے آخر میں اس کا کھوج لگایا کہ انقلاب کی اس عمارت میں کہاں کہاں رخنے ہیں۔ جن کو بند کرکے اس کو اپنایا جاسکتا ہے۔ اور اسلام کی حفاظت کے لیے اس کو ایک مضبوط و محفوظ قلعہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ترکی جو مسلمانوں کی امیدوں کا ایک آخری سہارا تھا۔ مولانا نے اس کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پھر ان سب تجربات اور افکار کو لیے ہوئے اسلام کے حرم محترم (حجاز) میں آکر مقیم ہوگئے۔ تاکہ جو کچھ بھی انھوں نے ان ملکوں میں دیکھا اور محسوس کیا تھا ان سب کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کی بحالی اور اسلام کی سربلندی کے لیے ایک مکمل خاکہ اور نظام فکر و عمل تجویز کریں جو نہ صرف کسی ایک ملک کے مسلمانوں کی حالت کو بدل دے۔ بلکہ اسلام کو دنیا کی عظیم الشان طاقت بنادے۔

اگر کوئی اور جلد باز اور سریع الانفعال (جلدی اثر قبول کرنے والا) شخص ہوتا تو وہ ان حالات میں اعتدال کی راہ پر مشکل سے ہی قائم رہ سکتا تھا۔ یورپ کی مادیت کا فروغ، ترکی کا جدید انقلاب، روس میں اشتراکیت کی شاندار فتح، یہ سب چیزیں ایک ایسے شخص کو مرعوب متاثر اور خیرہ کرنے کے لیے کافی تھیں جو نہ کسی عربی مدرسہ کا مدرس تھا، نہ کسی خانقاہ کا پیر طریقت تھا۔ نہ کسی اسلامی جماعت کا امیر تھا اور نہ اس کے پیچھے مریدانِ باصفا کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ وہ ان تمام دینی اور مذہبی حیثیتوں سے بالکل الگ اور دور تھا۔ خود آزاد تھا اور اپنے دوش پر کسی کی مسئولیت کا بار نہ رکھا تھا۔ اس بنا پر بہت ممکن کیا، بلکہ اغلب تھا کہ وہ عصر حاضر کے ان جھوٹے نگینوں کی آب و تاب سے مرعوب ہوکر کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھتا جو سراسر غیر اسلامی ہوتا۔

جو شخص اپنے خاندانی مذہب کو تمام عوائق وموانع کے باوجود تبدیل کردینے کی جرأت کرسکتا ہے وہ یہ بھی کرسکتا تھا کہ نئے اختیار کردہ مذہب کا طوق غلامی بھی اپنی گردن سے اُتار پھینک دیتا علی الخصوص جبکہ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد اس پر یہ حقیقت بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی

تھی کہ اس مذہب کے پیچھے کوئی سیاسی طاقت بالکل نہیں ہے اور اب یہ صرف مسجد و خانقاہ کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ جس کی بنا پر شاعر ملت اقبال کو کہنا پڑا تھا:

بہ بند صوفی و ملا اسیری حیات از حکمت قرآں نگیری
ز آیاتش ترا کاری جزیں نیست کہ از یٰسؔ او آساں بمیری

مولانا عبیداللہ سندھی کی سلامت فطرت۔ صحت ذوق اور استقامت علی الاسلام کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ وہ ان تمام حالات ومشاہدات سے بنفس نفیس راہِ راست دوچار ہوتے ہیں اور پھر جو چیز قیام دیوبند کے زمانہ میں ان کے فکر کا مرکز تھی۔ یعنی قرآن وسنت اور حجۃ اللہ البالغہ وہی اب بھی مرکز فکر ہے۔ اس میں سرا مو انحراف نہیں آیا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے عقیدہ وعملاً مسلمان تھے اسی طرح اب بھی مسلمان تھے نماز روزہ کی پابندی اور روزانہ قرآن مجید کی تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اپنی ظاہری شکل و صورت اور عالمانہ وضع قطع میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔

مولانا کے افکار و آراء کا مطالعہ کیجیے ان کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھئے، جلوت وخلوت میں ان کی گفتگو سنئے، آپ دیکھیں گے کہ ہیگل اور مارکس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ لینن ٹالسٹائی اور میکسم گورکی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اگر تذکرہ ہے تو قرآن وسنت کا ہی ذکر و بیان ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شیخ الہندؒ ہی کا۔ وہی ایک مرکز ہے جس کے اِرد گرد مولانا کے افکار گردش کرتے رہتے ہیں۔ وہی ایک سرچشمہ ہے جہاں سے ان تمام افکار کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ آپ مولانا کے استدلال و استنتاج سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ ان کے نتائج غور وفکر کو غلط قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ بہر حال ماننا ہی ہوگا کہ مولانا نے اپنے افکار کی بنیاد غلط یا صحیح مغرب کے کسی فلسفی کے اقوال و آرا پر نہیں رکھی ہے بلکہ ان کا اصل منبع وہی ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے۔

مولانا نے یورپ کے جدید ذہنی رجحانات نئے انقلابی جذبات کا جو مطالعہ کیا ہے وہ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے کیا ہے، اور مولانا یورپ کے جن ملکوں میں رہے ہیں اور وہاں مادی ترقیات کا مشاہدہ کیا ہے تو اس جاسوس کی طرح کیا ہے جو دشمن کے ملک میں اس کے انتظامات اور قلعہ بندیوں کا سراغ لینے آتا ہے، تاکہ وہ اپنے ملک والوں کو ان سے آگاہ کر کے ان کے خلاف اپنے آپ کو مضبوط اور محفوظ بنانے پر آمادہ کر دے۔

مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی معیت وصحبت میں حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' اور دوسری کتابوں کو بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور بعض جگہ ان کا درس بھی دیا تھا۔ اس لیے مولانا کو ان پر عبور تام حاصل تھا۔ اور ان کتابوں سے خاص انس اور دلچسپی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا عہد مسلمانوں کے انحطاط کا عہد تھا۔ برائے نام مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی۔ ورنہ دراصل شہنشاہیت اپنی تمام ہولنا کیوں کے ساتھ اس وقت بھی قائم تھی اور مسلمانوں میں وہ تمام اعتقادی اور عملی کمزوریاں پائی جاتی تھیں جو آج ان میں موجود ہیں۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ شاہ صاحبؒ ایسے مجدد امت کی تصنیفات میں خرابیوں کی اصلاح اور ان کو دُور کرنے کی تدبیروں کا تذکرہ ہوتا، چنانچہ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات میں ان چیزوں کو پالیا اور ان پر برابر غور کرتے رہے۔

اب ماسکو، ترکی اور دوسرے یورپین ممالک میں تجربات حاصل کرنے کے بعد قرآن کے مہبط اوّل (مکہ) میں آ بیٹھے تو آپ نے قرآن اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کی ہی رہنمائی میں موجودہ بین الاقوامی حالات میں اسلام کی مشکلات کا جو حل سوچا تھا اس کو عملی اعتبار سے مرتب کرنا شروع کر دیا۔ ان افکار کا تعلّق چونکہ اولاً ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا اس لیے جب آپ کو موقع ملا۔ آپ ان کو لیے ہوئے (۱۹۳۹ء میں ہندستان آ گئے اور یہاں ان کی تبلیغ واشاعت تادم آخر کرتے رہے۔

بات ذرا طویل ہوگئی لیکن مولانا کے افکار و آرا پر بحث کرنے سے قبل مولانا کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ضروری تھا کہ قارئین کرام کو ان افکار کا پس منظر معلوم کرنے کے بعد خود افکار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مولانا کی شخصیت پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا مختلف ملکوں میں پھرتے رہے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے سے مولانا کے افکار میں جو اسلام کے احیا سے متعلق تھے وقتاً فوقتاً تبدیلی ضرور پیدا ہوتی رہی لیکن ان کا بنیادی نقطہ فکر جس کی اساس قرآن مجید اور ائمہ اسلام کے افکار تھے کسی حالت میں نہیں بدلا۔ وہ عمر بھر اسلام کے لیے ہی زندہ رہے۔ اسی کے لیے مجاہدانہ وار دنیا بھر کے مصائب برداشت کیے اور اسی پر ان کی وفات ہوگئی۔

(مضمون ماخذ از کتاب مولانا سندھی اور ان کے ناقد)

# حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جماعت شیخ الہندؒ کے ایک عظیم سپاہی

تحریر: مفتی عبد الخالق آزاد

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اسی جماعت شیخ الہند کے ایک عظیم فرد ہیں جنھوں نے اس دور میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ ۱۸۹۷ء سے لے کر اپنی وفات ۱۹۴۴ء تک آپ کی زندگی کا وہ اہم ترین پچاس سالہ دور ہے، جس میں اگر ایک طرف آپ نے سندھ کی سیاسی طاقتوں کو قومی نقطہ نگاہ سے منظّم کیا تو دوسری طرف دیوبند کے تیار کردہ بکھرے ہوئے موتیوں کو 'جمعیت الانصار' کی شکل میں جہاد آزادی کے لیے تیار کیا۔ اسی طرح اگر آپ نے ایک جانب 'نظارۃ المعارف القرآنیہ' کے عنوان کے تحت مسلمانوں کے دو اہم مراکز دیوبند و علی گڑھ کے فضلا کو منظّم کیا، تو دوسرے مرحلے میں کابل کے مرکز میں شیخ الہندؒ کے بکھرے ہوئے کارکنوں کی سیاسی شیرازہ بندی کرتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں انگریز سامراج سے افغانستان کی آزادی تسلیم کروائی، اور مستقبل میں ہندوستان کی آزادی کا برطانیہ سے وعدہ لیا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ، جماعت شیخ الہندؒ کے ان عظیم راہنماؤں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے گزشتہ صدی کے دو عشروں میں حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ نگرانی بڑی جانفشانی اور جرأت وہمّت سے کام کیا، اور جہاں آزادی کی منزل کو قریب کرنے میں مجاہدانہ کردار ادا کیا، وہاں اپنے نابغۂ روزگار قلب وعقل سے کام لے کر ہندوستان کے واقعی اور حقیقی سیاسی، اقتصادی اور فکری مسائل کا تعین کیا، اور ان کی پیچیدگی اور ژولیدگی کے اسباب وعلل کا کھوج لگایا، اور اس کے حل کے لیے دینی نقطۂ نگاہ سے سیاسی، اقتصادی اور سماجی تشکیل جدید کا جامع نظریۂ فکر وعمل پیش کیا۔

اس سارے غور وفکر اور تدبر وبصیرت کے پیچھے جن بنیادی عناصر نے حضرت سندھیؒ کی کاوشوں کو ایک مربوط رُخ دیا، وہ بقول ان کے تین ہیں:

**(۱) حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کا فکر و فلسفہ:**

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا فکر وفلسفہ وہ جامع نظریہ ہے کہ جس میں طبیعات کے ابتدائی عناصر سے لے کر انسانی سماج کی تشکیل اور اس کے چار ارتفاقاتی دائروں کی صورت گری تک، اور پھر انسان کی نفسی قوتوں اور ان کے چار بنیادی اخلاق سے لے کر ماوراء طبیعات کے مقدس مقامات تک کائنات میں موجود تمام اشیاء کے حقائق، خواص، افعال اور احکام کو ایک مربوط نظام فکر وفلسفہ میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صحیحہ کے جامع اسرار ورموز، اور جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کامل اسوۂ حسنہ کا بہترین نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد تک آنے والے تمام مجددین، مجتہدین اُمت، علمائے ربانیین، اور عادل سلاطین کے طرزِ فکر وعمل کا لب لباب ہے۔ مولانا سندھیؒ نے اسے اپنی فکر وعقل کا مرکز بنایا۔

**(۲) دار العلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت:**

دار العلوم دیوبند کی تعلیم وتربیت ایک ایسے دینی فکر کا تسلسل ہے کہ جو حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے جانشین راہنمایان قوم کے فکر وعمل کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ اور جس میں دین اسلام کا قانونی نظام یعنی (شریعت) انسانی نفس، قلب، اور عقل وروح کی تہذیب وتربیت باطنی یعنی (طریقت) اور دین اسلام کے غلبہ کے لیے ظلم کی سیاست و معیشت کو ختم کرنے اور عادلانہ سیاسی اور معاشی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا سندھیؒ نے اسے اپنی قلبی قوتوں کا منبع بنایا۔

**(۳) یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ:**

ایک ایسے دور کا مطالعہ جس میں یورپ نے ڈارک ایج سے گزر کر اب تک جو سیاسی، اقتصادی اور فکری منزل حاصل کی ہے۔ مذہب کو رد کر کے یورپ نے فلسفہ وفکر کے میدان میں کس ژولیدہ فکری کا مظاہرہ کیا؟ اور لبرل ازم سے شروع ہونے والا سیاسی سفر جمہوریت کے کن دائروں تک پہنچا؟ نیز میکینکل ازم سے شروع ہونے والا اقتصادی سفر کیپٹل ازم سے گزرتے ہوئے سوشلزم کے نام سے سماجی فلاح کے کن دائروں تک آیا؟ مولانا سندھیؒ نے اس کا بھرپور تجزیہ کیا اور اس تحلیل

نفسی کا گہرا مطالعہ کیا۔

مولانا سندھیؒ نے یورپ کے اس سیاسی، اقتصادی اور فکری سفر کا تجزیہ کرکے اس بات کا تعین کیا کہ اس سارے سفر میں اس نے کہاں اور کن مراحل میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اور ژولیدگی کا شکار ہوا ہے۔ اور اس جدوجہد کے دوران کونسے مفید اجزا انسانیت کی خدمت کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی حوالے سے جو مفید اجزا ہیں، اور انسانی سماج کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں، وہ انتہائی ضروری اور انسانیت کی مشترک میراث ہیں، ان سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ اور اس سفر کے دوران جن مراحل اور مقامات میں یورپ نے انسانیت پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں، سرمایہ پرستی کی لعنت نے جس طرح انسانیت کا وجود فنا کیا ہے۔ اور فکر وفلسفہ کے میدان میں قطعاً غلط راہوں پر چل کر انسانیت کے لیے رجعت قہقری کا باعث بنا ہے۔ اسے رد کیا جانا ضروری ہے۔ اور نہیں تو اس خطہ کی اقوام کو اس لعنت سے بچانے کی جدوجہد کرنا اور اس کی جگہ اس دھرتی پر موجود دین اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ سیاست ومعیشت اور فلسفہ وفکر کے شارح اور جامع حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کے فکری تسلسل کو قائم رکھنا، اس دور کا اہم ترین تقاضہ ہے۔

اس لیے کہ ہر خطہ، علاقہ اور دھرتی سے پھوٹنے والے فکر وعمل، سیاسی تسلسل انصاف پر مبنی روایات اور سچے مذہب کی اساس پر ہی کسی خطہ کی سیاسی، اقتصادی اور فکری تشکیل ہوا کرتی ہے۔ یہ اس خطہ کے عوام کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے انسانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی دھرتی سے پھوٹنے والے فلسفہ ولی اللہی کو اساس بنا کر اپنی تشکیل جدید کریں۔ کیونکہ دین اسلام کے سچے فکر وعمل کے زیر سایہ ہندوستان نے اپنی ترقی کے تقریباً ہزار سال مکمل کئے ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ کا فکر وعمل اس ہزار سالہ دور کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

اس خطہ کے لوگ اپنے بنیادی فکری ورثہ یعنی دین اسلام کی تعلیمات کو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھیں اور پوری جرأت وہمّت سے کام لے کر یورپ کے مفید علوم، درست تجربات اور سائنس وٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں مہارت حاصل کریں۔ اور اس خطہ کی تعمیر نو اور سماجی تشکیل جدید کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے کہ جب تعلیمی صلاحیت، سیاسی شعور اور اقتصادی مسائل کی صحیح آگہی کو مسلسل محنت وجدوجہد سے حاصل کیا جائے۔ اور عدم تشدد کے اصول پر کام کرتے ہوئے مسلسل صبر، جرأت وہمّت اور محنت سے اپنے اہداف کے حصول کی کوشش کی جائے۔

گویا برصغیر پاک وہند میں انگریز سامراج کے قائم کردہ ظالمانہ نظام کے خلاف انقلابی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے جدوجہد کی جائے۔ اور اپنے اندر سے غلامی کے جمود کو توڑتے ہوئے تحریک انقلاب کی آبیاری کی جائے، یہی وہ پیغام انقلاب ہے، جو مولانا سندھیؒ کی تعلیمات کا بنیادی جوہر ہے۔

مولانا سندھیؒ نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام مراحل میں حاصل کردہ تجربات اور غور وفکر کے نتائج کو کسی نہ کسی صورت تحریر کیا ہے۔ چنانچہ کہیں آپ برصغیر کی قوموں کی تعمیر نو کے ابتدائی مرحلہ میں دستوری اور آئینی دفعات کی صورت میں اپنے نتائج فکر کو مرتب کر دیتے ہیں، تو کہیں سیاسی جماعتوں اور کانفرنسوں میں خطبات صدارت کی صورت میں اپنے مربوط خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی تاریخی تحقیق وتجزیہ پر مشتمل مقالات کی صورت میں خطہ کا فلسفہ تاریخ متعین کرتے ہیں، تو کبھی معرکۃ الآراء خطاب کی صورت میں اپنا پیغام انقلاب دیتے نظر آتے ہیں۔

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو مولانا سندھیؒ کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے، جس میں اس دور کی قومی، ملی تاریخ کے اہم ترین ورق شامل ہیں۔ آپ نے نہ صرف عملاً اس دور کی سیاست میں حصہ لیا، بلکہ عمر کے آخری حصہ میں اپنے افکار اور اعمال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ بھی کیا۔ اور جو چیز نوشتۂ دیوار کی طرح ایک حقیقت ثابت رکھتی تھی، اسے ملک وقوم کے سامنے کھلے طور پر پیش بھی کیا۔ عملی طور پر سیاسی زندگی گزارنے والے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں حالات وواقعات کا تجزیہ کرنے اور ملکی اور قومی مفاد میں درست فیصلوں تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔

مولانا سندھیؒ ان عظیم سیاسی مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے سماجی تہذیب وتشکیل کے لیے مربوط فلسفہ سیاست ومعیشت پیش کیا ہے۔ ایسا فلسفہ جس کی اساس انسانیت کی خدمت پر ہے۔ انسانیت کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل آپ کے فلسفہ سیاست ومعیشت کی بنیادی کلید ہے۔

❑❑

# قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی نظر میں

# امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی شخصیت

**حضرت مولانا حبیب الرحمن رائے پوریؒ نے قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے ارشادات و ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں، جنہیں مولانا عبداللہ صاحب آف بھکرنے 'ارشادات' حضرت رائے پوری کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اس میں مولانا سندھیؒ کے بارے میں حضرت رائے پوریؒ نے انتہائی وقیع رائے گرامی کا اظہار فرمایا ہے۔**

۷؍رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ/ ۵؍اگست ۱۹۴۶ء رائے پور میں ایک مجلس میں ارشاد فرمایا:

''میں نے حضرت شیخ الہندؒ کی زبانی خود سنا ہے، وہ ہمارے حضرت (شاہ عبدالرحیم رائے پوری) کے سامنے بیان فرماتے تھے کہ ''حضرت! مولانا انورشاہ صاحب اور مولانا عبیداللہ (سندھی) صاحب دونوں کی بڑی استعداد ہے، حضرت! مولوی عبیداللہ دہلی جارہے ہیں۔ میں نے ان کو کہہ دیا ہے کہ وہاں کوئی ایسی (گہری) بات نہ کرنا، جس کو عام طور پر لوگ نہ سمجھ سکیں اور شور ہو، کیونکہ تمہاری باتوں کو میں ہی سمجھتا ہوں اور کوئی یہاں نہیں سمجھتا اور مولوی کفایت اللہ صاحب بھی مستعد ہیں۔''

(ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر ۲۶)

۱۰؍رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ/ ۸؍اگست ۱۹۴۶ء رائے پور میں ایک مجلس میں حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا:

''میں نے حضرت شیخ الہندؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تعریف سنی ہے۔ کہ وہ بہت مستعد ہیں، اوران کی بہت ہی تعریف فرماتے تھے، تواب میرے خیال میں یہ ہے کہ مولانا سندھیؒ کی بات سمجھنی دشوار ضرور تھی، مگر بات صحیح کہتے تھے، البتہ زبان ایسی بولتے تھے، جس سے لوگ بدکتے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ بھی فرماتے تھے کہ میں نے مولوی عبیداللہ کو کہا ہے کہ تمھاری بات سمجھنے والا ہندوستان بھر میں مَیں ہی ہوں اس لیے لوگوں سے کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ جس سے وہ غلط فہمی میں پڑیں۔

حضرت شیخ الہندؒ جس کی تعریف کریں، میں تو ان کے متعلق نیک گمان ہی رکھتا ہوں۔ (کیونکہ) حضرت شیخ الہندؒ کی سمجھ اور علم، بہت گہرا تھا، حضرت مدنیؒ بے شک بہت بڑے بزرگ ہیں، مگر جو بات حضرت شیخ الہندؒ میں تھی، وہ بہت گہری تھی، لہٰذا مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے متعلق، حضرت شیخ الہندؒ کے اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے، میں تو مولانا عبیداللہ سندھیؒ صاحب کو ایسا نہیں سمجھتا، جیسا کہ عام نقطہ چین یا بعض حضرات فرماتے ہیں۔

**مولانا سندھیؒ کا اپنا علم بھی بڑا وسیع تھا، سیاست سے لگاؤ اس درجہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے تمام شاگردوں میں سے کابل جانے کے لیے مولانا سندھیؒ کو ہی بھیجنا مناسب سمجھا، اگر حضرت شیخ الہندؒ سے تعلیمی اور تربیتی تعلق نہ ہوتا تو شاید مولانا مسلمان بھی نہ رہتے، کیونکہ وہ محض کسی کی تقلید میں بات ماننے کے عادی نہ تھے۔**

مولانا سندھیؒ کا اپنا علم بھی بڑا وسیع تھا، سیاست سے لگاؤ اس درجہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے تمام شاگردوں میں سے کابل جانے کے لیے مولانا سندھیؒ کو ہی بھیجنا مناسب سمجھا، اگر حضرت شیخ الہندؒ سے تعلیمی اورتربیتی تعلق نہ ہوتا تو شاید مولانا مسلمان بھی نہ رہتے، کیونکہ وہ محض کسی کی تقلید میں بات ماننے کے عادی نہ تھے۔ مکہ معظمہ میں بڑے بڑے نجدی عالم ان کے علم کے قائل ہوگئے، اوران سے بعض نے پڑھا بھی، مگران کے سامنے اپنے آپ کو حنفی کہتے تھے۔

جب مکہ شریف جانا ہوا تو میں نے مولانا سندھیؒ کو بہت تلاش کیا، نہ ملے، پھر رات کو خود آ کر ملے اور فرمایا:

''میں حج کے موقع پر چھپا چھپا رہتا ہوں، ہر طرح کے لوگ (برطانوی حکومت کے جاسوس وغیرہ) اس موقع پر آئے ہوتے ہیں دانستہ میں لوگوں سے ملتا نہیں۔

میں نے (مولانا سندھیؒ سے) عرض کیا کہ آپ پڑھانا شروع کر دیں۔ تو فرمایا میں اب اپنے خیال سے لوٹنے والا نہیں، میرے لیے لوٹنا ناممکن ہے۔ یعنی سیاسی مشاغل سے یکسو نہیں ہونا چاہتا، اگر مولانا سندھیؒ پڑھاتے تو نجدی۔ جن میں قومیت کا اثر کم ہے۔ آپ کی بڑی قدر کیا کرتے تھے، اور آپ سے پڑھنا چاہتے تھے، اور باوجود (مولانا سندھیؒ) کے حنفی ہونے کے وہ ان سے استفادہ کرنے کو آمادہ بلکہ خواہش مند تھے۔

ہاں! مجھے یہ بیان کرنا ہے کہ جب مولانا عبیداللہ سندھیؒ صاحب سے مکہ معظّمہ میں ملنا ہوا تو میں نے (ان سے) یہ بھی دریافت کیا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ پر آپ کا (بڑا) اثر تھا، یہ کیا بات تھی؟ اس (سوال) پر مولانا صاحب مرحوم رو پڑے اور فرمایا'' کہ میرا اثر کیا ہوتا، خدا کی قسم! اگر مجھے اب بھی یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت شیخ الہندؒ میرے کام سے ناراض ہیں یا خوش نہیں تو باوجود اس پختگی کے، جو میں نے بیان کی۔ میں فوراً اس کام سے رُک جاؤں (مجھے معلوم ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ میرے کام سے خوش ہیں) اس لیے میں اسے چھوڑ کر اور کسی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ (ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر ۳۴ تا ۳۷)

۴؍ذالحجہ ۱۳۶۵ھ/ ۳۰؍اکتوبر ۱۹۴۶ء رائے پور میں ایک مجلس میں حضرت رائے پوری نے سب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''مولوی حبیب الرحمٰن (رائے پوری) نے ایک بات پوچھی تھی، اس پر دل میں کچھ بیان کرنے کی اُمنگ ہوئی، اور یہ مضمون کچھ میرا (اپنا) بھی نہیں (بلکہ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف کے بعض فقروں سے مستنبط (کیا ہوا) ہے، مولانا عبیداللہ سندھیؒ شاہ صاحب کے کوئی خواہ مخواہ کے معتقد نہ تھے (بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ) شاہ صاحب متاخرین میں زبردست علوم کے حامل ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر معاملے میں بڑے بڑے علوم عطا فرمائے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کو کسی زمانہ میں کوئی رنگ پھیلانا ہوتا ہے، تو ویسے ہی لوگوں کو پیدا فرما دیتے ہیں، اور ان کے جذبہ کی وجہ سے عام نفوس ادھر کو ہی کھینچ جاتے ہیں۔''

میں نے اس سے یہی سمجھا کہ ایک تو سلوک ہے، یعنی چلنا اور ایک جذبہ ہے یعنی کھینچ جانا، تو جب اللہ تعالیٰ کو دنیا میں کچھ کرنا منظور ہوتا ہے تو کسی ایسے قلب کے انسان کو دنیا میں بھیج دیتے ہیں، جس میں جذبہ ہو اور پھر اور لوگ بھی ایسے پیدا ہو جاتے ہیں، جن کو ان سے مناسبت ہو اس طرح وہ شخص ان کا مرکز بن جاتا ہے۔ اور وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور پھر ان کے اثرات سے زمانہ پر وہی رنگ چھا جاتا ہے۔ (ارشادات حضرت رائے پوری صفحہ نمبر ۹۵-۹۴)

۳۰؍ربیع الاوّل ۱۳۶۹ھ/ ۱۸؍فروری ۱۹۵۰ء دہلی میں عصر کی نماز کے بعد ایک مجلس میں حضرت اقدس رائے پوری نے (حضرت سندھیؒ کے شاگرد) خواجہ عبدالحی صاحب پروفیسر دینیات جامع ملیہ دہلی سے فرمایا:

''کیا جناب نے مولانا سندھیؒ سے آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ کے متعلق کوئی تفسیر سنی ہے، یا کبھی ان سے دریافت فرمایا۔ (اور تو بیان کیجیے) یا آپ بھی شیخ التفسیر ہیں۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ ''حضرت! نہ کبھی اس کے متعلق میں نے حضرت مولانا مرحوم سے کچھ دریافت کیا، اور نہ ان کا کوئی بیان اس سلسلہ میں سنا ہو مجھے یاد ہے۔ (ارشادات ۲۶۸)

ان ملفوظات سے دونوں بزرگوں کے باہمی تعلق اور ان کے باہمی اعتماد کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ □□

**جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ پر آپ کا (بڑا) اثر تھا، یہ کیا بات تھی؟ اس (سوال) پر مولانا صاحب مرحوم رو پڑے اور فرمایا'' کہ میرا اثر کیا ہوتا، خدا کی قسم! اگر مجھے اب بھی یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت شیخ الہندؒ میرے کام سے ناراض ہیں یا خوش نہیں تو باوجود اس پختگی کے، جو میں نے بیان کی۔ میں فوراً اس کام سے رُک جاؤں۔**

# مولانا عبیداللہ سندھیؒ

## جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی

عادل صدیقی

۱۸۵۷ء کا سال برصغیر اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے اپنے جلو میں جو مصائب اور آلام لے کر آیا اس کا دُھندلا سا نقشہ بھی لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس تحریکِ آزادی سے قبل بھی ایک اور تحریک آزادی بالاکوٹ میں ناکام ہوچکی تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے خیال میں بالاکوٹ کی تحریک آزادی کی ناکامی سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کی ہمت بندھی اور وہ کھل کر سامنے آگئے۔ ان سیاسی تحریکوں کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستانیوں کو انگریزی میں تعلیم دے کر ان کی ذہن سازی کی کوشش کی۔ اس فتنہ کے مقابلے کے لیے ہی ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد گرامی حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی کا دہلی میں مدرسہ رحیمیہ بھی نہ صرف برصغیر میں بلکہ برصغیر سے باہر کی دنیا کو بھی فیض پہنچا رہا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ''میں نے برصغیر کا چپہ چپہ چھان مارا، کوئی عالم مجھے ایسا نہ ملا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر مدرسہ رحیمیہ سے فیضیاب نہ ہوا ہو۔''

سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھ کے متعلق کپتان ہملٹن کا قول ہے کہ: ''چار سو مختلف علوم وفنون کے کالج اس شہر میں موجود تھے اور یہ زمانہ سلطان اورنگ زیب کا تھا۔'' (سفر نامہ بحوالہ الفرقان، ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ)

'تعلیم ہند' نامی رسالے میں مختلف چیزیں اس ضمن میں ذکر کی گئی ہیں۔ مثلاً انڈیا ڈسٹرکٹ اسکولوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر ۳۱ لڑکوں پر ایک اسکول ہے۔ (بیان ریونٹ وارڈ، ۱۸۲۱ء)

پروفیسر میکس میلر کا بیان ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدرسے تھے۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم کو درہم برہم کرنے کے لیے جدید نظامِ تعلیم کی تدوین وتربیت کا انگریزوں نے ایک نقشہ تیار کیا۔ اس کے ذریعے سے انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ پرانا نظامِ تعلیم بدل کر نئے نصابِ تعلیم کے ذریعے ہندستانیوں کے دلوں میں غلامی کے احساسات راسخ کردیئے جائیں۔

اس سلسلے میں حضرت شیخ الہندؒ نے نہ صرف یہ کہ دارالعلوم کے قیام میں حصہ لیا بلکہ انھوں نے آزادی کے متوالوں کا ایک گروہ بھی تیار کیا جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد اور سودیشی تحریک کے ذریعے سے آزادیِ وطن کے لیے طرح طرح کی قربانیاں دیں۔ انھوں نے اپنے مکان کے تہہ خانے میں بیٹھ کر ہندستان، افغانستان، برما، بنگال، ترکی، حجاز کے فوجی ہیڈکوارٹروں کی کمان کی۔ ان کی سرکردگی میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہندو مسلم مجاہدین سر سے کفن باندھ کر حیات کی بازی لگا رہے تھے۔ صرف ہندستان کے مرکز بغاوت دلّی میں علی برادران، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، جواہر لال نہرو، راجندر پرساد، مولانا آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی اپنی بیدار مغزی، بصیرت اور دانشوری سے آزادیِ وطن کے لیے بے تاب نظر آتے تھے اور ہر طرح کی قربانی دے رہے تھے۔

اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہندستان کی جنگ آزادی کے سرکردہ رہنماؤں کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جام پور کے مڈل اسکول میں پائی۔ دورانِ تعلیم ہی اپنے مطالعے کے دوران وہ اسلام سے متاثر ہوئے۔ جام پور سے سندھ چلے گئے، وہاں ایک درویش کامل حافظ محمد صدیق کی خدمت کی۔ ۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم دیوبند آئے اور سلسلۂ تعلیم شروع کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ الانصار کا قیام انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس کے ناظم بنائے گئے۔

### وطنی خدمات:

انھوں نے قوم ووطن کی جس بے جگری سے خدمات انجام دیں، وہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ 1915ء میں انھوں نے افغانستان میں کابل کے مقام پر اس قومی حکومت کی تشکیل میں حصہ لیا جو جانبازانِ وطن نے ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے وہاں قائم کی تھی۔ ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قومی حکومت

کا تصور پیش کیا گیا۔اس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے اور مولانا برکت اللہ بھوپالی اس کے وزیر خارجہ تھے۔اس کی برانچیں مدینہ منورہ، استنبول، قسطنطنیہ، انقرہ اور برنس تک پھیلی ہوئی تھیں۔ان سیاسی سرگرمیوں کے تحت دفتر خارجہ کے تحت انڈین نیشنل پارٹی قائم کی گئی جس میں لالہ ہر دیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی شامل تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے باہر ملکوں میں ہندستان کی آزادی کے لیے وہاں کے عوام کو ہمنوا بنایا۔ وہ آزادی کا پیغام جس خفیہ انداز میں دوسروں تک پہنچا پائے اس کو تاریخ ہند میں ریشمی خطوط کی سازش کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے فرمانے کے بموجب کابل میں سات آٹھ سال تک رہے اور شاہ امان اللہ اور ان کے والد شاہ حبیب اللہ سے تعلقات بڑھائے۔ مولانا نے حسن تدبیر سے شاہ افغانستان کو ہندستان کی آزادی کا حامی بنالیا تھا۔اس کے بعد مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے روس اور ترکی جا کر بھی وہاں کی حکومتوں اور وہاں کے عوام کو ہندستان کی آزادی کے متعلق بتایا۔ان دونوں ملکوں میں مولانا کے جذبۂ آزادی کی بڑے پیمانے پر حمایت کی گئی۔آخر میں بارہ سال مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے مکہ مکرمہ میں گزارے۔اس طرح ۲۵ سال کی لمبی جلاوطنی کی زندگی گزار کر ۱۹۳۹ء میں مولانا کانگریسی وزارت کی دعوت پر ہندستان آئے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے عالمی رائے عامہ کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔اس زمانے میں باہر ملکوں کے سفر بھی آسان نہ تھے۔ ذرائع نقل وحمل اور ذرائع مواصلات بے حد دشوار تھے۔ پھر انگریز حکومت کے جاسوس ہر جگہ نظر آتے تھے اور ان کا اپنا اثر بھی تھا۔

ان حالات میں کام کرنا آسان نہ تھا، مگر وطن کی آزادی کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ ان مشکلات کو انھوں نے اپنے مشن کے راستے میں نہیں آنے دیا۔اس مشن کے تحت وہ مکمل ۲۵ سال تک غیر ملکوں میں رہے اور انھوں نے ہزاروں طرح کی تکالیف برداشت کیں مگر پیشانی پر بل نہیں آیا۔البتہ مرد مجاہد کی جوانی ضعف ونقاہت میں بدل گئی تھی۔

دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے مکان پر قیام کے دوران مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے مولانا عثمانی سے فرمایا کہ ہم نے جامعہ ملیہ میں بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ سبھی لوگ اس میں ہاتھ بٹائیں۔مولانا عثمانی نے فوراً پچاس روپے حاضر کیے اور کہا کہ اس میں سے تیس روپے آپ کے ذاتی مصارف کے لیے ہیں اور بیس روپے آپ کے ادارے کے لیے۔مولانا نے فوراً تیس روپے اپنے نواسے عبیداللہ انور کو جو اُن دنوں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے دے دیئے اور فرمایا کہ دلّی تک جانے کے لیے کرایہ ہمارے پاس ہے، یہ روپے تم لے لو۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے عسرت کی زندگی گزاری مگر قوم و وطن کی خدمت کو ہر حالت میں مقدم سمجھا۔ دلّی میں اوکھلا سے جامع مسجد تک آنے کے لیے ان کے پاس تانگہ یا ٹرام کا کرایہ نہیں ہوتا تھا اور یہ بوڑھا ضعیف آدمی میلوں کا سفر پیدل طے کرتا تھا۔

آج افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنی زندگی میں اپنے وطن کو آزاد نہ دیکھ سکے، البتہ ان کی تعلیمات اور ان کی زندگی کے کارنامے ہمارے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔

ان کی آخری زندگی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ریاست بہاولپور کے قصبہ دین پور میں بسر ہوئی۔ ۲۱/اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور میں انتقال فرمایا۔

اخبار میں مولانا سندھیؒ کی وفات کی خبریں شائع ہوئیں۔ان کی موت پر مختلف دانشوروں نے مختلف طرح کے تبصرے کیے۔کسی نے کہا کہ علم اور سیاسی فکر کا ایک ستون گر گیا۔کسی نے کہا کہ ایک سخت جان اور جفاکش بے لوث خادم ملک وقوم نے اپنی جان جانِ آفریں کو سونپ دی، کسی نے کہا کہ ایک ناکام ترین لیڈر حیات کی کشمکش سے نجات پا گیا۔

اگر چہ وہ ایک ناکام لیڈر تھے مگر انھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جو داغ بیل ڈالی تھی، اس کو مشعل راہ بنا کر ملک کو آزاد کرایا جاسکا۔ البتہ ان کو اپنے دَور میں اپنی منجھی ہوئی فکر کی ناقدری کا بجا طور پر شکوہ رہا۔ ہندستان کی تاریخِ آزادی میں ان کا نام گاندھی جی، سبھاش چندر بوس، مولانا آزاد کے ساتھ ساتھ لکھا جاتا ہے۔

مولانا کبھی کبھی اس قدر دل برداشتہ ہو جاتے کہ خود کو دیوانہ کہنے لگتے۔ ایک بار اپنے ایک دوست سے کہا کہ ”مجھے تم پاگل کہو، مگر میری بات سن لو، اگر تم نے میری ایک بات بھی مان لی تو میری دیوانگی کی قیمت ادا ہو جائے گا۔“ وہ دیوانگی کیا تھی؟ وہ تھی سرزمینِ وطن کی آزادی، اس جملے سے ان کے جذبۂ وطن کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

□□

# مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ایک خط

## جسے بنیاد بنا کر انگریزی سامراج نے تحریک ریشمی رومال پر یلغار کردی

از کابل، ۹؍رمضان المبارک، روز ابتداء

وسیلۃ یومی وغدمی حضرت مولانا صاحب مدظلہم العالی! آداب و نیاز مسنون!

جدہ کے بعد کا حال یہ ہے۔ بمبئی آرام و بے خطر پہنچے۔ بندر پر اسباب کی تلاشی میں خدام سے دانستہ اغماض برتا گیا۔ فللّٰہ الحمد. مولانا مرتضیٰ صاحب کام کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو کام میں نہیں لیا گیا۔ مولوی ظہور صاحب بمبئی استقبال کو پہنچے تھے اور محمد حسین راندیر سے۔ راندیر میں تحریک چندہ صرف سیّد صاحب کے خلاف سے ناکام رہی۔ راندیر خطیب مکر رجانے والے تھے نہ معلوم کیا ہوا۔ قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سرپرستی قبول فرمائی۔ جماعت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی۔ اس کام کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک سالہ رخصت لینے کا قصد فرما رہے ہیں۔ جماعت کے ہر سہ ممبر سرفروشی کر رہے ہیں مطلوب الگ ہوگیا۔ سیّد نور رست مولانا رائے والے متفق ومعاون حکیم صاحب پچاس روپیہ ماہوار مکان پر جا کر خود دیتے رہتے ہیں اور درمیان میں بھی ایک دوبار جاتے رہتے ہیں۔ اور گاہ بگاہ ڈاکٹر صاحب بھی۔ حنیف کو جماعت دس روپیہ جیب خرچ دیتی ہے وہ مکان پر رہی ہیں۔ مدرسہ نے ان سے کوئی ہمدردی نہیں کی۔ مالکان مدرسہ سرکار کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں نمائش کے دربار میں شرکت کا فخر بھی نصیب ہونے لگا۔

امیر شاہ مولانا عبدالرحیم صاحب کے دستی کام کے لیے پڑا ہے۔ مولانا مدرسہ سے مرعوب ہیں مگر خدام کی صفائی فرماتے رہتے ہیں۔ مولوی رامپوری نے بھی تائید سے کنارہ کیا۔ مسعود بھی شکار ہوگیا۔

بندہ حسرت آزاد سے ملا۔ دونوں بیکار ہو چکا ہیں کیونکہ بندہ کا لوٹنا حضور تک نہ ممکن تھا۔ اس لیے آگے بڑھا۔

غالب نامہ احباب ہند کو دکھا کر حضرت یاغستان کے پاس لایا۔ حاجی بھی اب مہمند میں ہیں۔ مہاجرین نے مہمند باجوڑ صوات بنیر وغیرہ علاقوں میں آگ لگا رکھی ہے۔ ان علاقوں میں غالب نامہ کی اشاعت کا خاص اثر ہوا۔ اس لیے ضروری ہے کہ حسبِ وعدہ غالب مصالحت کے وقت یاغستان کی خدمت کا خیال رکھا جائے۔ ضعف جماعت ہند سے مہاجرین کو کافی امداد نہیں پہنچ سکی۔ بندہ یاغستان ایک ماہ قیام کر کے وفد مہاجرین کے ساتھ کابل پہنچا۔ مولانا سیف جماعت سے الگ ہوکر یہاں مقیم ہیں۔ ان کے لیے دولت کی طرف سے کام کی تجویز ہو رہی ہے۔ اعضائے وفد فضلین وعبدالعزیز ہیں۔ مولانا الناظم کی توجہات وحاجی عبدالرزاق صاحب کی عنایات سے وفد نے دربار نصراللہ رسائی کی ابتدائی کامیابی بھی ہوئی۔ بندہ ان سے الگ باریاب ہوا۔ حضور کے زیر اثر کام اور اس کے اصول کی تفصیل کی گئی۔ خاص قبولیت ہوئی۔ الحمدللہ اور انشاءاللہ اس ذیل میں حاضر خدمت ہوں گا۔

یہاں کا حال یہ ہے۔ یہاں فتاویٰ وسفرائے ترک وجرمن پہنچے ان کا اعزاز پورا ہوا۔ لیکن مقصد میں ناکام رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ترکی کا فرض تھا کہ ایام ناطرفداری میں ایران وافغانستان سے ان کی ضروریات معلوم کرتا۔ اس کے پورا کرنے کی سبیل کرتا اور حسبِ احوال معاہدہ دوستی کرتا افغانستان نہ بڑی جنگ میں شرکت کا سامان رکھتا ہے اور نہ کوئی بڑی دولت اس کے نقصانات کی تلافی

کی ذمہ دار ہے۔ اس لیے شریک حرب نہیں ہوسکتا۔ اگر ضروری افسران انجینئر ان اسلحہ روپیہ دیا جائے اور بصورت غلبہ کفر عصمت و اعانت کا عہد نامہ کیا جائے تو شرکت کے لیے تیار ہیں۔ بایں ہمہ سردار نائب السلطنت عام سرحدی وزیر، آفریدی، مہمد یا جوڑ، صولت، بنیر، چینئر، غور بند، کرناہ، کوہستان، ویر، چترال وغیرہ میں اپنا اثر منظّم کرتے اور ان سے وکلا طلب کر کے عہد شرکت بصورت جنگ لے رہے ہیں۔ یہ کام ایک حد ہو چکا ہے۔ سفراء جرمن واپس اور ترک مقیم ہیں، مگر بیکار۔ تعجب ہے کہ سفراء خالی ہاتھ آئے حتیٰ کہ کوئی کافی سند سفارت بھی نہ لائے۔ ایسی صورت میں کیا ہوسکتا ہے۔ مولانا الناظم باعافیت ہیں۔ دولت میں ایک حد تک اعتماد ہو گیا ہے۔ انگریز ان کو یہاں جاسوس ثابت کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جن کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا ہے۔ مگر الحمدللہ کہ ان کو اب تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

مہاجرین طلباء انگریزی اور بعض سکھ بھی اب یہاں حاجی عبدالرزاق صاحب کی مدد و نائب کی مہربانی سے آزاد ہیں اور مولانا الناظم کی زیر سرپرستی دے گئے ہیں۔ مصارف بذمہ دولت ہیں۔ کوئی سرکاری کام ان کے ذمہ نہیں ہے۔ البتہ مولانا کے خاص کاموں میں بہ ایمائے نائب السلطنت دست و بازو ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

ایک جمعیۃ ہندستان آزاد کرانے والی اس کا صدر ایک ہندی راجہ مقیم کابل ہے جو کہ سلطان المعظم اور قیصر جرمنی کے اعتماد نامہ کے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ ناظم صاحب و مولوی برکت اللہ اس جماعت کے وزراء ہیں۔ اس جماعت نے ہندستان میں مراکز و دیگر دول سے معاہدات کرنے کے لیے حرکت کی ہے جس میں ابتدائی کامیابی ہوئی ہے۔ اس کام میں عضو متحرک طلباء ہی ہیں۔ ان میں بعض دربار خلافت ہو کر حاضر خدمت ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دوسری جماعت الجنود الربانیہ۔ یہ فوجی اصول پر مخصوص اسلامی جماعت ہے جس کا مقصد اولیہ سلاطین اسلام میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس کا صدر جس کا نام فوجی قاعدہ سے جنرل یا القائد ہے، حضور کو قرار دیا گیا ہے اور مرکز اصلی مدینہ منورہ اس لیے خیال ہے کہ حضور مدینہ میں رہ کر خلافت علیا سے افغانستان و ایران کے ساتھ معاہدہ کی سعی فرمائیں۔ اور افغانستان کے متعلق، نیز یاغستان کے متعلق تجویز کو خدام تک پہنچا دینا کافی خیال فرمائیں۔

افغانستان شرکت جنگ کے لیے امور مذکورہ بالا طالب ہے۔ جسے اولیاء دولت عثمانیہ و خلافت ثانیہ تک پہنچانے کی جلد سے جلد تدبیر کیجیے۔ کیونکہ ہندستان میں کفر پر کاری ضرب لگانے کی یہی ایک صورت ہے۔ اہلِ مدرسہ مولوی محسن سیّد نور کے ذریعہ سے حضور کی ہند میں لانے کی سعی میں ہیں۔ کیونکہ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ حجاز میں بھی کام ہوسکتا ہے۔ ادھر انگریزوں میں پہلی سی عزت بوجہ عدم ضرورت اب نہیں رہی۔

قاضی صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب، مولانا رائے والے حضور کی مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں۔ خطرہ بوجہ قصہ غالب کے علم ہونے کے بذریعہ مطلوب اب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اس لیے ایسی کسی تحریک کو ہرگز ہرگز منظور نہ فرمایا جائے۔

مبلغ عطا حضور کے مکان پر اور سیّد نور کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کے سپرد کر دیا گیا۔ بندہ حصول قدم بوسی کی سعی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ کامیاب ہوں گا۔ مولانا الناظم، مولانا سیف فضلین و عبدالعزیز و جملہ مہاجرین طلباء سلام عرض کرتے ہیں۔ و از سلام برادر عزیز واحد، مولانا حسین ان کے والد صاحب و برادران و حرمت اللہ و احمد جان صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون۔ مدنی خطوط ہند کی ڈاک کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر شاہ بخش صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔ و سیّد ہادی و خدا بخش و حبیب اللہ غازی کو بھی۔ □□

## کانگریس کمیٹی کابل کا قیام

# مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا عظیم کارنامہ

۱۹۱۵ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ افغانستان گئے اور وہاں آزادیِ وطن کے لیے انگریزوں کے خلاف خفیہ سیاسی کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کارروائیاں آزادیِ وطن کی مشہور تحریک ریشمی رومال تحریک سے وابستہ تھیں، لیکن جب اس تحریک کا راز افشا ہوگیا تو تمام کوششوں پر پانی پھرگیا اور یہ تحریک ناکام ہوگئی، لیکن اس کے باوجود مولانا مایوس نہیں ہوئے، امیر امان اللہ خان کے دورِ حکومت میں جب افغانستان نے برٹش انڈین گورنمنٹ سے جنگ کی تیاریاں شروع کیں، تو مولانا سندھیؒ نے ایک بار پھر آزادی کی کرن دیکھی اور کابل میں قائم شدہ آزاد حکومت موقتۂ ہند کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے افغانستان گورنمنٹ سے معاہدہ کیا اور خود ذاتی طور پر بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مولانا کی امیدیں تو بر نہیں آئیں کہ افغانستان حکومت نے دورانِ جنگ ہی برٹش گورنمنٹ سے مصالحت کرلی اور افغانستان انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوگیا۔ اس استقلال میں مولانا کی حکمت عملی اور خدمات کا بہت بڑا دخل تھا، لیکن گردشِ زمانہ کہ امیر امان اللہ نے اس کا یہ صلہ دیا کہ انگریزوں کی خوشنودی کے لیے ان کی تمام خفیہ سیاسی کارروائیوں پر پابندی لگادی۔

۱۹۲۰ء میں جب افغانوں اور انگریزوں کے درمیان منصوری میں سمجھوتہ مکمل ہوگیا، تو مولانا نے سمجھ لیا کہ اب انھیں انگریزوں کے خاف کسی قسم کا خفیہ سیاسی کام کرنے کی اجازت نہیں مل سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے اب صرف قانونی سیاسی کارروائیاں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے ''کانگریس کمیٹی کابل'' کی بنیاد ڈالی اور وہ خود اس کے پریڈیڈنٹ بنے اور ہندستانی مہاجرین میں سے ڈاکٹر نور محمد کو سکریٹری جنزل اور دوسرے ہندستانی کالجیٹ احباب کو ممبران منتخب کیا۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے گیا سیشن میں، جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس کمیٹی کا آل انڈیا نیشنل کانگریس سے الحاق منظور کرلیا گیا۔ یہ سب سے پہلے کانگریس کمیٹی تھی جو انگریزی ملک سے باہر کسی آزاد ملک میں بنی تھی اور اس کا انڈین کانگریس سے الحاق ہوا تھا۔

اس کابل کانگریس کمیٹی کے ممبر اور حکومت موقتۂ ہند کابل کے

**تحریر: جاوید اشرف**

سکریٹری ظفر حسن ایبک نے اس کمیٹی کی کارروائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی ''آپ بیتی'' میں لکھا ہے:

''۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کو طاقتور بنانے کے لیے دسمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ یہ کوششیں کانگریس اور انگریزی حکومت کے درمیان رسی کشی کے مانند تھیں۔ اگر ۱۹۲۱ء کے سالانہ جلسہ کانگریس سے پہلے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا، تو کانگریس اور ہندستانی تحریک آزادی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اخبارات سے جو خبریں ہمیں ملتی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کا اس میں کامیاب ہونا محال ہے۔ کانگریس کے دسمبر ۱۹۲۱ء کے سالانہ اجلاس میں کوئی ایک ہفتہ باقی تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ روپیہ پورا ہونے کے لیے ابھی چند ایک لاکھ کی اور ضرورت ہے۔ ظاہراً یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مقررہ تاریخ تک ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہوسکے گا۔ اس لیے قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے فیصلہ کیا کہ روسیوں سے مالی مدد مانگی جائے۔ یہ فیصلہ بہت اہم تھا، کیونکہ اگر روسیوں نے ان کی درخواست کو رد کردیا، تو ان کا سیاسی رسوخ خاک میں مل جائے گا اور ان کی سیاسی زندگی ختم ہوجائے گی۔ اگر منظور کرلی تو روسیوں کا ہندستانی تحریک آزادی میں دخل انداز ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا، لیکن ہرچہ بادا باد قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے خوشی محمد (ہندستانی مہاجر ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر، روسی سفیر کمیونسٹ پارٹی کا ممبر، جس کے روسی سفیر سے تعلقات تھے) کے روسی سفیر کو پیغام بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس سے ''کانگریس کمیٹی کابل'' کے نام پر درخواست کی کہ وہ اپنی گورنمنٹ سے مالی مدد لے کر ہم کو دسمبر ۱۹۲۱ء کے آخری ہفتے سے پہلے جواب دے۔ روسی گورنمنٹ نے قبلہ مولانا مرحوم کی پوزیشن اور ان کی درخواست کی اہمیت کو فوراً سمجھ لیا اور باقی ماندہ چند ایک لاکھ روپیہ کانگریس کمیٹی کابل کے ذریعہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کو دینا منظور کرلیا اور یہ روپیہ کابل کے روسی سفارت خانے کو بھیج دیا۔ قبلہ

مولانا صاحب مرحوم نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کو خبر دی کہ ''کانگریس کمیٹی کابل یہ باقی ماندہ رقم دینے کو تیار ہے، تاکہ مقررہ تاریخ تک کانگریس کے پاس ایک کروڑ روپیہ جمع ہو جائے، مگر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ایک کروڑ روپیہ کے پورا ہونے کی خبر ہمیں پہنچ گئی، اس سے ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہندستانی تحریک آزادی کو روسی مدد کی ضرورت نہ رہی۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے روسی سفیر کو خبر بھیج دی کہ اب روپے کی ضرورت نہیں رہی ہے اور کانگریس کمیٹی کابل اس مدد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔'' (آپ بیتی، ص ۲۳۳ تا ۲۳۵، جلد ۱)

کانگریس کمیٹی کابل کے تحت قانونی کارروائی کے ضمن میں مولانا مرحوم نے دوسرا کام یہ کیا کہ کابل میں ایک ''ہندستانی اُردو یونیورسٹی'' کے قیام کے لیے افغان حکومت سے چارٹر مانگا اور یونیورسٹی کا نظام نامہ تیار کرکے افغانستان کے وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی کو دیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ افغان گورنمنٹ اور امیر امان اللہ خان سے اس کی منظوری لیں گے۔ ''ڈوبس لٹس'' کے ذریعہ ۱۹۲۱ء میں جب انگریزوں اور افغانوں کے درمیان عہد نامہ صلح طے پا گیا تو مولانا سندھی مرحوم نے افغان گورنمنٹ سے اس اُردو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے پر اپنی ساری طاقت لگانی شروع کردی۔ یہ یونیورسٹی ابتدائی شکل میں اسکول کی صورت میں قائم بھی ہوگئی اور اس کے لیے مولانا سندھی مرحوم نے افغانستان کے سردار سپہ سالار محمد نادر خان کی جاگیر حاصل کی۔ طے یہ پایا کہ اس اسکول میں اُردو زبان سکھائی جائے گی اور اس کا ذریعہ تعلیم آہستہ آہستہ اُردو زبان بن جائے گی۔ اس اسکول کے اخراجات اگر جاگیر کی زمینوں سے پورے ہوجاتے ہیں، تو ٹھیک ہے، ورنہ مولانا مرحوم ہندستانی مسلمانوں کی طرف سے اس خرچ کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسکول کی ہیئت تنظیمیہ کے متعلق ظفر حسن نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

''اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر قبلہ مولانا صاحب مرحوم کا ایک شاگرد، جس نے ان سے قرآن شریف کی تفسیر کا درس لیا تھا اور جس کا نام عبدالنبی تھا، مقرر ہوا۔ مجھے وزارتِ حربیہ کے میرے سرکاری کام کے سوا قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے یہ فرض بھی دیا کہ میں اس اسکول کی نگرانی، انتظام اور مالی امور کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ اس لیے مجھے شام کو اپنے وزارتِ حربیہ کے سرکاری کام کے بعد علی آباد کو جو افغانانِ کابل سے کوئی چار میل کے فاصلے پر ہے، جانا پڑتا تھا اور صبح کو پھر وزارتِ حربیہ میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس طرح پر دو فرائض ادا کرنا میرے لیے اگرچہ کافی تھکان کا باعث ہوتا تھا، لیکن اس کو ایک قومی کام سمجھ کر یہ بار بھی میں نے اپنے اوپر لے لیا تھا، اس طرح یہ اسکول اچھی بنیادوں پر قائم ہوگیا۔'' (آپ بیتی، ظفر حسن ایبک، ص ۲۳۷، ج ۱)

۲۲-۱۹۲۱ء کے موسم سرما میں جب جاگیر کی آمدنی اخراجات کے لیے ناکافی ثابت ہوئی، تو مولانا مرحوم نے پھر روسی سفارت خانے سے مالی مدد لے کر اسکول کے اخراجات کو پورا کرنا اور اس کے کام کو سرانجام دینا شروع کردیا۔ انگریز مولانا مرحوم کی سرگرمیوں سے باخبر تھا اور وہ ان کے وجود کو اپنے لیے ہر طرح سے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے چند صاحب رسوخ افغانوں کے ذریعہ یہ پروپیگنڈہ کرایا کہ یہ اسکول، جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے، ایک روز ہندستانی یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلے گا اور پھر ہندستانی کلچر غلبہ حاصل کرکے افغان تہذیب کو نیست و نابود کردے گا اور کم سے کم یہ تو ضرور ہوتا کہ علمی لحاظ سے ہندستان کا ذہنی غلام اور محکوم بنادے گا۔ یہ پروپیگنڈہ کامیاب رہا۔ چنانچہ ظفر حسن لکھتے ہیں:

''ایسے لوگوں نے عبدالنبی ہیڈ ماسٹر علی آباد اسکول کو ورغلایا اور اس نے اسکول کے لڑکوں کے قومی جذبات کو ہندستانی معلمین اور اُردو زبان کے خلاف اُبھارا۔ اس پر لڑکوں نے اُردو پڑھائے جانے کے خلاف پروٹیسٹ کیا اور اسٹرائک کرکے سب کے سب مکتب سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں جب شام کو وزارتِ حربیہ سے علی آباد اسکول آیا تو مجھے حالات کا علم ہوا۔ میں نے اگلے روز وزیر تعلیم سردار محمد یونس خان سے ملاقات کی۔ بات چیت کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے قطغن اور بدھوشان سے واپسی تک اسکول بند کردیا جائے۔''

اس واقعہ کے چند روز بعد حضرت مولانا عبیداللہ سندھی صاحب مرحوم نے افغانستان کے وزیر خارجہ سردار محمود بیگ طرزی کو اُردو یونیورسٹی کے چارٹر کے متعلق ان کا وعدہ یاد دلایا، تو وہ پہلے لیت ولعل کرتے رہے، لیکن جب ڈوبس مشن سے کیا ہوا معاہدہ منصوری میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور انگریز حکومت نے اس کی تصدیق کردی تو افغان گورنمنٹ نے ہندستانی اُردو یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے بالکلیہ انکار کردیا۔

افغان حکومت کے اس رویے کے بعد مولانا مرحوم نے دیکھا کہ اب قومی کاموں کا یہاں کوئی میدان نہیں، اس لیے آپ روس چلے گئے۔ کمیٹی ان کی ذات سے ہی عبارت تھی۔ وہ گئے تو کمیٹی بھی نابود ہوگئی۔ □□

# اسیرانِ مالٹا

یہ ان حضراتِ گرامی کا تذکارِ خیر ہے جنھوں نے حضرت شیخ الہند کے ہمراہ ریشمی رومال تحریک کی پاداش میں مالٹا کی انتہائی خطرناک جیل میں قید و بند کی زندگی گزاری۔

# اسیرِ مالٹا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ

والد ماجد مولانا ذوالفقار علی، صاحب خلف شیخ فتح علی صاحب رحمہم اللہ۔ آبائی وطن، دیوبند ضلع سہارنپور سن پیدائش۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء مقام بریلی

**تعلیم:**

چھ سال کی عمر میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے استاد منگلور کے ایک بزرگ تھے۔ 'میاں جی منگلوری' قرآن شریف کے زیادہ پارے ان سے پڑھے۔ پھر میاں جی عبداللطیف صاحب سے قرآن پاک کی تکمیل کی۔ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے چچا مولانا مہتاب علی صاحب سے فارسی کی تکمیل کی۔ اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء دیوبند کے چند بزرگوں نے دینی علوم کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ملا محمود صاحب مدرس مقرر کیے گئے۔ دیوبند کی ایک قدیم مسجد 'مسجد چھتہ' کے فرش پر درخت انار کی ٹہنیوں کے کرن افشاں سایہ میں عربی کتابوں کا درس شروع ہوا۔ یہ اس درسگاہ کی ابتدا تھی جس نے کچھ عرصہ بعد 'دارالعلوم' کی عظمت حاصل کرلی۔ اس کے سب سے پہلے مدرس محمود تھے اور سب سے پہلے شاگرد یہ نونہال محمود جن کی عمر اب پندرہ سال ہوچکی تھی اور عربی کی کچھ کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔

**دارالعلوم دیوبند کا مقصد:**

بانی دارالعلوم (حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ) نے دارالعلوم کے لیے کچھ اصول تحریر فرمائے تھے وہ خود حضرت ممدوح کے قلم کے لکھے ہوئے نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں بھی محفوظ ہیں۔ اس تحریر گرامی کا فوٹو 'سوانح قاسمی' جلد دوم میں ملاحظہ فرمایا جائے۔ (مابین ص ۲۲۰ ص ۲۲۱) ان اصول کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے جو مقاصد متعین ہوتے ہیں ان کی تفصیل علاحق جلد اوّل میں ملاحظہ فرمائی جائے۔ (از ص ۱۴ تا ۶۲) یہ مقاصد کس نصب العین اور مطمح نظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ سے دریافت کیا جائے۔ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے متعلّم اور بانی دارالعلوم کے مزاج شناس اور رازدار شاگرد رشید اور پختہ مغز مرید باصفا تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا۔ کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

**مقبولیت:**

نہ دارالعلوم کے مقاصد میں کوئی ایسا مقصد تھا کہ جن کی نگاہیں وقت کے تقاضوں پر تھیں وہ اس کو تقاضا وقت کی تعمیل اور تکمیل سمجھیں اور اس طرف متوجہ ہوں۔ نہ اس کے نصاب میں کوئی ایسی جدت تھی جو تقاضا وقت کے ہم آہنگ ہو اور ترقی پسند نونہالان ملت کو روشن مستقبل کی جھلک دکھاتے ہوئے اپنی طرف مائل کرسکے۔ نہ دیوبند ایسا مقام تھا جو اپنے اندر کوئی کشش رکھتا ہو۔ جس طرح ضلع سہارنپور کے دوسرے قصبے جو ایک درجن سے زائد ہیں، غیر معروف اور ترقی سے ناآشنا ہیں۔ ان کا تمدن بھی معمولی ہے۔ ایسے ہی دیوبند بھی غیر معروف اور پسماندہ قصبہ تھا۔ پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ پہلے ہی سال کی روئیداد میں شائع کیا جاتا ہے۔

''فقط قصبات ضلع سہانپور واضلاع ممالک غربی (یو۔پی) کے طلبہ ہی نہیں بلکہ پنجاب وکابل وبنارس تک کے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ پھر جس طرح طلبہ کے خانہ میں ایک نام مولوی بدرالدین عظیم آبادی (پٹنہ صوبہ بہار) کا ہے۔ چندہ دہندگان میں بھی دُور دراز مقامات مثلاً دانا پور (بہار) یا ٹونک (راجستھان) کے اصحاب خیر کے نام ہیں۔''

یہ سال اوّل کی روئیداد ہے۔ چند سال بعد جب تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا تو شمالی ہند کے صوبوں (پنجاب وبہار) کے مسلمانوں ہی نے نہیں، بلکہ جنوبی ہند کے مرکز (حیدرآباد) کے مسلمانوں نے بھی اس کے چندے میں اس طرح حصّہ لیا کہ فراہمی چندہ کے لیے مستقل مجلس قائم کی۔ پھر ان کی دلچسپیاں یہاں تک بڑھیں کہ ۱۲۹۷ھ۔۱۸۷۹ء کی روئیداد شائع ہوئی تو عام روئیداد کے علاوہ خاص حیدرآباد کے مسلمانوں کے امدادی چندہ کے لیے ایک علیحدہ کتابچہ ۲۶ صفحات کا شائع کرایا گیا۔

قسطنطنیہ، ہندستان یا ایشیا کا نہیں بلکہ دیوبند ضلع سہارنپور سے تقریباً آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر مشرقی یورپ کا مشہور تاریخی شہر ہے۔ 'خلافت عثمانیہ' یعنی ترکوں کی حکومت کا دارالسلطنت تھا یہاں سے عربی زبان میں

'الجوایت' اخبار نکلتا تھا۔ دیوبند جیسے کوردہ میں قائم ہونے والے 'دارالعلوم' کی مقبولیت کی حیرت انگیز مثال یہ ہے کہ ابھی اس کی درسگاہوں کی تعمیر بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ 'الجوایت' کے یورپین مدیر یا منیجر صاحب توجہ فرماتے ہیں۔ اور دارالعلوم کے طلبا کے لیے اپنا اخبار مفت (اعزازی) جاری کردیتے ہیں۔ (روئیداد دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۱ھ-۱۸۷۴ء)

اسی قسطنطنیہ کے ایک فاضل 'غلامہ احمد حمدی آفندی' نے ایک کتاب 'النجم الداری فی ارشاد الساری' تصنیف فرمائی۔ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی تھی، طبع سے پہلے ہی فاضل مصنف نے اس کے چار نسخے (کاپیاں) اپنی نگرانی میں نقل کرائیں۔ اور ان کو تقسیم اس طرح کیا۔

دارالخلافہ قسطنطنیہ کے کتب خانہ کو دو نسخے۔

جامع ازہر مصر کے کتب خانہ کے لیے ایک نسخہ۔

دارالعلوم دیوبند (ہندستان) کے کتب خانہ کے لیے ایک نسخہ۔

کتاب کے ساتھ علامہ مصنف کا فارسی زبان میں ایک خط بھی تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ: ''کتاب کے چار نسخے نقل کرائے گئے ہیں۔ تین نسخے قسطنطنیہ اور مصر اور ایک نسخہ 'بر مدرسہ آنحضرت کہ منبع فیض علوم ست فرستادہ آمد۔ تا یادگار آن بزرگوار بر محمل خود باشند۔'' یعنی ایک نسخہ آنحضرت کے مدرسہ کے لیے (جو فیض عام کا چشمہ ہے) بھیج رہا ہوں۔ تاکہ ان بزرگوار کی یادگار برمحل رہے۔''

خط ان چار حضرات کے نام ان کے القابوں کے ساتھ تھا (۱) جناب فضائل مآب مولوی محمد قاسم صاحب (۲) مولوی رفیع الدین مہتمم (مولوی محمد یعقوب صدر مدرس (۴) حاجی محمد عابد رکن شوری۔

ترکی حکومت کا نمائندہ جو بمبئی میں رہتا تھا۔ اس کے ذریعہ سرکاری طور پر یہ کتاب دارالعلوم دیوبند میں پہنچائی گئی اور اس سال کی روئیداد (۱۲۹۵ھ-۱۸۷۸ء) میں یہ خط شائع بھی کرایا گیا۔

## حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے آپ کا تعلق:

حضرت مولانا محمود حسن (رحمۃ اللہ) نے ۱۲۸۶ھ، ۱۸۶۹ء-۱۸۷۰ء) میں کتب صحاح ستہ (حدیث کے درجہ کی آخری کتابیں) اور بعض دیگر کتب، فخر زمانہ استاد حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے شروع کیں۔ مولانا ممدوح (مولانا محمد قاسمؒ) میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح (ایڈٹ) کا کام کرتے تھے۔ پھر مطبع دہلی میں منتقل ہوگیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی میں مقیم ہوگئے۔ اور کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لے جاکر مقیم رہتے۔

حضرت مولانا نے ان سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال استاد کے ساتھ رہ کر دل وجان سے قابلِ رشک خدمت کر کے سعادت حاصل کی اور سفر وحضر میں سلسلہ درس جاری رکھ کر استاد کی شفقت اور اپنی ذکاوت سے بکمال تحقیق کتابیں پڑھیں۔

یہ تعلق درس کی حد تک نہیں رہا۔ بلکہ آپ بیعت بھی حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ سے ہوئے۔ اور روحانی تربیت بھی آپ نے حضرت نانوتوی ہی سے حاصل کی۔ ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت کا اثر لامحالہ یہی ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا کہ جذباتی لحاظ سے بھی شاگرد، استاد کا ہم رنگ ہوگیا۔ یہ استاد اور مرشد وہی مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ ہیں جو چند سال پہلے ۱۸۵۷ء میں برطانوی فوج سے نبرد آزما تھے۔

شکست نے جذبات ختم نہیں کیے صرف راستہ بدلنے پر مجبور کردیا۔ تجویز کردہ راستہ یہی 'دارالعلوم دیوبند' ہے۔ جو بقول مولانا محمود حسنؒ اسی لیے قائم کیا گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی تلافی ہوسکے۔

## تدریس:

پڑھانے کا سلسلہ زمانہ طالب علمی میں بھی جاری رہا۔ اور جب ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں آپ چار سال بعد ۱۲۹۲ء/ ۱۸۷۵ء میں کتب درسیہ کی تکمیل کرچکے تو آپ معین مدرسہ بنادیئے گئے۔ 'دارالعلوم' کے مدرس چہارم قرار دیئے گئے۔ پھر ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء میں باتفاق آرا صدارت مدرسین کا منصب جلیل آپ کے حوالہ کردیا گیا۔ جس کے فرائض ۱۳۳۳ھ/ 1915ء تک انجام دیتے رہے۔

## ثمرۃ التربیت:

دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے تقرر کو پانچ سال ہوئے تھے کہ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۸ء میں آپ نے دارالعلوم ہی کے حلقہ میں ایک جماعت بنائی 'ثمرۃ التربیت' اس کا نام تجویز کیا۔ (یعنی تربیت کا پھل) دارالعلوم کے مالی مفاد کے لیے فضلا اور ہمدردان دارالعلوم سے رابطہ رکھنا اس جماعت کا مقصد ظاہر کیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ جملہ مقاصد کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاتا۔ خصوصاً ۱۸۷۸ء جیسے دور میں کہ ۱۸۵۷ء کے محاربہ عظیم کو صرف بیس سال گزرے تھے۔ برطانوی سامراج جوان تھا۔ اس کا سی.آئی.ڈی ماہر فن سرکار کا پکا وفادار 'انٹیلیجنس' چاق چوبند، البتہ رفقا اور کارکنوں کے ذوق اور ان کے کردار سے حقیقی مقاصد کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

مندرجہ ذیل امور پر غور فرمایئے یہ مقاصد کی غمازی کرتے ہیں۔

(الف) ۱۸۷۸ء سے تقریباً چالیس سال بعد (۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۳ء) احقر نے دارالعلوم سے استفادہ کیا۔ اس وقت دارالعلوم کے ذہین اور ترقی پذیر طلبہ کے جذبات یہ تھے (اور یہ جذبات طبقہ بہ طبقہ چلے آرہے تھے) کہ انگریز کی غلامی سے گلوخلاصی ہر ایک خوددار مسلمان بالخصوص حاملینِ دین کا فرض اوّلین ہے۔ طلبہ اسی جذبہ کو نمودِ زندگی اور جوہر حیات سمجھتے تھے۔ اپنی فہم کے بموجب اس جذبہ کی جلوہ آرائی کے لیے اپنے دماغوں میں نقشے بناتے اور متحرک قسم کے طلبہ پارٹی کا ڈھانچہ بھی تیار کر لیتے تھے۔

(ب) مقبولیت دارالعلوم کے زیر عنوان جو تفصیل پیش کی گئی اس کی شہادت یہ ہے کہ حضرت حاجی عابد حسینؒ اور مولانا مہتاب علی وغیرہما یعنی جن حضرات نے دیوبند میں دینی مدرسہ کی ابتدا کی تھی۔ بظاہر ان کا منشا ایک دینی درسگاہ ہی تک محدود تھا۔ مگر جیسے ہی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور بقول مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوگئے۔ تو یہ مدرسہ صرف مدرسہ نہیں رہا۔ بلکہ ان تمام حضرات کا مرکز اور مرجع بن گیا جو ۱۸۵۷ء کے مرد مجاہد رہے تھے۔ جن کے کام و دہن میں ناکامی کی تلخی اب تک موجود تھی۔

(ج) سب سے پہلی جماعت جس نے سند فراغت حاصل کی۔ اس میں اکثریت ان طلبہ کی تھی جو پنجاب اور افغانستان کے رہنے والے تھے۔ اس کا بین السطور یہ ہے کہ پہلے ہی سال یعنی ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں ایسے افراد میسر آگئے تھے۔ جن کے ذریعہ افغانستان اور سرحدی علاقہ میں کام شروع کیا جاسکتا۔ اور تحریک کی داغ بیل ڈالی جاسکتی تھی۔

(د) مولانا محمود حسن رحمہ اللہ جوان طلبہ کے رفیق اور ہم درس تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ یہ دارالعلوم اسی لیے قائم کیا جارہا ہے کہ ایسے مردانِ کار پیدا کیے جائیں جن کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہوسکے۔

(ہ) اس موقعہ پر مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے ایک بیان کا مندرجہ ذیل اقتباس بہت اہمیت رکھتا ہے۔

مولانا سندھی 'خودنوشت حالات زندگی' میں فرماتے ہیں:

''۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی تفصیلی پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیل حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کردیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتادیا کہ میرا کابل جانا طے ہوچکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔ کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے خادم شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہندؒ کے انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔''

(و) ۱۹۱۵ء سے پچاس سال پہلے یعنی ۱۸۶۵ء میں کون سی جماعت اس علاقہ میں کام کررہی تھی۔ اس کی نشاندہی ہم مقدمہ میں کرچکے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ اس کی نمائندگی کب سے کررہے تھے۔ اس کا سن اور سال مقرر کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یہ وہ وقت ہے کہ اس وقت تک دارالعلوم وجود میں نہیں آیا تھا۔ دارالعلوم کی بنیاد اگلے سال ۱۸۶۶ء میں پڑی۔ البتہ مولانا سندھی کی بیان کردہ مدت پچاس سال کو تقریبی قرار دیا جائے۔ اور نمائندہ سے مراد محرک یا شریک لیا جائے تو یہ حقیقت بے حجاب ہوجاتی ہے کہ جب سے حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ کے حلقہ درس میں داخل ہوئے وہ جذبات استاد کے آتشیں شیشہ بن گئے۔ اور اسی مقصد کے لیے جدوجہد شروع کردی، جس کے لیے بقول خود دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (حضرت مولانا محمود حسن نے ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء سے حضرت نانوتویؒ سے استفادہ شروع کیا جو ۱۹۱۵ء سے ۴۶ سال پہلے کا سال ہے یعنی تقریباً پچاس سال پہلے)

(ز) ممکن ہے حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ کی کوئی جماعت اس علاقہ میں ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ طلبہ دارالعلوم کے مذاق کے بموجب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ہم درس افغانی اور پنجابی طلبہ کے تعاون سے کوئی جماعت بنالی ہو، یا ایسے ساتھی تیار کرلیے ہوں کہ جب کوئی باضابطہ منصوبہ سامنے آئے تو وہ اس کے تحت کام کرسکیں۔

بہرحال اس پس منظر کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ 'ثمرۃ الترتیب' صرف فضلا اور منتسبین دارالعلوم کی تنظیم نہیں۔ بلکہ اصل مقصد ایسے باحوصلہ افراد کی تنظیم تھا جو قیام دارالعلوم کے مقصد ۱۸۵۷ء کی تلافی کے سلسلہ میں کام کرسکیں۔

## سیاسی ماحول:

محاربہ ۱۸۵۷ء کے انتقام میں جن وحشیانہ مظالم کی بارش برسائی گئی تھی۔ جن کے لیے گویا درندوں سے درندگی، پہاڑوں کی چٹانوں سے

سنگدلی اور طوفانوں اور زلزلوں سے تباہ کاری چھین لی گئی تھی۔ اس کا لامحالہ اثر یہ تھا کہ ہندستان کی فضا پر جمود طاری ہوگیا۔ بولنے والوں کی زبانیں بند ہوگئیں۔ اور لکھنے والوں کے قلم انگلیوں سے چھوٹ گئے۔ پھر حواس درست ہوئے تو عوام کی نگاہیں سفید فاموں کے چشم وابرو کی طرف تھیں۔ ان کی عظمت وہیبت دلوں میں اور ان کی خوشامد زبانوں پر تھی۔ پہلے انگریزوں نے ان سے بے نیازی برتی۔ ان کی خوشامدوں کا جواب تحقیر آمیز استغنا سے دیا۔ لیکن پھر ان کی مصلحت نے مجبور کیا۔ کہ وہ ان نیاز مندوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ مغل بادشاہ اور ایشیائی حکمراں حوصلہ بڑھانے کے لیے جاگیریں دیا کرتے تھے۔ مگر کفایت شعار انگریز نے انعامات کا بار اپنے بجٹ پر ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ صرف لفظی خطابات کو کافی سمجھا اور وفاشعار نیاز مند بھی اس پر خوش ہوگئے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک خطابات کی گرم بازاری رہی۔ خان صاحب، رائے صاحب، خان بہادر، رائے بہادر، راجا مہاراجا، سر وغیرہ درجہ بدرجہ خطابات تھے۔ جو نہ صرف وفاداری، بلکہ عموماً ضمیر فروشی کے معیار پر دیئے جاتے تھے۔

ایک طرف وفاداری، آستانہ بوسی، اور کاسہ لیسی کی یہ فضا تھی جو پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی۔ مگر دوسری طرف وہ سخت جان بلاکش بھی تھے۔ جن کی زبانیں اگرچہ بند تھیں، مگر جذبات سرد نہیں ہوئے تھے۔ درد دل کی ٹیس اور زخم جگر کی چسک ختم نہیں ہوئی تھی۔ غلامی کا طوق قانونی طور پر ان کے گلوں میں بھی تھا۔ مگر وہ ان کی حمیت وغیرت کے لیے چیلنج تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے اوزاروں کی تلاش میں رہتے تھے جو اس زنجیر کو کاٹ سکیں۔

غالباً اسی ذہنیت کے امانت دار وہ رندہ دل تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے صرف نو سال بعد ۱۸۷۶ء میں بنگال میں 'انڈین ایسوسی ایشن' قائم کی۔ دو سال بعد ۱۸۷۸ء میں یہ جماعت قائم ہوئی۔ جس کا مولویانہ نام 'ثمرۃ التربیت' تھا۔ اور چھ سال بعد ۱۸۸۴ء میں مدراس میں 'مہاجن سبھا' قائم ہوگئی۔ بمبئی میں کوئی جماعت قائم نہیں ہوئی۔ مگر مرہٹوں نے نئے نشو ونما کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ شیواجی کے نام پر سالانہ میلہ ہوتا تھا۔ جس میں 'رولٹ کمیٹی' کی رپورٹ کے بموجب انقلاب انگیز اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ مسٹر بال گنگا دھر تلک (لوکمان تلک) کا اخبار 'کیسری' ان کا ترجمان تھا۔ جوان جذبات کو پیدا کرتا اور پھیلاتا تھا۔

### کانگریس کا قیام:

خوشامد پسند انگریز آقا اگرچہ مطمئن تھے کہ بلاشرکت غیر زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے اور پورا ہندستان ان کے سامنے سرنگوں ہے۔ مگر ماہرین برطانیہ کے سامنے وہ جذبات تھے جو ان انجمنوں اور پارٹیوں کو وجود میں لا رہے تھے۔ جو اگرچہ ابھی بہت محدود تھے۔ لیکن اگر ان کے بخارات کو نکلنے کا موقع نہ دیا جاتا اور وہ سینوں ہی میں گھٹتے رہتے تو وہ آتش فشاں بن سکتے تھے۔ ان جذبات کو کمزور اور بے ضرر کرنے کی شکل یہ ہوسکتی تھی کہ ان کو ظہور اور نمود کا موقع دیا جائے۔ جس سے ان کی گھٹن ختم ہوجائے۔

لارڈ ڈفرن: وائسرائے ہند نے یہی نسخہ استعمال کیا تھا۔ جب انھوں نے اپنے دوست مسٹر ہیوم کو مشورہ دیا کہ: ''حاکم اور محکوم دونوں کے لیے مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کے سیاستداں اصحاب سالانہ جمع ہوکر گورنمنٹ کو بتائیں کہ ان کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کی حالت کس طرح بہتر کی جاسکتی ہے۔''

وہ انجمن جس نے 'انڈین نیشنل کانگریس' کا لقب اختیار کیا اسی مشورہ کی عملی شکل تھی۔

### کانگریس کے تجویز کردہ مقاصد:

اس پس منظر کے بموجب اگرچہ کانگریس خود انگریزوں کی آوردہ اور پیدا کردہ تھی۔ مگر عجیب بات یہ ہوئی کہ کانگریس نے جو مقاصد تجویز کیے وہ انگریز کے لیے دردسر بن گئے۔ جس نے بعد میں تپ دق کی شکل اختیار کرلی۔

کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں پونا میں ہوا۔ اس کے مقاصد میں اگرچہ نمبر تین پر ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

یعنی لارڈ ڈفرن نے جس مقصد کے لیے جماعت بنانے کی ضرورت محسوس کی تھی اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ مگر جن مقاصد کو اوّل اور دوم کا درجہ دیا تھا۔ وہ اس سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے اور ان کی سمت بھی دوسری تھی۔ ملاحظہ فرمائیے مقاصد یہ قرار دیئے گئے۔

(الف) ہندستان کی آبادی جن مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب ہے۔ ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا۔

(ب) اس طرح جو ہندستانی قوم پیدا ہو۔ اس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

(ج) ایسے حالات کی اصلاح وترمیم کرانا جو ہندستان کے لیے مضرت

رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

**مادرچہ خیالم و فلک درچہ خیال:**

لارڈ ڈفرن ایسی جماعت چاہتے تھے جو اقتدار برطانیہ کی خیر اندیش اور اس کی درازی عمر کی حامی ہو اور اسی جذبہ کے ساتھ وہ کار پروازانِ حکومت کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرے۔ لیکن کانگریس نے سب سے پہلا مقصد یہ قرار دیا کہ متضاد عناصر کو جوڑ کر ایک قوم بنائے۔ یہ مقصد انگریزی اقتدار کے لیے خطرہ عظیم تھا۔ کیونکہ یہ ہندستانی قوم جس کی دماغی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتیں دوبارہ زندہ ہوں گی۔ وہ کسی اقتدار اعلیٰ کو چیلنج بھی کر سکے گی۔ جس کے نتیجہ میں انقلاب بھی ہو سکے گا۔

پھر ہندستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد، یگانگت کی بنیاد بھی یہ قرار دی کہ ایسے حالات کی اصلاح کی جائے جو ہندستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں۔ ایسے حالات کی تشخیص بہت خلجان انگیز تھی۔ ہندستان کی غلامی ایسے حالات میں آ سکتی تھی۔ بہرحال جو جماعت وجود پذیر ہوئی وہ سراسر اقتدار اعلیٰ کی مرضی کے خلاف تھی۔

**حکمران طبقہ کی مخالفت:**

لیکن کسی قانونی اور آئینی وجہ کے بغیر اس کو ختم کرنا بھی غیر آئینی تھا۔ البتہ اس کو ناکام بنانے کی صورتیں آئینی ہو سکتی تھیں۔

'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی وہ تھی جس پر ہندستان میں انگریزی سامراج کی عمارت قائم تھی۔ متحدہ قومیت کے تصور کو فنا کرنے کے لیے اس سے بہتر پالیسی کیا ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس پالیسی کو زندہ رکھنے کے لیے لائحہ عمل تلاش کیا گیا۔

آپس کے بلوے اور فسادات حکومت کے لیے بدنامی کا باعث ہوتے، وہ حکومت کے لیے مشکلات بھی پیدا کرتے رہتے اور ان کے اثرات بھی عارضی ہوتے۔ لہٰذا ایسے تخم تلاش کیے گئے جن کے پودے نفرت آمیز ہوں اور ان کے پھل تفرقہ انگیز۔ یہ بیج کیا کیا تھا؟ ان کی تفصیل طویل ہے۔ صرف چند عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔

شجر افتراق کا پہلا تخم تھا مسئلہ شرکت کانگریس یعنی کیا مسلمانوں کو ایسی جماعت میں شریک ہونا جائز ہے۔ جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور اس بنا پر زمامِ قیادت بھی انھیں کے ہاتھ میں ہو۔ کیا ایسا اتحاد جائز ہے؟ کیا ہندو مسلمانوں کی قومیت ایک ہے؟

ہندو مسلم اختلاف و افتراق کا دوسرا تخم زبان کا مسئلہ تھا۔ ہندستان میں عموماً مسلم اور غیر مسلم حکومتوں کی زبان فارسی تھی۔ حتیٰ کہ شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں چمبہ، گڑھوال، بلاسپور وغیرہ میں بھی اہم دستاویزیں عموماً فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کی سرکاری زبان بھی فارسی تھی۔

۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے انگریزی کو فارسی کی جگہ رکھا اور فارسی کو سرکار دفاتر سے خارج کر دیا۔ اس وقت اُردو زبان نے بھی ایک حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ دوسری زبان کے طور پر اُردو کا استعمال کیا جاتا رہا۔ جس کا رسم خط فارسی تھا۔

لیکن اپریل ۱۹۰۰ء میں سرانیٹونی لیفٹیننٹ گورنر یوپی نے اس مضمون کا ایک سرکلر جاری کیا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جا سکیں گی۔ بظاہر حضرات علما نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ جب اُردو باقی تھی تو ہندی کو قانونی مراعات سے محروم کرنے کے لیے آواز بلند کرنا تقاضا انصاف نہ تھا۔ لیکن عام طور پر یہی ہوا کہ ہندوؤں کی طرف سے شکریہ اور مسلمانوں کی طرف سے شکوہ کے جلسے منعقد ہوئے اور فضا پرآشوب ہو گئی۔ پھر یہ خاردار پودا کتنا بڑھا اور انگریز کا منشا کہاں تک پورا ہوا۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ (تفصیل روشن مستقبل اور ہندستانی سیاست میں علماء کا کردار وغیرہ میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

تیسرا تخم جس کے پوست بدلتے رہے۔ اس کا مغز تھا مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کرنا۔ ہندو مسلمانوں کی تعداد میں اگرچہ فرق تھا۔ مگر اکثریت یا اقلیت کا احساس کسی کو نہ تھا وہ سینکڑوں سال سے مساویانہ زندگی کے عادی چلے آ رہے تھے۔ یہ احساس پیدا کرنا برطانوی ایجنٹوں کا کام تھا۔

مسلمان سمندر پار کے سفید فام تاجروں کو اپنا اور اپنے ملک کا دشمن اور غاصب سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ گزشتہ سو سال میں متعدد بار انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کر چکے تھے۔ اور ان کے کچھ جانباز اب بھی مغربی شمالی سرحد پر انگریزوں کے خلاف مورچے لگائے ہوئے تھے۔ ان کی ذہنیت کو بدلنے کے لیے نہایت مفید اور مؤثر نسخہ یہ تھا کہ ان کو انگریزوں کے بجائے ہندوؤں سے خائف کیا جائے۔ مسلمان تعداد میں تھوڑے ہیں، ان کے تمام سہارے ختم ہو چکے ہیں، وہ بے سہارا ہیں۔ ہندو جو مسلمان بادشاہوں کے مظالم کے زخم خوردہ ہیں وہ تعداد میں بھی ان سے کئی گنا زیادہ ہیں، ان کے پاس دولت بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کے

ذرائع بھی وسیع ہیں۔ وہ جب چاہیں گے مسلمانوں کو ختم کردیں گے۔

اس مشفقانہ سین کا آخری فقرہ جو بلا بتائے ہوئے زبان پر آ سکتا تھا یہ تھا کہ ان کی اگر پناہ ہے تو یہ بیرونی طاقت، جو حکمراں ہے، لہٰذا مسلمانوں کے خود اپنے بقا اور تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اس بیرونی طاقت کی حمایت کریں اور اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔

انگریز اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے میں بہت جلد کامیاب ہو گیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ترقی پذیر محبانِ وطن نے جو قدم ترقی کی طرف بڑھانا چاہا تو جن وفاداروں کو انگریزوں کا پڑھایا ہوا سبق یاد ہو گیا تھا۔ انھوں نے اس کی مخالفت کی۔

چنانچہ تشکیل حکومت کے لیے نامزدگی کی بجائے انتخاب کا مطالبہ کیا گیا تو اس کی مخالفت کی گئی کہ اس ملک میں جہاں مختلف فرقے آباد ہیں اور مختلف قومیں رہتی ہیں۔ انتخاب کا طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور جب یہ مخالفت کامیاب نہیں ہوئی تو برطانوی ماسٹران نے جداگانہ طریقہ انتخاب کا سبق یاد کرایا۔ اور اس سبق کو پختہ کرنے اور یاد رکھنے کے لیے ایک ہی سال بلکہ ایک ہی ماہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ایک طرف 'مسلم لیگ' اور دوسری طرف 'ہندو مہاسبھا' قائم کی گئی۔ پھر جداگانہ طریقہ انتخاب کی معقولیت ذہن نشین کرانے کے لیے قومیت کا سوال پیدا کیا گیا۔ جس کا عملی جواب 'ملک کا بٹوارہ تھا۔''

ان تمام مطالبات کے لیے زبانیں اہلِ وطن کی ہوتی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ الہامات ان کے ہوتے تھے جو غیر وطنی ہوتے ہوئے وطن کے مالک بنے ہوئے تھے۔ تفصیلات کے لیے وہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں جو اس زمانہ میں یعنی انگریزی حکومت کے آخری دور میں لکھی گئیں۔ خصوصاً مسلمانوں کا روشن مستقبل اور روح روشن مستقبل، علماحق جلد اوّل، ہندستان کی جدید سیاست میں مسلم علما کا کردار وغیرہ وغیرہ۔

**ملکی حالات:**

یہ ملکی حالات جو پیشِ نظر سطور میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کا تعلق بھی سیاسی ماحول سے ہے۔ لیکن ان کو جدا اس لیے کیا گیا کہ جو حالات سطور بالا میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا تعلق دستور آئین سے ہے۔ اس بنا پر ان کو آئینی مطالبات کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جذبات حریت کی فراوانی نے اسی زمانہ میں ایسے حالات بھی پیدا کر دیئے تھے جو آئین اور قانون سے آزاد تھے وہ جذبہ انقلاب کی پیداوار تھے اور ان کا کشت زار وہ جماعتیں تھیں جن کو انقلابی پارٹیاں اور رولٹ کمیٹی کی زبان میں باغیانہ جماعتیں کہا جاتا ہے۔

ان کے بارے میں رولٹ کمیٹی کا بیان مستند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کمیٹی اسی لیے بنائی گئی تھی کہ انقلابی جماعتوں اور ان کے عمل و کردار کی تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ لہٰذا اسی رپورٹ کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(الف) ۱۹۰۵ء میں ہندستان کے انقلاب پسندوں نے 'برلن' میں 'انجمن انقلاب ہند' بنائی۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان میں جمہوری حکومت قائم ہو۔ اس کے سلسلہ وار جلسے ہوتے رہتے تھے۔ جن میں ترک، رومی اور جرمن افسر شریک ہوتے تھے۔ (رولٹ کمیٹی کی رپورٹ ص ۲۲۶ مطبوعہ کاشی رام پریس لاہور دسمبر ۱۹۱۸ء)

(ب) بنگالیوں کی قوت کو منتشر کرنے کے لیے وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ۱۹۰۳ء میں اعلان کر دیا کہ ان کا ارادہ ہے کہ کمشنری چٹا گانگ، کمشنری ڈھاکہ اور میمن سنگھ کو صوبہ بنگال سے نکال کر آسام میں شامل کر دیں۔ اس کے خلاف بنگالیوں نے ہزاروں جلسے کر ڈالے۔ اور لاکھوں دستخط کرا کر عرضداشتیں بھیج دیں۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ ۵ر جولائی ۱۹۰۵ء کو تقسیم کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اکتوبر ۱۹۰۵ء سے اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

اب بنگالیوں نے احتجاج کی تین صورتیں تجویز کیں۔

(۱) ولایتی سامان کا بائیکاٹ (۲) سودیشی مال کو رواج دینا (۳) دہشت پھیلانا (رپورٹ رولٹ کمیٹی) بنگال کی اس شورش کا اثر لامحالہ صوبہ بہار اور اُڑیسہ پر ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ ۱۱راپریل ۱۹۰۸ء کو مسٹر کنگس فورڈ جج مظفر پور کی گاڑی پر بم سے حملہ کر دیا گیا۔ سی پی میں بنگالیوں کی حمایت میں شورش یہاں تک بڑھی کہ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کے اجلاس کے لیے ناگپور تجویز کیا گیا۔ مگر ناگپور کانگریس کی نرم پالیسی نے ناگپور کے گرم جوش نوجوانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ وہاں کانگریس کا اجلاس ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ ناگپور کے بجائے اجلاس بمبئی میں کیا گیا۔

(تقسیم بنگال کے خلاف تحریک تقریباً پانچ سال تک شدومد سے جاری رہی۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کرنا پڑا)

(روح روشن مستقبل ص ۵۸)

(ج) ایک شخص مسمّٰی ہردیال جو کبھی دہلی کا باشندہ اور پنجاب یونیورسٹی کا

طالب علم تھا۔ ۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ حاصل کرکے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کی غرض سے انگلستان پہنچا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ واپس آیا۔ اور اس نے ایک انقلابی پارٹی تیار کرنی شروع کردی۔ اس کا مرکز سان فرانسسکو (امریکہ) تھا۔ وہاں سے 'غدر' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ جس میں باغیانہ اشتعال انگیز مضامین ہوتے تھے اور خفیہ انجمنوں کے بنانے کی تلقین ہوتی تھی۔ اخبار کے علاوہ موقع بموقع پمفلٹ بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اس پارٹی میں ہندو مسلمان اور سکھ تینوں قومیں شریک تھیں۔ رام چندر اور برکت اللہ اس پارٹی میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ترکی اور جرمنی اس کی پشت پر تھے۔

ہم نے یہاں صرف تین پارٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس طرح کی دوسری پارٹیاں بھی تھیں۔ جن سے ہندستان کا تقریباً ہر ایک صوبہ متاثر تھا۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ اور علماحق جلد اوّل میں ان پارٹیوں اور ان کے اثر ورسوخ کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جس طرح یہ زمانہ اظہار وفاداری اور تقسیم خطابات کا موسم بہار تھا۔ جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی برطانوی پالیسی کو کامیاب کرنے کے لیے جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کا اشارہ کیا گیا۔ تو بہت سے ممتاز افراد اس کی تعمیل کے لیے حاضر اور حسبِ ہدایت عمل پیرا ہوگئے۔ پھر مطالبہ جداگانہ انتخاب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی فرقہ واریت کی عمر دراز کرنے کے لیے دو پارٹیوں کے قائم کرنے کا اشارہ ہوا تو ایک ہی سال میں بلکہ تقریباً ایک ہی ماہ میں دو جماعتیں 'مسلم لیگ' اور 'ہندو مہاسبھا' قائم کردی گئیں۔ اور تیر اندازی کی مشق ہونے لگی۔ اسی طرح انقلاب آفریں سیاسی سرگرمیوں کے لیے یہ زمانہ وہ تھا کہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر 'سر وینزل اسٹینس' نے فرمایا تھا۔ ہر جگہ لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے اور ان کے دماغوں میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ (رپورٹ رولٹ کمیٹی ص ۱۳)

## حضرت شیخ الہندؒ کا کردار:

اس موقعہ پر سیاسی ماحول اور ملکی حالات کی کسی قدر تفصیل اس لیے کی گئی کہ جب حضرت شیخ الہندؒ جیسے مرکب سیاست کے شہ سوار اور میدانِ انقلاب کے علمبردار کا ذکر کیا جائے تو ضروری ہے کہ ماحول پر نظر ڈال کر یہ واضح کیا جائے کہ اس کے تقاضے کیا تھے اور صاحبِ تذکرہ نے ان تقاضوں کو کس طرح پورا کیا۔ اگر متعدد پارٹیاں اور جماعتیں اسٹیج پر تھیں تو صاحب تذکرہ کا رویہ ان کے بارے میں کیا رہا۔ اس کے علاوہ ملکی حالات کے تحت انقلاب پارٹیوں کا تذکرہ اس لیے بھی کیا کہ جذباتی قسم کے کچھ خوش عقیدہ ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذہنی تصور یا آرزو کو واقعہ قرار دے کر اس کو تحریر کا جامہ پہنا دیا۔ اور اپنی تصنیف کا نادر باب بتا دیا اور اس میں بعض اکابرین کا بھی حوالہ دے دیا۔ جو سراسر غلط ہے۔ ہمارا یقین یہ ہے کہ ان انقلابی پارٹیوں سے حضرت شیخ الہندؒ کا کوئی تعلق نہیں تھا، نہ حضرت شیخ ان کے بانی تھے نہ رکن۔ البتہ بعض صورتیں ایسی ضرور ہوئیں کہ ان پارٹیوں کے ارکان یا کارکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وابستگان سے وابستہ ہوگئے۔ حضرت شیخ الہندؒ ایک مرکز اور مرجع تھے۔ بظاہر اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی کہ حضرت شیخ الہندؒ نے کوئی پارٹی یا جماعت بنائی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے خود ایک راستہ اختیار کیا۔ کچھ حضرات کو اس پر چلنے کی دعوت دی۔ وہ اپنی ارادت مندی سے آپ کے ساتھ ہولیے۔ یہ وہ تھے جنھوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت جہاد کی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کا اسم گرامی ان میں سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق اور سرحد کے نوجوان جانباز خان عبدالغفار خاں کو بھی ان میں شمار کیا جاتا ہے۔

اور کچھ وہ تھے جو اپنی جگہ اپنا مقام رکھتے تھے وہ اس لیے حضرت شیخ کے معاون ومددگار یا رفیق کار بن گئے کہ وہ بھی اسی منزل پر پہنچنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے حضرت شیخؒ بادہ پیما ہوگئے تھے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی انھیں حضرات میں ہیں۔ اگر اس کو پارٹی کہا جائے تو اس پارٹی میں ہندو بھی شامل تھے۔ یہ لوگ حضرت کے یہاں آتے، ان کے قیام کے لیے اپنے مکان کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ ان سے تنہائی میں باتیں ہوتیں۔ یہ سکھ، ہندو بنگالی ہوتے جو تقسیم بنگال کے خلاف تحریک انقلاب چلا رہے تھے۔ ان کا تعارف صرف حضرت شیخؒ سے ہونا تھا، خدام ان کی خدمت کرتے تھے۔ ان کے نام پتے ان کو معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح کے حضرات بہت سے تھے۔ چونکہ حضرت کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کا صحیح طریقہ صرف یہ تھا کہ مذہبی حدود میں مداخلت قطعاً نہ ہو۔ ہر ایک اپنے مذہب کا پابند اور اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہو۔ تو ان حضرات

کے کھانے پینے کا انتظام بھی ان کے مذاق کے بموجب علیحدہ ہوتا تھا۔

ایک بڑی جماعت وہ تھی جو حضرت شیخ سے غائبانہ عقیدت رکھتی تھی۔ اور دِلوں میں وہی جذبات رکھتی تھی۔ جن جذبات کے حضرت شیخ امام اور امین تھے۔ اس کو حضرت شیخ سے بیعت وغیرہ کا رابطہ قائم کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ بایں ہمہ وہ عقیدہ اور جذباتی اتحاد کی بنا پر اس جدوجہد کی حمایت اور امداد کرنے لگی۔ جس میں حضرت شیخ کے رفقا مصروف تھے۔ انھوں نے مالی امداد بھی کی اور ضرورت کے بموجب عملی حصہ بھی لیا۔ سی. آئی. ڈی نے 'کون کیا ہے' کے سلسلہ میں جو نام لیے ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے ہی حضرات کی ہے۔

انقلابی یا بقول رولٹ کمیٹی 'باغیانہ جماعتوں کے علاوہ جن جماعتوں کا تذکرہ سیاسی ماحول کے تحت کیا گیا ہے۔ جو آئین و دستور کی حدود میں اپنے مطالبات پیش کررہی تھیں۔ حضرت شیخ جیسا علم بردار انقلاب نہ ان کی طرف چل سکتا تھا نہ ان جماعتوں کی یہ ہمّت تھی کہ وہ کسی مجاہد انقلاب کو اپنے دامنوں میں سمیٹ لیں۔ وہ حکومت کی وفادار تھیں۔ اس کے اشاروں پر رقص کرنے والی یا حکومت کی تفرقہ انگیز پالیسی یعنی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی آلہ کار۔ ان جماعتوں میں صرف 'انڈین نیشنل کانگریس' کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب کچھ ابنائے زمانہ نے اس میں شرکت کو حرام قرار دیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے اس کی تردید کی۔ اور اپنے بزرگ محترم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتویٰ کی تصدیق کی کہ: ''اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع وشرا وتجارت میں کرلیویں۔ اس طرح کہ اس میں کوئی نقصان دین میں نہ ہو یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود و بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آئے تو جائز ہے اور مباح ہے۔''

اس وقت جبکہ ہندستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا کانگریس کے مقاصد میں داخل تھا تو جواز سے آگے وجوب و لزوم کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کانگریس کے مذکورہ بالا تینوں مقاصد کے پیشِ نظر فتوے کا حاصل یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان اگر آپس میں مل جل کر متحدہ قومیت بنانے کی کوشش کریں۔ جس کا مقصد خود ان کی اور ان کے ملک کی ترقی ہو۔ تو جیسے اور معاملات میں ہندو اور مسلمان کا اشتراک جائز سمجھا جاتا ہے اس جدوجہد میں بھی اشتراک جائز ہے۔

اس اشتراک کو جائز قرار دینے کی بنا پر اگرچہ ان حضرات کے خلاف بہت طوفان برپا کیا گیا۔ گویا عرصہ حیات تنگ کردیا گیا۔ لیکن خود حضرت شیخؒ اور ان کے رفقا نے کانگریس میں شرکت نہیں کی۔ یعنی اس کے ممبر یا رکن نہیں بنے۔ کیونکہ یہ ہندستان اور انگلستان کے اتحاد کے حامی نہیں تھے۔ بلکہ انگلستان کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

**ثمرۃ التربیت کا کام:**

چند صفحات پلٹیے سیاسی ماحول سے پہلے 'ثمرۃ التربیت' کا ذکر آچکا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ جماعت ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۸ء میں قائم فرمائی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسی دستاویز نہیں ہے۔ جس سے ہم اس انجمن کی خدمات شمار کراسکیں۔ البتہ:

(الف) حضرت مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے (جو چند سطر بعد آرہا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ختم نہیں ہوئی اور تیس سال تک اپنے انداز میں کام کرتی رہی۔ تیس سال بعد ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء) میں 'جمعیۃ الانصار' کے نام سے اس کا ظہور ہوا۔

'جمعیۃ الانصار' کا سب سے پہلا اجلاس شوال ۱۳۲۸ھ/ ۱۵، ۱۶، ۱۷/ اپریل ۱۹۱۱ء کو مرادآباد میں ہوا۔ اس جلسہ کے صدر حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق قدیم (حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص) حضرت مولانا احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''بعض نئی روشنی کے شیدائی کہ 'جمعیۃ الانصار' اولڈ بوائز ایسوسی ایشن' کی نقل ہے۔ لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔ 'جمعیۃ الانصار' کی تحریک غالبًا اب سے تیس برس پہلے شروع ہوگئی تھی۔ اور اس تحریک کے بانی مدرسہ عالیہ کے طالب علم تھے جو آج علوم کے سرچشمہ اور آفتاب فنون ہیں۔ اور جن کی ذات بابرکات پر آج زمانہ جس قدر ناز کرے کم ہے۔ لیکن یہ تحریک اس وقت ضروریات سے متعلق نہیں تھی اس لیے رک گئی۔ اور آخر اس کلیہ کی بناء پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کردیتی ہے۔ ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء سے اس انجمن کو دوبارہ زندہ کرکے 'جمعیۃ الانصار' نام رکھا گیا۔ 'جمعیۃ الانصار' ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں ہے۔ اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے بحثیت دنیاوی اس کا تعلق ہے بلکہ اس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں، جن کی آج بہت ضررت ہے۔''

(ب) حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے ایک بیان کا اقتباس 'ثمرۃ التربیت' کے زیر عنوان ضمن:

(ہ) میں گزر چکا ہے۔ اس کا آخر فقرہ یہ ہے۔

''کابل جاکر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندہ تھے، اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظّم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے خادم شیخ الہندؒ کی ضرورت تھی۔

(ج) ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمالیجئے۔ اس سے آپ ایک نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔ اور آپ کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ اقتباس یہ ہے۔

''سلاطین اسلام کے زمانہ میں کابل ہندستان کا جزو رہا ہے۔ انگریزوں نے بھی اس کا ارادہ کیا۔ مگر ناکام رہے۔ حضرت سیّد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جدوجہد نے ہندستانی اور سرحدی مجاہدین میں ایک رابطہ قائم کردیا۔ جو انبالہ اور پٹنہ کے حضرات کے زمانہ ۱۸۶۴ء تک یعنی 'ثمرۃ التربیت' کے قیام سے تقریباً پندرہ سال پہلے تک استحکام کے ساتھ باقی رہا۔ ان حضرات کے بعد امداد رسانی کا وہ تعلّق ختم ہوگیا۔ مگر مجاہدین کا رابطہ ختم نہیں ہوا۔ ہندستانی مجاہدین سرحدی علاقوں میں باقی رہے۔ دارالعلوم دیوبند نے اس رابطہ کو استاد اور شاگردی کی شکل میں تبدیل کردیا۔ جو انقلابی جدوجہد کے لیے پہلے سے بہت زیادہ مستحکم اور مفید ہوسکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مولانا محمود حسنؒ صاحب جیسا سیاسی اور مذہبی مقتدا نہ صرف استاد بلکہ شیخ اور مرشد بھی ہو۔ جس کے دست حق پرست پر سلوک وطریقت کے لیے بھی بیعت کی جاتی ہو اور جہاد کے لیے بھی۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تقریر صدارت میں فرمایا تھا کہ یہ تحریک اس وقت ضروریات سے متعلق نہیں تھی اس لیے رُک گئی۔ یہ رُکنا صرف ہندستان کی حد تک تھا۔ مگر مغربی شمالی سرحد کے قبائل میں اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ البتہ یہ پارٹی یا جماعت کی شکل میں نہیں تھا۔ بلکہ افراد کے ذہنوں میں جذبہ انقلاب پیدا کرنا۔ اور اس کی تربیت اس کا پروگرام تھا جو شاگردی یا ارادت مندی کی صورت میں جاری رہا۔ یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا کارنامہ تھا۔

اور جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے دور میں جب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان منتشر افراد کو منظّم کرکے ان سے کام لیا جائے تو حضرت مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا گیا۔ جو 'جنود ربانیہ' کا نقشہ تیار کیے ہوئے تھے۔ یہ خلاصہ ہے 'ثمرۃ التربیت' کی خدمات کا سی.آئی.ڈی کی رپورٹ کے سلسلہ میں ''استغاثہ ملک معظم بنام عبیداللہ وغیرہ۔'' پیش کیا گیا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اسی خلاصہ کی تفسیر وتشریح ہے۔

**۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء کی خصوصیت:**

حضرت مولانا امروہوی کی تقریر صدارت کا اقتباس جو الف) میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ایک فقرہ تشریح طلب ہے۔ فقرہ یہ ہے۔

''ثمرۃ التربیت کا رکا ہوا کام اب ہندستان میں 'جمعیۃ الانصار' کے جدید عنوان سے کیوں جاری کیا جارہا ہے۔''

اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں: ''آخر اس کلیہ کی بنا پر کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کردیتی ہے۔ اس انجمن کو دوبارہ زندہ کرکے 'جمعیۃ الانصار' نام رکھا گیا۔''

پھر آخر میں فرماتے ہیں: ''اس کے مقاصد وہ ضروری مقاصد ہیں جن کی آج ضرورت ہے۔''

وہ ضرورت کیا ہے؟ جس نے خود ثمرۃ التربیت کو زندہ کردیا۔ اور وہ ضروری مقاصد کیا ہیں؟ جن کی آج ضرورت ہے۔ ان مبہم الفاظ کی تشریح کے لیے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے۔ جو رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے حوالہ سے ملکی حالات کے آخر میں گزر چکا ہے کہ ''ہر جگہ کے لوگ کسی تبدیلی کے متوقع تھے اور ان کے دماغوں میں ہوا بھری ہوئی تھی۔''

**اقدام اور محرکات اقدام:**

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

(حکومت نے) یو.پی ۱۹۰۰ء میں ناگری کا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور مہا سبھا کا۔ پھر کانپور میں مسجد کا، کلکتہ میں توہین جناب سرکار دو عالم علیہ السلام اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کرایا۔ ادھر ترکی جو عرصہ سے مسلمانوں کا قبلہ توجہ اور خلیفہ دینی چلا آتا تھا۔ اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیاں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے۔ جنھوں نے انتہائی بے چینی عام قلوب میں پیدا کردی۔

حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن قدس سرہٗ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم بالخصوص ہندستان اور ترکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی۔ ان واقعات سے اس قدر متاثر ہوگئے کہ ان کے لیے آرام وچین تقریباً حرام ہوگیا۔ اور گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔

زمانہ کی تاریکیاں موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہلِ

ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ غور وخوض میں گزرا۔ مگر چونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس لیے (خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد و بھروسہ کرکے) کام شروع کر دیا۔ اور لوگوں کو ہم خیال و رفیق سفر بنانے لگے۔ بڑے بڑے علما اور مشائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے بہت سے خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اپنے تلامذہ (شاگردوں) اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے۔ جن میں سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی ہیں۔

**نظارۃ المعارف:**

۱۳۲۱ھ میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی۔ اس کے کارپرداز دوسرے حضرات تھے۔ اور روح رواں حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ تعلیم گاہ بھی تھا، تربیت گاہ بھی اور خفیہ مشورہ گاہ بھی۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانانِ اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے۔ اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک وشبہات دینِ اسلام سے دُور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکّے مسلمان ہو جائیں۔''

سی۔آئی۔ڈی کی تحقیق یہ ہے: ''دیوبند کو اپنے مشنریوں کی تربیت گاہ نہ بنا سکا۔ تو عبیداللہ نے فیصلہ کیا کہ ایک مدرسہ دلی میں اس مقصد کے لیے قائم کرے۔'' (استغاثہ ملک معظم فقرہ نمبر ۱۷)

یہ مدرسہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قرآن کی مبینہ اصلی وحقیقی تشریح کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ عربی زبان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ (ایضاً فقرہ نمبر ۱۷)

اس درس کے علاوہ جو نظارۃ المعارف میں دیا جاتا تھا۔ اور جو صریحاً درست نہیں تھا سازشیوں کے وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے کے لیے بھی ایک جلسہ گاہ کا کام دیتا تھا۔ (فقرہ نمبر ۲۰/ استغاثہ مذکور)

اور غالباً صحیح بات یہ ہے کہ نظارۃ المعارف ایک بیمار خانہ کا نرسنگ ہوم تھا۔ مریضان دردِ حریت کے لیے یہ تقاضا تھا ان احساسات کا جو حامیانِ ملّت کو دعوتِ اتحاد دے رہے تھے۔ جس کی تفسیر علما حق جلد دوم کے الفاظ میں یہ ہے:

''۱۹۱۲ء میں دنیائے اسلام پر ایک نئی مصیبت آئی۔ جب کہ بلقان کی ریاستوں کو شاطر برطانیہ اور اس کی ہمنوا حکومتوں نے ترکوں کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا اور بلقانیوں کے ذریعہ ترکوں کے مقابلہ پر وہی کرانا چاہا جو جرمنی اور اٹلی نے اسپین میں جنرل فرانکو کے ذریعہ جمہوری حکومت کو تباہ کرنے کے لیے کرایا تھا۔ پھر ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک سیدھی کرنے کے لیے مسجد کو شہید کرا دیا۔ مسلمانوں نے مسجد کی حمایت میں اپنے سینے پیش کر دیئے۔ جو ستم شعار فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے۔''

ان دونوں ہنگاموں نے خامیانِ ملت کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا۔ استخلاص وطن کی جدوجہد تیز کر دی گئی۔ اور دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کرکے نوجوانانِ ملت کو درس سیاست دیا جانے لگا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، اس کے معاون تھے۔ سی۔آئی۔ڈی کی رپورٹ یہ ہے کہ نظارۃ المعارف ان کا دارالمشورہ تھا اور عوام کی بے تکلف زبان میں سیاسی کلب تھا۔

**مولانا سندھی کی سیاسی تربیت:**

بلاشبہ نظارۃ المعارف نے کچھ دنوں اعلیٰ درجہ کی فکری درسگاہ کے انداز میں کام کیا اور متعدد فضلا پیدا کیے۔ مگر یہ ایسا دور تھا کہ بالغ النظر فضلا اور عمیق الفکر دانشور وہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ جو حضرت شیخ الہندؒ کے نزدیک اس دور کا جوہری کام تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت یہ ہے کہ: ''حضرت شیخ الہندؒ دلّی تشریف لے گئے اور مولانا عبیداللہ صاحب سے ملاقات کی اور تذکروں میں فرمایا کہ جبکہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال بناؤ گے۔ اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے۔''

**خلاصہ مقاصد:**

نظارۃ المعارف کے مقصد کے بارے میں جو متعدد عبارتیں متعدد بزرگوں کے بیانات میں ملتی ہیں۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اصل مقصود وہ تھا جو بعد میں ظاہر ہوا مگر ابتدا میں فکری تربیت گاہ کے طور پر اس کو قائم کیا۔ اور مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ذمہ دار بنا کر دیوبند سے دلّی منتقل کر دیا۔ مگر پھر جلد ہی سیاسی تربیت بھی آپ نے اس کے پروگرام میں داخل فرمادی۔ اس کا ذمہ دار بھی مولانا سندھی ہی کو بنایا۔ اور خاص طور پر دلّی تشریف لا کر اونچے درجے کے رہنماؤں

مولانا آزاد، مولانا محمد علی وغیرہ سے جو حضرت شیخ کے ہم نوا تھے، ان کا تعارف کرادیا۔ اس تعارف کے نتیجہ میں حضرت مولانا سندھی کی حیثیت ایک ناظم اور کنوینر کی ہوگئی۔ اب ان حضرات کے اجتماعات اور مشورے بھی ہونے لگے اور نظارۃ المعارف ان حضرات کا دارالمشورہ بھی ہوگیا۔

**جنگ بلقان و طرابلس اور ترکوں کی مالی امداد:**

حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بلقان کی خونریز جنگ اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا۔ چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاد اکبر مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہٗ العزیز (بہ زمانہ جنگ روس) مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام پر فرمائی۔ فتوے چھپوائے۔ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) کو بند کرایا۔ طلبہ کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی۔ ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی۔ مگر اس پر بھی چین نہ پڑا۔ کیونکہ جنگ بلقان کے نتیجہ نے دوربین حضرات کو بالکل غیر مطمئن کردیا تھا اور بتادیا تھا کہ یورپ کے سفید عفریت اسلام کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کردینے کی فکر میں ہیں۔ پھر ذمہ دارانہ برطانیہ مسٹر اسکویبھ وغیرہ کی روباہ بازیاں، خرس روس کی جفاکاریاں تو یقین دلاتی تھیں کہ تقسیم ترکی اور اجراوصایا گلیڈسٹون کا زمانہ سرپر ہی آگیا ہے۔

**منصوبہ انقلاب:**

برسراقتدار جماعت سے مقاطعہ اور عدم تعاون بھی انقلاب کا ذریعہ ہوسکتا تھا۔ مگر اس کے لیے جملہ اہلِ وطن، ورنہ بڑی اکثریت کا اتحاد اور ولولہ عمل ضروری تھا۔ عوام پر ولولہ عمل پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ موتمر الانصار کے جلسے اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار 'الہلال' مولانا محمد علی جوہرؔ کا 'کامریڈ' اس خدمت کو بخوبی انجام دے رہے تھے اور اسی بنا پر ان حضرات کو نظر بند کردیا گیا تھا۔ مگر ابھی تک اس جدوجہد کے اثرات ایک خاص حلقہ میں محدود تھے۔ 'ہندومہاسبھا' اور 'مسلم لیگ' کا تذکرہ ہی کیا۔ 'انڈین نیشنل کانگریس' جو تمام ہندستانیوں کو ایک قوم بنانے اور اس کی صلاحیتوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ وہ بھی ابھی برطانوی سامراج کے سامنے دریوزہ گر رہی تھی، حقوق کی درخواست کررہی تھی۔ انگریزی اقتدار سے ٹکرانا تو درکنار 'ڈومینین اسٹیٹس' بھی اس کی پرواز فکر سے بالا تھا۔ زیر سایہ برطانیہ داخلی خودمختاری اور 'ہوم رول' صرف ان رہنماؤں کی زبان پر آجاتا تھا۔ جو اظہار رائے میں بے باک اور دلیر سمجھے جاتے تھے۔ ان حالات میں خداوندان اقتدار سے مقاطعہ بے ادبی اور گستاخی سمجھا جاسکتا تھا۔ انقلاب کا حربہ نہیں بن سکتا تھا۔ ان حالات میں انقلاب کا راستہ صرف یہی ہوسکتا تھا کہ حامیانِ انقلاب کفن بردوش میدان میں آئیں۔ اور قربانیاں پیش کریں۔ اور پیش کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں۔

بین الاقوامی حالات نے کروٹ لی۔ دُوَل یورپ (یوروپین حکومتوں) کے مابین مفاد اور رشک وحسد کا ناسور جو عرصہ سے رِس رہا تھا۔ وہ پھوڑا بنا۔ اور یورپ دو جنگجو طاقتوں میں تقسیم ہوکر خون کے سمندر میں تیرنے لگا۔

ترک کنارہ کش تھے مگر ان کو بھی زبردستی جنگ میں کھینچا گیا۔ اب ایک طرف قیصر جرمنی اور ترکی سلطان تھے اور دوسرے جانب یورپ کی بڑی طاقتیں روس، فرانس اور برطانیہ۔

تصادم اس شدت سے ہوا کہ پوری دنیا دہل گئی۔ سونے والے جاگ گئے۔ اور جاگنے والے دوڑنے اور بھاگنے لگے۔ انقلاب کے لیے موسم بہار آگیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جو عرصہ سے بیدار تھے۔ اور قوم کو بیدار کررہے تھے۔ وہ بھی اٹھے قدم بڑھایا اور اس سلسلہ کو متحرک کیا۔ جس کی کڑیاں آپ طویل عرصہ سے جوڑ رہے تھے۔ جس کے لیے آپ نے ثمرۃ التربیت قائم کیا تھا۔ جس کے لیے آپ نے وہ تلامذہ تیار کیے تھے جو جذبہ جہاد سے سرمست تھے۔ ان کو جہاد یا انقلاب کے لیے کوئی ٹریننگ نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ آپ کی شفقت اوّل ان کو گرویدہ بناتی، پھر اپنے شیخ اور مربی کے رنگ میں رنگ دیتی تھی۔

آپ دارالعلوم کے صدر مدرس تھے۔ اونچے درجہ کے ایک دو سبق صدر مدرس ضرور پڑھاتا ہے۔ مگر پورا وقت اسباق میں صرف نہیں کرتا۔ نہ چھوٹے درجہ کے طلبہ کو پڑھانا اس کا کام ہوتا ہے۔ لیکن آپ کا دستور العمل سالہا سال یہ رہا تھا کہ اسباق متعلقہ کے علاوہ چھوٹے درجوں کے ہونہار طلبہ کو بھی درس دیتے۔ نماز صبح کے بعد سے دوپہر تک یہ مشغلہ رہتا۔ پھر آپ کی نشست گاہ بھی درس گاہ بنی رہتی۔ آپ کی اس غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوتا کہ طلبہ صرف گرویدہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بہت سے وہ ہوتے جو آپ کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ اس رنگ کا ایک چھینٹا یہ ہوتا کہ جو آپ سے روحانی تربیت کے لیے بیعت کیا کرتا تھا اس سے آپ بیعت جہاد بھی لیتے۔

ان بیعت کرنے والوں کا فوری کام یہ ہوتا کہ جہاں وہ پہنچتے وہاں مدرسہ قائم کرتے۔ یعنی اشاعت علم کے ساتھ ولولہ جہاد کے بھی پودے لگا دیتے تھے۔ اس طرح کے مدرسے پورے ہندستان میں قائم کیے گئے۔ خصوصاً یاغستان میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔

اب کچھ کرنے کا وقت آیا تو پرورش کردہ جذبات کو بروئے کار لانے کے لیے مرکز قائم کیے گئے۔

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے چند مرکزوں کے نام بنائے ہیں۔

(۱) دیوبند (۲) دہلی (۳) دین پور شریف (۴) امروٹ شریف (۵) کھڈا (کراچی) (۶) چک وال (۷) اس کے علاوہ بنگال میں ایک مرکز تھا۔ (جس کا نام نہیں معلوم ہوسکا)

یاغستان آپ کے انقلابی مشن کا خاص علاقہ تھا۔ سب سے پہلے اسی کو متحرک کیا گیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کے نوجوان وہ تھے جنھوں نے اب تک انگریز اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ یہ جنگجو بھی تھے اور جانباز بھی۔ مگر خرابی یہ تھی کہ یہ منظم نہیں تھے اور نہ صرف منتشر تھے بلک قبائلی رقابت نے ان کے انتشار میں جارحیت بھی پیدا کر رکھی تھی۔ چنانچہ جانبازی اور سرفروشی کے جذبات ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہی صرف ہوتے تھے۔ حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے لوگ (مجاہدین سرحد جو ستھیانا اور چمرقند میں مقیم تھے) وہ بھی قبائل سے مربوط نہیں تھے۔

حضرت مولانا مدنیؒ فرماتے ہیں:

اس نازک وقت میں سب سے اہم اور ضروری کام یہ تھا کہ کم از کم جہادِ حریت کے لیے ان سب کو متفق کیا جائے۔ چنانچہ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو دہلی سے مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب جو اس علاقہ کے رہنے والے اور اس علاقہ میں مقیم تھے ان کو آمادہ کیا گیا۔ ان حضرات اور ان کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کے جو بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ انھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی۔ یہ کوششیں کامیاب رہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اصرار کر کے حاجی صاحب ترنگ زئی کو بھی مجبور کیا کہ وہ یاغستان تشریف لے جائیں۔ چنانچہ جب حاجی صاحب نے اس پر عمل کیا اور جب وہ پہنچے تو مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہوگیا۔

لیکن مجاہدین حریت کے پہلو بہ پہلو خفیہ پولیس کے وفادار ایجنٹ بھی اپنا کام مستعدی سے کرتے رہے۔ چنانچہ ابھی مجاہدین حریت نے قدم نہیں بڑھایا تھا کہ انگریزی فوجیں قومی سرحدوں سے آگے کئی کئی میل تک یاغستان میں داخل ہوگئیں اور متعدد مقامات پر قبضہ کرلیا۔ اب مجاہدین بھی میدان میں آئے۔ اور بقول حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ انھوں نے نہایت جوش اور جوانمردی سے یکے بعد دیگرے ایسے زور دار حملے کیے کہ پلٹنوں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالیں۔ اور پھر جو فوجیں آگے بڑھ گئی تھیں ان کی امداد اور رسد بند کردی۔ اس طرح ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا وارا نیارا ہوگیا اور سامان تو کروڑوں کا تلف ہوگیا۔ پہاڑی جنگ میں مجاہدین ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ اور اعلیٰ درجہ کی مہارت جنگ اور پہاڑی تحفظات کے باوجود انگریزی باضابطہ اور میدانی فوج ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، انگریزی فوجیں توپوں اور مشین گنوں اور ٹینکوں وغیرہ سے حملے کرتی تھیں۔ مگر یہ سب چیزیں ضائع جاتی تھیں۔ مجاہدین پہاڑوں کے دروں اور چٹانوں کی آڑ اور اونچے مقامات وغیرہ سے ایسے کارتوس اور گولیا برساتے تھے۔ جو کہ ضائع ہونا جانتے ہی نہ تھے۔ (حدود افغانستان میں کارتوس پیسے پیسے فروخت ہوتا تھا۔ اس لیے بازار موجود تھا۔ افغانستان اگرچہ بظاہر انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ مگر ہتھیاروں کے متعلق اس کے حدود میں کوئی پابندی نہ تھی اور نہ آج تک ہے) خلاصہ یہ کہ چند مہینوں کی جنگ میں انگریزوں کو انتہائی نقصان جان و مال کا اٹھانا پڑا۔ اور تمام بلند بانگ دعوے خاک میں مل گئے۔

بالآخر وہی پرانا طریقہ جو کہ پہلی جنگوں میں اور آڑے وقتوں میں انگریز اختیار کرتے رہے یہاں بھی کرنا پڑا۔ جس کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کو درمیان میں ڈالا گیا۔ اور اشرفیوں اور روپیوں کی بھرمار کر کے دیہات یاغستان کے سرداروں کو توڑ لیا گیا۔ اور یہ پروپیگنڈہ کردیا کہ جہاد بغیر بادشاہ کے شریعتِ اسلامی میں درست نہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ ان اطراف میں امیر کابل امیر حبیب اللہ خاں ہیں۔ تم ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے منظم ہوجاؤ۔ جب امیر صاحب اٹھیں اور علم جہاد بلند کریں۔ تب ان کے ساتھ ہوکر جہاد کرنا۔ سردار نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں اس کے ناظم بنائے گئے۔ اور تمام بیعت نامہ کے کاغذات ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس پروپیگنڈہ پر پانی کی طرح روپے بہائے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین کی قوت کمزور ہوگئی۔ چند لڑائیوں کے بعد جن میں مجاہدین رسد اور کارتوس کے خرچ ہوجانے کی

وجہ سے پورے اجتماع کو سنبھال نہ سکے تھے۔ ادھر دیہاتوں کے مکھیا اور سرداران قبائل ٹوٹ گئے۔ ادھر عوام امیر کابل کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے اپنے جوش وخروش کو قائم نہ رکھ سکے۔

**ترکوں کے خلاف فتوے اور حضرت شیخ الہندؒ کا انکار:**

پروپیگنڈہ کے طوفان کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اعلان کرایا گیا کہ (۱) ترک ازخود جنگ میں داخل ہوئے۔ ہم نے مجبور نہیں کیا۔ (۲) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں (۳) ہم مقامات مقدسہ کا احترام کریں گے۔ جدہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور بغداد وغیرہ پر نہ بمباری کریں گے نہ ان پر جنگ کا کوئی اثر پڑنے دیں گے۔ (۴) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں، اور نہ اپنے فسق وفجور اور بداعمالیوں کے باعث اس کے مستحق ہیں کہ منصب خلافت اسلامیہ ان کے سپرد ہو۔ اس پر علما سے فتوے لکھوائے گئے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے فتویٰ مرتب کیا۔ جس پر ہمنوا اور کمزور دل علما سے دستخط کرائے گئے۔ یہ فتویٰ دو مرتبہ حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ دونوں مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سختی سے اس کو رد کردیا۔ جن مولویوں نے اس کی تصدیق کی تھی۔ ان کے متعلّق بھی سخت کلمات کہے اور مجمع عام میں اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔

**سفر حجاز:**

مرکز یاغستان سے تقاضہ ہورہا تھا کہ حضرت یہاں تشریف لے آئیں۔ تو مجاہدین کا اجتماع اور زیادہ ہوجائے۔ آپس کے تفرقہ کا خطرہ نہ رہے اور کاروبار جہاد میں پختگی اور رونق پیدا ہوجائے۔ لیکن مجاہدین اور ضروریات جہاد کے لیے غیر معمولی امداد کی بھی ضرورت تھی اور حضرت کے علاوہ اور کوئی ایسا نہ تھا کہ لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہوں اور محض خفیہ اشارہ پر غیر معمولی امداد پیش کردیں۔ لہٰذا حضرت نے یاغستان جانا خلاف مصلحت سمجھا۔ مسلسل تقاضوں کے بعد کچھ تیار بھی ہوئے تو خبریں پہنچیں کہ میگزین ختم ہوچکا ہے۔ رسد بھی باقی نہیں رہی اور یہ کہ عوام کی خفیہ امدادیں ضروریات جہاد کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا کسی باقاعدہ حکومت کو آمادہ کیا جائے کہ وہ پشت پناہی کرے۔

اس مرحلہ پر حضرت نے یاغستان کے بجائے حجاز کا ارادہ کیا کہ ترکی حکومت سے رابطہ قائم کریں اور مرکز یاغستان کے لیے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو مامور فرمایا۔ مولانا سندھی فرمایا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا 'عبیداللہ افغانستان چلوٗ میں نے پوچھا۔ حضرت کیوں حضرت شیخ الہندؒ خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن حضرت نے پھر فرمایا۔ 'عبیداللہ افغانستان چلوٗ میں نے پھر پوچھا۔ حضرت کیوں؟ حضرت خاموش ہوگئے مگر چہرہ پر کچھ ناگواری کا اثر تھا۔ اب میں پریشان ہوا اور طے کرلیا کہ آئندہ اگر حضرت فرمائیں گے تو میں بلاچون وچرا تسلیم کرلوں گا۔ خوش قسمتی سے حضرت نے تیسرے دن پھر فرمایا۔ 'عبیداللہ افغانستان چلوٗ میں فوراً تعمیل حکم کے لیے تیار ہوگیا۔ بہرحال حضرت سندھی کو اس علاقہ کے لیے مامور فرمایا۔ اور خود سفر حجاز کا ارادہ کرلیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ تھا کہ آپ کی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ آپ کی گرفتاری یقینی تھی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے تعلقات مرکزی حکومت کے افسران سے بھی تھے۔ ان کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ آپ کی گرفتاری طے ہوچکی ہے۔ حضرت مولانا آزاد کی رائے یہ تھی کہ مولانا ہندستان ہی میں رہیں اور یہیں گرفتار ہوں۔ مگر ڈاکٹر انصاری کا اصرار یہ تھا کہ آپ جلد سے جلد برطانوی حدود سے نکل جائیں۔ یاغستان کے حالات کے پیشِ نظر حضرت شیخ الہندؒ نے اسی کے محرک تھے انھوں نے ٹکٹوں کا انتظام بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب حضرت سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور بڑی فراخدلی سے سفر کی جملہ ضروریات مہیّا کردیں۔

**تاریخ روانگی اور رفقائے دارالعلوم کو ہدایات:**

۲۹ر شوال ۱۳۳۳ھ (۱۰ر ستمبر ۱۹۱۵ء) کو خاص روانگی کے دن بعد ظہر اپنی قدیم درسگاہ نودرہ میں دارالعلوم کے خاص منتظمین اور مدرسین، ملازمین وطلبہ کو جمع فرمایا۔ اور مناسب تمہید کے بعد بہت تصریح سے فرمایا کہ میرا ارادہ صرف زیارت حرمین وشریفین کا ہے۔ یہ بتادینا تو مشکل ہے کہ کتنی مدت میں واپس ہوں گا۔ مگر انشاء اللہ ضرور اور حتیٰ الوسع جلد واپس ہوں گا۔ اور مدرسہ کے قدیم بزرگوں اور مقدس بانیوں کا ذکر کرکے فرمایا کہ مدرسہ کا کام خدا تعالیٰ کا کام ہے اس کی امانت سمجھ کر ہر شخص کو کوشش کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

**ھجرت کے متعلق افواہ اور زیارت کرنے والوں کا ھجوم:**

مشہور ہوگیا کہ مولانا ہجرت فرمارہے ہیں اور چونکہ آپ نے اپنی جائیداد وارثوں میں تقسیم فرمادی تھی اور ایک عرصہ تک کے لیے خانگی مصارف کا بھی انتظام کردیا تھا۔ اس لیے یہ افواہ قرین قیاس بھی تھی۔ چنانچہ ہرطرف سے اصحاب ارادت کی آمد شروع ہوگئی اور روانگی کے وقت

تک بے پناہ ہجوم رہا۔ دارالعلوم کے طلبہ اور دوسرے معتقدین نے تار دے کر اپنے اعزہ اور اقارب کو روانگی کے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ تو ہر اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع رہتا۔ مصافحہ کرنا بھی مشکل ہوتا۔ رتلام اور اندور میں قیام فرمایا تو وہاں بھی مجمع کا یہی حال رہا۔

**بمبئی میں قیام اور روانگی:**

حکیم عبدالرزاق صاحب نے انجمن محافظ حجاج کے آفس کو ریزرو کرا لیا تھا اور اس کو آراستہ کر دیا تھا۔ یہیں آپ نے قیام فرمایا۔ یہاں بھی ہر وقت زائرین اور معتقدین کا اتنا ہجوم رہا کہ اگر انجمن کے کارکن پوری چستی سے کام نہ کرتے تو آرام کرنے کی مہلت بھی میسر نہ آتی۔ ۷؍ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ، ۱۸؍ستمبر ۱۹۱۵ء کو 'اکبر جہاز' سے آپ جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔

**رفقائے سفر:**

مولانا کی روانگی معمولی شخص کی روانگی نہ تھی۔ بہت سے حقیقی اور مصنوعی ارباب عقیدت آپ کے ساتھ ہو لیے۔ خاص خاص حضرات یہ تھے مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی (جنھوں نے بعد میں اپنا نام منصور الانصاری تجویز کیا) مولانا عزیر گل صاحب، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری حاجی خان محمد صاحب، مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبند، حاجی محبوب خاں صاحب سہارنپوری، حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی، مولانا وحید احمد صاحب مدنی۔

**قائم مقام:**

تحریک کے کاموں کے لیے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا قائم مقام نامزد فرمایا اور کارکنوں کو ہدایت کر دی کہ اہم امور ان کے مشورہ سے انجام دیئے جائیں۔ اور جزوی امور حضرت مولانا احمد اللہ پانی پتیؒ کے حوالہ تھے۔

**وارنٹ گرفتاری کا تماشہ:**

کچھ بعید نہیں کہ گرفتاری کا حکم دیوبند پہنچ چکا ہو۔ مگر یہاں معتقدین اور زائرین کا ہجوم تھا۔ جو دُور دُور سے آئے ہوئے تھے اور یہ وہ تھے جو اپنی اپنی جگہ بااثر تھے۔ دیوبند میں گرفتار کرنا عوام میں ہیجان برپا کر دیتا جس سے حکومت بچنا چاہتی تھی۔ یہی صورت ہر اسٹیشن پر رہی۔ بمبئی میں حکومت یو۔ پی نے مرکزی حکومت کے واسطہ سے عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن کو جہاز سے اُتار لو۔ مگر تار دینے والے ڈاکٹر انصاری کے آدمی تھے۔ انھوں نے تار دینے میں اتنی تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا گیا کہ مولانا کو جہاز پر گرفتار کر لو۔ جہاز سے اُترنے نہ دو۔ لیکن اس وقت گورنمنٹ حجاز کا انتظامیہ تھا کہ جدہ پہنچنے سے پہلے تمام حجاج کو 'جزیرہ سعد' میں اُتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے مکہ معظّمہ پہنچایا جاتا تھا۔ یہ تار کپتان کو اس وقت ملا کہ حضرت شیخ عام حجاج کے ساتھ جزیرہ سعد میں اُتر چکے تھے۔ بہرحال گرفتاری کی کوششیں پیچھے پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہندؒ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے۔ اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔

**خفیہ پولیس کی افواہ:**

بمبئی میں جہاز پر سوار ہوتے وقت حضرت شیخ کے رفقا سے کہہ دیا گیا تھا کہ آپ کے ساتھ آٹھ دس آدمی خفیہ پولیس کے ہیں۔ ان سے احتیاط کی جائے۔ ان کے نام ونشان بھی بتا دیئے تھے۔ یہ بات ترکی پولیس تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ جزیرہ سعد میں ترکی پولیس نے ان کو اپنی حراست میں لے لیا اور اسی طرح زیرِ حراست ان کو حج کرایا۔ حج کے بعد ان سے کہا گیا کہ محافظ سپاہی آپ کے ساتھ مدینہ جائیں گے۔ اگر ان کا خرچ ادا کرو تو مدینہ جا سکتے ہو۔ انھوں نے خرچ سے معذوری ظاہر کی تو ان کو مدینہ جانے کی اجازت نہیں ملی اور مکہ معظّمہ ہی سے ہندستان واپس کر دیئے گئے۔

**جدّہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں حاضری:**

۲۷؍ذیقعدہ ۱۸؍اکتوبر کو جدہ سے روانہ ہو کر ۲۸؍ذیقعدہ ۱۳۳۳ھ ۹؍اکتوبر ۱۹۱۵ء کی شام کو آپ مکہ معظّمہ میں حاضر ہوئے۔

**غالب پاشا گورنر حجاز سے ملاقات:**

حضرت مولانا جیسے ہی مکہ معظّمہ پہنچے اپنے مقصد کے لیے کوشش شروع کر دی۔ گورنر حجاز سے پہلے سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ حافظ عبدالجبار صاحب مکہ کے سربرآوردہ سن رسیدہ تاجر تھے۔ اہلِ شہر ان کی عزّت کرتے تھے اور سرکاری حلقوں سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ دہلی کے مشہور اور معزز تاجر حاجی علی جان صاحب جو سیاسی رہنماؤں کے بھی معتمد تھے۔ حافظ عبدالجبار صاحب کا تعلّق اسی خاندان سے تھا۔ اس خاندان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ تھا اور اب مجاہدین ستھیانہ سے جو حضرت سیّد صاحب کے پیرو تھے، تعلّق رکھتا تھا۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے حافظ عبدالجبار صاحب کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب صحیح ثابت ہوا۔ حافظ

عبد الجبار صاحب نے گورنر حجاز سے ملاقات کا پروگرام طے کرلیا اور اپنے ایک معتمد کو ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ کے ساتھ کر دیا۔ (یہ ایک ہندستانی نوجوان تھا۔ عربی اور ترکی زبان کا ماہر ترکی اسکول کا سند یافتہ مکہ معظّمہ میں تسبیحوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ گورنر سے تعارف رکھتا تھا) حضرت شیخؒ نے گورنر حجاز سے گفتگو کی اور اپنا مقصد سمجھایا۔

گورنر نے تمام باتیں غور سے سنیں ضروری سوالات کے جوابات حاصل کیے اور اپنی طرف سے جواب دینے کے لیے اگلے روز اپنے یہاں تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس وقفہ میں گورنر نے ہندستان کے معزز اور معتمد تاجروں سے حضرت شیخؒ کے متعلق تحقیقات کی۔ اور جب ان حضرات کے بیانات سے حضرت شیخؒ کی عظمت، آپ کی غیر معمولی علمی قابلیت، آپ کے جذبات اور کارناموں کا اندازہ ہوگیا۔ تو دوسری ملاقات میں حضرت شیخؒ کا بہت احترام کیا اور تمام پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس گفتگو سے اور زیادہ مطمئن ہوگیا۔ اور اتنا متاثر ہوا کہ حضرت شیخؒ نے اپنے مقصد کے سلسلہ میں جو تحریریں حاصل کرنی چاہیں وہ مرتب کر کے دے دیں۔ ان میں سب سے اہم مسلمانانِ ہند کے نام پیغام تھا۔ جس میں حضرت شیخ پر اعتماد ظاہر کرتے ہوئے ان کی جدو جہد کی تحسین کی تھی۔ اور ہدایت کی تھی کہ ان کی حمایت اور امداد کریں۔ اس کے علاوہ اپنی یعنی ترکی حکومت کی طرف سے بھی امداد کا یقین دلایا۔ یہ تحریر غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی اور اس کی کاپیاں یاغستان میں تقسیم کی گئیں۔ اس تحریر کے علاوہ دوسری تحریر مدینہ طیبہ کے گورنر 'بصری پاشا' کے نام تھی۔ جس میں حضرت شیخ پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے فرمائش کی تھی کہ ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دیں۔ تیسری تحریر 'انور پاشا' کے نام تھی کہ یہ معتمد بزرگ ہیں۔ ان کے مطالبات پورے ہونے چاہئیں۔ لیکن حضرت شیخ کو استنبول جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ جب حضرت شیخ الہندؒ حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر ۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۴ھ کو مدینہ منورہ پہنچے تو خود انور پاشا اور جمال پاشا اپنے سرکاری پروگرام کے مطابق مدینہ طیبہ حاضر ہوگئے، وہیں حضرت شیخؒ سے ملاقات ہوئی۔ اور حضرت شیخؒ کی فرمائش کے بموجب ان حضرات نے فرامین اور پیغامات لکھ کر دے دیئے۔ ان پیغامات کا مضمون بھی وہی تھا جو 'غالب نامہ' کا تھا۔ یعنی ہندستانیوں کے مطالبہ آزادی کی تحسین کی گئی تھی اور اپنی طرف سے امداد و اعانت کا وعدہ تھا۔ اور ہر شخص کو جو ترکی رعیت یا ملازم ہو، حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت میں حصّہ لے۔

## یاغستان پہنچنے سے معذوری:

حضرت مولانا حسین احمدؒ فرماتے ہیں:

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات اور وثائق و تحریرات حاصل کرنے کے بعد حضرت نے یہ خواہش کی کہ آپ مجھ کو براہِ ایران یاغستان پہنچا دیں۔ جمال پاشا نے جواب دیا کہ ہم اس وقت اس سے عاجز ہیں۔ روس نے ایران کے راستہ کو اور انگریزوں نے عراق کے راستہ کو کاٹ دیا ہے۔ جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ دولت عثمانیہ (ترکی حکومت) اور افغانستان میں مواصلات نہ رہیں۔ ایران میں روسی فوجیں داخل ہوکر سلطان آباد پر جنگ کر رہی ہیں۔ اور عراق میں انگریزی فوجیں کوت العمارہ پر جنگ کر رہی ہیں۔ کوئی اطمینان بخش صورت ہمارے قبضہ میں نہیں ہے۔ آپ کو ہندستان ہی کے راستہ سے یاغستان جانا چاہیے۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ مجھے نہایت قوی خطرہ ہے کہ مجھے راستہ ہی میں انگریز گرفتار کرلیں گے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ پھر آپ حجاز ہی میں اپنا مرکز قائم کریں اور یہیں سے کارروائیاں عمل میں لائیں۔ (اس کے بعد حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں) اگر حضرت شیخ الہندؒ یاغستانی مرکز میں پہنچ جاتے تو قوی امید تھی کہ باوجود پسپائی اور شکستوں کے مرکز یاغستان منتشر ہونے نہ پاتا اور کسی نہ کسی صورت میں کسی جگہ قائم رہتا۔ مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔

یہ فرمان کس طرح صندوق کی دوہری تلی میں پیوست کر کے ہندستان پہنچائے گئے۔ پھر ان کے فوٹو لیے گئے اور ان کو افغانستان و یاغستان پہنچایا گیا۔ اور ہر ایک مرحلہ پر سی. آئی. ڈی کی کوشش کس طرح ناکام رہی۔ اس کی تفصیل نقش حیات کے حوالہ سے زیر عنوان 'تحریکِ انقلاب' حصّہ اوّل میں گزر چکی ہے۔ یہاں اعادہ غیر ضروری ہے۔ اب اس کے بعد کے واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

## مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ:

جو پیغامات اور فرامین حاصل کیے گئے تھے وہ ہندستان پہنچ چکے ہیں۔ پھر ان کے فوٹو یاغستان و افغانستان پہنچائے جا چکے ہیں۔ حضرت شیخؒ خود یاغستان نہیں پہنچ سکتے۔ انور پاشا اور جمال پاشا کا مشورہ ہے کہ حجاز ہی کو اپنا مرکز بنائیں۔ اب اس مرکز سے کارروائی کس طرح ہو۔ اس

سلسلہ میں غالب پاشا گورنر حجاز سے مشورہ ضروری تھا۔ جس کا ہیڈ کوارٹر مکہ اور موسم گرما میں طائف ہوتا تھا۔ لہٰذا آپ نے مکہ معظّمہ حاضری کا ارادہ فرمایا اور ۱۲ یا ۱۳ر جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ، ۱۷ر اپریل ۱۹۱۶ء میں اپنے رفقا کے ساتھ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوگئے۔

**مکہ معظمہ سے طائف:**

حضرت شیخ الہندؒ مکہ معظّمہ پہنچے تو غالب پاشا طائف جا چکے تھے۔ آپ نے چندروز مکہ میں قیام فرمایا۔ ۲۰ر رجب ۱۳۳۴ھ/۴ر مئی ۱۹۱۶ء کو طائف تشریف لے گئے۔ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد آپ کا ارادہ استنبول تشریف لے جانے کا تھا۔ لیکن دشواری یہ ہوئی کہ شتربان ایک ہفتہ کی مہلت لے کر جا چکا تھا۔ کوئی اور سواری دستیاب نہ ہوئی۔ حضرت شیخؒ نے دو تین روز بعد دوبارہ تاکید فرمائی۔ مگر اب بھی سواری مہیّا نہ ہوسکی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ سفرنامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ اس قدر تقاضا کیوں ہے۔ مگر دو تین روز بعد ہی معلوم ہوا کہ طائف دشمنوں کے محاصرہ میں ہے۔ گویا حضرت شیخؒ کی کشفی نگاہ نے ان واقعات کو دیکھ لیا تھا۔ جن کو ہم نہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر چونکہ اخفا کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ نیز مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ لہٰذا دو چار مرتبہ سواری تلاش کرنے کا تقاضہ کر کے خاموش ہوگئے۔

**عربوں کو کس طرح باغی بنایا گیا:**

کرنل لارنس کی تمام تبلیغ (یعنی ولولہ انگیز دھواں دار عربی تقریروں) شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے خفیہ معاہدوں کے باوجود غالباً عام باشندگان حجاز ترکوں سے بغاوت پر آمادہ نہیں تھے۔ تو ان کو باغی بنانے کے لیے ایک نہایت وحشت ناک اور انسانیت سوز طریقہ استعمال کیا گیا۔ اس کی تفصیل شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یہ ہے۔

(۱) غلّہ ملک حجاز سے بند کر دیا گیا۔ اوائل ماہ صفر ۱۳۳۴ھ میں آخری جہاز پہنچا۔ اس کے بعد غلّہ کی آمد ملک حجاز میں بند کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے سخت گرانی ہوگئی اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ اہلِ ہند کے سخت مطالبہ پر ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ میں کلکتہ سے فیروزی اگنبوٹ چاول وغیرہ کے چند ہزار بورے لے کر روانہ ہوا۔ اس کو جبراً عدن میں خالی کرا دیا گیا۔ اور وہ غلہ جدہ میں اس وقت پہنچا جبکہ ترکی حکومت کا اثر بالکل اُٹھ گیا تھا۔

(۲) اسی زمانہ میں بادبانی جہازوں کو جو بحر احمر میں افریقہ کے سواحل سے غلّہ لا کر جدہ مکہ معظّمہ اور حجاز کے اہالی کو پہنچاتے تھے اور لوگوں کو بھوک سے مرنے کے محافظ ہوتے تھے۔ انگریزی جہازوں نے ڈبونا اور لوگوں کو قید کرنا اور غلّہ چھیننا شروع کیا۔ اور اس طرح اہل عرب کے بہت سے بادبانی جہاز غارت کر دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے غلّہ کی آمد بالکل بند ہوگئی۔ اور لوگ بہت زیادہ پریشان ہوگئے۔ (رسالہ ترک موالات ص ۲۴)

(۳) دو برس سے زیادہ مدینہ منورہ محصور رکھا گیا۔ راستے بالکل بند کر دیئے گئے۔ ریل کی پٹری ڈائنامنٹ کے گولوں کے ذریعہ اُڑا دی گئی۔ غلہ بند کر دینے کی وجہ سے اس قدر شدّت لوگوں پر ہوئی کہ ہزاروں آدمی بھوک سے مر گئے۔ قبروں سے مردوں کو نکال کر لوگوں نے ان کا گوشت کھایا اور طرح طرح کے ناگفتنی آلام اٹھانے پڑے۔ (رسالہ ترک موالات ص ۲۴)

**طائف پر باغیوں کا حملہ:**

پہلے گزر چکا ہے کہ غالب پاشا سے ملاقات کے بعد حضرت شیخؒ جلد از جلد روانگی کا ارادہ فرما رہے تھے۔ مگر سواری مہیّا نہ ہونے کے باعث چندروز طائف میں رکنا پڑا۔ لیکن نیرنگی زمانہ نے دوسرا گل کھلا دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۱ر شعبان ۱۳۳۴ھ کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے زیر کمان عبداللہ بیگ طائف پر چڑھائی کی۔ لیکن شریف کی فوج میں عموماً غیر منظّم بدو تھے۔ جن کو ترکی فوج کے معمولی دستے نے پسپا کر دیا۔

اس سے دو دن پہلے مکہ معظّمہ، جدہ، ینبع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آ چکا تھا۔ کیونکہ شریف کا انتظام یہ تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ بغاوت ہو۔

جنگ چھڑ جانے سے آمدورفت بند ہوگئی۔ میوے، غلّے اور ترکاریاں سب بند ہوگئیں، شب وروز گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ترکوں کی مختصر سی جماعت شرف کی کثیر تعداد اور جدید سامان جنگ سے مسلح فوجوں کو تباہ کرتی رہی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ لیکن جب 'جدہ' پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انگریز کی مصری فوجیں مکہ معظّمہ کے قلعے اور قشلہ کو توپوں سے فتح کرتے ہوئے طائف پہنچیں۔ اور طائف کے چاروں طرف توپیں نصب کر کے گولہ باری شروع کر دی۔ رمضان المبارک کا سارا مہینہ اسی خوف وہراس، اضطراب اور بے چینی میں گزرا۔ خاص عید کے دن بھی انگریزوں اور شریف کی فوجوں نے مہلت نہیں دی۔ مسجد ابن عبّاس رضی اللہ عنہما جو طائف شریف کی سب سے

بڑی مسجد ہے۔اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھی اور کبھی کبھی گولیوں کی بوچھاڑ اتنی مہلت بھی نہ دیتی تھی۔لیکن اب طائف میں غلّہ ختم ہو چکا تھا۔لوگ فاقوں سے تنگ آ گئے تھے۔مجبوراً ترکوں سے نجات کی درخواست کی۔چنانچہ ان کو نکلنے کی اجازت دی گئی۔

۶ر شوال ۱۳۳۴ھ کو حضرت شیخؒ بھی مع اپنے تینوں رفقا کے طائف سے روانہ ہو کر ۱۰ر شوال کو مکہ معظّمہ پہنچے۔آپ کا ارادہ یہی تھا کہ کسی صورت سے آپ استنبول پہنچ جائیں۔لیکن افسوس تقدیر تدبیر پر غالب آئی۔آپ اسی مقصد سے جدہ تشریف لے گئے۔چونکہ مولانا خلیل احمد صاحب مکہ کی بدامنی کی وجہ سے مجبور ہو کر ہندستان کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔اور جہاز کی تلاش میں جدہ میں مقیم تھے تو حضرت شیخؒ کے اس سفر کا دوسرا مقصد مولانا سے ملاقات کرنا بھی تھا۔بہر حال حضرت شیخ الہندؒ نے تقریباً دو ہفتہ جدہ قیام فرمایا۔پھر مجبوراً مکہ معظّمہ واپس ہو گئے۔

اس سال ایک سی.آئی ڈی کا انسپکٹر مسمی بہاؤالدین خاص طور پر مکہ معظّمہ بھیجا گیا۔تاکہ حضرت شیخؒ کی نقل و حرکت کی تفتیش کرتا رہے۔

**خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی اور ترکوں کی تکفیر کا فتویٰ:**

شریف حسین کی بغاوت کے برخلاف جو بے چینی عام طور پر ہندستان میں تھی اس کو فرو کرنے کے لیے حکومت ہند نے تجویز کیا کہ خان بہادر صاحب موصوف کو خفیہ طور سے مکہ معظّمہ بھیج کر ایک فتویٰ منگایا جائے۔چنانچہ شریف کے عہدہ دار علما کی امداد سے خان بہادر صاحب نے استفتا اور اس کا جواب مرتب کرایا۔جس میں ترکی قوم کی مطلقاً تکفیر تھی۔سلاطین آل عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا۔اور شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا۔بہت سے شریفی علما نے اس پر دستخط بھی کر دیئے تھے۔لیکن علما کی کثیر تعداد متردد اور خائف تھی۔حضرت شیخؒ کے سامنے یہ فتویٰ پیش کیا گیا تو حضرت موصوف نے انکار کر دیا۔آپ کے انکار پر تمام حق پرست علما کی ہمّت بلند ہو گئی۔جو حضرات متردد اور خائف تھے ان سب نے دستخط سے انکار کر دیا۔

**گرفتاریاں:**

اس استفتا کا ایک مقصود یہ تھا کہ ہندستانیوں کے جذبات کو فرو کیا جائے مگر اہم مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو اس بہانہ مکہ شریف سے طلب کیا جا سکے گورنمنٹ کی یہ چال کامیاب رہی۔شریف حسین اور اس کے شیخ الاسلام اور بقیہ علما وغیرہ کے دل میں حضرت شیخؒ کی جانب سے غبار پیدا ہو گیا کہ آپ ہم لوگوں کو باغی اور خارجی کہتے ہیں۔

فتوے پر دستخط سے انکار کرنے کے بعد یقین ہو گیا تھا کہ شریف حسین اب کوئی الزام لگا کر خود قید کر دے گا۔یا انگریزوں کے حوالے کر دے گا۔چنانچہ ارادہ کیا تھا کہ شریف کی قلمرو سے باہر چلے جائیں۔مگر سواری وغیرہ میسر نہ آ سکی۔نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ نے ان حضرات کو شریف سے طلب کیا اور شریف نے گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔

حضرت شیخؒ کی راحت کی خاطر حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے شیخ الاسلام سے معافی بھی چاہی۔مگر سب نے بے سود رہی۔

رفقا حضرت شیخؒ نے اولاً طے کیا کہ حضرت شیخؒ اور مولانا وحید احمد صاحب کو کہیں چھپا دیا جائے۔پھر خفیہ طور سے کہیں باہر بھیج دیا جائے گا۔باقی اور حضرات کو اگر گرفتار بھی کیا گیا تو کچھ دنوں بعد چھوڑ دیئے جائیں گے۔چنانچہ اس پر عمل بھی کیا گیا۔مگر فائدہ نہ ہوا۔

**مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی گرفتاری:**

سب سے پہلے حضرت موصوف کو کوتوالی طلب کیا گیا اور انگریزوں کو بُرا کہنے کے جرم میں قید کر دیا گیا۔

**حضرت شیخ الہندؒ کے مقابلے میں انگریزی تعلقات کو ترجیح:**

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے متعلق خبریں شہر میں گشت کرنے لگیں تو دہلی کے تاجر صاحبان شریف کے پاس پہنچے اور رحم کی درخواست کی۔مگر شریف نے جواب دیا کہ: ''ہماری انگریز سے دوستی نئی ہے۔ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ضروری ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ اس میں رخنہ پیدا ہو۔''

**حاضر کرو، ورنہ گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے:**

۲۲ر صفر دوشنبہ کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب گرفتار کر لیے گئے۔حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا وحید احمد صاحب چھپا دیئے گئے۔مولانا عزیر گل صاحب اور مولانا حکیم نصرت حسین صاحب سامنے ہیں۔ان دونوں سے حضرت شیخؒ کا پتہ دریافت کیا گیا۔ان حضرات نے لاعلمی ظاہر کی تو گرفتار کر لیے گئے۔شام تک پولیس نے سب جگہ حضرت شیخؒ کو تلاش کیا مگر نا کام رہی۔

**گولی سے اُڑا دو، اور کوڑے لگواؤ:**

مغرب کے بعد شریف نے حکم دیا کہ اگر عشا تک مولانا محمود الحسن

صاحب حاضر نہ ہوں تو ان کے دونوں رفیق (مولانا عزیر گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب) کو گولی سے اُڑادو۔ ان کے مطوف کی مطوفیت چھین لو۔ اور سوکوڑے لگاؤ۔

حضرت شیخ الہندؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ ''مجھے گوارا نہیں کہ میرے باعث میرے کسی دوست کا بال بیکا ہو۔''

چنانچہ عشا کے قریب حضرت شیخؒ خود تشریف لے آئے۔ احباب نے اصرار کیا کہ احرام باندھ لیجیے۔ تا کہ یہ کہا جا سکے کہ احرام باندھنے کے لیے حرم سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت کو فوراً زیرِ حراست لے لیا گیا۔ ساٹھ اونٹوں پر سوار کرا کر مسلح گارڈوں کی حفاظت میں جدہ روانہ کر دیا گیا۔ حضرت شیخؒ احباب سے ملاقات فرما رہے تھے اور ارشاد فرماتے تھے:

''الحمد اللہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے۔''

مولانا حسین احمدؒ صاحب چونکہ جیل خانہ میں تھے۔ آپ کو ان واقعات کا علم صبح کو ہوا۔ جب احباب ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔

مولانا حسین احمد صاحب سے آپ کے احباب نے فرمایا کہ ہم نے آپ کی رہائی کی بہت کوشش کی مگر چونکہ شریف بہت خفا ہے۔ اس لیے کم از کم آٹھ دس روز آپ کو جیل میں رہنا پڑے گا۔

مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا۔ میں مدینہ طیبہ سے حضرت مولانا کی خدمت کے لیے آیا ہوں۔ اگر مولانا کو ہندستان کے بجائے کہیں اور بھیجا گیا تو حضرت مولانا کی خدمت میں میرا رہنا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح ممکن ہو مجھ کو مولانا کے پاس بھجوا دیجیے۔ انھوں نے کہا یہ تو بہت آسان ہے۔ ہم ابھی شیخ الاسلام سے جا کر کہتے ہیں کہ ''مادہ فساد کا باقی رکھنا مناسب نہیں۔'' مولانا حسین احمد صاحب کو بھی مولانا محمود الحسن صاحب کے پاس ہی پہنچا دینا چاہیے۔ چنانچہ ظہر کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا حسین احمد صاحب کو بھی جدہ کا حکم ہوا ہے۔ اور پھر اگلے روز خچر پر سوار کرا کر جدہ روانہ کر دیا گیا۔

## جدہ سے روانگی:

ان حضرات کو جدہ میں ایک ماہ قیام کرنا پڑا۔ کیونکہ 'معتمد برطانیہ' کرنل ولسن کہیں باہر چلا گیا تھا۔ واپس ہوا تو حکم ہوا کہ ان حضرات کو مصر روانہ کیا جائے۔

چنانچہ ۱۸/ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲/جنوری ۱۹۱۷ء کو خدیوں اگنبوٹ پر سوار کرا کر مصر روانہ کر دیا گیا۔ ۲۲/ربیع الاوّل مطابق ۱۶/جنوری کو اگنبوٹ سویز پر پہنچا۔ وہاں تقریباً ڈیڑھ درجن گوروں کی مسلح گارڈ کی حراست میں ان حضرات کو قاہرہ تک پہنچا دیا گیا۔ اور وہاں سے 'خیرہ' (جو قاہرہ کے مقابل دریائے نیل کی دوسری جانب واقع ہے) پہنچا دیا گیا۔ جہاں سیاسی جیل خانہ بنایا گیا تھا۔ اس جیل خانہ میں تقریباً دو سو سیاسی قیدی مختلف ممالک کے اور بھی تھے۔ جن میں بیشتر مسلمان تھے۔

اگلے روز صبح کو ان حضرات کو شہر میں لے گئے۔ جہاں جنگی دفتر اور مرکز تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو ایک علیحدہ کمرے میں کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس میں تین انگریز موجود تھے۔ جن میں دو انگریز نہایت صاف اُردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

ان کے پاس گورنمنٹ ہند کے بھیجے ہوئے کاغذات کا ایک فائل تھا۔ جس میں سب حضرات کے متعلق رپورٹ تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی ڈائری بہت زیادہ تھی۔ اتفاق سے حضرت شیخ الہندؒ کو کچھ پیشاب کا تقاضا بھی تھا، کچھ رفقا کی تنہائی کا خیال اور مزید برآں انگریز سے طبعی نفرت۔ ان تمام چیزوں نے حضرت کے لب ولہجہ میں خاص طور پر سختی پیدا کر دی تھی۔ اس وقت بہت سے سوالات کیے گئے۔ جن کے جوابات حضرت شیخؒ نے اکھڑے طور پر نہایت بے التفاتی سے دیئے۔ ایک ہندستانی کی یہ بے پروائی اور یہ طرز خطاب انگریز کی نظر میں حیرت ناک تھا۔ چنانچہ حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم سے شکایت بھی کی گئی کہ غالباً مولانا کو کبھی حکام سے سابقہ نہیں پڑا۔

ہم ذیل میں 'سفرنامہ اسیر مالٹا' سے ان سوالات اور جوابات کو بجنبسہ نقل کرتے ہیں۔ یہ سوالات اور جوابات بذات خود حضرت شیخ الہندؒ کی تاریخ ہیں:

سوال: آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا؟

جواب: اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر۔

سوال: آپ نے اس پر دستخط کیوں نہ کیے؟

جواب: خلاف شریعت تھا۔

سوال: آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندستان میں پیش کیا گیا۔

جواب: ہاں!

سوال: پھر آپ نے کیا کیا؟

جواب: رد کردیا۔
سوال: کیوں؟
جواب: خلافِ شرع تھا۔
سوال: آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں؟
جواب: ہاں!
سوال: کہاں سے؟
جواب: انھوں نے دیوبند میں عرصہ دراز تک مجھ سے پڑھا ہے۔
سوال: وہ اب کہاں ہیں؟
جواب: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں مقیم ہوں۔
سوال: ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے؟
جواب: مجھے کچھ علم نہیں، نہ میں نے دیکھا ہے۔
سوال: وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلافِ برطانیہ شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کماندار ہیں؟
جواب: اگر وہ لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کمانداری میری جیسی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ اور پھر عمر کا اندازہ کیجیے۔ میں نے تمام عمر مدرسی میں گزاری۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا نسبت۔
سوال: مولوی عبیداللہ صاحب نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟
جواب: مدرسہ کے مفاد کے لیے۔
سوال: پھر کیوں علیحدہ کیا گیا؟
جواب: آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔
سوال: کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر نہیں تھا؟
جواب: نہیں۔
سوال: غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟
جواب: غالب نامہ کیسا؟
سوال: غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے۔ اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا ہے؟
جواب: مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیق سفر تھا۔ مدینہ منورہ سے وہ مجھ سے جدا ہوا ہے وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مدینہ منورہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے۔ جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں۔
سوال کرنے والا: محمد میاں صاحب کے پاس۔
حضرت شیخ: مولوی محمد میاں کہاں ہیں؟
سوال کنندہ: وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔
مولانا: پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا۔
سوال کنندہ: لوگوں نے دیکھا۔
مولانا: آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی۔ میرا وہاں تک کہاں گزر ہوسکتا ہے۔ پھر میں ناواقف شخص نہ زبان ترکی جانوں، نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط، حج سے چند دن پہلے مکہ معظّمہ پہنچا۔ اپنے امور دینیہ میں مشغول ہوگیا۔ غالب پاشا اگرچہ حجاز کا گورنر تھا۔ مگر طائف میں رہتا تھا۔ میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہوسکتی تھی نہ بعد از حج۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ کسی نے یونہی اڑائی۔
سوال: آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی۔
جواب: بے شک۔
سوال: کیوں کر؟
جواب: وہ مدینہ منورہ میں ایک دن کے لیے آئے تھے تو صبح کے وقت انھوں نے مسجد نبوی میں علما کا مجمع کیا۔ مجھ کو بھی مولوی حسین احمد صاحب اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے اور اختتام مجمع پر انھوں نے دونوں وزیروں سے مصافحہ کرادیا۔
سوال: آپ نے اس مجمع میں کوئی تقریر کی؟
جواب: نہیں۔
سوال: مولانا خلیل احمد صاحب نے کی؟
جواب: ہاں۔
سوال: پھر کچھ انور پاشا نے آپ کو دیا۔
جواب: ہاں اتنا ہوا ہے کہ مولوی حسین احمد صاحب کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لے کر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے۔
سوال: پھر آپ نے کیا کیا؟
جواب: مولوی حسین احمد صاحب کو دیئے تھے۔
سوال: ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ترکی۔ ایران اور

افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں۔ اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندستان پر کرا کے ہندستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں۔ اور انگریزوں کو ہندستان سے نکالنا چاہتے ہیں؟

جواب: میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے اتنے دن گزر چکے ہیں۔ کیا آپ گمان کر سکتے ہیں۔ کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اور کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرے جیسا شخص زائل کر سکتا ہے۔ اور پھر اگر زائل بھی ہوجائیں، تو کیا ان میں ایسی طاقت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندستان کی حدود پر فوجیں پہنچا دیں۔ اور اگر پہنچا بھی دیں، تو آیا ان میں آپ سے جنگ کی طاقت ہوگی۔

سوال کرنے والا: فرماتے تو آپ سچ ہیں۔ مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔

سوال: شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: وہ باغی ہے۔

سوال: حافظ احمد صاحب کو آپ جانتے ہیں؟

جواب: 'خوب' وہ میرے استاد زادے ہیں۔ اور بہت سچے اور مخلص دوست ہیں۔ میری تمام عمران کے ساتھ گزری ہے۔

اس قسم کے اور بھی سوالات کیے۔ جن کے جوابات اسی نوعیت کے تھے۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کو رفقا سے الگ، اندرون جیل خانہ تنگ و تاریک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ جس میں روشنی کے لیے پشت کی دیوار میں چھت کے قریب ایک روشن دان تھا۔ کواڑ لکڑی کے تھے مگر ان میں سوراخ نہیں تھا۔ پاخانہ پیشاب وغیرہ کے لیے ایک بالٹی رکھ دی جاتی تھی۔ اور ایک صراحی۔

اگلے روز حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اظہار ہوئے اور دو روز تک ہوتے رہے پھر مولانا عزیر گل صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب، مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کے بیانات لیے گئے۔

بیانات کے بعد ہر ایک کو کال کوٹھری میں بند کیا جاتا رہا۔ ایک گھنٹہ کے لیے ان کوٹھریوں میں سے نکال کر باہر صحن میں ٹہلاتے تھے۔ مگر یکے بعد دیگرے۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک آپس میں ایک دوسرے کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے بعد ٹہلانے کا وقت ایک ہی کر دیا گیا۔ جس کے باعث آپس میں ملاقات کر سکتے تھے۔ اس عرصہ میں ہر ایک کو یقین ہو گیا تھا کہ پھانسی کا حکم ہوگا۔

مگر بہ ظاہر ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔ لہٰذا پھانسی سے نجات ملی۔ اور مالٹا جانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ ۲۳/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵/فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ جو سیاسی اور جنگی قیدیوں کا مرکز تھا۔ اور جہاں صرف ایسے فوجی افسروں یا سیاسی اسیروں ہی کو بھیجا جاتا تھا جو بہت خطرناک اور اپنے خیالات پر نہایت سخت اور پختہ ہوتے تھے۔ اور کسی قسم کی طمع ان پر کوئی اثر نہ کر سکتی تھی۔ ۲۹/ربیع الثانی مطابق ۲۱/فروری کو یہ حضرات مالٹا پہنچے۔ شام کے وقت ان کو اس لیے اُتارا گیا کہ شہر والے دیکھیں اور خوش ہوں۔ کیونکہ وہ سب عیسائی تھے۔

**مراعات کا حکم:**

غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ایک روز حضرت شیخؒ کو آفس میں بلایا گیا۔ کمانڈر نے کہا کہ ہمارے پاس خاص طور سے آپ کے متعلق یہ حکم آیا ہے کہ آپ کی پوری طرح خاطر داری کریں۔ لہٰذا جو کپتان فوج کے حقوق و مراعات ہوتے ہیں وہی آپ کے بھی ہوں گے۔ نیز آپ کو جن چیزوں کی شکایت ہو، ان سے مطلع کریں۔ وغیرہ۔

**رِہائی:**

۲۳/جمادی ثانی ۱۳۳۸ھ (۱۲/مارچ ۱۹۲۰ء) جمعہ کے دن حضرت شیخ الہندؒ بمع اپنے رفقا سرکاری حفاظت میں مالٹا سے روانہ کیے گئے۔ سرکاری نگرانی اور حفاظت ہی میں 'سیدی بشر' میں اٹھارہ روز اور سویس میں پونے دو ماہ قیام کرتے ہوئے۔ ۲۰/رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۸/جون ۱۹۲۰ء) کو یہ حضرات بمبئی میں وارد فرما ہوئے۔ اور اس وقت معلوم ہوا کہ یہ آزاد ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ ابھی جہاز ہی میں تھے کہ سرکاری مولوی ''مولوی پورے بخش'' حضرت شیخ الہندؒ اور خیر خواہانہ جذبات کے ساتھ درخواست کی کہ حضرت شیخؒ ہندستان کے سیاسی جھگڑوں میں شرکت نہ فرمائیں۔ کمزوری کا آخری زمانہ عافیت کے ساتھ یاد خدا میں بسر کریں۔ نیز یہ کہ بمبئی اترتے ہی مولانا دیوبند روانہ ہوجائیں۔ خلافت والوں کے ہاتھ نہ پڑیں۔ مگر وہاں تو بقول شخصے:

یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

یہ سیاسی جھگڑا ہی رگ جان تھا۔ مرض وفات میں کئی مرتبہ فرمایا کہ اچھا ہوجاؤں گا تو اس تحریک کے لیے پورے ہندستان کا دورہ کروں گا۔ □□

# شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی زندگی مبارک کے مختصر حالات

**ولادت باسعادت:**

۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ ۱۱ بجے سہ شنبہ برج قمر بمقام قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ تاریخی نام چراغ محمد آبائی وطن موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ، ضلع فیض آباد۔

**سلسلہ نسب:**

آپ حسینی سیّد ہیں، آپ کا خاندان تقریباً انیس پشت پیشتر ہندستان میں آیا۔ والد ماجد حضرت سیّد حبیب اللہ صاحب، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ راشد تھے۔

۱۳۰۹ھ میں جبکہ عمر مبارک بارہ سال تھی آپ کو دیوبند، سیّدنا شیخ الہند قدس اللہ سرۂ العزیز کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ یعنی ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کیا گیا۔

حضرت شیخ الہند قدس سرۂ العزیز کی فراست کاملہ نے اس سعادتِ عظمیٰ کو پہچان لیا۔ جس کے آثار بشرہ مبارک سے نمایاں تھے۔

مخصوص شفقت کے ساتھ اپنی اولاد کی طرح تربیت شروع فرمائی۔ اپنی نگرانی میں رکھا۔ اور باوجود یہ کہ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرۂ العزیز کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی خارجی اوقات میں کسی کتاب کے درس کا موقع نہ دیتے تھے۔ مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو بہت سی ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں۔

اس شاگرد رشید کی نیازمندی، سعادت اور ایثار کی بھی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں سے کسی نے فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرادو۔ بھنگی نہیں ملا۔ مگر نالی صاف ہوکر دُھل بھی گئی۔ معلوم ہوا کہ حسین احمد نے اپنے ہاتھ سے کیچڑ کو صاف کیا تھا۔ (بروایت مولانا جلیل احمد صاحب کیرانوی خادم حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرۂ العزیز (استاذ دارالعلوم دیوبند)

صرف سات سال کے عرصہ میں جملہ علوم متداولہ سے فارغ ہوکر قطب العالم امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرۂ العزیز سے بیعت بھی ہوگئے۔ ۱۳۱۶ھ میں والد ماجد قدس اللہ سرۂ العزیز نے جملہ اہل وعیال سمیت بغرض ہجرت، بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا تو آپ بھی ان کی رفاقت میں حجاز مقدس تشریف لے گئے۔

امام ربانی مولانا گنگوہی قدس اللہ سرۂ العزیز نے مراحل سلوک طے کرنے کے لیے اپنے شیخ مرشد یعنی سیّدنا حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس اللہ سرۂ العزیز مہاجر مکی کی خدمت میں حاضری کا ایما فرمایا۔ چنانچہ مکہ معظّمہ پہنچ کر مراحل سلوک حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرۂ العزیز کی زیر تربیت طے کیے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چند ماہ حاضر رہ کر دار ہجرت یعنی مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ جس سے چند ماہ بعد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداداللہ صاحب نے رحلت فرمائی۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب نے جوار رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر وہ تمام فیوض حاصل کیے۔ جو ایک باخدا انسان اس مجمع الجود والکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار مبارک سے حاصل کرسکتا ہے۔

**دور ابتلا:**

یہ پورا گھرانا مدینہ طیبہ پہنچا تو رہائش کے لیے ایک مدنی صاحب نے مکان دے دیا۔ اور انھیں صاحب کے مدرسہ میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے بصورت ملازمت تدریس شروع کردی۔

لیکن پھر کچھ ناگواریوں کی بنا پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو یہ تعلّق منقطع کرنا پڑا۔ اور مدنی صاحب موصوف نے مکان بھی خالی کرالیا۔ اس عرصہ میں جو کچھ اثاثہ والد صاحب کے پاس تھا وہ بھی ختم ہونے لگا۔ اور فاقہ کی نوبت آنے لگی۔ تب حضرت والد صاحب نے اپنی تمام اولاد کو مخاطب کرکے فرمایا: میں مدینہ طیبہ میں ہجرت کرکے حاضر ہوا ہوں۔ آپ محض زیارت بیت اللہ کے لیے آئے تھے۔ جس سے فارغ ہوچکے۔ اب یہاں بسر اوقات کی بظاہر کوئی شکل نہیں۔

اس وقت کچھ تھوڑی بہت رقم اتنی ہے کہ آپ کسی صورت سے ہندستان پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا میری رائے یہی ہے کہ آپ سب اپنے وطن چلے جائیں۔ میں یہاں مقیم رہوں گا۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب اور جملہ متعلقین نے جواب دیا۔ خداوند عالم رزاق ہے۔ ہم فقر و فاقہ سے نہیں گھبراتے، شکم پری کی اگر کوئی صورت نہ ہو تو درختوں کی پتیاں کھاکر بھی اس سرزمین پاک میں زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ مگر ظل ہمایوں سے مفارقت گوارا نہیں۔

لیکن جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار کیا تھا: فرمایا تھا۔ "اگر تمھیں

میرے سے محبت ہے تو فاقہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جو جھول کی طرح تمھیں گھیر لے گا۔''

اس خاندان پر بھی فاقہ جھول بن کر آیا۔ چنانچہ متواتر چند ماہ اس حالت میں گزرے کہ ایک وقت میں تھوڑی سی مونگ کی دال میسر آتی تھی۔ جس کو پکا کر گھر کے سب آدمی تھوڑی تھوڑی پی لیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔ اس وقت اس گھرانے کے افراد کی تعداد تیرہ تھی۔ اور سب اس دور ابتلا میں اس قدر صابر وشاکر تھے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب نے حرم اطہر میں درس دینا شروع کر دیا تھا۔ اسی فاقہ میں صبح سے شام تک درس کا مشغلہ جاری رہتا۔

**پابندی اصول:**

اس خاکسار کے مشفق کرم فرما حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم تھے۔ جہاں یہ نیاز مند تقریباً سولہ سال مدرس رہا۔ ان کا بچپن مدینہ منورہ میں گزرا تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب ترکی فوج سے پنشن یافتہ مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ان کی تعلیم کے لیے ان کے والد صاحب نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو منتخب کیا۔ چنانچہ مولانا کی خدمت میں ٹیوشن کی پیشکش کی۔ مولانا نے ٹیوشن پڑھانے سے انکار فرما دیا۔ والد صاحب کا اصرار یہ تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب بطور حق الخدمت کچھ منظور فرمائیں۔ اور مولانا کو اس سے سخت انکار دونوں طرف اپنی اپنی رائے پر اصرار رہا اور اسی میں چھ مہینے گزر گئے۔ آخر کار مولانا کا اصرار بالا رہا۔ والد صاحب نے بلا معاوضہ شرط منظور فرمائی اور مجھے حضرت مولانا کے حوالہ کر دیا۔ حضرت مولانا کی یہ خودداری عین اس زمانہ میں تھی جب افلاس کا دور دورہ تھا۔ اور اخفا اور پردہ داری کا یہ عالم تھا کہ باوجود یہ کہ تعلّقات بہت قریب تھے۔ حضرت مولانا کے والد رحمۃ اللہ اور ڈاکٹر صاحب کے آپس میں بھی یگانگت تھی۔ مگر اس فاقہ کشی کا انکشاف کسی طرح اس وقت ہوا جب یہ دور ختم ہو چکا۔ اور افلاس کے بجائے خوش حالی کا نمود ہوا۔

عجیب حقیقت یہ ہے کہ عمر مبارک ہنوز تقریباً اکیس سال تھی یعنی خاص دور شباب ونشاط تھا۔ جس میں یہ اصول کی پابندی تھی۔

**تعمیر مکان میں سنت نبوی کی اتباع:**

جبکہ مکان خالی کرا لیا گیا۔ اور مدینہ طیبہ میں سب حضرات کے قیام کا ارادہ ہوا تو شہر سے باہر ایک قطعہ زمین لے لیا گیا۔ عورتوں، بچوں اور مردوں نے مل کر اپنے ہاتھ سے اینٹیں پاتھیں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تعمیر کیں۔ جن کی چھت بقول مولانا عبدالحق صاحب مدنی اتنی نیچی تھی کہ چارپائی پر کھڑے ہونے سے سر میں لگتی۔ یعنی اس طرح رہائش کے سلسلہ میں بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر عمل ہوا۔ زہے قسمت:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

مولانا عبدالحق صاحب مدنی کا بیان ہے کہ اس ابتلا کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا کہ حضرت شیخؒ اور آپ کے بھائیوں نے ایک عالی شان مکان مدینہ طیبہ میں حرم اقدس کے قریب تعمیر کرایا۔

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موصوف کے کچھ حالات تذکرۃ الرشید جلد دوم مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھیؒ کے الفاظ میں پیش کیے جائیں۔ یہ بیان اس لیے اہمیت رکھتا کہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب سیاسی مسلک میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شدید اختلاف رکھتے تھے اور جمعیۃ علما کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا حسین احمد صاحب نے ۱۳۱۶ھ میں حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب سے بیعت ہو کر والد اور برادران کے ہمراہ جدامجد کے بلدہ طیبہ (مدینہ منورہ) میں اقامت اختیار کی۔ مکہ معظّمہ پہنچ کر حسبِ اجازت امام ربانی قدس سرہٗ۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب سے رجوع کیا۔ اور اذکار تعلیم فرمودہ قطب العالم پر بھی بہمت تمام کاربند رہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ واردات عجیبہ و کیفیات غریبہ ظاہر ہوئیں ان کی اطلاع گنگوہی میں آستانہ علیہ پر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۱۸ھ میں حضرت کا والا نامہ پہنچا کہ چند روز کے واسطے گنگوہ آکر مجھ سے مل جاتے تو بہتر ہوتا۔ اس فرمان والا شان پر مطلوب بن کر باوجود تنگدستی و بے سروسامانی کے مراجعت ہندستان کا تہیّہ کر لیا۔ باپ کا باقتضائے محبت جی چاہا کہ بھائیوں میں سے کوئی ایک رفیق سفر ہوتا تو اچھا تھا۔ چھوٹے بھائی مولوی سیّد احمد صاحب جو ان کے دو چار مہینے آگے پیچھے سلسلہ حدام میں داخل ہوئے تھے۔ غلبہ شوق کے سبب فرضی ضروریات ذاتی وخانگی قائم کر کے باپ سے ہمراہی برادر کی اجازت بھی لے چکے۔ مگر قدرت کو منظور ہی کچھ اور تھا۔ بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب در پردہ خفیہ انتظام کر کے چھپ کر چند روز پہلے روانہ بھی ہو لیے۔ جس کی اطلاع بارہ گھنٹے بعد قریب مغرب ہوئی۔ مجبوراً مولانا سیّد

احمد صاحب کو ارادہ فسخ کرنا پڑا۔ اور مولانا حسین احمد صاحب تنہا روانہ ہوئے۔ جدہ میں دونوں بھائی مل گئے اور حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر گنگوہ پہنچے۔ چند روز گزرے تھے کہ امام ربانی نے ایک ایک جوڑا یعنی ملبوس کرتہ اور پائجامہ دونوں بھائیوں کو عطا فرمایا۔ چونکہ اس میں ٹوپی یا عمامہ نہ تھا۔ اس لیے دونوں میں سے کسی صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ ارشاد ہوتو ہم خدام اپنا اپنا عمامہ حاضر کریں۔ اپنے دست مبارک سے عطا فرمادیا جائے۔ یہ سن کر حضرت نے سکوت فرمایا اور بمقتضائے ادب دونوں بھائی عطیہ قطب العالم کو سرآنکھوں پر رکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے اُٹھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں صاحب بلائے گئے اور حکم ہوا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ اور جب دونوں صاحبوں نے اپنے عمامے حاضر کیے تو حضرت امام ربانی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھ کر ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟

مولانا محمد صدیق صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ 'دستار فضیلت' ارشاد ہوا۔ 'دستار خلافت' امام ربانی قدس سرہٗ کی قولی وفعلی خلافت کے مجموعہ کے مثال میں آپ کے خلفاء کے اندر صرف یہی دو حضرات پیش کیے جاسکتے ہیں جن کے کمالات علمیہ وعملیہ اسی سے ظاہر ہیں کہ مدنی مہاجر اور بطحائی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پڑوسی ہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کا درس بحمداللہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت وجاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علما کو کیا معنی یمنی اور شامی بلکہ مدنی علما کو بھی وہ بات حاصل نہیں۔ ذالک اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔ آپ سرتاپا خلق، مہمان نواز، غیور، باحیا، اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔

(ص ۱۵۸ تا ص ۱۵۹ تذکرۃ الرشید)

مختصر یہ کہ زائد سے زائد ۲۲ سال کی عمر ہے کہ چشمہ رشد وہدایت خود سے ساقی کو بلاکر خلافت صادقہ کا خلعت عنایت فرمادیتا ہے۔ زہے قسمت۔

۱۳۱۸ھ کے مذکورہ بالا سفر کے بعد ۱۳۲۶ھ تک مسلسل جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام رہا۔ حرم پاک میں حلقہ درس روز افزوں ترقی کررہا تھا۔ اور آپ صحاح ستہ اور تفسیر وفقہ کی بڑی بڑی کتابوں کے تقریبا ۱۵ اسبق روزانہ پڑھاتے تھے۔ نماز صبح کے بعد سے سلسلہ درس شروع ہوکر عشا کے بعد تک رہتا۔ آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کرکے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ اور شیخ الحرم کے خطاب سے آپ مشہور ہوگئے تھے۔

## دیگر ممالک کا سفر اور ترکی زبان سے واقفیت:

آپ نے ایک مکتوب میں (جو طالوت صاحب کے نام ہے۔ جو فتنہ قومیت کے زیر عنوان آپ ملاحظہ فرمائیں گے) تحریر فرمایا ہے:

''میں ہندستان سے باہر تقریباً سترہ سال رہا ہوں۔ عرب، شام، فلسطین، افریقہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں رہنا ہوا۔ ہر ملک کے باشندوں سے ملنا جلنا، بیٹھنا اٹھنا ہوا۔ جرمن، اسٹرین، بلگیرین، انگریز، فرانسیسی، آسٹریلین، امریکی، روسی، چینی، جاپانی، ترکی، عربی وغیرہ وغیرہ۔ مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ سالہا سال ملنا، جلنا نشست وبرخاست کی نوبت آئی۔ اگر یہ لوگ عربی یا ترکی یا فارسی یا اُردو سے واقف ہوتے تھے تو بلا ترجمان، ورنہ بذریعہ ترجمان گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ سیاسی مسائل اور مذہبی امور زیر بحث رہتے تھے۔ (مکتوب نمبر ۴۲ جلد سوم۔ مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱۲۶ تا ۱۲۷)

جہاں تک جرمنی، آسٹریا وغیرہ کے لوگوں سے ملاقاتوں کا تعلق ہے۔ تو بظاہر یہ ملاقاتیں مدینہ منورہ میں اور مالٹا میں ہوئیں۔ اور مالٹا اور مصر کا سفر بسلسلہ حراست واسارت ہوا کہ پہلے کچھ دنوں مصر رکھا گیا۔ پھر مالٹا بھیجا گیا۔ لیکن شام، فلسطین اور افریقہ کا سفر کب ہوا اور کیوں ہوا؟ یہ ان سطور سے معلوم نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ سفر اسی زمانہ میں ہوا۔ جب آپ مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ ان ممالک کے طلبہ اور زائرین آپ سے مدینہ منورہ میں استفادہ کرتے تھے۔ بظاہر انھیں حضرات کی دعوت پر آپ شام، فلسطین اور افریقہ تشریف لے گئے۔ اور کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا۔ اور جن سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی وہ بظاہر مسلم ممالک کے اتحاد سے متعلق تھے۔ اسی سے سفر کے مقصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ بظاہر اسی زمانہ میں آپ نے ترکی زبان سیکھی۔ تقریباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ گورکھپور میں ایک تقریر میں آپ نے سیاسی مخالفین کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ اگر انگریزی زبان جانتے ہیں تو اس لیے کہ ان کی حکومت کی زبان انگریزی ہے تو ہمارے یہاں (مدینہ منورہ میں) ترکوں کی حکومت تھی۔ ہم ترکی زبان سے واقف ہیں۔

۱۳۲۶ھ میں آپ دوبارہ ہندستان تشریف لائے۔ جمعیۃ الانصار، موتمر الانصار، اور دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی آپ کی جدوجہد کے رہینِ منت ہوا۔ تین سال بعد آپ دوبارہ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اگلے سال یعنی ۱۳۳۰ھ میں آپ پھر ہندستان تشریف لائے اور چند ماہ قیام فرماکر واپس مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہی زمانہ تھا جبکہ انقلاب کی خفیہ تحریکیں ہندستان میں جاری

تھیں۔ اور جنگ یورپ کا میدان تیار ہو رہا تھا۔

حضرت مدنی ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''تحریکات آزادی ہند میں ۱۹۱۴ء سے شریک ہوں۔ اور اس کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ پہلے میں تشدد والی انقلابی پارٹی میں شریک تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ ہمارے امام تھے۔ اسی سلسلہ میں مالٹا کی اسیری کا واقعہ پیش آیا۔'' (مکتوب نمبر ۱۳۳، ج اصفحہ ۹۷ و مکتوب ۳۶ جلد دوم ص ۱۵۲)

## ۱۹۱۴ء والی جنگ یورپ مولانا کی نظر میں:

یہ جنگ بظاہر دو رقیب ملکوں کی جنگ تھی۔ روس، فرانس اور جرمنی کی رقابت پرانی تھی۔ برطانیہ فرانس کا مددگار تھا۔ ترکوں نے جرمنی کی حمایت کی تو وہ بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔ اب ایک طرف فرانس، روس اور برطانیہ ہو گئے۔ ان دول ثلاثہ (تینوں حکومتوں) کو دول متحدہ یا اتحادی بھی کہا جاتا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ جنگ سیاسی ہے، مذہبی نہیں ہے۔ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں۔ ہم نے انھیں مجبور نہیں کیا۔ ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جدہ، مکہ، مدینہ منورہ اور بغداد وغیرہ پر بمباری نہیں کریں گے۔

لیکن یہ صرف اس کا ظاہری رُخ تھا۔ حقیقت اس کے خلاف تھی۔ حضرت مولانا کی نظر میں پس پردہ یورپ کی بڑی طاقتوں کا وہ بغض وعناد تھا جو ترکوں سے چلا آ رہا تھا جس کی بنا پر منصوبہ یہ تھا کہ ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور اس کے تمام مقبوضات آپس میں تقسیم کر لیے جائیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ابھی تک اس نے (ترکی حکومت نے بلقان کے تباہ کرنے والے صدموں سے سنبھالا نہیں لیا تھا کہ ایک خونخوار بلا ناگاہ اس پر آدھمکی۔ دشمن جو مدتوں سے تقسیم ترکی کی فکر میں تھے موقع مناسب دیکھ کر وقت کو غنیمت سمجھنے لگے۔ عراق میں مدتوں کی سازشیں۔ سوریہ میں سالہا سال کی ریشہ دوانیاں، حجاز میں برسوں کی خفیہ کوششیں۔ آرمینیا میں قرنوں کی ظاہر اور پوشیدہ کارروائیاں، پیٹر اعظم کی قدیم وصیتیں، فرانس اور گلینڈ سٹون کی قلبی خواہشیں پھول اور پھل لانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اس ایک زبان اسلام پر بتیس مسیحی دانتوں سے خوب زور آزمائی کی گئی۔ ہر ایک نے طرح طرح کی دھمکیوں اور قسم قسم کی قوتوں سے اس کو دبانا شروع کیا۔ اس کے بنے بنائے مکمل ڈیڈ رنات (جنگی جہاز) جن کو اس نے اپنے خون سے بنوایا تھا۔ اپنی قوم پر فاقے گوارا کر کے جیبوں سے کروڑ ہا پونڈ نکلوا کر تیار کرائے تھے۔ برطانیہ نے عمداً چھین لیے پھر ہر محاذ پر قوت جنگی جمع کر دی۔

## عرب باغی اور اہلِ مدینہ وفادار:

ترکوں کے خلاف منصوبہ کا ایک جزو تھا۔ ''عربوں کی بغاوت ترکوں کے خلاف'' چنانچہ عربوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا گیا۔ اور موقعہ بموقعہ اس کو بڑھایا گیا۔ اب اس جنگ کے زمانہ میں خدا جانے کتنے انگریز ہوں گے جو تقریروں اور تحریروں سے عربوں کے جذبہ قومیت کو اُبھار رہے ہوں گے۔ ان میں کرنل لارنس زیادہ مشہور ہے جس نے اسلام قبول کر کے اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ فصیح عربی میں اس کی شعلہ بار تقریریں عربوں کو مسخر کر لیتی تھیں۔ بہر حال یہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ عربوں میں ترکوں کے خلاف جذبات پیدا ہو گئے۔ 'شریف مکہ' کی بغاوت اسی کا کڑوا پھل تھا۔ لیکن عجیب ماجرا تھا کہ باشندگان مدینہ منورہ آخر تک ترکوں کے وفادار رہے۔ ان کی وفاداری ناقابل برداشت تھی۔ ان پر غلہ بند کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہزاروں مجاور فاقہ کشی کرتے ہوئے واصل فق ہوئے۔

غیر مناسب نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس موقع پر تحقیق کریں کہ یہ وفادار کیوں رہے؟ ہمارے غور وفکر کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ان کی وفاداری کا راز وہ اعتماد تھا جس کا محور حضرت مولانا حسین احمد اور ان کے وہ رفقا تھے جو اس جنگ کے بنیادی مقصد سے واقف تھے۔ جو اس کو شاطران یورپ کی جنگ زرگری سمجھتے تھے۔ تاکہ ترکی کے مرد بیمار کا جنازہ نکال دیں۔ اور اس کی مملکت کے حصّے بخرے کر لیں۔

حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مدینہ منورہ میں قیام رہا تھا۔ تو ان رفقا کی کوششیں کامیاب رہیں۔ یہاں تک کہ شریف کی علانیہ بغاوت نے کامیابی کے تمام امکانات ختم کر دیئے۔ حرفِ آخر یہ تھا کہ شریف حسین نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور حضرت مولانا حسین احمدؒ کو بھی ان کا ضمیمہ بنا دیا۔

## مولانا حسین احمد مدنیؒ گرفتار:

حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ اس وقت شریف کی رعیت نہ تھے۔ برطانیہ یا حکومت ہند کے ملازم بھی نہیں تھے۔ لیکن شریف حسین اور اس کے عمائد وارا کین سے نظری اختلاف تھا۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی طرح آپ بھی ترکوں کو کافر نہیں کہتے تھے اور ترکوں کے سلطان کو خلیفۃ المسلمین اور اس کے خلاف بغاوت کو ناجائز سمجھتے تھے۔ انگریزوں اور انگریزی چیزوں اور یورپین

تہذیب سے آپ کو نفرت تھی۔

یہی نظریات شریفی حکومت کی نظر میں باغیانہ جرائم تھے۔ جن کی بنا پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کو مولانا محمود حسن دیوبندی کا ہم طوق اور رفیق زنداں بنایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں:

''پولیس کا آدمی مجھ کو اور وحید کو بلانے کے لیے پہنچا۔ وحید موجود نہیں تھا۔ مجھ کو حمیدیہ میں لے گئے۔ کمشنر پولیس نے مجھ کو کہا کہ تو انگریزی حکومت کو بُرا کہتا ہے۔ اب اس کا مزہ چکھ اور قید خانہ میں بھیج دیا۔''

اس کے بعد عشا کے قریب حضرت شیخ الہندؒ کو حراست میں لیا گیا۔ اور اونٹوں پر سوار کرا کر مسلح گارڈ کی حفاظت میں جو ساٹھ اونٹوں پر لدی ہوئی تھی، جدہ روانہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو جدہ کب پہنچایا گیا۔ بہتر ہے کہ خود حضرت مولانا کی زبان قلم سے اس کا جواب حاصل کریں۔ حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''مجھ کو قید خانہ میں کوئی حالت صبح تک معلوم نہ ہوئی۔ صبح کو جب احباب ملنے آئے تب معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سیّد امین عاصم صاحب کے بھانجہ زادہ سیّد احمد جعفری آئے اور کہا کہ ہم نے تیرے چھڑانے کے لیے بہت کوشش کی مگر چونکہ شریف بہت خفا ہے۔ اس لیے کم از کم آٹھ دس دن تک تجھ کو قید خانہ میں رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ چونکہ میں مدینہ منورہ سے فقط مولانا کی خدمت کے لیے نکلا ہوں۔ اس لیے مجھ کو خدمت میں رہنا ضروری ہے۔ اگر جدہ سے مولانا ہندستان تشریف لے گئے تو آپ کے ساتھ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں مجھ سے اعلیٰ اعلیٰ خدام موجود ہیں۔ اور اگر کسی دوسری جگہ ان کو بھیجا گیا تو میرا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ اس لیے جس طرح ممکن ہو مجھ کو مولانا کے پاس بھجوا دیجیے۔

انھوں نے کہا کہ یہ بات تو آسان ہے۔ ہم ابھی شیخ الاسلام سے جا کر کہے دیتے ہیں کہ مادہ فساد میں سے بعض کا باقی رکھنا اور بعض کا اخراج کرنا مناسب نہیں۔ اس لیے اس کو بھی وہاں بھیج دو۔ غالباً وہ اسی وقت تجھ کو بھی وہاں بھیج دیں گے۔ میں نے کہا ہاں ایسا ہی کیجیے۔ پھر نہ معلوم ان سے کیا باتیں ہوئیں۔ ظہر کے بعد قریب عصر کے معلوم ہوا کہ مجھ کو جدہ جانے کا حکم ہوا ہے۔ میں نے مکان پر پولیس کے ساتھ جا کر اپنا ضروری سامان ساتھ لیا اور باقی ماندہ جس قدر اسباب حضرت مولانا اور رفقا کا تھا۔ اس کو بھی منتظم کر کے حافظ عبدالجبار صاحب کے سپرد کیا کہ آپ اس تمام اسباب کو خچروں پر جدہ مطوف صاحب کے وکیل کے پاس بھجوا دیں۔ الغرض مولانا کی روانگی کے بعد اگلے دن خچروں پر مجھ کو زیر حراست روانہ کیا گیا۔ چونکہ اونٹ جدہ اور مکہ کے درمیان دو دن لگاتا ہے اور خچر ایک ہی شب میں پہنچتا ہے۔ اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پہنچنے کے تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد میں پہنچ گیا۔ جدہ کے قید خانے کے دروازہ پر ایک کمرہ تھا۔ وہاں پر مولانا مع اپنے رفقا کے فروکش تھے وہاں ہی میں بھی پہنچا دیا گیا۔ مولانا کو میری طرف سے بہت فکر تھی۔ حاضر ہو جانے پر اطمینان ہوا۔

یہ با اطمینان رفاقت نہ صرف اسارت مالٹا کے ختم تک بلکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک رہی۔

جدہ سے روانگی، مصر پہنچنا، خیرہ کے سیاسی قید خانہ میں داخلہ وہاں کی تاریک کالی کوٹھریوں میں بند کیا جانا۔ پھر انگریزوں کے ٹریبونل کے سامنے پیشی۔ حضرت شیخ الہندؒ سے سوالات اور حضرت کے جوابات۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تذکرہ میں گزر چکے ہیں۔

مزید یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بیانات بعد ۲۵؍ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۱۹؍ جنوری ۱۹۱۷ء) جمعہ کے روز حضرت مولانا مدنی پیش ہوئے۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں:

''مجھ کو کچہری میں بلایا گیا۔ اور مجھ سے بیانات لیے گئے۔ چونکہ میں ہمیشہ سے فضول گو اور کثیر الکلام ہوں۔ میں نے زمین آسمان کے قلابے بہت کچھ ملائے۔ میرا بیان دو دن تک وہ لکھتا رہا۔ اور بار بار کہتا رہا کہ تم لوگوں کی نسبت ہمارے کاغذات میں تو باتیں پھانسی کی ہیں مگر تم اقرار نہیں کرتے۔ شریف کی بغاوت، مسئلہ خلافت کے متعلق، ترکی حکومت سے اسلامی علائق وغیرہ کی نسبت سب کے بیان بحمداللہ ایک ہی رہے۔ کوئی بھی حق کے کہنے سے نہیں ہٹا۔

البتہ جو دوسرے اتہامات یا افواہیں تھیں ان کا مناسب جواب سب نے دیا۔ آخر میں یہ بھی پوچھا گیا کہ گورنمنٹ کے لیے تم کوئی مشورہ خیر دیتے ہو تو غالباً سبھو نے کہا کہ مشورہ یہ ہے کہ شریف کی مدد نہ کی جائے۔ اور سلطان سے لڑائی نہ کی جائے۔ اس میں گورنمنٹ کا بڑا نقصان نہ ہوگا۔ آخر کار مجھ کو بھی ایک دوسری کوٹھری میں جو مولانا کی کوٹھری کے بعد تھی۔ رکھا گیا۔''

اسارت سے آپ کی رہائی حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ عمل میں آئی۔ ◻◻

# مولانا عزیر گل

**وطن:**

سی.آئی.ڈی کی رپورٹ میں آپ کو درگئی کا باشندہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ مالاکنڈ ایجنسی کا ایک مقام ہے۔لیکن آپ کا آبائی وطن 'زیارت کاکا صاحب' (ضلع پشاور) تھا۔صرف آپ کے والد صاحب نے درگئی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

**تعلیم:**

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے اساتذہ سے حاصل کی۔ پھر آپ دیوبند تشریف لے آئے۔ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بنے اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ سے رابطہ قائم کرکے ان کے خادم خاص بن گئے۔

**تحریک میں شرکت:**

مولانا عزیر گل صاحب کا سایہ خدا دراز کرے۔ آپ سادہ مزاج تکلّفات سے نا آشنا ملنسار، ہر ایک کے خدمت گزار، دوسروں کے لیے آپ تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ اور اسی میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے انھیں اوصاف نے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کا خادم خاص بنایا۔ اسی خصوصیت نے آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا بھی سرگرم ممبر بنا دیا۔ آپ کے دورِ شباب نے جس سے آشنائی کی وہ تحریک کی سرگرمی تھی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا عزیر گل صاحب، حضرت شیخ الہندؒ کے خادم خاص ہیں۔ مشن کے ابتدا سے ممبر رہے اور نہایت مہتمم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور آزاد علاقہ (یاغستان) میں سفارت کی خدمات عظیم انھوں نے انجام دیں۔ عموماً حضرت شیخ الہندؒ ان کو پہاڑی علاقوں میں اپنے ہم خیال اور ہم نوا لوگوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ دشوار گزار اور خطرناک راستوں کو قطع کرکے نہایت رازداری اور ہمّت و استقلال کے ساتھ باربار آتے جاتے رہے۔ پہاڑی علاقوں اور ہولناک جنگلوں کو رات دن پیدل قطع کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی اور علما سرحد، یاغستان اور دیگر خواتین کو آپ نے مشن کا ممبر بنایا۔ 'ان کے پاس پیغام اور خطوط پہنچانا ان کو ہموار کرنا' ان کا اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کا فریضہ تھا۔ جن کو ان دونوں حضرات نے اوقات مختلفہ میں انجام دیا۔ باوجودیہ کہ سی.آئی.ڈی ان کے پیچھے لگی رہی۔ مگر انھوں نے کبھی اس کو پتہ چلنے نہیں دیا۔ بارہا ان کو بھیس بدلنا اور انجان علاقوں میں گزرنا پڑا، مگر نڈر ہوکر ان کو قطع کیا۔ ہر قسم کے خطرات میں بلاخوف وخطر اپنے آپ کو ڈالتے رہے۔''

**شیخ الہندؒ کا سفر حجاز اور مولانا عزیر گل کی رفاقت:**

حکومت ہند نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کرنا طے کرلیا۔ ابھی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ حجاز روانہ ہوگئے۔ اس کی تفصیل حضرت شیخ الہندؒ کے حالات میں ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا عزیر گل صاحب سے اس سرگزشت کا تعلق یہ ہے کہ اس سفر کے رفقا اگر چہ ایک دہائی کو پورا کردیتے تھے۔ مگر ان میں مولانا عزیر گل صاحب وہ تھے جن کو حضرت شیخ نے اپنی رفاقت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور یہ وطن چلے گئے تھے تو ان کی واپسی تک سفر ملتوی فرمادیا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت شیخ الہندؒ نے شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا۔ چونکہ مولانا عزیر گل صاحب خادم خاص کو اپنے وطن جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا۔ اس لیے ان کی واپسی کا انتظام فرمایا۔

**حجاز میں قیام:**

مولانا عزیر گل صاحب اپنے استاذ اور شیخ محترم کے ساتھ حجاز شریف پہنچے۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت شیخ الہندؒ اپنے جملہ رفقا کی وطنی ضرورتوں اور ملازمت وقرابت کے علائق سے بخوبی واقف تھے۔ سب کو حکم دیا کہ جب حج وزیارت سے فارغ ہوچکے ہو تو وطن چلے جاؤ۔ اپنے متعلق فرمایا کہ میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جملہ رفقا بجز مولانا عزیر گل صاحب، مولوی ہادی حسن صاحب اور وحید احمد سب روانہ ہوگئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے چند ماہ مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ پھر رجب ۱۳۳۴ھ میں آپ مکہ معظّمہ حاضر ہوئے کہ وہاں گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرکے تحریک کے سلسلہ میں ضروری باتیں طے کریں۔ یہ مئی کا

مہینہ تھا۔ غالب پاشا موسم گرما کے مستقر (ہیڈ کوارٹر) طائف جا چکے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی طائف تشریف لے گئے۔ آپ طائف ہی میں تھے کہ شریف مکہ نے ترکوں سے بغاوت کردی۔ حضرت شیخ الہندؒ طائف سے مکہ معظّمہ واپس پہنچے تو مکہ باغیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ جہاں 'شریف' کے ذریعہ برطانوی پالیسی کارفرما تھی۔ جس کا کارنامہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اوران کے رفقا کو صفر ۱۳۳۵ھ (نومبر ۱۹۱۶ء) میں گرفتار کیا گیا۔ قاہرہ میں برطانوی ٹربیونل کے سامنے ان کی پیشی ہوئی۔ حکم کچھ نہیں سنایا گیا۔ البتہ عمل یہ کیا گیا کہ ان کو 'مالٹا' پہنچا دیا گیا۔ گرفتاری کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''شریف صاحب جدہ گئے اور وہاں کرنل ولسن معتمد برطانیہ سے خدا جانے کیا گفت وشنید ہوئی کہ شب کو شیخ الاسلام عبداللہ سراج (جو ترکی حکومت کے زمانہ میں مفتی احناف تھے۔ اوراب انقلاب کے بعد عہدہ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت کے عہدہ پر مامور ہوگئے تھے، کے نام حکم آیا کہ مولانا اوران کے جملہ ہمراہیوں کو زیر حراست یہاں بھیج دو۔ صبح کو شیخ المطوفین احمد بجی۔ مولانا کے پاس مکان پر پہنچا۔ اس وقت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مولوی عزیر گل صاحب اور دوسرے رفقا تھے۔ کاتب حروف (مولانا حسین احمد) نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ تمھاری گورنمنٹ جس کی تم رعایا ہو تم کو طلب کرتی ہے۔ اس لیے مجھ کو 'شریف' کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ تم کو راحت کے ساتھ روانہ کردوں۔ جس سواری اور جتنی سواریوں کی ضرورت ہے ہم کو بتلا دو۔ تاکہ ہم ان کا انتظام کردیں۔ مولوی عزیر گل صاحب سے اس کی کچھ زبانی گفتگو ہوئی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ (مولانا عزیر گل صاحب نے فرمایا) ہم یہاں کسی کافر گورنمنٹ کو نہیں پہچانتے ہم حرم خداوندی میں امان لیے ہوئے پڑے ہیں۔ اگر شریف ہم کو یہاں سے نکالتے ہیں تو ہم خوشی سے نہ جائیں گے۔ جب تک تم ہم کو ڈنڈے کے زور سے نہ نکالو۔ وہ کچھ پیچ وتاب کھا کر جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں میں (مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ) پہنچ گیا۔''

پھر حضرت مولانا مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ہم میں سے بعض احباب کی رائے ہوئی کہ مولانا کو اوران کے ساتھ وحید احمد کو کہیں چھپا دیا جائے اور شب کو کسی دوسری جگہ روانہ کردیا جائے۔ باقی لوگوں کو دو چار دن قید رکھیں گے پھر چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کا آدمی مجھ کو اور وحید کو بلانے کے لیے پہنچا۔ وحید وہاں نہیں تھا مجھ کو حمیدیہ (پولیس اسٹیشن کا نام) میں بلا کر لائے۔ پولیس کمشنر نے مجھ سے کہا تو انگریزی حکومت کو برُا کہتا ہے۔ اب اس کا مزہ چکھ، اور قید خانہ میں مجھ کو بھیج دیا۔

پھر پولیس نے مولانا کو تلاش کیا چونکہ مولانا مکان پر موجود نہ تھے۔ اس لیے مولوی عزیر گل صاحب اور حکیم نصرت حسین صاحب کو پکڑا۔ اور کہا کہ جہاں سے ممکن ہو مولانا کو ڈھونڈھ کر لاؤ۔ ان دونوں خدام نے لاعلمی ظاہر کی۔ باوجود سخت تقاضے اور موت کی دھمکی کے ان خدام نے کچھ پتہ نہیں دیا۔ بالآخر یہ دونوں اسی مکان میں حضرت کی آمد تک مقید رکھے گئے۔ اورشریف کے نوکر چاکر حضرت کی تلاش میں رہے۔ جب شام کا وقت ہوگیا اور مولانا باوجود تفتیش کثیر کے ہاتھ نہ لگے۔ تو پھر شریف نے حکم دیا کہ اگر عشا تک مولانا ازخود آ موجود نہ ہوئے تو دونوں ساتھیوں کو گولی ماردو۔ اور مطوف کے سو کوڑے لگاؤ اوراس کا منصب چھین لو۔

> **مولانا عزیر گل صاحب اپنے استاذ اور شیخ محترم کے ساتھ حجاز شریف پہنچے۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت شیخ الہندؒ اپنے جملہ رفقا کی وطنی ضرورتوں اور ملازمت و قرابت کے علائق سے بخوبی واقف تھے۔ سب کو حکم دیا کہ جب حج و زیارت سے فارغ ہوچکے ہو تو وطن چلے جاؤ۔ اپنے متعلق فرمایا کہ میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔**

حضرت مولانا کو یہ خبر ہوئی تو آپ خود مکان پر تشریف لے آئے۔ اسی وقت اونٹ وغیرہ حاضر کیے گئے اور چاروں آدمی تقریباً عشا کے وقت وہاں سے دو اونٹوں پر روانہ کردیئے گئے۔ (چار رفقا، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا عزیر گل صاحب، حکیم نصرت حسین صاحب، مولانا وحید احمد مدنی)

یہ حضرات پہلے مصر پہنچائے گئے وہاں سے قاہرہ کے قریب جنیرہ کے جیل خانہ میں ان کو رکھا گیا۔ پہلے ان سب کو الگ الگ کال کوٹھریوں میں رکھا گیا۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ ان کوٹھریوں میں ایک

طرف ایک بالٹی رکھی تھی۔ جس میں وضو، پاخانہ، پیشاب کرنے کا حکم تھا۔اس بالٹی پرڈھکنا بھی ہوتا تھا۔کوٹھری کا دروازلکڑی کا تھا۔جس میں کوئی سراخ نہ تھا۔ کوٹھری میں پشت کی جانب ایک روشندان بہت اونچائی پرتھا۔جس سے ہوا،اوردن کوروشنی آتی رہتی تھی۔صبح کوایک گھنٹہ اورشام کوایک گھنٹہ کوٹھری کھول کرہوا کھلانے کے لیے نکالتے تھے۔اسی وقت بالٹی بھی میلا صاف کرنے والے خدام لے جاتے تھےاورصاف کرکے پھررکھ جاتے اور کمرہ میں جھاڑو دے جاتے تھے۔ان کوٹھریوں میں الگ الگ رہتے ہوئے ان کے بیانات لیے گئے۔ان کوٹھریوں میں ان کو رکھا جاتا ہے۔جن کوموت کی سزادی جاتی ہے۔ ان سب حضرات کو یہی خیال تھا کہ ان کو پھانسی دی جائے گی۔ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں:

''مولوی عزیرگل صاحب تواپنی کوٹھری میں رہ کراپنا گردن اور گلے کو پھانسی کے لیے ناپتے اوردباتے تھے کہ ذرا عادت ہوجائے اور پھانسی کے وقت یک بارگی تکلیف سخت نہ پیش آئے اور تجربہ کرتے تھے کہ دیکھوں کس قسم کی تکلیف ہوتی ہے۔مگرسب کے دل مطمئن تھے گویا کہ نانی کے گھرمیں آرام کررہے ہیں۔''

بیانات وغیرہ کے بعدوہ وقت آیا کہ ان سب کوایک ہی وقت میں ہواخوری کی جگہ میں داخل کیا گیا۔اس وقت سب سے پہلے ہرایک نے ایک دوسرے سے یہی پوچھا کہ اس نے کیا بیان دیا۔تو یہ خدا کا فضل و کرم تھا کہ سب کے بیانات متفق تھے۔گویا مشورہ کرکے دیئے گئے ہیں۔

مولانا عزیرگل صاحب سے حدود کے واقعات، قبائل کے احوال، سیّد احمد صاحب شہید مرحوم ومغفور کے قافلہ کی خبریں، حاجی صاحب (حاجی عبدالغفور صاحب جوحدود کے بڑے پیر ہیں) وہ اس زمانہ میں انگریزی علاقہ سے اپنے اہل وعیال کو لے کریاغستان چلے گئے تھے۔ اوروہاں جاکرمشہور ہوا تھا کہ انھوں نے جہاد قائم کیا ہے۔مولوی سیف الرحمٰن صاحب، مولوی عبیداللہ صاحب مولوی محمد میاں صاحب وغیرہ وغیرہ حضرات کے متعلّق زمین وآسمان کی واہی تباہی باتیں پوچھیں، جن کا نہ سرتھا نہ پیر۔مگر مولوی صاحب (مولانا عزیرگل صاحب) نے نہایت استقلال سے اپنے ولایتی اکھڑپنے سے سب کا جواب دیا اور بہت ہی متین جواب دیا۔

## مصر سے مالٹا:

۱۶/جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۳/ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ کو یہ حضرات مصر پہنچے تھے۔ وہاں پورا ایک مہینہ ان کے بیانات وغیرہ میں گزرگیا۔ پھران کو مالٹا بھیج دیا گیا۔۲۱/فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۹/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو یہ حضرات مالٹا پہنچے۔ جہاں ۲۱/اپریل ۱۹۲۰ء۱۳/رجب ۱۳۳۸ھ تک قیام رہا۔ اسی اثنا میں گورنر یو۔پی مسٹرمسٹن کا چیف سکریٹری مسٹربرن ان حضرات کے جذبات کااندازہ کرنے اورخیالات کاجائزہ لینے کے لیے مالٹا پہنچا۔اوران حضرات سے گفتگو کی۔

مولانی مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:اورآخرجنوری یاابتدافروری ۱۹۱۸ء میں ایک روز ہم سب کوصبح کے وقت آفس میں بلایا گیا۔ہمیں ایک طرف کرسیوں پربٹھا دیا گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد کمانداراوراس کے ساتھ ایک بڈھا انگریز آئے اورہم سبھوں سے ہاتھ ملاکربیٹھ گئے۔اس بڈھے نے اُردو میں باتیں کیں۔ اورمزاج پرسی وغیرہ شروع کردی۔ مولوی عزیرگل صاحب نے خیال کیا کہ یہ سنسرہے۔اس دفتر میں ملازم ہوکرآیا ہے۔ اس نے جب خطوط اور پارسلوں کی نسبت سوال کیا۔تو انھوں نے نہایت بےرُخی سے کہا کہ آپ ہم سے کیا پوچھتے ہیں۔اپنے دفتر میں دیکھ لیجیے۔اسی طرح اوربھی کچھ اکھڑی اکھڑی باتیں کیں۔اس نے کہا۔آپ عزیرگل ہیں؟ ان کواس واقفیت پرتعجب بھی ہوا۔اور پھر غالبًا ان کے مسکن اورشہروغیرہ کا بھی ذکرکیا۔اس وقت ان کا تعجب کچھ زیادہ ہوااوراس نے اپنے ہندستان آنا اورانگلستان کا قصد کرنا، بیان کیا۔

## زمانہ اسارت کی دلچسپی:

مولانا مدنیؒ فرماتے ہیں: اسارت مالٹا میں انتہائی دلچسپی اوردل جمعی سے شریک ورفیق رہے۔ ہرقسم کی خدمت کواپنے لیے خوش نصیبی سمجھا کیے۔مختلف اوقات میں اعمال سلوک تعلیم کردہ حضرت مولانا مرحوم میں مشغول رہتے تھے۔ پھرکچھ وقت قرآن شریف یادکرنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ انھوں نے زبان ترکی سیکھنے کی طرف بھی توجہ کی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں بحمداللہ اچھی خاصی ترکی بولنے لگے۔اس کے بعد انگریزی زبان کی طرف متوجہ ہوئے،مگرسوربخت یا خوش نصیبی نے اس میں دستگیری نہ کی۔ان کوحسبِ خواہش کوئی استاد نہ ملا۔اورکچھ طبعی عدم استقلال بھی اس فن کے کمال سے مانع ہوا۔

**مالٹا سے رہائی کے بعد:**

تین برس دو ماہ مالٹا میں قیام رہا۔ ۲؍جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو اسارت گاہ مالٹا سے خارج کیا گیا۔ اور فوجی گارڈ کے ساتھ سنگینوں کے پہرہ میں ان کو سویس پہنچایا گیا۔ پونے دو ماہ یہاں زیر حراست رکھا گیا۔ بالآخر ۲۰؍رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (۸؍جون ۱۹۲۰ء) کو بمبئی پہنچا کر ان حضرات کو رہا گیا۔ مولانا عزیر گل صاحب جس طرح دیوبند میں حضرت شیخ کے خادم خاص تھے۔ مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور اسارت مالٹا کے زمانہ میں خادم خاص رہے۔ اب بھی وہ خادم خاص تھے۔ دیوبند پہنچے تو آپ کا مسکن بھی آستانہ شیخ الہند رہا۔ مگر حضرت شیخ الہندؒ کی فیوض و برکات کا دورہ ختم ہو رہا تھا حتیٰ کہ ۱۸؍ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ کو یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

**خلافت کمیٹی دیوبند کی صدارت:**

تحریک خلافت شروع ہوگئی تھی۔ یہ حضرات ہندستان پہنچے تو تحریک میں شباب آ گیا۔ ایک چنگاری گویا آتش فشاں پہاڑ بن گئی۔ یہ حضرات اسارت و حراست کے طویل دور سے گزر چکے تھے۔ سفر اگرچہ ختم نہیں ہوا تھا، مگر ان حضرات کو حق تھا کہ پڑاؤ ڈال کر آرام کریں۔ مگر شاہرہ عشق کا جادہ پیمانہ منزل پہچانتا ہے نہ آرام وسکون سے آشنا ہوتا ہے۔

چنانچہ مولانا عزیر گل صاحب نے پوری سرگرمی سے تحریک میں حصہ لیا۔ قدر دانوں نے آپ کو خلافت کمیٹی دیوبند کا صدر بنا دیا۔ لیکن تحریک کا سیلاب پایاب ہو چکا تھا۔ اہل وعیال کی ضرورتوں نے وارفتگان تحریک کو کسب معاش کا ہوش دلا دیا تھا۔ مولانا عزیر گل صاحب اگرچہ ابھی تک فارغ البال تھے۔ اہلیہ محترمہ اسارت مالٹا کے زمانہ میں دارفانی کو خیر باد کہہ چکی تھیں۔ مگر آپ کی خودداری یہ بھی گوارا نہیں کرتی تھی کہ قوت بازو بیکار رہے۔ آپ نے لکڑیوں کی ٹال کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ تجارت کفایت شعاری کا مطالبہ کرتی ہے اور آپ کی قلندرانہ فطرت کفایت شعاری سے بیگانہ، چنانچہ یہ مشغلہ سودمند نہ ہوا۔

> **مولانا عزیر گل صاحب نے پوری سرگرمی سے تحریک میں حصہ لیا۔ قدر دانوں نے آپ کو خلافت کمیٹی دیوبند کا صدر بنا دیا۔ لیکن تحریک کا سیلاب پایاب ہوچکا تھا۔ اہل و عیال کی ضرورتوں نے وارفتگان تحریک کو کسب معاش کا ہوش دلادیا تھا۔ مولانا عزیر گل صاحب اگرچہ ابھی تک فارغ البال تھے۔ اہلیہ محترمہ اسارت مالٹا کے زمانہ میں دارفانی کو خیر باد کہہ چکی تھیں۔ مگر آپ کی خود داری یہ بھی گوارا نہیں کرتی تھی کہ قوت بازوبیکار رہے۔**

علاوہ ازیں آپ ذی استعداد عالم تھے۔ تجارت کے بجائے سلسلہ درس آپ کے لیے موزوں تھا۔ مدرسہ رحمانیہ رڑکی جو اکابر کی یادگار ہے وہ صدر مدرس سے محروم تھا۔ شیخ الاسلام، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اس محرومی کا احساس تھا۔ آپ کی توجہ عالی دست گیر ہوئی۔ مولانا عزیر گل کو حلقہ درس میسر آیا۔ اور مدرسہ رحمانیہ کو مولانا عزیر گل جیسا صدر مدرس۔ تقسیم ہند سے دو سال پہلے تک آپ یہاں درس دیتے رہے۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں آپ وطن تشریف لے گئے۔ ضلع مردان میں آپ کی آبائی مملوکہ زمین ہے، دیوبند سے منتقل ہوکر آپ نے اسی زمین میں کچا مکان بنایا اور سکونت اختیار کرلی۔

**شادی:** زمانہ اسارت میں اہلیہ محترمہ داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ رہائی کے بعد دیوبند میں قیام ہوا تو احباب نے کوشش کی اور حضرت شیخ الہندؒ کی بھانجی کی لڑکی سے آپ کا عقد ہوگیا۔ ان سے آپ کے دو لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں۔ پھر وہ خود رخصت ہوگئیں۔

رڑکی میں ایک ذی علم یورپین خاتون تھیں اصل وطن لندن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں شاہی خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے شوہر کا جو ہندستان میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز تھے، انتقال ہوگیا تھا۔ اس ذی علم خاتون کے مطالعہ نے ان کو اسلام کا شوق دلایا۔ وہ اسلام سے مشرف ہوئیں۔ پھر ذی علم رفیق کی تلاش ہوئی تو ان کی نظر صائب نے حضرت مولانا عزیر گل صاحب کو رفاقت کے لیے منتخب کیا۔ حضرت مولانا عزیر گل صاحب نے بھی ان کے انتخاب کی قدر کی، اور ان سے نکاح کرلیا۔ یہ خاتون یورپ کی تھیں یورپین وضع کی عادی۔ مگر اسلام سے مشرف ہوئیں تو ہر ایک وضع کو چھوڑ کر نہایت سادہ زاہدانہ زندگی اختیار کرلی۔ شدّت سے پردہ کی پابند ہوگئیں۔ صوم وصلوٰۃ اور وظائف اور تلاوت قرآن حکیم ان کا مشغلہ تھا۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی انگریزی میں لکھا مگر افسوس اس کی طباعت کا انتظام نہ ہوسکا۔ ☐☐

## شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے برادرِ بزرگ

# مولانا وحید احمد مدنیؒ

مولانا وحید احمد مدنی مرحوم ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں بمقام ٹانڈہ پیدا ہوئے۔ ۴ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ وہاں گورنمنٹ اسکول میں عربی اور ترکی زبانوں میں تعلیم مکمل کی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنی سوانح میں ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے:

''وحید احمد مرحوم اس وقت ترکی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور علوم جدیدہ اور ترکی زبان میں اچھی طرح ماہر ہو چکا تھا۔ عربی کی تعلیم بھی ایک درجہ تک حاصل کر چکا تھا مگر وہ قابلِ اطمینان نہ تھے۔ میرے سفر ہندستان اور وہاں تین برس تک قیام کی وجہ سے اس کی تعلیم میں بہت خلل پڑ گیا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم (اس کے والد) اس کی تعلیم و تربیت پوری طرح نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دوسرے نکاحوں اور سوتیلی ماؤں کے معاملات کی وجہ سے نیز اُن کے مغلوب الغضب اور زیادہ سخت ہونے کی بنا پر اس کو طبعی طور پر اپنے والد سے لگاؤ نہیں تھا۔ بلکہ مجھ سے اور والد مرحوم سے اس کو زیادہ تعلّق تھا۔ اس بنا پر والد صاحب مرحوم نے اس کو ترکی اسکول میں داخل کر دیا تھا مگر وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں اس کے اعمال و اخلاق پر غیر مستحسن اثر پڑ رہا تھا۔ وہ طبعی طور پر نہایت ذہین تھا۔ زبان ترکی اور فنون جدیدہ رائجہ میں وہ اپنے درجوں میں ممتاز رہتا تھا مگر علوم جدیدہ اور فلسفۂ طبعیات اور یورپین فیشن کا جو زہریلا اثر مذہب کے خلاف اہل اسکول اور کالجوں پر پڑتا ہے۔ اس سے وہ بھی مسموم ہو رہا تھا۔ اس لیے والد صاحب مرحوم کا ارشاد ہوا کہ اس کو دیوبند لے جا اور دارالعلوم دیوبند میں علوم عربیہ کی تکمیل کرا۔''

۱۳۱۳ھ کی ابتدا میں آپ چچا (حضرت شیخؒ) کے ساتھ دیوبند تشریف لائے اور حضرت اقدس شیخ الہندؒ قدس سرہٗ کی خصوصی نگرانی، تربیت اور شاگردی میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ بھی ہمرکاب مراجعت فرمائے وطن (مدینہ) ہوئے۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ گرفتاری کیے گئے تو آپ بھی ان حضرات کی معیت میں قید کر کے مالٹا روانہ کیے گئے۔ گرفتاری کے وقت ایسی صورتیں ممکن تھیں کہ آپ قیدیوں کی اس جماعت سے الگ کرا لیے جاتے۔ مگر اپنے چچا اور استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی ہمرکابی سے الگ ہونا آپ نے کسی حالت میں پسند نہیں کیا۔ حضرت شیخؒ نے اسارت مالٹا کے حالات میں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ گرفتاری کے بعد بیان دینے کے بارے میں سب کو پریشانی تھی۔ خصوصاً وحید بالکل نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ مگر حضرت شیخ الہندؒ کی برکت اور خدا کے فضل وکرم سے سبھوں کے بیانات تقریباً متفق ہوئے۔

مالٹا کی قید کے زمانے میں آپ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھتے رہے اور اس کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ سے علوم دینیہ اور عربی بھی پڑھتے اور مطالعہ کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی فارغ اوقات میں آپ مختلف قوموں کے قیدیوں سے ملتے اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ آپ کے مشاغل کے بارے میں حضرت نے تذکرہ کیا ہے۔ ''وحید نے ابتدا ہی سے اجنبی زبانوں کی طرف توجہ کی اور اولاً فرانسیسی اور پھر جرمنی زبان کو سیکھا۔ پھر جب دیکھا کہ پانسۂ جنگ پلٹ گیا ہے تو انگریزی کی طرف متوجہ ہوا۔ مختلف فنون عربیہ خصوصاً حدیث اور تفسیر کی چند کتابیں اس سفر میں اس نے مولانا سے پڑھیں۔'' ۱۹۲۰ء میں جب رہائی ہوئی تو آپ ان اولیائے کرام کی معیت میں دیوبند آ گئے اور مدرسۂ دیوبند میں معین مدرس مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ کی شادی اپنے والد کی ماموں زاد بہن، روجۂ سیّد فاروق احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دیوبند سے آپ بمبئی چلے گئے اور اپنی زباں دانی اور ذہانت کی بنیاد پر کسی اخبار کے عملہ ادارت میں ملازم ہو گئے۔ بمبئی کا قیام راس نہ آیا تو واپس آ گئے اور بہار شریف پٹنہ صوبہ بہار میں مدرسۂ عزیزیہ وقف بی بی صغرا اسٹیٹ میں مدرس ہو گئے۔ وہاں حدیث، تفسیر اور فقہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ عربی ادب پڑھاتے رہے اور عوام و

خواص میں ادیب صاحب کے لقب سے مشہور رہے۔ زباں دانی میں آپ کو خاص ذوق اور ملکہ تھا۔ عربی، فارسی، انگریزی، ترکی، فرانسیسی، جرمن، ہندی، اُردو، پشتو اور بنگالی وغیرہ بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ہفت زباں مشہور تھے اور لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک آدمی بیک وقت اتنی زبانیں کس طرح یکساں مہارت اور قدرت کے ساتھ حاصل کرسکتا ہے۔ ''عربی اُردو مادری زبانیں تھیں۔ فارسی و انگریزی سبقاً حاصل کیں، ترکی اور فرانسیسی مالٹا کے مصاحبین سے سیکھیں۔ پشتو، بنگلہ اور کچھ دوسری زبانیں احباب کی مجلسوں سے۔ اس طرح ہفت زبان نہیں بلکہ دہ زبان ہوگئے تھے۔'' بعض اوقات خاص طور پر حالتِ سفر میں آپ کی ملاقاتیں انگریزوں اور دوسرے غیر ملکی لوگوں سے ہوتی تھیں۔ وہ جس ملک کے ہوتے تھے اُسی میں آپ گفتگو شروع کردیتے تھے۔ چونکہ لباس وضع قطع اور ظاہری تراش و خراش میں حد درجہ سادگی پسند تھے اس لیے راقم الحروف کو ایسے بعض مواقع یاد ہیں کہ ایک معمولی سی شکل وشمائل کے ہندستانی سے اپنی زبان، انگریزی، فرنچ یا ترکی سن کر وہ لوگ بے حد خوش ہوتے تھے اور بڑے احترام وتواضع سے پیش آتے تھے۔

شعر وادب کا بڑا ستھرا اور اعلیٰ مذاق تھا۔ مختلف زبانوں میں ہزاروں شعر اور ادب پارے برنوک زباں یاد تھے۔ بڑے نڈر، جری اور بے باک تھے۔ کسی سے کسی مصلحت کی بنا پر وہ جھجکنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ جو بات حق جانتے تھے اسے برملا کہتے تھے: ''حوادث ومصائب سے کھیلنے والا انسان خوف ودہشت سے ناآشنا۔ صاف گو، صاف دل، نہایت پابند مگر نہایت آزاد، اصول کا پابند مگر تکلّفات سے آزاد۔ نہ واسکٹ نہ شیروانی، نہ عبا نہ قبا، صرف کرتہ پاجامہ زیب تن کرتے میں جیب نہیں، جیب کا کام نیفے کے ذمّے، رونق مجلس، پُرزور مقرر، جیّد عالم مگر وضع وقطع طالب علمانہ، فقر وفاقہ میں بھی ہشّاش بشّاش، خالی ہاتھ مگر دل کا تونگر۔''

مدرسہ عزیزیہ گورنمنٹ برطانیہ کی ماتحتی اور کنٹرول میں تھا۔ اس وقت کے بادشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر مدرسہ میں بڑا جشن، تقریبات اور عام جلسہ ہوا۔ جس میں ذمہ دارانِ مدرسہ نے مدح خوانی کی تقریریں کی اور مبارک بادی کے ریزولیشن پاس کیے۔ مولانا نے ان تقریبات میں شرکت اور جلسہ میں تقریر کرنے سے صاف انکار کردیا کہ اگر حکومت برطانیہ کی فرمانبرداری بھی ملازمت کی شرط ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تربیت اور صحبت فیض رحمت نے آپ کو مکمل سیاسی فہم وبصیرت عطا کردی تھی۔ حجاز میں قیام، سامراج کی انسانیت سوز اور اسلام کش چالوں کے مشاہدہ وتجربہ اور مالٹا کی اسارت میں مختلف قوموں کے لیڈروں سے تبادلۂ خیالات نے آپ کے قلب ودماغ کو حریت، مساوات اور انسانیت کی اِسپرٹ سے معمور کردیا تھا۔ ہندستان میں آپ متحدہ قومیت کے حامی اور انڈین نیشنل کانگریس کے سپاہی تھے۔ تقریر وتحریر کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کی سیاسی تقریریں خاص طور پر مقبول تھیں اور مختصر سی مدت میں کافی مشہور ہوگئے تھے۔ کچھ دن جیے ہوتے تو بعید نہیں تھا کہ ہندستان کی تاریخی شخصیتوں میں شمار ہوتے۔ راقم الحروف نے بعض اہل الرائے حضرات سے سنا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو اپنی جدوجہد میں مولانا وحید احمد سے بہت کچھ توقعات اور امیدیں تھیں۔ مختصر یہ کہ عمر بھر کی محرومیوں اور گردشوں کے بعد جب چین کے چند سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تو شفیق چچا نے آبائی وطن ٹانڈہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا قیمتی اور وسیع مکان بھتیجے کے لیے تعمیر کرایا۔ مگر مقدر کا لکھا پورا ہوکر رہا۔ پورے چھ ماہ بھی اُس مکان میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ شوال ۱۳۵۶ھ مطابق نومبر ۱۹۳۷ء میں بہار شریف سے بیمار ہوکر آئے اور ۱۳ دن نمونیہ میں مبتلا رہ کر رمضان شریف کا چاند دیکھنے کے چند گھنٹوں کے بعد پانچ ننھے ننھے بچّوں کو یتیم اور اہلیہ کو بیوہ کرکے اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ دنیاوی حوادث اور صدمات کو برداشت کرنے میں پہاڑ

**۱۳۱۳ھ کی ابتدا میں آپ چچا (حضرت شیخ) کے ساتھ دیوبند تشریف لائے اور حضرت اقدس شیخ الہندؒ قدس سرہٗ کی خصوصی نگرانی، تربیت اور شاگردی میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ بھی ہمرکاب مراجعت فرمائے وطن (مدینہ) ہوئے۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ گرفتاری کیے گئے تو آپ بھی ان حضرات کی معیت میں قید کرکے مالٹا روانہ کیے گئے۔**

کی طرح ثابت وصابر تھے۔اس صدمے کو بھی بے مثال صبر وشکر کے ساتھ جھیلا۔مگر پھر بھی کہیں کہیں خلاف عادت ومزاج کچھ نہ کچھ اظہار ہو ہی گیا۔تفصیل تو حضرت ہی کے بیان میں۔تاہم دو اقتباسات اس موقع پر مناسب ہیں۔حضرت نے بھتیجے کی بیوہ کو لکھا:

''تمھارے رنج وغم کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔مگر تم مجھے دیکھ کر صبر کرو۔اب یہ وقت تھا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں پیوندِ زمین کرتا۔مگر میری تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔''

اپنے ایک مخلص خادم مولانا وحید الدین صاحب سابق ناظم دفتر جمعیۃ علماء ہند کو تحریر فرمایا:''خواب کی تعبیر ظاہر ہے۔عزیزم مولوی وحید احمد کی دائمی مفارقت میرے لیے معمولی تکلیف نہیں ہے۔ وہ میری پرورش میں بچپن سے رہا تھا۔اُس کو اپنے والد مرحوم سے اتنا تعلق نہیں تھا جتنا مجھ سے تھا۔ وہ ننھے ننھے چار بچے چھوڑ کر اور اپنی اہلیہ کو بیوہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم۔

بہر حال آپ حضرات دعوات صالحہ سے امداد فرماتے رہیں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

نئی سڑک سلہٹ، ۱۱رمضان ۱۳۵۶ھ

مولانا وحید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔ بڑا (راقم الحروف) فرید احمد ہے۔اس کی شادی حقیقی ماموں سیّد توکل حسین صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔اس کے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑا لڑکا عمید الوحیدی ڈاکٹر ہے۔اس کی شادی مراد آباد میں ڈاکٹر مولانا بدرالدین الحافظ پروفیسر آف عربک بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس کی صاحبزادی سے ہوئی ہے اور اس کے ایک بچہ خالد الوحیدی ایک بچّی عائشہ الوحیدی ہے، تیسرا علی الوحیدی ہے۔ دوسرا حسین احمد الوحیدی ثانویہ علمی پاس کر کے تجارت میں باپ کا دست راست ہے۔ اس کی شادی حقیقی پھوپھی رضیہ سلمہا کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ تیسرا لڑکا فواد الوحیدی بھی ثانویہ علمی پاس کر کے تجارت میں باپ کا قوتِ بازو ہے۔ اس کی شادی حقیقی چچا سعید الوحیدی سلمہٗ کی لڑکی یاسمین سے ہوئی ہے۔

اس کے دو بچّے عمار اور معاذ ہیں۔ چوتھا لڑکا صدیق الوحیدی سلمہٗ ثانویہ کا طالبِ علم ہے۔اس کی شادی ماموں کی لڑکی سے ہوئی ہے اور ایک لڑکا عمر ہے۔لڑکی رعنا الوحیدی سلمہا کی شادی حقیقی پھوپھی کے لڑکے خالد جاوید سے ہوئی ہے۔اس کے تین بچّے ہیں۔ سلمہم اللہ وعافاہم اللہ۔

مولانا وحید احمد کے دوسرے لڑکے ڈاکٹر رشید الوحیدی کا قیام جامعہ ملّیہ دہلی میں ہے جہاں وہ اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر ہے۔اس کی شادی حقیقی ماموں سیّد مشتاق احمد صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔نہایت متقی، پابندِ شریعت، صاحبِ تصانیف ہے۔ اس کے پانچ لڑکے ہیں۔ بڑا سعد الوحیدی رومی جس کا ایک بچہ، عمیر اور ایک بچّی مُزنیٰ ہے، دوسرا وحید الوحیدی غزالی، تیسرا فہد الوحیدی رازی، چوتھا حبیب الوحیدی سعدی اور پانچواں سیّد احمد والوحیدی جامی، ایک بچّی فاطمہ رشیدی الوحیدی زویا، سب ابھی بچّے ہیں اور زیرِ تعلیم ہیں۔

مولانا کا تیسرا لڑکا ڈاکٹر سعید الوحیدی جدّہ میں مقیم ہے۔اس کی شادی بھی حقیقی ماموں سیّد توکل حسین صاحب کی لڑکی سے ہوئی ہے۔اس کے دو بچّے اجمل وفیصل اور ایک بچّی یاسمین والوحیدی ہیں۔دونوں بچے زیرِ تعلیم ہیں۔

**ہندستان میں آپ متحدہ قومیت کے حامی اور انڈین نیشنل کانگریس کے سپاہی تھے۔ تقریر و تحریر کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کی سیاسی تقریریں خاص طور پر مقبول تھیں اور مختصر سی مدت میں کافی مشہور ہوگئے تھے۔ کچھ دن جیے ہوتے تو بعید نہیں تھا کہ ہندستان کی تاریخی شخصیتوں میں شمار ہوتے۔**

مولانا کی ایک لڑکی صفیہ بیگم نیرہ سلمہا کی شادی پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ڈاکٹر ذاکر حسین اسلامک انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ سے ہوئی۔اس کے دو لڑکے ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی پروفیسر وصدر اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملّیہ دہلی اور دوسرے ڈاکٹر علاء الحسن آباد فاروقی سائنٹسٹ سی میپ (Cimap) لکھنؤ ہیں۔ایک لڑکی ڈاکٹر عطیہ بیگم فاروقی اور دوسری ڈاکٹر عرفی فاروقی ہے۔سب شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں۔

دوسری لڑکی رضیہ بیگم سلمہا کی شادی ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف اُردو جموں یونیورسٹی سے ہوئی۔ اس کے چار لڑکے خالد جاوید، طارق، شکیب اور صہیب ہیں اور چار لڑکیاں شاہانہ، فوزانہ، سعدانہ اور دردانہ ہیں سلمہم اللہ جمیعاً۔□□

# مولانا حکیم سیّد نصرت حسین

**وطن:**

کوڑا جہاں آباد، ضلع فتح پور، ہمسوہ۔ پھر حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے۔ خاندانی زمیندار تھے اور کامیاب طبیب بھی۔ انھیں خصوصیات کی وجہ سے اپنے علاقہ میں باعزت تھے۔ سرکاری افسروں سے بھی تعلق رہتا تھا۔ لیکن وطن عزیز کی غلامی کا احساس بھی اتنا ہی شدید تھا۔

حج بیت اللہ کے ارادہ سے اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ مکہ معظّمہ پہنچے۔ حضرت شیخ الہندؒ وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ حکیم صاحب حضرت شیخ سے ہی وابستہ ہوگئے۔ حضرت ہی کے ساتھ مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ پہنچے۔ پھر حضرت رحمۃ اللہ کے ساتھ ہی اقامت اختیار کرلی۔ جو دوسرے مرحلہ میں رفاقت بن گئی جو آخر دم حیات تک قائم رہی۔ مکہ معظّمہ میں جب حضرت شیخ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس پہنچی تو حضرت شیخ قیام گاہ پر موجود نہ تھے۔ حکیم صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب وہاں حاضر تھے۔ ان دونوں کو حکم دیا کہ جہاں سے ممکن ہو مولانا کی آمد تک مکان میں مقید کردیا گیا۔ اور جب شام کے وقت تک مولانا کا پتہ نہ چلا تو جیسا کہ مولانا عزیر گل صاحب کے تذکرہ میں گزر چکا ہے۔ شریف نے حکم دیا کہ اگر عشا کے وقت تک مولانا آ موجود نہ ہوئے تو ان دونوں کو گولی مار دو۔ جب حضرت مولانا تشریف لے آئے تو ان چاروں حضرات (حکیم نصرت حسین صاحب، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا وحید احمد صاحب رحمہم اللہ اور مولانا عزیر گل صاحب کو اونٹوں پر سوار کر کے جدہ روانہ کردیا گیا۔

اس روانگی کے بعد مصر اور مالٹا پہنچنے کے حالات وہی ہیں جو حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عزیر گل صاحب کے تذکرہ میں گزر چکے ہیں۔ ان کے دُہرانے کی ضرورت نہیں، ان کے علاوہ کچھ خصوصی حالات ہیں جن کے متعلق سفرنامہ اسیر مالٹا کے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

(۱) مصر میں کال کوٹھریوں میں رکھا گیا اور بیانات لیے گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا مدنیؒ فرماتے ہیں:

''اخیر میں حکیم نصرت حسین صاحب کو بلایا۔ اور ان سے کہا کہ میں تمھاری نسبت کچھ ڈائری میں نہیں پاتا۔ انھوں نے کہا کہ جناب میں تو حقیقت میں ان جملہ اشخاص خصوصاً مولانا کی طرح بالکل بے قصور ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ مولانا بڑے آدمی ہیں۔ اس وجہ سے اصحاب اغراض کو ان سے اور ان کے خدام سے مقاصد اور اغراض ہیں۔ اس لیے مولانا کی نسبت افواہیں مشہور کی گئی ہیں۔ اور میں تو ایک سرکاری زمیندار آدمی ہوں۔ ہمیشہ مقدمہ بازی وغیرہ میں مبتلا رہا ہوں۔ مجھ پر گورنمنٹ کے بڑے بڑے احسانات ہیں۔ جن کو انھوں نے ذکر کیا اور کہا کہ مجھ کو تو بلاوجہ پکڑلیا گیا۔ میں مولانا کا شاگرد ہوں۔ اور مجھ کو مولانا کے احوال اور ان کے بدخواہوں کے احوال سے واقفیت ہے۔ میں بغرض حج و زیارت آیا تھا۔ بعد از حج بہ نیت زیارت مدینہ منورہ مولانا کے پاس ٹھہر گیا۔ شریف نے مجھ کو پکڑ کر بھیج دیا۔ شریف کی نسبت اور اس کی حکومت کے متعلّق اور گورنمنٹ سے اس کے ناجائز تعلقات کی برائی میں انھوں نے خوب تفصیلی بیان دیا۔ مگر بالکل خیرخواہانہ طریقہ پر۔ وہ مقدمہ بازی اور قانون وغیرہ سے واقف تھے۔ اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ آخر کار ان کو بھی کوٹھری میں سب سے آخر میں بھیجا گیا۔ مگر چونکہ کوٹھریاں فقط چار خالی تھیں۔ اور ہم پانچ آدمی تھے۔ اس لیے ان کی چارپائی مولانا مرحوم کی کوٹھری میں رکھی گئی۔ جس روز وہاں لائے گئے تو انھوں نے ہم سبھوں پر جو واقعات ہوئے تھے۔ مولانا کو اجمالاً سنائے اور کہا کہ اور باقی رفقا بھی ان ہی کوٹھریوں میں ہیں۔ وضو وغیرہ میں

> **گرفتاریوں کا علم ہوا تو ہندستان میں ان کی رہائی کے لیے کوشش کی گئی۔ جن حضرات کا تعلق حکومت سے تھا تو انھوں نے اپنے تعلّق سے کام لیا۔ حضرات علماء کا ایک وفد صوبہ یو.پی کے گورنر مسٹر مسٹن سے ملا اور رہائی کی سفارش کی۔ مسٹن گورنر کا چیف سکریٹری اپنے وطن لندن جارہا تھا۔ اس نے اسی کو مامور کیا کہ وہ مالٹا میں ٹھہرے اور ان حضرات سے گفتگو کرے اور ان کے خیالات و رجحانات کا جائزہ لے۔''**

اعانت بھی کی۔

ان حضرات کی گرفتاریوں کا علم ہوا تو ہندستان میں ان کی رہائی کے لیے کوشش کی گئی۔ جن حضرات کا تعلق حکومت سے تھا تو انھوں نے اپنے تعلّق سے کام لیا۔ حضرات علماء کا ایک وفد صوبہ یو. پی کے گورنر مسٹر مسٹن سے ملا اور رہائی کی سفارش کی۔ مسٹن گورنر کا چیف سکریٹری اپنے وطن لندن جا رہا تھا۔ اس نے اسی کو مامور کیا کہ وہ مالٹا میں ٹھہرے اور ان حضرات سے گفتگو کرے اور ان کے خیالات ورجحانات کا جائزہ لے۔''

چنانچہ مسٹر برن مالٹا پہنچا، اس نے ان حضرات سے گفتگو کی۔ حضرت مدنی اسی ملاقات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

## حکیم نصرت حسین صاحب کی استقامت:

سبھوں کے بیانات لکھنے کے بعد اس نے حکیم نصرت حسین صاحب کو بلایا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد یہ کہا کہ میں تم پر کوئی الزام نہیں پاتا۔ اور تم کو چھوڑ سکتا ہوں۔ ہندستان آپ ابھی جاسکتے ہیں۔ اسی کے قریب ان سے بہاء الدین انسپکٹر سی. آئی. ڈی نے جدہ میں بھی کہا تھا۔ مگر انھوں نے اس وقت بھی اکیلے چھوٹ جانے کی مخالفت کی تھی اور اب بھی کی۔ یہ کہا کہ آپ کو ہم سبھوں کو چھوڑنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں، مگر تمھارا امر میرے اختیار میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مولانا کو چھوڑ کر اگر ہندستان چلا گیا تو ہندستان والے مجھ کو کھا جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم مولانا کو پھنسوا کر اکیلے چلے آئے۔ میں اکیلا ہرگز نہیں جانا چاہتا۔ وہاں سے لوٹ کو جب آئے اور واقعہ بیان کیا تو مولانا نے اور ہم سبھوں نے بہت ان کو سمجھایا اور زور دیا کہ آپ ہندستان اکیلے جانے پر راضی ہوجایئے اور چلے جایئے۔ مگر انھوں نے ایک بھی نہ مانی۔ مولانا مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ آپ وہاں جاکر ہماری خلاصی کی کوششیں کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں تو ہماری ہر طرح سے ہاتھ پیر بندھے ہوئے پڑے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بھی نہ آیا۔ اور پھر تیسری مرتبہ جب وہ سخت بیمار ہوئے تب بھی مولانا مرحوم نے ان کو کہا۔ اور زور دیا کہ تم اپنی تبدیلی آب وہوا کی درخواست دے دو۔ انھوں نے جواب دیا کہ موت وحیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہوسکتا۔ خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے۔ نہایت مستقیم اور ایماندار شخص تھے۔

## مولوی حکیم نصرت حسین صاحب کا اشتغال:

حکیم صاحب موصوف نہایت سلیم الطبع، ذکی القریحہ مستقیم الاوقات تھے۔ انھوں نے علم حدیث وغیرہ دیوبند میں پڑھا تھا۔ باقی کتابیں لاہور، کانپور، دہلی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ دیوبند سے تکمیل کے بعد لکھنؤ وغیرہ میں طب کی تکمیل کی۔ جلسہ دستار بندی دیوبند میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ساتھ دورہ میں شریک تھے۔ اسی زمانہ جلسہ میں مولانا مرحوم سے بیعت بھی ہوئے تھے۔ اپنے والدین کے اِکلوتے بیٹے تھے۔ گھر پر جاکر زمینداری کے انتظامات اور مطب میں مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں انگریزی بھی کچھ پڑھ لی مگر مشق پوری نہ تھی۔ اس سفر میں بولتے بولتے اچھی طرح کام نکالنے لگے تھے۔ تقویٰ طبیعت میں ابتدا ہی سے تھا۔ اس لیے نمازوں کو ہمیشہ اوّل وقت پر پڑھتے تھے۔ تہجد کا بہت ہی زیادہ خیال تھا۔ فضولیات کی طرف طبیعت کو رغبت نہ تھی۔ اسلام کا درد اور وطن اور قوم کی محبت نہایت زیادہ تھی۔ سیاسی امور میں پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندستان کی آزادی کی ہمیشہ دھن لگی رہتی تھی۔ نہایت معزز خاندان کے نونہال تھے کوڑا جہان آباد (ضلع فتح پور ہسوہ) ان کا آبائی وطن ہے۔ جب یہ نظر بند ہوگئے تو ان کو جدہ ہی سے خیال ہوا کہ اس وقت کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔ بلکہ سلوک طریقت کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا مرحوم سے اس کی درخواست کی۔ مولانا نے کوئی ذکر مناسب تعلیم فرمایا۔ چنانچہ انھوں نے نہایت پابندی سے جملہ امور تعلیم کردہ مولانا مرحوم پر عمل کرنا شروع کیا۔ عموماً ہر وقت ذکر اسم ذات جاری رہتا تھا۔ اور کچھ اوقات معینہ میں مراقبہ وغیرہ بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اسی طرح ہمیشہ اپنے کام میں مشغول رہتے اور اپنی جملہ کیفیات مولانا مرحوم سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ بعد مولانا مرحوم کے ہماری جماعت میں کوئی بھی بااوقات شب خیز تہجد گزار، ان سے زیادہ نہ تھا۔ بلکہ تمام کیمپ اسرانِ مالٹا میں بھی کوئی ایسا نہ تھا۔ مولانا کی نظر عنایت بھی ان پر بہت تھی۔ ان کو ضعف معدہ کی شکایت بھی تھی۔ اور ہمیشہ گھر پر بھی بخار وغیرہ میں مبتلا رہتے تھے۔ یہ اپنے اوقات۔ قرآن شریف دلائل الخیرات، ذکر مراقبہ وغیرہ میں صرف کرتے تھے۔ ڈاکٹر غلام محمد کے چلے جانے کے بعد ایک مدت تک شام کا کھانا بھی پکاتے تھے۔ اور خود اپنی خواہش اور اصرار سے اس کا ذمہ لیا تھا۔ میں نے کوئی زور ان پر نہ ڈالا تھا اور نہ ڈاکٹر غلام محمد پر، ان کی طبیعت کچھ عرصہ کے بعد مالٹا میں خوب سنبھل گئی تھی۔ اور جو شکایتیں ان کو ضعف معدہ اور بخار وغیرہ کی تھیں جاری رہی تھیں۔ مگر ماہ رجب

۱۳۳۶ھ سے ان کو جب تپ ولرزہ کے دورے شروع ہوئے تو خیال کیا گیا کہ معمول جیسے ہمیشہ ان کو اس قسم کے دورے ہوا کرتے تھے۔ ویسے ہی ہیں، نہ انھوں نے کوئی فکر کی اور نہ دوسرے لوگوں نے، یہی حال تمام شعبان رہا۔ رمضان آنے پر انھوں نے روزے بھی رکھے۔ اواخر رمضان میں بہ مجبوری ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے مختلف دوائیں استعمال کرائیں۔ جن کو حکیم صاحب بوجہ رمضان شریف دن کو استعمال نہ فرماتے تھے۔ بلکہ شب کو استعمال کرتے تھے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عید کے بعد پھر ڈاکٹر آیا اور اس نے کہا کہ ان کو اسپتال جانا چاہیے۔ ہم نے زور دیا کہ ان کو یہیں رکھا جائے مگر اس نے کہا کہ یہاں باقاعدہ علاج نہیں ہوسکتا۔ اب تک کیا گیا مگر کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوا۔ وہاں جانا ضروری ہے۔ ہم نے جب دیکھا کہ یہ صورت نافع نہیں ہے تو درخواست کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس نے کہا کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ خلاف قاعدہ ہے۔ اور پھر ایک کے ساتھ کیا دوسرا بھی مریض ہوگا۔ الغرض ان کو وہاں پہنچا دیا۔ ہم نے آفس میں اس کے متعلق درخواست کی کہ یا تو ہم میں سے ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے ورنہ کم از کم روزانہ ہم کو ان سے ملنے اور ان کی خبر گیری کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے اوّل بات کی تو اجازت نہ دی مگر یہ کہا کہ ہر تیسرے دن تم جا کر دو بجے کے بعد مل سکتے ہو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد جس کو ان کی روانگی سے پانچ چھ دن کے بعد ہم حاصل کر سکے تھے۔ ہم وہاں گئے۔ مگر ان کی حالت بہت گری ہوئی اور کمزور پائی۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی ایک بڑی جماعت جس میں بڑے بڑے آفیسر ہیں ان کی مداواۃ میں مشغول ہیں اور بہت توجہ سے کام کر رہے ہیں۔ جو میم کمپونڈری اور دوسری ضرورتوں کو انجام دیتی تھی۔ وہ ان پر خاص طور سے مہربان ہے۔ جس کی وجہ ان کا انگریزی جاننا اور برٹش رعیت ہونا ہے۔ کیونکہ اس تمام ہال میں سب غیر برٹش رعایا بلکہ دشمنان برطانیہ تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں تمھارے لیے یخنی اور دوسری مقوی دوائیں جن میں شراب کا جوہر پڑتا ہے، دوں گی۔ جس سے تمھاری صحت بہت جلد کامل ہو جائے گی۔ مگر انھوں نے یخنی اور ایسی مقوی دواؤں سے انکار کر دیا کہ ہمارے مذہب میں یہ چیزیں حلال نہیں۔ اس نے نہایت افسوس کیا۔ پھر ہم کو وہاں سے حکم آیا کہ تم خود مرغی ذبح کر کے اس کی یخنی بھیجا کرو۔ چنانچہ ہم نے اس کا انتظام کر دیا۔ اور روزانہ بھیجتے رہے۔ جو لوگ اس ہال میں بیمار تھے ان میں بعض مسلمان بھی تھے اور بعض عیسائی تھے۔ مگر اکثر حصہ عیسائیت کا تھا جن میں سے بعض سے قدرے واقفیت بھی تھی۔ اور ان میں مادہ انسانیت کا بہت زیادہ تھا، ان کی صحت بھی تقریباً کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں نے بہت اچھی طرح حکیم صاحب کی خبر گیری کی۔ حکیم صاحب نے کچھ نقد بھی لیا کہ خدام کو برابر دیتے رہیں گے۔ تاکہ خبر گیری اور خدمت پوری طرح سے ہو۔ ہم کو کبھی امید ان کی صحت کی بن جاتی تھی اور کبھی خوف بھی ہوتا تھا۔ مگر اواخر شوال میں ان کی حالت زیادہ گرنے لگی۔ اس وقت ہم نے آفس سے درخواست کی۔ کہ ہم کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اور حکیم صاحب سے بھی طلب کرایا۔ مگر اس کا جواب آنے میں بہت تاخیر ہوئی۔ غالباً ۲ ذی قعدہ کو اجازت ملی۔ مگر فقط تحریری اجازت تھی۔ جب ہم نے چاہا تو ایک دو دن کی تاخیر افسروں کے نہ موجود ہونے یا کسی اور عذر سے کرا دی گئی۔ نویں تاریخ کو جب ہم اجازت لینے گئے تو ہم کو خبر دی گئی کہ ان کا شب کو صبح کے قریب انتقال ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

**حکیم صاحب موصوف نہایت سلیم الطبع ، ذکی القریحہ مستقیم الاوقات تھے۔ انھوں نے علم حدیث وغیرہ دیوبند میں پڑھا تھا۔ باقی کتابیں لاہور، کانپور، دھلی وغیرہ میں پڑھی تھیں۔ دیوبند سے تکمیل کے بعد لکھنؤ وغیرہ میں طب کی تکمیل کی۔ جلسہ دستاربندی دیوبند میں ان کی دستار بندی ہوئی۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ساتھ دورہ میں شریک تھے۔ اسی زمانہ جلسہ میں مولانا مرحوم سے بیعت بھی ہوئے تھے۔**

اس سے تقریباً دو روز پہلے بھی حسبِ عادت ہم گئے تھے۔ ان ایام میں ان کو سانس بہت زور سے اور جلدی جلدی آیا کرتا تھا۔ ہوا کے لیے برقی پنکھا ان کے آگے رکھا رہتا تھا۔ وہ اکثر تکیوں کے سہارے پر کمر لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ وفات سے ایک دن پہلے جب ہم گئے تھے تو آواز بہت پست پائی تھی۔ مگر وہ خود اطمینان سے تھے کسی قسم کی گھبراہٹ ان کو نہ تھی۔ ان کا رُخ قبلہ کی طرف ایک عرصہ سے اس وجہ سے کر دیا گیا تھا کہ ان کو اٹھنے اور چلنے کی اجازت ڈاکٹروں کی طرف

سے نہ تھی۔اس لیے ان کو نماز پڑھنا چار پائی ہی پر اشاروں سے پڑتا تھا۔جس کی وجہ سے چار پائی ہمیشہ رو بقبلہ رہتی تھی۔مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ رات کو چار پائی سے اُتر کر خفیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔(واللہ اعلم) انھوں نے جب جب جانا ہوا تو کہا کہ ذکر برابر جاری ہے۔اور تعلّق خداوند ذوالجلال سے بندھا ہوا ہے۔وللہ الحمد والمنتہ۔

چونکہ مرحوم کا مرض نمونیہ تجویز کیا گیا تھا اور وہ امراض متعدیہ میں سے ہے۔اس لیے کمانداراسرا نے مولانا مرحوم کو اور ہم کو بلا کر کہا کہ حکیم صاحب مرحوم کی نعش تم کو قبرستان میں ملے گی۔لیکن تم فقط دور سے نماز پڑھ لینا۔تابوت کے پاس بھی مت جانا۔ہم نے اصرار کیا کہ ہم کو غسل دینا،کفن پہنانا ضروری ہے۔اس نے کہا کہ ڈاکٹر کا حکم ہے کہ ان کے پاس بھی کوئی نہ جائے۔ہم نے کہا کہ ہم کو شریعت کا حکم ہے غرضیکہ اس بارے میں مولانا مرحوم کی کماندار سے بہت زیادہ ردوقدح ہوتی رہی۔ جب اس نے زیادہ ردوقدح کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی ردوقدح پر بھی راضی نہ ہوا تو ہم نے کہا۔اچھا ہم نہ نہلائیں گے۔مگر کفن تو پہنادیں۔ بڑی مشکلوں سے جب وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا تو مولانا خفا ہو کر کہنے لگے کہ جب آپ کو ہمارے مذہبی ضروریات پر ادنیٰ توجہ نہیں تو پھر ہم کو کیوں بلایا،خود ہی جو چاہتے تھے کر دیا ہوتا۔یہ کہا اور لوٹ جانے کے لیے آمادہ ہوگئے۔اس وقت اس نے اجازت دی۔مولانا مرحوم نے فرمایا کہ اس بہانہ سے ہم ان کو تیمّم کرادیں گے اور کفنا بھی دیں گے۔اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شفاخانہ میں ان کو اپنے طریقہ پر دوا کے پانی سے ڈاکٹروں نے خوب نہلایا تھا۔مولانا نے فرمایا کہ وہ کافی تھا۔مگر ہم چاہتے تھے کہ طریق مسنون پر ان کو نہلائیں۔

خلاصہ یہ کہ ان کے لیے مقبرہ میں جانے کے واسطے ہم نے تقریباً پچاس یا ساٹھ آدمیوں کی اجازت طلب کی۔کماندار نے اجازت دے دی۔ہم سب وہاں گئے ایسا اجتماع کسی شخص کے جنازہ میں وہاں نہیں ہوسکا تھا۔ان کو تیمّم کرا کے کفنایا گیا۔اور پھر مولانا مرحوم نے بادل غمگین نماز پڑھائی۔اور دروازہ کے قریب ہی ان کی قبر کھودی ہوئی تیار تھی۔اس میں دفن کر دیئے تھے۔ان کے مصارف جو کچھ وہاں ہوئے تھے وہ تو ہم نے اپنے پاس سے دیئے ہی تھے۔مگر گاڑیوں کا کرایہ کرنیل اشرف بیگ نے جو کئی پونڈ کی مقدار میں ہوتا تھا۔بغیر ہماری اطلاع کے دے دیا۔ان کی قبر پر جو کہ مثل دیگر قبور کے خام ہے۔حسبِ رائے مولانا مرحوم ایک پتھر لگا دیا گیا ہے جس پر ذیل کی عبارت کندہ ہے۔

**ھذا قبر الحکیم السیّد نصرت حسین من اھل کوڑا جھان آباد الھند. اسربمکۃ المکرمۃ مع حضرت العلامۃ مولانا شیخ الھند محمود حسن صدر مدرسین بکلیۃ دیوبند فی الحرب العمومی و توفی اسیرافی تاسع ذی قعدہ سنہ ۱۳۳۷ ھ من ھجرۃ النبی سیّدنا محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم رحمۃ اللّٰہ رحمۃ واقعۃ ولہ الفاتحہ.**

اس پتھر کو کرنیل اشرف بیگ ہی نے کندہ بھی کرایا تھا اور لگوایا بھی تھا۔کیونکہ اس نے ایک بڑی مقدار نقود کی خرچ کر کے بطور یادگار جملہ اسرانِ مدفونین کے لیے پتھر کندہ کرائے تھے۔اور بیچ میں ایک مربع ستون پتھر کا جس میں سنگِ مرمر پر جملہ ان ترکی اسرا کا نام کندہ تھا۔ جو کہ ایام اسارت جنگ عمومی میں وہاں مدفون ہوئے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ کی تحریک ریشمی رومال کیا تھا؟ اس کا پس منظر کیا تھا؟ اور اس کو برطانوی حکومت کے محکمہ خفیہ نے کس نظر سے دیکھا؟ اس تحریک میں شریک لوگوں کو کس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔ان پر مقدمہ چلایا۔اور اس مقدمہ میں ملوث لوگوں کے بیانات اور محکمہ خفیہ کی رپورٹوں میں اس کا جواب موجود ہے۔جو آپ (مولانا سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ایک دوسری تصنیف 'تحریک شیخ الہندؒ' میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ان رپورٹوں کے اُردو ترجمہ کے ساتھ مولانا مرحوم کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔جس میں اس تحریک سے متعلق مختلف نکات کی وضاحت کی گئی ہے اور امید ہے کہ یہ کتاب اس تحریک سے دلچسپی رکھنے والے تاریخ کے طلبا اور محققین کے لیے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

مصنّف رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری تصنیف 'سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کو خود مصنّف نے اپنی 'زندگی کا شاہکار' فرمایا ہے۔یہ تصنیف مصنّف کے وسیع مطالعہ اور سالہا سال کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔جس میں علم کے اس بحر ذخار کے پوشیدہ خزانے پوری طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔سیرت مبارکہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔لیکن یہ تصنیف اس اعتبار سے نرالی ہے کہ اس میں سرورِ کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبلیغی اور اخلاقی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔□□

# ریشمی رومال پر ڈاک ٹکٹ کا اجراء

نئی دہلی ۱۱؍جنوری ۲۰۱۳ء: (رپورٹ)

آج وگیان بھون نئی دہلی میں شیخ الہند ٹرسٹ اور یونیورسل ایسوسی ایشن آف اسپرچول اویرنیس کے زیر اہتمام جشن صد سالہ تحریک شیخ الہند کے ۶۰؍ ویں اجلاس کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں مشہور مفکر اسلام، مجاہد آزادی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تحریک ریشمی رومال پر ڈاک ٹکٹ کی رسم اجراعمل میں آئی۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے ٹکٹ جاری کرنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب شیخ الہند کے بارے میں سوچتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی میدانوں میں اولیت کا شرف رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند جسے ہندستان میں ایشیا کی الازہر یونیورسٹی کہا جاتا ہے اس کا آغاز پہلے طالب علم کی حیثیت سے ان سے ہی ہوا تھا، پھر وہ اس ادارے کے صدر مدرس بنے۔ تعلیم کو انھوں نے رسمی دائروں میں قید نہ رہنے دیا بلکہ اسے غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک مشن کے طور پر فروغ دیا وہ اپنے شاگردوں کو علم کا جوہر بھی عطا کرتے تھے اور ساتھ ہی برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کا پرعزم حوصلہ بھی۔ ریشمی رومال ان کے جذبۂ حریت کی جیتی جاگتی نشانی ہے، یہ شیخ الہند کی تعلیم اور سوچ کا ہی نتیجہ تھا کہ اس وقت کے مشاہیر علماء جمعیۃ علماء ہند کے جھنڈے تلے مشترکہ قومیت اور متحدہ ہندستان کی ہمیشہ وکالت کی اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کو ہر وقت تیار رہے۔ ایک ایسے وقت میں جب مغرب سے متاثر کچھ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نعرہ لگا رہے تھے کہ قومیں مذہب سے بنتی ہیں تو یہ شیخ الہند کے ہی تربیت یافتہ مولانا حسین احمد مدنی تھے جنھوں نے ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ قومیں مذہب سے نہیں وطن سے بنتی ہیں۔ انھوں نے مسلم علماء کے کردار کی سراہنا کرتے ہوئے اس کے ماضی کو تابناک قرار دیا۔ اس موقع پر مولانا نیاز احمد فاروقی نے محترمہ سونیا گاندھی کا خط پڑھ کر سنایا جس میں انھوں نے شیخ الہند کی تحریک کی ستائش کرتے ہوئے ڈاک ٹکٹ کے اجرا پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔

وزیر مواصلات کپل سبل نے اپنے خطاب میں کہا مجھے فخر ہے ہندستان میں مولانا محمود حسن دیوبندی جیسی شخصیت پیدا ہوئی، ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ بات وعدوں کی نہیں بات جذباتوں کی ہے، بات انصاف کی ہے، اگر تاریخ میں نمایاں کردار ادا کرنے والوں کا نام نہ لیا جائے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی، وہ ماحول میں شیخ الہند افغانستان گئے، جس طرح وہ ہندستان کے بارے میں سوچ رہے تھے اس طرح سے ہم ہندستان کے بارے میں نہیں سوچتے، ہمارا یہ عزم ہونا چاہیے کہ جیسا انھوں نے ہندستان کے بارے میں سوچا تھا، وہ ہندستان بنانے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔ شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال پر تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ شیخ الہند نے ہی مہاتما گاندھی کو مہاتما کا خطاب دیا تھا، آج تک مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمود مدنی ملک کی خدمت کررہے ہیں، میرا ماننا ہے کہ اگر ہندستان برقرار رہے گا تو اسی شیخ الہند کے نظریے کے مطابق برقرار رہے گا۔ لڑائی ان طاقتوں کے خلاف ہونی چاہیے جو بربادی کی طرف چلتی ہے، ایسی طاقتوں کے خلاف مولانا شیخ الہندؒ کی شخصیت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جو کام جمعیۃ علماء ہند نے کیا اس وقت ہندستان کو برقرار رکھنے کے لیے وہ قابل تعریف کام تھا اور جو آج کررہی ہے وہ بھی قابل تعریف ہے، آئیے ہم ان بزرگوں کی قربانیوں سے روشنی حاصل کرکے آج عہد کریں ہم آگے بڑھنے کے لیے مل کر کام کریں۔

جمعیۃ علماء ہند کے صدر مولانا قاری سید محمد عثمان منصورپوری نے تقریر تہنیت میں کہا آج ہمارے لئے بہت خوشی کا موقع ہے کہ حکومت ہند نے تحریک آزادیٔ ہند کے ایک عظیم رہنما شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کے اعتراف میں ''یادگاری ڈاک ٹکٹ'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے، حکومت ہند کا یہ اقدام یقیناً قابل قدر اور قابل ستائش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس قدم سے بزرگوں کے کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا راستہ کھلے گا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی وسیع تر علمی اور قومی خدمات اس قابل ہیں کہ انہیں یاد رکھا جائے اور نئی نسل کو ان سے روشناس کرایا جائے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ محبان وطن میں حضرت شیخ الہندؒ کا نام سرفہرست رکھا جائے، اور ان کا تعارف سرکاری نصاب میں شامل کیا جائے۔

مولانا محمود مدنی نے کہا کہ سوال صرف ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کا نہیں بلکہ اس سوچ کا ہے، وہ سوچ جو سو سال سے ان بزرگوں کی خدمات کو نظر انداز کرتی ہے، کو شکست دے کر یہ ٹکٹ جاری کیا جارہا ہے، انھوں نے اس

کے لیے کپل سبل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر چہ ٹکٹ ان بزرگوں کے نام پر جاری کیا گیا ہے، لیکن تاریخ کا حصہ کپل صاحب بھی بن رہا ہے۔ ہم سب لوگوں کو کپل صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، پھر اس خوبصورت موقع کو مزید خوبصورتی عطا کی صدر جمہوریہ ہند نے، یہاں پر مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنما موجود ہیں، آواز چھوٹی تھی، لیکن شخصیت بڑی تھی ،اس لیے پورا ملک یہاں جمع ہو گیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ملک کی آزادی کا جو نقشہ پیش کیا تھا، اگر انڈیا اس روڈ میپ سے ہٹے گا تو میں کہتا ہوں کہ ہندستان کبھی ترقی نہیں کرے گا، ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم ہر چیز برداشت کرلیں گے لیکن جوش، جنون میں کوئی غلط مظاہرہ نہیں کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آگے بھی ڈاک ٹکٹ کے ذریعے ہم ملک کے جیالوں کو یاد کریں گے۔ انھوں نے مفتی کفایت اللہ، مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا اسعد مدنیؒ جیسے شیخ الہند کے جاں نثاروں کے لیے بھی ٹکٹ جاری کرنے کا مطالبہ کیا، پنڈت این کے شرما نے صدر جمہوریہ کو چادر او پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔ جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر اختر الواسع جامعہ ملیہ اسلامیہ نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز مفتی عفان منصور پوری کی تلاوت سے ہوا۔

دیگر خطاب کرنے والوں میں مفتی سلمان منصور پوری، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر سید فاروق، قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ وجاہت حبیب اللہ، نجیب جنگ وی سی جامعہ ملیہ اسلامیہ، ضمیرا لدین شاہ وی سی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اقلیتی وزیر کے رحمٰن خاں، مولانا عبدالخالق مدراسی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، جناب عزیز قریشی گورنر اتراکھنڈ، پنڈت این کے شرما کے نام اہم ہیں۔ دیگر اہم شرکاء میں، مفتی سلمان منصور پوری ،مولانا عبدالخالق سنبھلی، مولانا مجیب اللہ گونڈوی دارالعلوم دیوبند، حاجی جمال، نواز دیوبندی، مولانا حیات اللہ قاسمی، مولانا صدیق اللہ چودھری، مولانا قاری شوکت علی ویٹ، مولانا حکیم الدین قاسمی ، جمعیۃ اہل حدیث کے ناظم عمومی مولانا اصغر علی مہدی، حافظ پیر شبیر، مولاا قبال قاسمی، کمال فاروقی، سراج الدین ہاشمی، مولانا حسیب صدیقی، مولانا متین الحق اسامہ قاسمی، مولانا علی حسن، مولانا ظہور احمد، مولانا محمد مدنی، مولانا عبدالرحمٰن سمیت بیرونی ممالک کے سفراء اور بڑی تعداد میں جمعیۃ علماء ہند کے اہم ذمہ داران اور مدارس کے علماء بھی شریک ہوئے۔

❑❑

# شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر ڈاک ٹکٹ

نئی دہلی ۲۷/ اگست ۲۰۱۲ء: (رپورٹ)

آج اسٹین آڈیٹوریم انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر نئی دہلی میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام منعقد ایک تقریب میں وزیر مواصلات کپل سبل کے ہاتھوں ایک قومی نظریہ کے بانی اور مشترکہ قومیت کے علم بردار، دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث، جمعیۃ علماء ہند کے معمار و صدر اور دنیا بھر میں لاکھوں انسانوں کے مربی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر ڈاک ٹکٹ کی رسم اجرا عمل میں آئی، اس موقع پر جناب کپل سبل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے کہا کہ یہ ہمارا دیرینہ مطالبہ رہا ہے کہ اکابر آزادی کی تاریخ کو زندہ کیا جائے اور اس کو داخل نصاب کرکے نئی نسل کو واقف کرایا جائے، اس سلسلے میں وعدے بھی ہوئے، ۲۰۰۵ء میں اس وقت کے وزیر صاحب نے بھی وعدہ کیا تھا، لیکن یہ سعادت کپل سبل صاحب کو حاصل ہوئی، ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور شکریہ بھی ادا کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ جس فکر کو لے کر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کے شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ کھڑے ہوئے، اہل علم اور تاریخ دانوں کو معلوم ہے کہ

انھوں نے کن حالات میں قران وحدیث کی روشنی میں دوقومی نظریہ کی مخالفت کی، انھوں نے متحدہ قومیت کو ثابت کرنے میں اور اسے عملی طور سے منوانے میں جو قربانیاں دیں اس کا یہ مقام نہیں ہے کہ ان کو فراموش کردیا جائے، ان کی وراثت جو جمعیۃ علماء ہند کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے، آج بھی یہ جماعت اس پر کاربند ہے اور ان شاء اللہ آگے بھی کاربند رہے گی۔ میرا ماننا ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں اگر آج بھی حضرت مولانا مدنیؒ کے افکار و نظریات کی روشنی میں اقدام کیا جائے تو پچاس فی صد سے زائد دشواریوں کا حل نکل آئے گا، مولانا مدنی نے کپل سبل کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے ہمارے بزرگوں کی قربانی کو یاد کرنے کی طرف جو پیش قدمی کی ہے، اسے درمیان نہ چھوڑیے گا بلکہ اسے منزل پر ضرور جانے دیجیے گا، مجھے یقین ہے بہت جلد شیخ الہند پر ڈاک ٹکٹ جاری ہوگا بلکہ ان کی خدمات کو بھی داخل نصاب کیا جائے گا۔ اگر ان بزرگوں کی خدمات کو نصاب میں داخل کرکے نئی نسل کو واقف کرایا جائے تو مسلمان یہ محسوس کریں گے کہ ہمارے بزرگوں نے بھی ملک کے لیے قربانی دی ہے، اس سے ان کے اندر بھی حوصلہ پیدا ہوگا اور وہ بھی پرینا

پا کر ملک کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہوں گے، انھوں نے سبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے، مجھے یہاں کی مٹی میں جو خوشبو ملتی ہے وہ ترقی پذیر ممالک کے پھولوں میں بھی نہیں ہے، لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ جنون ہے مگر مجھے یہ جنون عزیز ہے۔

ٹکٹ جاری کرنے سے قبل اپنے خطاب میں کپل سبل نے کہا کہ کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ کسی نامور تنظیم کے نام پر ٹکٹ جاری کیا جاتا ہے، کبھی کسی فرد کے بڑے کارنامے کی وجہ سے ٹکٹ جاری کیا جاتا ہے، لیکن تاریخ میں ایسا موقع بھی آتا ہے جب ہم ان کو یاد کرتے ہیں جن کو یاد کرکے ہمارا سر اونچا ہو جاتا ہے، آج ہم ایک ایسی ہی شخصیت کو یاد کررہے ہیں، آج ہمارا سر فخر سے اونچا ہے، مولانا حسین احمد مدنیؒ تاریکی میں ایک روشن چراغ تھے، یہ تاریکی ۱۹۴۷ء میں پھیلی تھی، اس وقت ان چند لوگوں کی ضرورت تھی جو ہمیں اس تاریکی سے نکال سکے۔ مولانا مدنی ان ہی چند تاریخ ساز لوگوں میں سے تھے، انھوں نے بادِ مخالف کی پروا کیے بغیر بٹوارا کی مخالفت کی، انھوں نے کرپس مشن کی مخالفت کی، وہ مالٹا کے قیدی بھی تھے۔ کپل سبل نے کہا کہ آج جب ملک پھر تاریکی میں ہے، آج پھر مولانا مدنی کی فکر کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے، ان کے لڑکے مولانا اسعد مدنیؒ بھی ان کے راستے پر چلے اور آج ہمارے درمیان مولانا محمود مدنی ہیں جو اسی سوچ کی روشنی میں جدوجہد کررہے ہیں، ہم عہد کریں کہ مولانا مدنی کی روشنی کو آگے بڑھائیں گے اور اس دیش کو ایسا بنائیں گے کہ اس دیش میں صرف پیار بسے، یہ دیس انسانیت کی مثال بن جائے، میں خود کو کسی شکریہ کا مستحق نہیں سمجھتا، ہمیں پہلے ہی یہ کام کرنا چاہیے، ہمیں آگے اس دیش کے بچوں کو یاد کرانا ہے کہ ہمارے رگوں میں خون ایک ہے، ہمارا دیش بھی ایک ہے اور ہمیں اس وطن میں یہ بھی دکھانا ہے ہم سب ایک ہیں۔

مرکزی وزیر سبودھ کانت سہائے نے اپنے خطاب میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی کو مبارکباد دی کہ وہ مولا حسین احمد مدنیؒ کے ایک قومی نظریہ کو آگے بڑھارہے ہیں، انھوں نے کہا کہ ان کے نظریات میں سچا اسلام جھلکتا تھا، آج ہندستان میں جمعیۃ علماء ہند وہ تنہا جماعت ہے جو ان کے پیغام کو آگے بڑھا رہی ہے۔ سابق راجیہ سبھا اسپیکر کے رحمٰن خان نے کپل سبل کی پہل کی تحسین کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ دیگر بزرگوں کے نام بھی ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے۔ سماجی کارکن مہیش بھٹ نے ایک واقعہ ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مولانا حسین مدنیؒ کو جب گرفتار کرکے لے جایا جارہا تھا تو ایک انگریز نے مشورہ دیا کہ آپ یہ کرلو جان بچ جائے گی تو مولانا مدنیؒ نے کہا کہ بھائی میں تو اپنے ساتھ کفن لے جارہا ہوں، یہ واقعہ میرے دل میں گھر کرگیا ہے، آج جس طرح فرقہ پرستی کا زور ہے، جس طرح آسام میں اقلیتوں پر مظالم ہوئے ہیں اس کا حل یہی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے نظریے کو فروغ دیا جائے، مجھے خوشی ہے کہ مولانا مدنی کے رخ پر آج کی جمعیۃ علماء ہند چل رہی ہے۔ مشہور شاعر گلزار دہلوی نے حضرت مدنی سے اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شان میں ایک نظم پیش کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ہیڈ اختر الواسع نے پروگرام کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا حسین مدنیؒ متحدہ قومیت کے علمبردار تھے، آج صرف یہ ٹکٹ نہیں ہے بلکہ ان کی فکر پر اسٹمپ ہے اور یہ پیغام ہے ملک کی بھلائی اس کے ان نظریہ پر چل کر ہی ممکن ہے۔ مولانا مدنی وہ تھے جنھوں نے اپنے گھروں میں تاریکی رکھی لیکن ہمارے گھروں کو اجالا کردیا، مولانا مدنی کے نام سے یہ پروگرام ایک تحریک کی یاد تازہ کرتی ہے، جس کی اساس پر آج کی جمہوریت قائم ہے اور ہماری زندگی کی روح اور ہمارے ملک کے اتحاد کا سبب ہے۔

اخیر میں تقریب کی صدارت کررہے ہیں مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری نے کہا کہ یہ پروگرام صرف ڈاک ٹکٹ کا اجرا نہیں ہے بلکہ ایک عنوان ہے، اپنے بڑوں کی خدمات کو جو قوم یاد رکھتی ہے تو انھیں راستہ ملتا ہے اور جو بھلا دیتے ہیں وہ راہوں میں بھٹک جاتی ہے، اس لیے جن لوگوں نے ملک کے لیے قربانیاں دیں ہیں، یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان کی خدمات کو محفوظ کرے، آج سرکار نے اپنی ذمہ داری پوری کی ہے، انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کی قربانیوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ملک میں دہشت گردی اور فرقہ پرستی سے جمعیۃ علماء ہند ہر سطح پر نبرد آزما ہے، صدر جمعیۃ علماء ہند کی دعاء پر ہی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

دیگر خطاب کرنے والوں میں پنڈت این کے شرما بانی یونیورسل ایسوسی ایشن مشہور شاعر گلزار دہلوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، جامعہ ملیہ کی پروفیسر سنیتا دیوی نے مولانا مدنی کی زندگی پر ایک مقالہ پیش کیا۔ کپل سبل کو مولانا ندیم صدیقی مہاراشٹرا، کمال فاروقی اور دھیرج شرما نے گلدستہ کو پیش کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام اس تقریب میں سیف الدین سوز، حسین دلوائی، سنتوش بٹوریا، جماعت اسلامی ہند کے مجتبیٰ فاروق، جمعیۃ اہل حدیث کے ناظم عمومی مولانا اصغر علی مہدی، مولانا عبدالوہاب خلجی، مولانا اسرار الحق قاسمی، تسلیم رحمانی سمیت سینکڑوں ملی وسیاسی رہنما شریک ہوئے۔ اخیر میں مولانا نیاز احمد فاروقی رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے پروگرام کے منتظمین اور آنے والے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا، نظامت کے فرائض پروفیسر اختر الواسع نے انجام دیے۔ □□

# رپورتاژ

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام پورے سال ریشمی رومال تحریک کو بطور یادگار تحریک منایا گیا اور ملک کے طول وعرض میں اس سلسلہ کی ایک سو کانفرنسیں منعقد کی گئیں جن میں سے چند اہم کانفرنسوں کی رپورٹ پیش کی جارہی ہیں۔

# شیخ الہندؒ آزادیٔ وطن کی لڑائی کے ایک عظیم ہیرو تھے: مولانا محمود مدنی

## تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے پر جمعیۃ علماء گجرات کی جانب سے سیمینار کا انعقاد

احمد آباد: تحریک آزادی میں انتہائی اہمیت کی حامل شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کے ایک سو سال مکمل ہونے پر جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام اور جمعیۃ علماء صوبہ گجرات کی جانب سے ایک پر وقار سمینار احمد آباد شہر کے تاریخی سردار ولبھ بھائی میموریل ہال شاہی باغ پرانا گورنر ہاؤس میں مولانا محمد رفیق بڑودوی (صدر جمعیۃ علماء گجرات) کی زیر صدارت قاری نور محمد صاحب کی تلاوت کلام پاک سے صبح ساڑھے نو بجے منعقد ہوا۔ اس سمینار سے گجرات کی گورنر عزت مآب ڈاکٹر کملا جی نے تفصیلی خطاب کرتے ہوئے آزادی ہند کی جنگ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آزای کے حصول کے لئے لوگوں نے گولیاں اور لاٹھیاں کھائیں، پھانسیوں کے پھندے چومے لیکن جنگ آزادی کے مورچے کو سنبھالا۔ ہمیں چاہئے کہ ملک کے آزادی کے لئے قربانیاں دینے والوں کو یاد رکھیں اور اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کو طے کریں اور ملک کو متحد اور مستحکم رکھنے کی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اس ملک میں بھائی چارہ کا قیام ہر شہری کی ذمہ داری ہے ہر ظالم کو کیفر کردار تک پہنچانا اور ہر مظلوم شہری کو اس کا حق دلوانا بھی ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

محترمہ گورنر گجرات نے اپنی تقریر میں اپنے بچپن کے واقعات اور حوالوں سے کہا انگریزوں کی غلامی سے ہمارے ملک کو آزاد ہوئے چونسٹھ سال ہو رہے ہیں اور اس آزادی کے حصول کے لئے مولانا محمود حسن دیوبندی نے آج سے ایک سو سال قبل ریشمی رومال تحریک چلائی تھی جو کہ جنگ آزادی کا ایک عظیم الشان سنہرا باب ہے۔ ۸۵ر سالہ محترمہ کملا جی نے اس پروگرام کے انعقاد پر جمعیۃ علماء ہند اور صوبہ گجرات کے ذمہ داران کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے مولانا محمود حسن دیوبندی، ڈاکٹر بدرالدین طیب جی، حضرت حسرت موہانی، سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، رفیع احمد قدوائی، مولانا اسعد مدنی وغیرہ کے نام لیکر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تمام مجاہدین آزادی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ آج مجھے بہت فخر ہو رہا ہے کہ میں جمعیۃ علماء ہند کے اس پروگرام میں شریک ہوئی، مولانا محمود مدنی جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سماج میں بیداری پیدا کرنے اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے آپ کا یہ اقدام انتہائی قابل تحسین ہے۔ ہمارے بڑوں نے جنگ آزادی کی تحریک کھڑی کر کے سماج میں ایک بڑی بیداری جگائی اور مسلمانوں نے بھی بابائے قوم گاندھی جی کی آزادی کی تحریک کو مکمل تعاون دیا تھا گورنر صاحبہ سے قبل جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری وقائد مولانا سید محمود مدنی نے اپنے مختصر خطاب میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو آزادیٔ وطن کی لڑائی کا ہیرو قرار دیا۔

مولانا محمود مدنی نے کہا کہ جمعیۃ علماء ہند نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت شیخ الہند کی اس تحریک اور خدمات سے عوام بطور خاص اس دور کے نوجوانوں کو روشناش کرانے کے لئے ملک کے طول وعرض میں سمینار اور کانفرنسیں کی جائیں گی چونکہ یہ اس تحریک کا سواں سال ہے اس لئے یہ اس تحریک کا سو سالہ جشن بھی ہوگا اور اس کی افادیت سے ہمیں ملک کے مستقبل کو سنوارنے کا طریقہ سمجھنے میں آئے گا۔ ہماری نوجوان نسل میں ملک کے لئے قربانی کا جذبہ بیدار ہوگا۔ ہمارے بزرگوں نے اپنی آنکھوں میں خواب سجائے تھے کہ آزادی کے بعد ملک ایک ایسا ملک ہوگا جہاں مذہب کے نام پر بھید بھاؤ نہ کرتے ہوئے تمام شہریوں کے ساتھ انصاف ہوگا مولانا مدنی نے کہا کہ اس ریشمی رومال تحریک کی صدی منانے کے لئے ہم نے اس کی شروعات بابائے قوم گاندھی جی کی جائے پیدائش گجرات سے کی ہے۔ مولانا محمود مدنی نے زور دے کر کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے جنگ آزادی اس لئے نہیں لڑی تھی کہ انھیں گورے انگریزوں سے نفرت تھی بلکہ یہ جنگ ان گورے انگریزوں کے ظلم کے خلاف تھی اور آج یہ گورے انگریزوں کی کالی اولاد ظلم تشدد کو برپا کئے ہوئے ہیں ہمیں ان کے ظلم کے خلاف جنگ لڑنی ہوگی لیکن امن وانصاف کے ساتھ۔

گجرات ودھیا پیٹھ کے وائس چانسلر سدرشن آئنگر نے اپنے خطاب میں حضرت شیخ الہند کو زبردست خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے کہا کہ حقیقی خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم آج کے اس دور میں ان کے دکھائے اور بتائے ہوئے راستوں کو اپنائیں وائس چانسلر نے کہا کہ شیخ الہند مولانا محمود

حسن دیوبندی میں روحانی طاقت تھی کہ انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں گاندھی جی کو مسٹر کہ لیڈر بنائے جانے کا فیصلہ کرلیا انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا محمود حسن دیوبندی فقیری فطرت کے آدمی تھے اور انکے شاگرد مولانا حسین احمد مدنی بھی ان کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے آزادی کے بعد حکومت کو کہا تھا کہ ہم سے ہماری چٹائیاں نہ چھینو۔ انسانیت کی فکر کرنے اور جذبات میں مغلوب نہ ہونے کہ حمایت کرتے ہوئے سدرشن آئنگر نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے ان حقیقی بزرگوں کی علمی وعملی تعلیمات کو اپنانے ہی میں بھلائی ہے آپ سے قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر جناب اختر الواسع نے انتہائی تاریخی مدلل تفصیلی خطاب میں حضرت شیخ الہند کے زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند اور مولانا محمود مدنی کو بہت مبارکباد دی کہ انھوں نے اس عنوان پر ملک میں پہل کی پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ حضرت شیخ الہند جہاں ہندستان کے ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس وشیخ الحدیث تھے وہیں جدید تعلیمی ادارے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی بھی تھے حضرت شیخ الہند نے تحریک ریشمی رومال کے تحت کابل میں سب سے پہلی جلاوطن حکومت قائم کی تھی۔ مولانا کی تحریک کو سامراج مخالف تحریک قرار دیتے ہوئے موصوف نے کہا کہ ہمارے محسن تھے اور جو لوگ یا قوم اپنے محسنوں کو بھول جاتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر محسنوں کو اتارنا بند کردیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک اس تحریک کو آج گجرات سے شروع کرنے کے جو مقاصد بھی پیش نظر رہے ہوں لیکن میرے نزدیک اس کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اسی گجرات کی سرزمین پر ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس میں حضرت شیخ الہند ہی کے ایک جیالے سپوت حضرت مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا ریزولیشن پیش کیا تھا۔ پروفیسر اختر الواسع سے قبل مفسر قرآن مولانا محمد ابراہیم تاراپوری نے مالٹا سے واپسی کے بعد قوم کے نام حضرت شیخ الہند کا پیغام عنوان پر خطاب کیا جبکہ صوبہ گجرات کے جنرل سکریٹری مولانا عبدالقدوس پالن پوری نے تحریک ریشمی رومال کا تعارف سمینار کے اغراض ومقاصد اور سمینار کی تحریک صدارت پیش کی اسٹیج پر مولانا نیاز احمد فاروقی، مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری، مولانا حکیم الدین قاسمی، وغیرہ رونق افروز تھے۔

پہلی نشست کے اخیر میں راشٹریہ گیت جن من گن بھی پڑھا گیا اس کے بعد محترمہ گورنر صاحبہ روانہ ہوئیں، دوسری نشست بعد نماز ظہر شروع ہوکر شام پانچ بجے ختم ہوئی جس میں مولانا حکیم الدین قاسمی (سکریٹری) مولانا مختار احمد فاروقی قاسمی (احمدآباد) حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھوٹا (لندن) جناب مولانا نیاز احمد فاروقی (دہلی) حضرت مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری (مرادآباد) کا تفصیلی خطاب ہوا اور مقالات پیش کئے گئے مفتی منصور پوری کی دعا پر سمینار کا اختتام ہوا۔ ۲۸/اپریل کو دن بھر ہوئے اس سیمینار کا خطبہ صدارت مولانا محمد رفیق بڑودوی، خطبہ استقبالیہ مفتی محمد اسجد قاسمی، خطبہ افتتاحیہ مولانا محبوب الرحمٰن قاسمی نے پیش کیا اس سمینار میں پورے صوبہ گجرات کے ذمہ داران جمعیۃ علماء اور دینی مدارس کے نمائندے شریک ہوئے دوسری نشست میں مولانا داؤد قاسمی پٹن، مولانا محمد عمران پٹن، مولانا نور محمد نے بھی مقالے پیش کیے جبکہ مفتی محمد اسجد قاسمی، جناب پروفیسر انصاری، احمد شیخ، شعیب، مولانا شفیق احمد القاسمی، مولانا ابوالحسن پالن پوری، حافظ بشیر احمد (آرگنائزرس جمعیۃ علماء ہند) و دیگر مقامی افراد انتظامات میں مصروف تھے۔ ☐☐

# شیخ الہند صرف ایک عالم دین نہیں بلکہ آزادئ ہند کی جہد مسلسل کا نام ہے

## چھاھی میں تحریک ریشمی رومال کے سوسالہ جشن کا عظیم الشان کامیاب اجلاس، 'تذکرہ شیخ الہند' کتاب کا اجرا

پالن پور گجرات ۱۳/مئی: مولانا سید محمود مدنی قائد و جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند نے کہا کہ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی مسلمان دہشت گرد نہیں ہے اور نہ ہی مدرسے دہشت گردی کے اڈے ہیں اگر یہ مدارس جماعتیں اور خانقاہیں نہ ہوتی تو مسلمانوں کو دہشت گرد بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا مولانا محمود مدنی نے اپنی تفصیلی تقریر میں کہا کہ یہ اجلاس یادگار شیخ الہند کی ایک کڑی ہے۔ آج شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کو ایک سو سال مکمل ہورہے ہیں اس موضوع پر پروگرام کے انعقاد کو خشک موضوع بتایا جاتا ہے لوگوں کی خواہش ہے کہ طاقت، قوت اور اجتماع کرنٹ موضوع پر ہونا چاہئے ایسا موضوع جن کا تعلق تاریخ سے ہو اس پر بات کی جاتی ہے تو لوگوں کو مزہ نہیں آتا۔ بولنے اور سننے والوں کو بھی بھاری لگتا ہے۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ کوئی قوم اپنے لئے اس وقت تک راہ متعین نہیں کرسکتی

جب تک وہ اپنی تاریخ سے واقف نہ ہو تاریخ کو نظر انداز کر کے، بھلا کر ہم نہ اپنے دشمنوں کی سازشوں کو پہچان سکتے ہیں اور نہ اپنے لئے مستقبل کی راہ اپنا سکتے ہیں۔

جمعیۃ علماء ضلع پٹن و بناس کانٹھا کی جانب سے چھاپی میں تاج ہوٹل کے پیچھے وسیع وعریض میدان میں ۱۲رمئی کی شام منعقدہ عظیم الشان اجلاس عام میں خطاب کرتے ہوئے مولانا محمود مدنی نے ایک وقعہ کے حوالے سے بتایا کہ ایک مجلس میں مسلمانوں کے پچھڑے پن اور اس کی ذمہ داری پر بات ہو رہی تھی تو دانشوران نے کہا کہ اس کے سب سے بڑے ذمہ دار بھی مسلمان ہی ہیں اور اس کی وجہ مسلمانوں کے مدرسوں کو بتایا کہ اگر مسلمان بچے ان مدرسوں کے بجائے اسکولوں میں پڑھتے تو انھیں نوکریاں ملتیں۔ اور اپنے اس نظریہ کے لئے انھوں نے سچر کمیٹی کی رپورٹ کا حوالہ دیا ان سے کہا گیا کہ سچر کمیٹی نے یہ بھی بتایا ہے کہ کتنے مسلمان بچے مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں؟ سچر کمیٹی نے اپنے رپورٹ میں بتایا ہے کہ چار فیصد بچے مدرسوں میں پڑھتے ہیں مولانا مدنی نے کہا کہ اس میں جسٹس سچر نے مدرسوں اور مکتب دونوں کو شامل کیا ہے جبکہ مکتب اور مدرسوں کو الگ الگ کیا جانا چاہئے تو یہ بات صاف سامنے آئے گی کہ صرف دو فیصد بچے ہی مدرسوں میں پڑھتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ۹۸رفیصد بچے کہاں ہیں ان دانشوروں کے بقول مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں نے اپنا مستقبل خراب کیا ہے تو میں ان سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار اور ان کے ذہن رکھنے والے لوگ ۹۸رفیصد کی کیوں فکر نہیں رکھتے۔ مولانا نے کہا کہ آج ہندستان کے تقریباً آٹھ سو اضلاع میں نکسلائٹ لوگوں کی حکومت چلتی ہے یہ دہشت گرد کیوں بنے ان پر جب طرح طرح کے ظلم و جبر ہوئے ۱ان کی زمینوں اور جائداودں پر قبضہ کیا گیا تو انھوں نے ہتھیار اٹھائے ان کی دہشت گردی ناانصافی کا نتیجہ ہے۔ اس ملک میں غریبوں کے لئے ترقی کے راستے بند ہیں مسلمان بھی غریب ہیں تمام طرح کے ظلم و جبر کو برداشت کر رہے لیکن یہ مدارس جماعتوں اور خانقاہوں کا ہی فیض ہے کہ انھیں ہتھیار اٹھانے نہیں دیا اور دہشت گرد نہیں بننے دیا، مولانا نے کہا کہ جو لوگ آج ان جماعتوں پر طرح طرح کے الزامات عائد کر رہے ہیں اور ہمارے مدرسوں کو دہشت گردی کے اڈے بتا رہے ہیں وہ صرف ان کے ہی نہیں بلکہ وہ اس ملک کے بھی غدار اور دشمن ہیں ایسے لوگوں کو سزا دی جانی چاہئے۔

مولانا نے مسلمانوں سے کہا کہ شیخ الہند صرف کسی ایک مجاہد آزادی کا نام نہیں کسی ایک انسان، عالم، صوفی، بزرگ اور محدث کا نام نہیں۔ یہ ہندستان کی آزادی کے جہد مسلسل کا نام ہے، ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے اور اس فہرست کو غور سے دیکھئے ایک ایک شاگرد اپنی جگہ پہاڑ ہیں، آپ نے مثال میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد الیاس صاحب کا نام پیش کیا۔ اسلام کا کوئی حصہ اور پہلو ایسا نہیں ہے کہ اس کے لئے شیخ الہند نے اپنے شاگردوں کو تیار نہ کیا ہو۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی تصنیفی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا محمود مدنی نے کہا کہ صرف مولانا تھانوی کی تمام کتابوں کا ان کی عمر کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان کی عمر کے ایک ایک دن میں ہر روز کے چھیاسی صفحات بنتے ہیں۔ اس ملک کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مدنی نے کہا کہ آج پوری دنیا میں اسلام کی صحیح تاریخ آپ کو ہندستان میں ملے گی اور دنیا کی کسی حصہ میں ملے گی تو وہ بھی ہندستان کا طفیل ہے کہ وہاں اسلام کی خدمت اور لوگوں میں اسلامی جذبہ پیدا کرنے والی جماعت کے لوگ اسی سرزمین سے منسلک افراد ملیں گے۔ آج شیطانی طاقتیں لوگوں کو ان کے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں منتشر و بھٹکانا چاہتی ہیں لیکن مسلمانوں ان کے ہتھکنڈہ نہ بنو اور اپنے ان مدارس اور جماعتوں کو مضبوط کرو آپ انھیں جتنا مضبوط کرو گے دشمنان اسلام کا پیٹ اتنا ہی دکھے گا۔

مولانا نے کہا کہ ظلم کے خلاف لڑائی جاری رہے گی اور اس لڑائی کو متعینہ طریقہ سے ہی لڑا جائے گا، غیر متعینہ طریقہ نہ اختیار کرتے ہیں اور نہ ہی کریں گے کسی پر ظلم نہیں کرنا ظلم کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنا یہ اسلام کی تعلیم ہے مولانا نے فرمایا کہ احساس کمتری کو بھی اپنے دلوں سے نکال دو۔ اسلام طاقت اور روپیہ پیسہ سے نہیں پھیلا ہے اسلام اس ملک میں فقیروں کے ذریعہ آیا ہے، سرکاروں سے ہم اپنے حق کے لئے مطالبات کرتے ہیں، یہ ہمارا حق ہے، ہمیں ہمارا حق چاہئے بھیک نہیں۔ مولانا نے کہا کہ قوم کی عزت قوم کے ہاتھ میں ہے قرآن وسنت کو گلے لگالیں قوم باعزت ہو جائے گی۔ مولانا محمد یحییٰ خان قاسمی (ناظم جمعیۃ علماء صوبہ اتر پردیش) نے اپنی ولولہ انگیز تقریر میں کہا کہ مسلمانوں میدان عمل میں آؤ اور یاد رکھو جب میدان عمل میں آؤ گے تو ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا یہ ہمارے رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ رسول اللہؐ مکہ والوں کی نظر میں امین وصادق تھے لیکن جب کلمہ حق کا اعلان فرمایا تو

پتھر کھائے اور ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کیا اس لئے میدان عمل میں آنے کے بعد گھبرانا اور مایوس نہ ہونا۔مولانا یحییٰ خان نے کہا کہ اس ملک کا مسلمان تین اداروں سے تعلق رکھتا ہے مدارس اسلامیہ دعوت وتبلیغ اور خانقاہیں ۔علما سے جڑنا ،اپنے ایمانیات کا سیکھنا سیکھانا اور قلب کا تزکیہ ، یہ کامیابی کے لئے کافی ہے اور ان تینوں کے لئے ہمارے اکابرین نے پہریدار کی حیثیت سے جمعیۃ علماء ہند کو قائم کیا ہے۔آج مولانا محمد قاسم نانوتوی ،مولانا رشید احمد گنگوہی ، شیخ الہند مولانا محمود حسن ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ،مولانا محمد الیاس وغیرہ کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں اور امت کی رہنمائی کے لئے لاکھوں حفاظ ،علماء سیکڑوں مفتیان موجود ہیں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا تھا کہ بہت سے چہرے جن پر نمازوں کا نور بھی ہے اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ باطل کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئیے تو ان کے دلوں پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ ماضی کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے مولانا یحییٰ خان نے کہا کہ کسی قوم کے فرزندوں سے ان کا ماضی چھپایا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے رہنما انہیں اندھیروں میں لے جانا چاہتے ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی نے تاریخ آزادی ہند کے حوالوں سے اپنی تقریر میں کہا کہ انگریز حضرت شیخ الہند کے بارے میں کہتا تھا کہ اگر اس شخص کو جلا کر راکھ کر دیا جائے اور اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر دیا جائے اور یہ راکھ ہوا سے ٹکرائیگی تو اس میں بھی انگریز مخالف بو پائی جائیگی مولانا نے کہا کہ حکومت تو ہمارے ان اکابرین کی قربانیوں کو فراموش کر رہی ہے لیکن ہماری بھی کمزوری ہے کہ ہم خود بھی اپنے بزرگوں کے خدمات کو فراموش کر رہے ہیں ۔ اجلاس کے صدر مولانا محمد رفیق خان مظاہری ( صدر جمعیۃ علماء صوبہ گجرات وشیخ الحدیث دارالعلوم بڑودہ ) نے اپنے خطبۂ صدارت میں تمام مقررین کی تقریروں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ آج اکابرین کی قربانیوں کے تذکرے کو ہم سننا اور بولنا بھی نہیں چاہتے ۔انہوں نے حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ایک مسجد میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات اور تحریک کے حوالے سے تقریر کر رہے تھے تو مجمع میں سے ایک ذمہ دار شخص انہیں ہاتھوں کے اشارے سے منع کر رہے تھا کہ یہ سب تقریر میں نہ بتاؤ۔مولانا نے کہا کہ ہماری ایمانی کمزوری ہے کہ آج صحیح اور حق بات بھی مجمع عام میں بولنے بتانے سے گریز کرنے کو کہا جارہا ہے جمعیۃ علماء صوبہ گجرات کے جنرل سکریٹری اجلاس کے روح رواں

مولانا عبدالقدوس پالن پوری نے اپنی دلنشین تقریر میں کہا کہ آج مذہب بیزاری اور مذہبی تعلیم سے دوری کا نتیجہ ہے کہ عصری تعلیم کا طوفان ہیجانی شکل میں آرہا ہے، علماء عصری تعلیم کے مخالف نہیں اور نہ ہی اسلام اس سے روکتا ہے اس ہیجانی طوفان پر بندھ باندھنے کی ضرورت ہے اس کے مثبت نتائج سے فائدہ اٹھانے اور مضر اثرات سے اپنے آپ کو بچانے کا مشورہ دیا، اجلاس میں ضلع پٹن و بناس کانٹھا کے سینکڑوں علماء کرام، اور ہزاروں عوام کا جم غفیر موجود تھا۔شام چھ بجے جمعیۃ علماء ہند کا پرچم اسی میدان میں قائد و جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند مولانا سید محمود مدنی کے دست مبارک سے لہرایا گیا جناب قاری احمد عبداللہ قاسمی نے پرچم کا ترانہ پڑھا۔

مدرسہ خلیلیہ ماہی کے متعلم عبدالحفیظ کی تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا نعت پاک کے بعد تجاویز کی خواندگی شروع ہوئی۔ پہلی تجویز ارتدادی سرگرمیوں کے سدباب کے لئے مولانا عبدالاحد ( نائب صدر ضلع بناس کانٹھا ) نے پیش کی جس کی تائید میں مولانا محبوب الرحمٰن ( احمد آباد ) مولانا محمد عمران ( جنرل سکریٹری ضلع پٹن ) مولانا کفایت اللہ ( حسن پور ) نے کی دوسری تجویز آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو ریزرویشن سے متعلق تجویز جمعیۃ علماء گجرات کے سکریٹری مولانا مختار احمد قاسمی فاروقی ( احمد آباد ) نے پیش کیا جس کی تائید عبدالرحمٰن حبیب بھائی ( بھاگل ) مولانا محمد ارشد ( ڈینڈرول ) نے کی اوقاف کے تحفظ سے متعلق تیسری تجویز مولانا محمد عرفان نے پڑھی، مولانا محمد یوسف ( باؤنچوڑی ) حاجی ادریس میمن ( لاکھنی ) نے تائید کی۔مولانا علاء الدین مظاہری ( نائب صدر ضلع بناس کانٹھا ) نے دہشت گردی کے خلاف تجویز پڑھی صدر ضلع سانبر کانٹھا مولانا خادم لال پوری، مولانا اشرف ( نواواس ) احمد بھائی میمن ( واؤ ) نے تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پانچویں تجویز میں انسداد فسادات کے متعلق تجویز صدر جمعیۃ علماء ضلع پٹن مولانا محمد داؤد ( ودانی ) نے اظہار خیال کرتے ہوئے تجویز پیش کی جبکہ سکریٹری ضلع پٹن مولانا محمود قاسمی ( رادھن پور ) نے تائید کی اجلاس کی نظامت قائم مقام جنرل سکریٹری جناب عتیق الرحمٰن قریشی نے انجام دی۔

مولانا محمد رفیق مظاہری کی پرسوز دعا پر اجلاس رات دس بجے ختم ہوا۔اجلاس میں تذکرہ شیخ الہند نامی کتاب کا مولانا سید محمود مدنی کے دست مبارک سے رسم اجراء عمل میں لایا گیا۔ جو کہ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے تدوین کی ہے اور مراد آباد کے مکتبہ فدائے ملت نے شائع کر کے اس موقع پر عوام میں پیش کیا ہے۔ ◻◻

# فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہی حضرت شیخ الہند کا پیغام تھا

## گیا میں شیخ الہند کانفرنس کا انعقاد

جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال مکمل ہونے پر پورے ملک میں شیخ الہند کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں جو فیصلہ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس منتظمہ نے ۱۸-۱۹ر مئی ۲۰۱۲ء کو دہلی میں کیا تھا اور جس کا اعلان قائد جمعیۃ حضرت مولانا محمود اسعد مدنی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے اجلاس عام میں کیا تھا اسی فیصلہ کے مطابق اور جمعیۃ علماء ہند کے مشن کو عام کرنے کے لیے جمعیۃ علماء گیا کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان شیخ الہند کانفرنس زیر صدارت حضرت الحاج قاری محمد فتح اللہ قدوسی نائب صدر جمعیۃ علماء بہار اور زیر نظامت مولانا محمد عظمت اللہ ندوی ناظم مدرسہ ترتیل القرآن، پنہر مسجد، گیا نہایت تزک واحتشام کے ساتھ مدرسہ ترتیل القرآن پنہر مسجد میں منعقد ہوئی جس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حضرت الحاج مولانا کلیم الدین قاسمی سکریٹری جمعیۃ علماء ہند شریک ہوئے۔ تحریک صدارت مولانا الیاس صاحب قاسمی امام وخطیب مرکز والی مسجد گیا نے پیش کی اور تائید صدارت حافظ محمد امانت اللہ جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء اور مولانا اصغر مظاہری نائب سکریٹری جمعیۃ علماء گیا نے کی، کانفرنس کا آغاز حافظ محمد عطاء اللہ کی تلاوت کلام پاک اور حافظ محمد تفسیر کی نعت سے ہوا۔

مولانا کلیم الدین قاسمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس ملک پر مسلم حکمرانوں نے تقریباً ۹۳۶ سال تک حکومت کی اور ملک کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا ملک کو تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار جیسی شاندار تاریخی عمارتیں دیں جن کی شہرت پوری دُنیا میں ہے۔ مسلم بادشاہوں اور انگریز حکمرانوں دونوں نے اس ملک میں حکومت کی لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ مسلم حکومتوں نے ملک کو سنوارا اور سجایا اور دولت وثروت سے مالامال کردیا۔ اس کے برعکس انگریزی حکومت نے اس ملک کو لوٹا۔ صرف ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد پندرہ ارب سے زیادہ کی مالیت لوٹ کر انگلستان پہنچادی۔ اسلامی شریعت میں مداخلت شروع کردی اور جب علمائے کرام نے ان کے خلاف اعلانِ جہاد کیا تو انھیں پھانسی کے پھندوں پر لٹکا دیا گیا۔ ایسے حالات میں علمائے دیوبند خاص طور پر حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی رومال کی تحریک چلائی اور ملک کو انگریزوں سے نجات دلانے کے لیے ملک اور بیرونِ ملک کوششیں کیں۔ انھوں نے تحریک ریشمی رومال اور مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی سیرت وشخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے ملک کی آزادی کے لیے جو تحریک چلائی اس کی مثال نہیں ملتی انھوں نے کہا کہ مسلمان تین چیزوں کو اپنالیں تو کامیابی یقینی ہے (۱) تعلیم (۲) تنظیم (۳) تجارت۔ مسلمانوں کو حصولِ علم سے آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور خوب ترقی کریں گے اور آپسی اتحاد سے باہمی قوت ملے گی اور تجارت کے فروغ سے مالی استحکام ہوگا اور خوشحالی آئے گی۔

کانفرنس کے صدر قاری محمد فتح اللہ قدوسی نے اپنا نہایت وقیع خطبہ صدارت پیش کیا جسے سامعین نے پوری توجہ کے ساتھ سماعت کیا اور پسند بھی فرمایا۔ خطبہ صدارت میں حضرت شیخ الہندؒ کے تفصیلی ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے پیغام کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی و پرامن بقائے باہم کے نظریہ کو خاص طور پر پیش کیا۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ تحریک آزادی کے مسلم مجاہدین کو جس طرح فراموش کرنے کی روش ہندستان میں چل پڑی ہے اس سے آنے والی نسلوں کو جنگ آزادی کے بارے میں مکمل جانکاری حاصل نہیں ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات قابل مذمت حد تک خراب ہے کہ جن اکابر علمائے کرام نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کردیا اس کا نام نامی تحریک آزادی کے مجاہدین کی فہرست سے غائب ہے اور جن لوگوں نے تحریک آزادی میں نمایاں رول ادا نہیں کیا ان کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ تاریخ کی اس غلطی کو سدھارنا انتہائی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ علمائے کرام کی قربانیوں کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے پورے ملک میں سو کانفرنس کرنے کا جو فیصلہ لیا ہے وہ نہایت ہی اہم ہے اور آج

کا یہ اجلاس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سے جڑنا ہم لوگوں کی ایک دینی وملّی ذمہ داری ہے۔ مولانا انوار الحق قاسمی نائب صدر جمعیۃ علماء بہار نے علمائے صادق پور کی قربانیوں کا تفصیلی ذکر کیا اور پر جوش انداز میں مجاہدین آزادی کے جذبہ حریت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم انہی بزرگوں کی خدمات کی برکت سے آزاد فضا میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بعدہ مولانا محمد ناظم قاسمی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء بہار نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ تم اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست مت بناؤ۔ چنانچہ علمائے کرام اس حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انگریزوں کی ظالم و جابر حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے خلاف متعدد تحریکیں چلائی تھیں اور ملک چھوڑنے پر ان کو مجبور کر دیا تھا۔

کانفرنس کے کنوینر مولانا قاری محمد عظمت اللہ ندوی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج کی شیخ الہند کانفرنس ایک تاریخی کانفرنس ہے اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے سو سال قبل جو شعلہ حریت ملت اسلامیہ کے دلوں میں بھڑکایا تھا وہ آج بھی فروزاں ہے ان کے نام پر دور دراز علاقوں سے سینکڑوں کی تعداد میں علمائے کرام، دانشورانِ قوم اور نوجوانانِ اسلام کا مجتمع ہو جانا، تحریک ریشمی رومال کی عنداللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے۔ میں حکومت ہند سے پرزور مطالبہ کرتا ہوں کہ مسلم مجاہدین آزادی اور علمائے کرام کی قربانیوں کو اُجاگر کرے اور حضرت شیخ الہندؒ کے نام پر ڈاک ٹکٹ جاری کر کے خراج عقیدت پیش کرے۔

اس موقع پر شاعر اسلام قاری زبیر آصف نے اپنی مترنم آواز میں حمد و نعت و نظم پیش کر کے سامعین سے داد و تحسین حاصل کی۔ شیخ الہند کانفرنس میں علماء، ائمہ، دانشوران اور عمائدین شہر کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں مولانا قاری شہرت قاسمی، قاری مسلم ایاز مظاہری، مولانا مظفر آفاق، اخلاق احمد ندوی، مولانا امان اللہ انصاری، حاجی نعیم الدین، حاجی منصور عالم، ڈاکٹر حامد، منصور عالم ایڈوکیٹ، غلام نبی، پرویز عالم، شارق احمد، دانش محبوب، محمد صبغت اللہ، ماسٹر منظور محبوب وغیرہ کے اسمائے قابل ذکر ہیں۔ حافظ محمد امانت اللہ صاحب کی دعا پر کانفرنس کا بحسن وخوبی اختتام ہوا۔ □□

# شیخ الہندؒ کے روشن کارناموں کو بھلایا نہیں جاسکتا

## جہان آباد میں شیخ الہند کانفرنس

جامعہ اسلامیہ جعفر گنج جہان آباد میں شیخ الہند کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جمعیۃ علماء بہار کے ذمہ دار حضرات کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے کارگزار جنرل سکریٹری مولانا حکیم الدین قاسمی نے بھی شرکت کی۔ مولانا قاسمی نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جنگ آزادی میں علماء کی قربانیاں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اکابر علماء نے مختلف تحریکیں چلا کر صرف آزادی کا ترانہ نہیں گایا تھا بلکہ انھوں نے بنفس نفیس حریت کا علمبردار بن کر فرنگیوں کے خلاف آواز بلند کی تھی، انہی دیوانوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی بھی تھے جنھوں نے تحریک ریشمی رومال کی بنیاد ڈالی اور ہندستانیوں کے رگ وریشہ میں آزادی کا خون دوڑا دیا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ایسے عظیم مجاہد آزادی کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شیخ الہندؒ کے روشن کارناموں اور ان کی شخصیت سے نئی نسل کو روشناس کرایا جائے تا کہ نئی نسل ان کی قربانیوں کو یاد رکھ سکے۔ یہ کانفرنس جمعیۃ علماء جہان آباد کے زیر اہتمام جامع مسجد جہان آباد میں منعقد ہوئی۔

اس موقع پر جمعیۃ علماء بہار کے جنرل سکریٹری مولانا ناظم قاسمی نے جمعیۃ علماء ہند کی روشن خدمات کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے شیخ الہند کے روشن کارناموں کو پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جمعیۃ علماء ہند کا یہ پروگرام ہے کہ تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے پر جگہ جگہ کانفرنس کا انعقاد کر کے شیخ الہند کی شخصیت کو نئی نسلوں تک پہنچایا جائے، اسی کڑی کے طور پر جہان آباد میں بھی شیخ الہند کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے۔

اس موقع پر جمعیۃ علماء جہان آباد کے جنرل سکریٹری و قاضی شہر جہان آباد مولانا شہرت قاسمی نے فرمایا کہ تحریک ریشمی رومال انگریزوں کے خلاف ایکشن پلان تھا، جس کے روحِ رواں مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ اس موقع پر جمعیۃ علماء جہان آباد کے صدر مولانا قاری

مسلم ایاز نے فرمایا کہ آج جو ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور پورے اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اس کے پس پردہ انہی اکابر کی قربانیاں ہیں۔

اس موقع پر مولانا مظفر آفاق قاسمی، مولانا سالم قاسمی اور مولانا اسلم مظاہری نے اپنے اپنے خطاب میں تحریک ریشمی رومال کے تاریخی حوالے سے شیخ الہندؒ کی قربانیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ اس سے قبل کانفرنس کا آغاز مولانا قاری مسلم ایاز کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور جامعہ عربیہ اسلامیہ جعفر گنج کے استاد و صدر مدرس مولانا مظفر آفاق نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے۔ یہ اجلاس قاری محمد امتیاز قاسمی امام وخطیب جامع مسجد کی دعا پر ختم ہوا۔

# ہمارے اسلاف نے ملک کی آزادی کے لیے زبردست قربانیاں دی ہیں

## قنوج میں ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں جلسہ

ہندستان ہمارا ملک ہے اس سے زیادہ خوبصورت جگہ کوئی نہیں، یہاں دین کی خدمت کرنے کے بہت سے مواقع ہیں، قوموں کی تعمیر وترقی تاریخ کے بغیر ممکن نہیں۔ جو قوم اپنے اکابر کی تاریخ سے نابلد ہوتی ہے اس کے پاس اپنا کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا۔ نوجوانوں کو اپنے آبا اجداد کی قربانیوں کا علم ہونا چاہیۓ، انہوں نے نسل نو کی تعمیر کے لیے جو خواب سجائے تھے جو گائڈ لائن تیار کی تھی ہمیں اسی کی پیروی کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیۓ، ہماری ترقی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ جس قوم کے نوجوان کا کوئی لائحہ عمل نہیں ہوتا وہ قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ ہندستان کے ذرہ ذرہ پر مسلمانوں اور علمائے کرام کی قربانیوں کے نقوش موجود ہیں۔ جو ہمیں غیر سمجھتے ہیں وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ غیر کون ہیں؟ ان خیالات کا اظہار جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمود اسعد مدنی نے سدھن میں تحریک ریشمی رومال کانفرنس میں سیلاب کی طرح امڈی بھیڑ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

مولانا مدنی نے کہا کہ تحریک ریشمی رومال کے سو سال مکمل ہوگئے ہیں اور جمعیۃ علماء نے اس موقع پر سو کانفرنسیں کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سویں کانفرنس انشاء اللہ دیوبند میں ہوگی۔ ہمارے اسلاف نے جنگ آزادی کے لیے اتنی قربانیاں کیوں دیں، ہمارے مستقبل کے لیے کیا خواب سجائے تھے۔ ہمارے اکابرین کی سوچ کیا تھی، ان کی فکر کیا تھی، ان کی شام کیسے ہوتی تھی اور صبح کیسی ہوتی تھی، کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے اپنی نسلوں کے لیے کچھ اور سوچا ہو، کہیں ایسا نہیں کہ انہوں نے ہمارے لیے جو لائحہ عمل طے کیا تھا ہم اس سے ہٹ تو نہیں گئے، ان کانفرنسوں کا مقصد صرف مسلمانوں کو ہی اصل تاریخ سے روشناس کرانا نہیں بلکہ برادران وطن کو بھی بتانا ہے کہ تحریک ریشمی رومال کیا تھی۔ اس کے مقاصد کیا تھے، مولانا محمود حسنؒ کے کیا کارنامے تھے۔ انہوں نے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے کیا قربانیاں پیش کیں۔

مولانا مدنی نے ہندستان کی تاریخ کے سنہرے باب کے ساتھ تن کے گورے من کے کالے انگریزوں سے ملک کو آزاد کرنے میں مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مسلمانوں نے ہندستان کے گلے سے غلامی کا طوق نکال پھینکنے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں لیکن اس تاریخ کو مٹایا جارہا ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد میں جنگ آزادی کی کوششوں میں مسلمانوں کے رول کو نظر انداز کرکے مسلم نوجوانوں کو اپنی تاریخ سے بے خبر رکھنے کی مسلسل سازشیں کی جارہی ہیں۔ ہندستان کے ذرہ ذرہ میں علماء کی قربانیاں شامل ہیں۔ تحریک ریشمی رومال جس کے بانی مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہ تھے جنہوں نے ہندستان اور عالم اسلام کو انگریز سے نجات دلانے کے لیے ایک تنظیم بنائی جس نے بہت ہی خفیہ طریقے سے انگریزوں کو نیست ونابود کرنے کے لیے جال بنے جس کا راز فاش ہونے کے بعد برطانوی حکومت دہل گئی تھی۔

نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ قوم کی ترقی کے لیے نوجوانوں کو اپنے شب روز کے معمول کو بدلنا ہوگا۔ اسلامی طریقے کو اپنانا ہونا ہوگا۔ کسی بھی قوم کا مستقبل اس وقت تک تابناک نہیں ہوسکتا جب تک اس قوم کا نوجوان مستقبل سنوارنے کی فکر نہ کرے۔ تعلیم کو حاصل کرکے اور خود کو منظم کرکے انشاء اللہ بیس سال میں قوم کے مستقبل کو تابناک بنایا

جاسکتا ہے جو قوم خود کو منظم نہیں کر سکتی وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

مولانا نے فرقہ پرست عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہمیں اپنے وطن سے محبت ہے ہمارے پاس جانے کا موقع تھا ہم نہیں گئے ہم نے یہاں رہنا پسند کیا، تمہارے پاس کوئی موقع نہیں تھا۔ ہمیں امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔

جمعیۃ علماء اتر پردیش کے صدر مولانا حیات اللہ قاسمی نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کا رول اور تحریک ریشمی رومال کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جو تاریخ ہمارے نوجوانوں کو پڑھائی جارہی ہے اس سے تقریباً دوسو سال قبل ہی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندستانیوں کے سینوں میں جنگ آزادی کی چنگاری لگادی تھی۔ ان کے بعد ان کے جانشین، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسحاق وسید احمد شہید وغیرہ نے مسلسل اس نہج پر کام کیا اور پورے ملک میں ہندستانیوں کو بیدار کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے۔

مولانا نے کہا گاندھی کو مہاتما جمعیۃ علماء ہند بنایا اور اپنے فنڈ سے پورے ہندستان میں بطور مہاتما کے ان کا تعارف کرایا۔ مولانا نے کہا کہ ہمارے نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات اپنانا ہوگا تبھی وہ محمد بن قاسم، مسعود غازی بن کر مظلوموں کی دادرسی کر سکتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ مظلوموں کو ظلم کے شکنجوں سے نجات دلائی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے شمار علماء نے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ تیس ہزار سے زائد مدرسوں کو تہس نہس کر دیا گیا، سیکڑوں مسجدوں کو شہید کر دیا گیا۔ مولانا نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ دہلی میں کھدائی کے دوران شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جو مسجد دریافت ہوئی ہے اس کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔

دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا شوکت علی بستوی نے کہا کہ برصغیر میں جو اسلامی تہذیب وتشخص نظر آرہا ہے وہ سب ہمارے اکابرین کا صدقہ ہے۔ شاملی کے میدان میں دی جانے والی قربانیوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ الہند کی تحریک دراصل شاہ ولی اللہ محدث نے جو آزادی روح پھونکی تھی اس کا ثمرہ تھی اور ہندستان کی آزادی تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ جذبہ حریت سے ہندستانیوں کو سرشار کرنے کا نتیجہ ہے۔ تحریک ریشمی رومال کے فرزندوں نے ہی حالات کے مدنظر جمعیۃ علماء ہند کے نام سے تنظیم بنائی جس نے ہندستان سے انگریزوں کو نکالنے میں اہم رول ادا کیا۔

جمعیۃ علماء یوپی کے نائب صدر مولانا محمد متین الحق اسامہ قاسمی نے تحریک ریشمی رومال کیا تھی اس کا مقصد کیا تھا، اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے اس سلسلے مختصر لیکن بہت ہی جامع خطاب کیا۔ مولانا نے کہا کہ دوسو سال تک جو تحریکیں چلائی گئیں تھیں ان میں سب سے زیادہ منظم تحریک ریشمی رومال تھی، جس کا راز فاش ہونے کے بعد انگریز گورنر نے کہا تھا کہ اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی ہوتی تو انگریزوں کو سمندر کی تہہ میں سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی۔ ریشمی رومال ایک خط تھا جس میں ان سبھی مجاہدین کی پوری تفصیل درج تھی جو منصوبہ کے تحت ایک خاص تاریخ کو انگریزوں سے بغاوت کرنے والے والوں کی قیادت کرنے والے تھے۔ ایک منصوبہ بنایا گیا تھا کہ باہر سے ترک، جرمن، جاپان، چین وغیرہ ممالک یلغار کردیں اور اندر سے ہندستانی حملہ کردیں تاکہ انگریزوں کو بھاگنے کی کوئی جگہ ہی نہ بچے۔ لیکن یہ خط ایک شخص کی لاپرواہی سے انگریزوں کی خوشامد حاصل کرنے والے کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے انگریز کمشنر کودے دیا۔ جس کی تفصیل کو معلوم کرنے کے بعد پوری برطانوی حکومت دہل کر رہ گئی کہ یہ منصوبہ اتنا منظم اور مستحکم تھا کہ اگر یہ کامیاب ہوجاتا تو پوری دنیا سے برطانوی حکومت کا اسی وقت خاتمہ ہوجاتا۔ تحریک ریشمی رومال کو ناکام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس کے طفیل میں چھبیس ستائیس سال کے بعد ہی انہیں جیالے فرزندوں نے جمعیۃ کے بینر تلے متحد ہوکر ہندستان نے انگریزوں کو نکال کردم لیا۔

مولانا اسامہ نے کہا کہ حضرت مولانا سید محمود مدنی کی قیادت میں جمعیۃ علماء کی کوششوں سے دو شخصیات پر ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا ہے۔ ہمارا حکومت سے مطالبہ ہے کہ شیخ الہند اور شیخ الاسلام سمیت حریت کے مجاہدین کو تاریخ میں درج کیا جائے اور باقاعدہ انہیں بھی دیگر مجاہدین آزادی کی طرح تعلیمی نصاب میں داخل کیا جائے۔ جب تک ہمارا مطالبہ پورا نہیں ہوگا ہم جدوجہد جاری رکھیں گے۔ مولانا نے کانفرنس میں موجود لوگوں سے عہد لیا کہ ہم اکابرین کی تاریخ کو نصاب میں درج ہونے تک ہر طرح کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔ سبھی نے متفقہ طور پر اتفاق کرتے ہوئے عہد لیا۔

بزرگ عالم مولانا عبدالغنی خاں صاحب کی سرپرستی میں ہونے والی اس کانفرنس کی نظامت مفتی محمد ظفر قاسمی صدر جمعیۃ علماء ضلع فرخ آباد نے کی۔ جمعیۃ علماء کا ترانہ اور بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت مشہور شاعر جمعیۃ علماء ہند کے آرگنائزر مولانا احمد عبداللہ نے پیش کیا اور آخر میں مولانا

محمد کلیم جامعی صدر جمعیۃ علماء قنوج اور مولانا نظام الدین مظاہری جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء قنوج نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

کانفرنس میں ہردوئی، اناؤ، کانپور، مین پوری، ایٹہ، اٹاوہ، فرخ آباد، کاس گنج، گنج ڈنڈوارا سے بھی سے لوگوں نے شرکت کی، جلسہ گاہ میں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ قریب مکانوں میں کثیر تعداد میں خواتین موجود تھیں۔□□

# ہلدوانی میں تحریک ریشمی رومال پر ایک روزہ اجلاسِ عام

تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے پر جمعیۃ علماء کماؤں منڈل (اُتراکھنڈ) کے زیر اہتمام ۸۲واں اجلاسِ عام مورخہ ۷؍جون یومِ جمعہ جامع مسجد بنجاران ہلدوانی میں منعقد کیا گیا۔

اس اجلاس کے انعقاد کے لیے جمعیۃ علماء اتراکھنڈ کے نائب صدر مولانا جلیس احمد قاسمی، مولانا محمد سالم حیاتی صدر جمعیۃ علماء نینی تال اور عالیجناب عبدالقادر فارمر جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء نینی تال کی شب و روز کی جدوجہد رہی۔ مرکزی دفتر سے مہمانِ خصوصی کے طور پر امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری صدر جمعیۃ علماء ہند و استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند اور مفتی محمد سلمان منصور پوری استاذ حدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد نے اس ایک روزہ اجلاس میں شرکت فرمائی جہاں ریلوے اسٹیشن پر ان کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔

اس کے بعد مہمانِ خصوصی اور جملہ علمائے کرام ہوٹل روشن تاج پہنچے اور ہوٹل کا افتتاح فرمایا اور اپنے خطابات سے نوازا۔ بعدہٗ ہوٹل کی کامیابی و ترقی کے لیے دعا کرائی گئی۔ یہاں سے جامع مسجد بنجاران تشریف لے گئے جہاں مفتی محمد سلمان صاحب نے تحریک ریشمی رومال کے ایک سو سال پورے ہونے پر اس کی حقیقت سے عوام کو روشناس کرایا۔ مفتی صاحب نے عوام کو بتلایا کہ ہندستان کی جنگ آزادی کے معروف سپہ سالار اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بانی نیز تحریک ریشمی رومال کے محرک ہمہ جہت شخصیت کے مالک حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے نہ صرف ہندستان سے انگریزوں کو نکالنے بلکہ پوری دُنیا میں ان کی سامراجیت کو سبوتاژ کرنے کی ایک بہت ہی منظّم تحریک چلائی تھی۔ ہمارے علماء نے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کیسی کیسی قربانیاں پیش کیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا کہ جب ہم ان اکابر کے بارے میں خود نہیں سمجھیں گے تو ہم دُنیائے انسانیت کو کیسے سمجھائیں گے اس لیے جمعیۃ علماء ہند کے قائد اور ناظم عمومی مولانا محمود مدنی اور امیر الہند حضرت مولانا قاری محمد عثمان مدظلہٗ نے پورے ملک میں اس بات کی تحریک چلائی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت، حیات اور کارنامے سے نئی نسل کو آگاہ کیا جائے۔ اسی کے پیش نظر پورے ملک میں بڑے کامیاب پروگرام چل رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء کماؤں منڈل اُتراکھنڈ کے تحت ہلدوانی میں ۸۲واں اجلاسِ عام بھی اسی کی کڑی ہے۔ آج کے اس دورِ انحطاط میں مسلمان اپنی قربانیوں سے ناواقف ہیں۔ ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ نوجوانوں کو اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کریں، ان کو بتلائیں کہ ہم نے ملک کی آزادی کے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔

۷؍جون ۲۰۱۳ کو بعد نماز جمعہ حضرت امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری صدر جمعیۃ علماء ہند نے اصلاحِ معاشرہ کے تعلق سے سماج میں پھیلی برائیوں سے بچنے کی تلقین کی اور کہا کہ مسلمان اپنے گھریلو ماحول کو دینی بنائیں، بچوں کو نماز، روزہ اور اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور احکامِ شریعہ کے جملہ تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کیا جائے۔ حضرت امیر الہند کی دعا پر اس روحانی اجلاس کا اختتام ہوا۔

پروگرام کا آغاز قاری محمد منصور صاحب کی تلاوت سے ہوا۔ نعت شریف قاری ذوالفقار (ٹانڈہ) نے پیش کی جبکہ پروگرام کی صدارت جناب الحاج عبدالرزاق فارمر نے کی اور نظامت کے فرائض جمعیۃ علماء اُتراکھنڈ کے صدر مولانا ڈاکٹر محمد اسلام قاسمی نے انجام دیئے۔

پروگرام میں خاص شرکت کرنے والوں میں جمعیۃ علماء اُتراکھنڈ کے ناظم عمومی مولانا محمد الطاف مظاہری، مولانا محمد عارف قاسمی (جوالا پور)، مولانا محمد معصوم قاسمی، جمعیۃ علماء اُتراکھنڈ کے نائب صدر مولانا جلیس احمد قاسمی، مولانا محمد سالم حیاتی، عبدالقادر فارمر، عبدالباری فارمر، مولانا مفتی عبدالباسط (امام جامع مسجد) مفتی پرویز، مولانا محمد حنیف مظاہری، حافظ عبدالرشید تابش، مولانا محمد رئیس قاسمی، حافظ جمیل احمد، نیتا تسلیم احمد ٹھیکیدار رام نگر، عبدالرؤف قابل ذکر ہیں۔□□

# آزادی کا ایک خونیں باب غدر تحریک

ڈاکٹر نریش (پنچکولہ)

ہندستان کی آزادی کے لیے ایک ملک گیر تحریک شروع ہونے سے قبل ملک کے مختلف حصوں میں محبانِ وطن کے چھوٹے بڑے گروہ اپنے اپنے طور پر انگریزی سامراج کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء کے غدر تک اور ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی رہنمائی میں 'انگریز و بھارت چھوڑو' کا عازمانہ نعرہ بلند ہونے تک متعدد انقلابی کارروائیاں بھی اس یقین کے ساتھ ہوتی رہیں کہ صرف مسلم انقلاب کے ذریعے ہی ملک کو غلامی سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی قسم کی کارروائیوں میں ایک کارروائی تھی 'غدر تحریک' جسے ہماری تاریخ آزادی میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے، جس کی یہ حقدار ہے۔

غدر تحریک کی بات کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس پس منظر کو سمجھ لیا جائے، جو اس تحریک کو جنم دینے کے لیے ذمہ دار ہے۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب پر قبضہ کرلیا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں یہ قبضہ کمپنی نے برٹش حکومت کو منتقل کردیا اور انگلینڈ کی سرکار براہِ راست پنجاب پر حکومت کرنے لگی تھی۔ بنیادی طور پر تاجر انگریزوں نے پنجاب کو ایک بالقوت عالمی بازار کے طور پر آنکا اور یہاں سے اناج برآمد کرکے مزید دولت کمانے کا ارادہ بنالیا۔ اس کے لیے انھوں نے لگان اور ٹیکسوں میں اضافہ کرکے اور جبراً وصولیاں کرکے ایسے حالات پیدا کردیئے کہ کسانوں کو اپنی زمینیں فروخت کرنے یا گروی رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کے اس اقدام سے ایک نیا 'بنیا' طبقہ وجود میں آ گیا، جو انگریزوں کا ممنون احسان بھی تھا اور ان کے تئیں مکمل طور پر وفادار بھی۔

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر بنیادی طور پر سکھ ریاستوں کی مدد سے پسپا کیا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اگر سکھوں کا اعتماد حاصل کرلیا جائے تو پنجاب کو ہندستان میں اپنی حکومت کا دست راست بنا سکتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے شعوری پور پر سکھوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں کیں کہ وہ ہندوؤں سے مختلف ایک الگ 'مارشل قوم' ہیں۔ نتیجتاً انھوں نے نہ صرف سکھ سرمایہ داروں اور سکھ پجاریوں ہی سے بھرپور وفاداری حاصل کی بلکہ ان کو اپنی افواج کے لیے بڑی تعداد میں سکھ نوجوان بھی دستیاب ہوئے۔

پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد اگلے پچاس برسوں میں پنجاب میں چھ بار قحط پڑا۔ متعدد بار پلیگ کی وبا یہاں پر پھیلی۔ یہاں سے اناج انگلینڈ جاتا رہا مگر پنجابی کسانوں کے گھروں میں چولھے ٹھنڈے پڑتے گئے۔ اس بدحال صورت حال میں جب پنجاب کے کاشتکاروں کو یہ معلوم پڑا کہ وہ امریکہ یا کینڈا جاکر وہاں پر محنت مزدوری کر کے خوب دولت کما سکتے ہیں اور اچھی خاصی رقمیں بچا کر اپنی گروی رکھی ہوئی زمین بھی چھڑا سکتے ہیں اور اپنے کنبوں کو مالی طور پر آسودہ حال بھی بنا سکتے ہیں تو غریب کسانوں کے گبرو جوان بیٹے ممالک غیر کی طرف روانہ ہونے لگے۔ یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب تک غیر ملکی حکومتوں نے اپنے ملکوں میں ان کے داخلے پر پابندی عائد نہیں کی۔ ۱۹۱۰ء میں امریکہ اور کینڈا کے ساحل سمندر پر مزدوری کررہے ہندستانیوں کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کرگئی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں چھ ہزار ہندستانی منیلا میں بیٹھے ہوئے امریکہ میں داخل ہونے کا موقع ملنے کے منتظر تھے۔

بیرونی ممالک میں جاکر ہندستانیوں کی سمجھ میں آیا کہ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے ان کے اپنے وطن کو کیسی بدحالی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بیرونی ممالک کی ترقی یافتہ مالی حیثیت اور وہاں کے عوام کی خوشحالی دیکھ کر وہ حیرت زدہ بھی تھے اور شرمسار بھی کہ ان کے اپنے وطن میں ان کو وہ تمام وسائل کیوں دستیاب نہ تھے، جو بیرونی ممالک کے عوام کو دستیاب تھے۔ اسی اثنا میں بعض ایسے محبانِ وطن انقلابی بھی بیرونی ممالک میں پہنچ چکے تھے۔ جو اپنے وطن میں انگریزوں کے قید و بند میں سڑنے کے بجائے ملک سے باہر بیٹھ کر ملک کے لیے کچھ کر گزرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ نسلی امتیاز کے شدید جذبے کی وجہ سے ہندستانیوں کو وہاں کے گوروں کے ہاتھوں جس طرح کی ذلت اور خواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس کا سدباب تلاش کرنے کے لیے یہ لوگ مل بیٹھ کر اپنا غم و غصہ ایک دوسرے سے بانٹنے لگے تو انقلابیوں نے ان کے اندر سیاسی بیداری لانے کا کام شروع کردیا۔ شہر در شہر تارکین وطن کے گٹوں کے جلسے منعقد کیے

گئے، غدر تحریک کے موجد لالہ ہردیال ان سے مخاطب ہوئے اور انھوں نے ان کو سمجھایا کہ ہماری معاشی، سیاسی اور معاشرتی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ انگریز ہندستان کی دولت لوٹ کر انگلینڈ لے جا رہے ہیں۔

تاکین ہند کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان انقلابیوں نے ان کو عملی طور پر مادرِ وطن کے لیے کچھ کرگزرنے پر بھی راغب کیا۔ انقلابیوں نے ایک طریقۂ کار وضع کیا کہ سب سے پہلے تو مختلف ممالک میں رہ رہے تاکین وطن میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے اور پھر ان کے ذریعے سے انگریزی افواج میں ملازمت کر رہے ہندستانیوں کو بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی غرض سے لالہ ہردیال نے یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو سین فرانسسکو (امریکہ) سے ایک ہفتہ وار اُردو اخبار جاری کیا، جس کا نام تھا 'غدر' اس اخبار کی ہزاروں کاپیاں ممالک غیر میں رہنے والے تارکینِ وطن میں اور ہندستانی فوج کے دستوں میں مفت تقسیم کی گئیں۔ اس اخبار کی اشاعت اور دیگر انقلابی کارروائیوں پر ہونے والے اخراجات تارکینِ وطن کی گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے حاصل ہونے والی امداد سے پورے ہوتے تھے۔ اس اخبار کی پیشانی پر لکھا رہتا تھا۔ 'انگریزی راج کا دشمن' ۸/نومبر ۱۹۱۳ء کو اس اخبار کا پنجابی ایڈیشن بھی شروع کر دیا گیا، جس کی پیشانی پر دو مصرعے شائع ہوتے تھے۔ ''جو چت پریم کھیلن کا چاؤ، سر دھر تلی گلی میری آؤ'' (اگر تمھارے دل میں محبت یعنی حب الوطنی کی بازی کھیلنے کا شوق ہے تو اپنا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میری گلی میں آؤ) ان اخباروں کو چلانے کے لیے ایک پارٹی قائم کی گئی جس کا نام رکھا گیا۔ ''ہندی ایسوسی ایشن'' سوہن سنگھ بھکنا کو صدر، لالہ ہردیال کو سکریٹری اور پنڈت کانشی رام کو خازن مقرر کیا گیا۔

اخبارات اور دیگر تبلیغی مواد کی اشاعت کے لیے سین فرانسسکو کی ہل اسٹریٹ میں ۴۳۶ نمبر مکان کرائے پر لے کر اس کا نام رکھا گیا 'یگانتر آشرم' یہ مکان انقلابی محبانِ وطن کی جائے رہائش بھی تھا۔ ہردیال، سوہن سنگھ بھکنا، ہرنام سنگھ، کرتار سنگھ سرابھا، جگت رام جیسے انقلابی اس آشرم میں فقیروں کی طرح گزر بسر کرتے ہوئے خدمتِ مادرِ وطن کے بےلوث جذبے کے ساتھ شب و روز تبلیغی لٹریچر تحریر کرنے اور اس کی نشر و اشاعت میں منہمک رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ جیتندر ناتھ لاہڑی، دارسی چینچیا، گوبند بہاری لال، تارک ناتھ داس، بھائی بلونت سنگھ، بھائی جوالا سنگھ، پنڈت کانشی رام، بھائی بھگوان سنگھ، رام چندر، مولوی برکت اللہ، حسین رحیم وغیرہ محبانِ وطن بھی لالہ ہردیال کے طریقۂ کار کو فروغ دینے کی غرض سے سرگرم عمل ہو گئے۔

تارکینِ وطن کو سیاسی بیداری سے ہمکنار کرنے اور ان کے دلوں میں جوش حب الوطنی پیدا کرنے کی غرض سے لالہ ہردیال اور ان کے ہم نواؤں نے جگہ جگہ پر جلسوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ پہلا بڑا جلسہ مونارک مل میں منعقد ہوا جس کو لالہ ہردیال اور بھائی پرمانند نے خطاب کیا۔ اس کے بعد ایسے ہی جلسے برائڈل ویل، ایسٹوریا، وڈلینڈ، لنٹن، پورٹ لینڈ، برکلے، ہولٹ ویل اور دیگر مقامات پر منعقد کیے گئے۔ ایسٹوریا میں منعقد ہوئے جلسے میں شرکا نے ایک نمائندہ مرکزی کمیٹی قائم کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ انگیز دشمن مہم کو باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھایا جاسکے۔ کمیٹی وجود میں آئی، جس کے اندر ہردیال، بھکنا اور کانشی رام پر مشتمل ایک کور کمیٹی کو فیصلہ لینے کے تمام اختیار دے دیئے گئے۔ 'غدر' اخبار کی نسبت سے اس کمیٹی کو 'غدر پارٹی' کے نام سے جانا گیا۔ یہیں سے غدر تحریک کی شروعات ہوئی۔ چھ ماہ کی قلیل مدت ہی میں اس تحریک نے تارکینِ وطن کو بیدار کرنے کا فریضہ انجام دے دیا اور تارکینِ ہند جلد از جلد وطن واپس جا کر غدر برپا کرنے کے لیے بےقرار ہو اٹھے۔

اگست ۱۹۱۴ء میں جرمنی اور انگلینڈ کے درمیان شروع ہوئی تو انقلابی محبانِ وطن نے جرمنی سرکار کے محکمۂ خارجہ سے بڑی تعداد میں ہتھیار اور مالی امداد کی یقین دہانی حاصل کر لی اور متعلقین غدر تحریک کو یقین ہو گیا کہ جب وہ ہندستان جا کر غدر برپا کریں گے تو انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہی مسلح بغاوت شروع کر دیں گے اور جرمنی سے ملنے والے ہتھیاروں کی مدد سے وہ انگریزوں کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کر دیں گے۔ ان کی حب الوطنی نے ایک جنون کی صورت اختیار کر لی۔ اس جنون کے پس پشت ایک ہی جذبہ کارفرما تھا کہ انگریز تو تعداد میں کچھ سو یا کچھ ہزار ہوں گے، ہم تیس کروڑ ہندستانی اُٹھ کھڑے ہوں گے تو دس دس ہندستانیوں کے حصے میں ایک ایک انگریز آئے گا جس کو مار بھگانا مشکل نہیں ہے۔

حب الوطنی کے اُبلتے بلکہ کھولتے ہوئے جذبے کے جنون میں نہ کسی نے حکومت انگلشیا کی طاقت کا اندازہ لگایا، نہ انگریزوں کی خفیہ کاری کی قوت کا حساب لگایا، نہ جرمنی سے حاصل ہونے والی مدد کو یقینی بنایا، نہ

اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت اوران کے غلامانہ رجحانات کو سمجھا، نہ ہندستانی سپاہیوں کی مسلح بغاوت کا تیقن کیا، بس اپنے خون پسینے کی کمائی سے غیر ملکوں میں بنائی ہوئی اپنی جائدادیں فروخت کیں، اپنی جمع پونجی یگانتر م آشرم میں جمع کرائی اورغول درغول ہندستان کی طرف چل پڑے۔

سمندری جہازوں پرسفر کر کے جب یہ لوگ ہندستان پہنچے تو اکثر کوتو بندرگاہوں پر ہی حراست میں لے لیا گیا۔ جو مال وزر وہ اپنے ہمراہ لائے تھے، وہ ضبط کرلیا گیا۔ گرفتار کیے گئے لوگوں میں غدر پارٹی کے صدر، دونائب صدور اور مجلس عاملہ کے کئی اراکین شامل تھے۔ جولوگ کسی نہ کسی طرح پولیس سے بچ بچا کر پنجاب پہنچنے میں کامیاب رہے، ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کس مقام پر جمع ہونا ہے اور کیا کرنا ہے۔ ایک سربراہ نے ان کو لدھیانہ کے قریب لاڈووال ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے کی دعوت دی تو دوسرے نے ان کو موگا میں طلب کرلیا۔ جگت رام نے ان کومشورہ دیا کہ وہ لاہور میں بھائی پرمانند سے ہدایت لیں کہ اگلی کارروائی کیا ہوگی۔

ہندستان آکر ان پر صورت حال واضح ہوئی تو یہ لوگ ششدر رہ گئے۔ان کے گاؤں والے ان کو خبطی سمجھ رہے تھے اوران کو انگریزوں کی اطاعت کی تلقین کررہے تھے۔ انگریزی فوج کے ہندستانی سپاہی مسلح بغاوت کرنے میں پس وپیش کا مظاہرہ کررہے تھے۔ سکھ مکمل طور پر انگریزوں کی تابعداری کررہے تھے۔ جرمنی سے ہتھیار اور مالی امداد لے کر روانہ ہوا جہاز راستے ہی میں پکڑا جاچکا تھا اور ہر طرح سے چوکس انگریز ان کو گرفتار کرنے کے لیے برسرپیکار تھے، چونکہ ان کی نظر میں یہ لوگ خبطی ہی نہیں، غدار اور نمک حرام بھی تھے۔

موگا میں جمع ہوئے تارکین ہند نے طے کیا کہ غدر ۲۶/نومبر ۱۹۱۵ء کو فیروز پور سے شروع کیا جائے گا، جہاں پٹھان دستے کے متعدد سپاہی مسلح بغاوت کریں گے۔ موگا سے لدھیانہ واپس آنے کے وقت تقریباً ۲۰ مجاہدین کی ریل گاڑی چھوٹ گئی۔ انھوں نے تین چار تانگے کرائے پر لیے اور لدھیانہ کی طرف چل دیئے۔ راستے میں ایک ذیلدار اور ایک پولیس افسر گاؤں والوں سے کچھ پوچھ تاچھ کررہے تھے۔ ان پر ان کو شک ہوا تو انھوں نے تانگے روک کر ان سے بھی پوچھ تاچھ شروع کردی۔ دونوں افسروں کی زبان انتہائی فحش اور توہین آمیز تھی۔ ان انقلابیوں نے اسی زبان میں ان کو جواب دیا تو پولیس افسر نے رحمت علی خاں نام کے ایک انقلابی کو تھپڑ مار دیا۔ اس کا ایک ساتھ یہ ہتک برداشت نہ کرسکا تو اس نے فوراً اپنا ریوالور نکالا اور دونوں افسروں کو ہلاک کردیا۔ گاؤں والوں کی طرف سے اپنے بچاؤ میں گولی باری ہوئی تو دو انقلابی شہید ہوگئے۔ مزید پولیس موقعہ واردات کی طرف دوڑی اور ان میں سے سات انقلابی گرفتار کرلیے گئے۔ گرفتار ہونے والوں میں غدر تحریک کا اعلیٰ سربراہ پنڈت کانشی رام بھی شامل تھا۔ سیشن عدالت میں ان ساتوں اشخاص پر تیز رومقدمہ چلا کر ان ساتوں کی پھانسی دے دی گئی۔

ادھر کرتار سنگھ سرابھا اور وِشنو گنیش پنگلے نے جب یہ دیکھا کہ تحریک کو ترتیب دے پانا ان کے بس کی بات نہیں ہے تو انھوں نے پنگلی انقلابی راس بہاری بوس اور شچیندر ناتھ سانیال کو پنجاب بلالیا۔ پنجاب آکر ان انقلابیوں کو ان کے راستے میں آنے والی زبردست مشکلات کا اندازہ ہوگیا تھا مگر ان کو پنجابیوں کے حوصلے اور ان کی ثابت قدمی پر مکمل بھروسہ تھا۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ غدر ۲۱/فروری ۱۹۱۵ء کو فیروز پور سے شروع ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے مختلف مقامات پر موجود ہندستانی سپاہی بغاوت کا علم بلند کردیں گے۔ یہ بھنک پڑنے پر کہ ان کی کور کمیٹی میں جگہ حاصل کرلینے میں کامیاب ہوچکے کرپال سنگھ نام کے ایک جاسوس نے انگریز حکومت کو اس کے بارے میں آگاہ کردیا ہے، غدر کی تاریخ کو دو دن آگے کھینچ کر ۱۹/فروری کردیا گیا۔

۱۹/فروری کی رات کو ایک جتھہ کرتار سنگھ کی سربراہی میں اور ایک جتھہ مذہبی رہنما بھائی رندھیر سنگھ کی سربراہی میں، کل ملا کر ساٹھ ستر مجاہدین دیسی ہتھیاروں سے لیس ہوکر فیروز پور پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی ان کو معلوم پڑا کہ وہ تمام سپاہی، جن سے ان کی واقفیت تھی یا رابطہ تھا، یا تو نوکری سے برخاست کیے جاچکے تھے یا ان کا تبادلہ کیا جاچکا تھا۔ ادھر کرتار سنگھ بوس کو مطلع کرنے کے لیے لاہور کی طرف دوڑا تو ادھر شچیندر ناتھ سانیال مع اپنے ساتھیوں کے بنارس میں منتظر تھا کہ کب پنجاب سے خوش خبری آئے اور وہ مقامی ہندستانی سپاہیوں کو بغاوت شروع کرنے کا اشارہ کرے۔ باقی مجاہدین آزادی گرفتاریوں سے بچنے کے لیے روپوش ہوگئے۔ تین سرکردہ مجاہدین کرتار سنگھ سرابھا، ہرنام سنگھ ٹنڈی لاٹ اور جگت سنگھ ایک دوست سے ہتھیار لینے کے لیے سرگودھا گئے تو دوست نے دغا دے دیا اور ان تینوں کو گرفتار کروادیا۔ دوسرے تین مجاہدین کو لاہور کے انارکلی بازار میں پولیس نے روک کر سوال جواب

کرنا شروع کیا تو ان میں سے ایک نے پولیس والے کو گولی مار دی۔ تینوں کو گرفتار کر کے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔

تحریک ناکام ہوگئی تھی۔ انگریزوں نے دھڑادھڑ پکڑ دھکڑ کی، مجاہدینِ آزادی پر اسپیشل عدالتوں میں مقدمے چلائے اور ان کو مختلف انواع کی سزائیں سنادیں۔ 'لاہور سازش کیس اوّل' میں ۸۲ مجاہدین کو مجرم قرار دیا گیا۔ 'لاہور سازش کیس دوم' میں ۱۰۲ کو اور 'لاہور سازش کیس سوم و چہارم' میں ۷۴ مجاہدین کو ملزم بنایا گیا۔ ان میں سے ۴۶ کو سزائے موت سنائی گئی، ۴۹ کو عمر قید و جلاوطنی کی سزا ہوئی اور ۱۲۵ کو مختلف مدت کے قید و بند کی سزائیں سنائی گئیں۔ سزائے موت پانے والوں میں تحریک کے تقریباً تمام اعلیٰ ارکان سوہن سنگھ بھکنا، بھائی جوالا سنگھ، بھائی کیسر سنگھ، بابا ندھان سنگھ، بھائی پرمانند، رام سرن داس، جگت رام، ہرنام سنگھ ٹنڈی لاٹ اور کرتار سنگھ سرابھا شامل تھے۔ فیصلہ سنائے جانے سے قبل سرابھا نے عدالت میں بیان دیا:

''آج یہ عدالت مجھے عمر قید کی سزا سنائے گی یا پھانسی کی۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائے تاکہ میں دوبارہ جنم لے کر پھر سے جہار آزادئ وطن میں شریک ہوسکوں۔ میری آرزو ہے کہ میں تب تک بار بار جنم لیتا رہوں اور پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاتا رہوں جب تک میرا ملک آزاد نہیں ہوتا۔''

یہی اس تحریک کا منشور و مقصد تھا۔ یہی وہ جنون تھا جس کو لے کر تارکینِ وطن اپنے دیس لوٹے تھے مگر ان کے اس جوش بلا ہوش کا انجام محبانِ وطن کی قربانیوں اور ان کے اہل و عیال کی بے شمار مصیبتوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ کاش! اس وقت ان کی آواز پر اہلیان پنجاب نے لبیک کہا ہوتا اور وہ انگریزوں کی پشت پناہی کرنے کی جگہ پر ان مجاہدین آزادی کے شانہ بہ شانہ اُٹھ کھڑے ہوتے تو یہ ملک شاید برسوں پہلے ہی آزاد ہوگیا ہوتا۔

# حضرت شیخ الہند کا درسِ حدیث: خصوصیات وامتیازات

مولانا مفتی محمد شوکت علی بھاگلپوری (شیخ الحدیث دار العلوم سعادتِ دارین ست پور، بھروچ، گجرات)

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم! امابعد!

محترم صدر عالی قدر! دانشورانِ ملک وملت! سامعینِ عالی مقام!

آج کا یہ سیمینار اُس عظیم المرتبت ہستی اور جانشینِ اکابر کے نام پر منعقد ہوا ہے جنھیں لوگ ''محمود حسن دیوبندی'' کہتے ہیں، اور مالٹا سے رہا ہوکر بمبئی پہنچنے پر خلافت کمیٹی نے متفقہ طور پر ان کے لیے 'شیخ الہند' کا خطاب تجویز کیا تھا، یہ پُر مغز خطاب فکر ونظر کی تابانی، محاسن وکمالات کی جامعیت،، کمالِ علم وتقویٰ، مومنانہ فراست وبصیرت، اور بزرگانہ عظمت کی وجہ سے ان کے قائدانہ کردار پر ایسا چسپاں ہوا کہ ان کے نام کا جز بن گیا، آج حالت یہ ہے کہ اگر صرف مولانا محمود حسن کہا جائے تو سوچنا پڑے گا کہ اس سے کون مراد ہے، 'شیخ الہند' کا لقب اُس پیکرِ علم وتقویٰ اور برصغیر کے مدبر ورہبرِ اعظم کا تعین کردیتا ہے، جو اپنے عہد کی سب سے بڑی دینی وسیاسی شخصیت تھی، بعض سوانح نگاروں کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ تحریکِ آزادئ ہند میں حضرت شیخ الہند کا وہی مقام تھا، جو اِس تحریک کے دورِ ثانی میں شاہ اسماعیل شہید کا تھا، ملاحظہ فرمائیے! ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی حقیقت پسندانہ تحریر جس میں اس کا برملا اظہار کیا گیا ہے، موصوف تحریر فرماتے ہیں: ''مولانا ابوالکلام آزاد نے خانوادۂ ولی اللہی میں شاہ اسماعیل شہید کو خود شاہ ولی اللہ صاحب سے بھی اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر ان کے (شاہ اسماعیل شہید کے) عہد میں شاہ ولی اللہ صاحب بھی ہوتے تو انھی کے جھنڈے کے نیچے ہوتے، میں پوری علمی بصیرت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پورے علمی خانوادۂ قاسمی میں جو برصغیر کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے، حضرت شیخ الہند کا وہی مقام ہے جو اس تحریک کے دورِ ثانی میں شاہ اسماعیل شہید کا تھا، حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی میں وہ (بے مثال) کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر اُس دور میں حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ ہوتے تو وہ بھی اس سلطانِ وقت واسکندرِ عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں پہ یہ عہد سعادت اور دورِ علوم وافکار اُسی ذات گرامی اور فضیلت مآب کا عہد ہے، جسے تاریخ اسلامیانِ پاک وبھارت میں 'محمود حسن' کے نام 'دیوبندی' کی نسبت اور 'شیخ الہند' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ (دیکھئے شیخ الہند ایک سیاسی مطالعہ ص: ۳۴۰)

حاضرینِ ذی وقار! حضرت شیخ الہند کی خدمات، مجاہدانہ کارناموں، ان کے کمالات اور سوانحی خاکوں پر مشتمل ہزاروں صفحات لکھے جاچکے ہیں، اور کم وبیش پندرہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں، مقالات و مضامین اس کے علاوہ ہیں، مگر ان سب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرِ مشترک ہر کتاب میں حضرت شیخ الہند کی زندگی کے صرف آخری پانچ سالہ کارناموں پر زورِ قلم زیادہ صرف کیا گیا ہے، حضرت کی ریشمی رومال تحریک پر ہی بلا مبالغہ مخالفین وموافقین نے ہزاروں صفحات لکھے، درجنوں کتابوں میں اس کی تفصیلات پائی جاتی ہیں، حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء پر مقدمۂ بغاوت کی فائل، جو انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ وہ بھی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، ان تحریرات اور کتابوں کے پڑھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا یہی ایک کارنامہ ہے، جس نے پوری دنیا میں آپ کے نام کو روشن کررکھا تھا۔

بہی خواہانِ قوم! اس میں شک نہیں کہ تحریکِ آزادئ ہند کی تاریخ میں حضرت شیخ الہند کی منصوبہ بند محنت ہندستان کے تابناک مستقبل کا پیش خیمہ تھی، اور آزادئ ہند کے باب میں اس کا بڑا اونچا مقام رہا، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کہ بظاہر اسباب حضرت شیخ الہندؒ کے جہدِ مسلسل ان کے مقرر کردہ نقوش وخطوط، ان کے رفقائے کار اور تلامذہ کی فکر ولگن اور مدبرانہ کاوشوں کی بدولت ہی انگریز کے خونی چنگل سے نکال کر اس ملک کو آزاد کرانا ممکن ہوسکا، اور بلاتردد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی بے لوث قربانیوں کے بغیر ہندستان کی آزادی کا خواب شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوپاتا۔

لیکن یہ کہنا کہ حضرت شیخ الہند جیسی ہمہ جہت شخصیت کی زندگی کا یہی اصل کارنامہ ہے، جس نے آپ کو پورے عالم میں چمکا کر ترقی کے بام عروج پر پہنچایا، عوام وخواص میں یکساں مقبول بنایا، اپنے پرائے سب نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، اور یہ آپ کی زندگی کا ایسا امتیازی

کارنامہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر جگہ ہر طبقہ کے لوگ آپ کے نام پر ادب واحترام کے ساتھ عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کرنے کو بے تاب نظر آتے ہیں، کسی طرح درست نہیں ہوسکتا، کیونکہ دنیا کے سامنے 'شیخ الہند' کا اس سے بھی عظیم بلکہ عظیم ترین ایک کارنامہ ہے، جس نے آپ کے کلاہ عزت وافتخار پر چار چاند لگادیئے ہیں، اور وہ ہے علوم وفنون کے ماہر سیکڑوں شاگردوں کی کھیپ، آپ نے اپنے پُراثر حلقۂ درس کے ذریعہ اپنے سیکڑوں شاگردوں کی ایسی ہمہ جہت عبقری شخصیات پیدا کیں، جنھوں نے اسلامی علوم وفنون میں وہ مہارت حاصل کی، اور درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ملک وملت کی وہ مثالی خدمت انجام دی کہ دُور دُور تک ان کا کوئی شریک وسہیم نظر نہیں آتا، حضرت کے ان جلیل القدر تلامذہ نے قرآن وحدیث اور ان سے متعلقہ علوم وفنون کی وہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں کہ پچھلی صدیوں میں کوئی مثال ڈھونڈنا مشکل نظر آتا ہے۔ 'شیخ الہند' کے فیضان علم کا یہ کرشمہ تھا کہ ان کے حلقۂ درس سے علم حدیث کے ماہرین اور ایک سے بڑھ کر ایک باکمال صاحب بصیرت افراد پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ شیخ الہند کی روایت کو زندہ رکھا، بلکہ ان کے علوم ومعارف کی تبلیغ واشاعت میں بھی تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا، دارالعلوم کی مسند حدیث اس فیضان علمی کا سرچشمہ بن گئی، جس مسند پر بیٹھ کر حضرت شیخ الہندؒ نے ۲۵ رسال تک بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ جیسی اہم کتابوں کے محققانہ درس کے ذریعہ اطراف عالم سے آئے ہوئے تشنگانِ علوم کو سیراب کیا، اسی مسند پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے آپ کے ہونہار شاگردان علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے سات سال، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ۳۲ رسال اور فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحبؒ نے ۱۵ رسال درس حدیث کا لازوال وبے مثال کارنامہ انجام دیا، اور تحقیق وتدقیق کا وہ معیار قائم کیا کہ آج ان بزرگوں کی املائی درسی تقریر نے سیکڑوں علماء کو مدارس اسلامیہ میں شیخ الحدیث بنا دیا۔ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا محمد منصور انصاریؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حافظ محمد احمد نانوتویؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا محمد صادق کراچویؒ، مفتی سہول احمد بھاگلپوریؒ، مولانا مناظر حسن گیلانیؒ وغیرہ اکابر آپ کے ان ممتاز تلامذہ میں تھے کہ ان میں کا ہر ایک اپنی ذات میں پوری انجمن تھے۔

پھر حضرت کے تلامذہ میں صرف یہ مذکورہ بالا دوچار ہمالیائی شخصیات نہیں، ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ غیر منقسم ہندستان کا ہر گوشہ ان کی سدابہار خدمات سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، کوئی اپنے زمانے کا رازی وغزالی تھا تو کوئی جنید وشبلی، غرض یہ کہ حضرت کے شاگردوں نے اتنے بڑے معمورۂ عالم کو اسلامی علوم وفنون کی روشنی سے منور کیا کہ اس سے پہلے بڑی سے بڑی شخصیت کے شاگردوں کا دائرۂ خدمت اتنا وسیع نظر نہیں آتا، حضرت ممدوحؒ کی وفات حسرت آیات کو بانوے سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی مدارس اسلامیہ کی خوشگوار فضاؤں میں ان کے زمزموں کی گونج سنائی دیتی ہے، آپ کی عبقریت وآفاقیت کا اصل راز یہ ہے کہ آپ نے اپنے سوز دروں سے انقلابی شخصیات اور ماہرین کی ایسی جماعت تیار کی تھی کہ ان میں سے بہتوں کی جامعیت، عبقریت اور بے مثالی کو دنیا نے بلاچون وچرا تسلیم کرلیا تھا، اور دانشورانِ قوم وملت انھیں اپنا پیشوا اور مسیحا سمجھ کر ان کے جھنڈوں تلے انقلابی تحریک میں شریک کار رہے، اور انگریزوں کو دیس نکالا دینے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، کسی استاذ کے حلقۂ درس سے اتنے سارے تلامذہ عظمت وعزت کے بلند مقام پر فائز ہوئے ہوں پچھلی کئی صدیوں میں اس کی مثال کمیاب نظر آتی ہے۔

سامعین گرامی! شیخ الہند کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ان کا نرالا اور مبصرانہ درس حدیث ہے، یوں تو آپ فقہ وتفسیر اور اُن کے اصول، صرف ونحو، معانی وبلاغت، شعروادب، منطق وفلسفہ، حکمت وہیئت اور تمام ہی علوم عقلیہ ونقلیہ میں بحر ذخار تھے، مگر درس حدیث میں خاص کر آپ کا بڑا نرالا انداز تھا، دور دور تک اس کا شہرہ تھا، طلبہ کیا فضلا مدارس بلکہ اونچی پائے کے مدرسین بھی کسبِ فیض کے لیے آپ کا رُخ کرتے تھے، حضرت کا انداز درس سمجھنے کے لیے مختصر تمہید درکار ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریر کے مطابق علماء حجاز کے یہاں حدیث پڑھانے کے تین طریقے رائج تھے۔

۱- سرد: (رواروی) یعنی صرف حدیث کی عبارت پڑھ دینا۔

۲- بحث وحل: یعنی حدیث کی عبارت خوانی کے بعد استاذ کی طرف سے غریب الفاظ کی تشریح، مشکل ترکیبوں کا حل، سند کے غیر معروف اسماء جن کا ذکر کم آتا ہے۔ کا بیان، موٹے موٹے اعتراضات کے جوابات، حدیث میں مذکور صریح مسائل کی قدرے تفصیل طالب حدیث کے سامنے پیش کرنا۔

۳- امعان وتعمق: یعنی حدیث کے ہر ہر لفظ کے متعلقات اوراس کے مالہ وماعلیہ پر سیر حاصل بحث۔

جب دہلی کی مسند حدیث کی لَو دھیمی ہوئی تو ہندستانی درسگاہوں میں ہر طرف حکمت ومنطق کا بول بالا، اور فلسفیانہ موشگافیوں کا دور دورہ تھا، رامپور، خیرآباد، جونپور، ٹونک وغیرہ کی درسگاہوں میں انھیں علوم کی گونج سنائی دینے لگی تھی، لوگوں کے ذہن ودماغ بحث وتمحیص، دلائل براہین اور امعان وتعمق کے عادی ہوگئے تھے، تو ایسے دور میں مجبوراً اکابر دیوبند کو درس حدیث کا پہلا طریقہ چھوڑ کر حدیث کے دوسرے دونوں طریقوں کو حسبِ موقع وضرورت اختیار کرنا پڑا، چنانچہ دارالعلوم میں روز قیام ہی سے حدیث پڑھانے کے لیے بحث وحل اور امعان وتعمق کا طریقہ رائج ہے، یہاں کے محدثین انھیں دوطریقوں پر حدیث کا درس دیتے رہے ہیں اور آج تک جاری ہے۔

حضرت نانوتویؒ اکابر دہلی کے فیض یافتہ تھے، تحقیق وتنقید آپ کا مزاج بن چکا تھا، سندوں اور راویوں پر نقد، ائمہ اربعہ کے مسلک کا بیان حدیث کے مفہوم کی وضاحت آپ کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، اس پر مستزاد یہ کہ وقت وحالات کے تقاضہ پر آپ نے اپنے درس حدیث میں داخلی نقد کا اضافہ فرمایا، حدیث کا سیاق وسباق، وقت، حالات، ماحول، پس منظر موقع ومحل کو سامنے رکھ کر احادیث کا مفہوم پیش کرنا اور منشاء رسول کو سمجھنے سمجھانے کی محققانہ ومخلصانہ کوشش کرنا آپ کا ایسا کمال وامتیاز تھا جو اس سے پہلے کبریت احمر تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ بھی اُنھی کے علوم ومعارف کے وارث وامین اور اُن کے سچے جانشین تھے، پھر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے کسب فیض نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، ان کے درس حدیث نے آپ کی ذات کو دوآتشہ بنا دیا تھا، اس لیے جب شیخ الہندؒ جلوہ آرائے مسند حدیث ہوئے تو اکابر کے علوم ومعارف کی تعبیر وتشریح کا ایسا دلنشیں انداز اختیار فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگ عالم میں آپ کی حدیث دانی اور علمی مہارت کا ڈنکا بج گیا، دُور دراز کے بلاد وممالک تک سے تشنگانِ علوم نبوت اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے کشاں کشاں اس بحر بیکراں کا رُخ کرنے لگے۔

شیخ الہندؒ کا حلقۂ درس اسلاف کرام کے حلقۂ درسِ حدیث کا نمونہ تھا، طلبہ انتہائی ادب واحترام کے ساتھ ہمہ تن گوش رہتے، آپ نہایت سبک اور آسان الفاظ بامحاورہ اُردو میں جوش وروانی سے علوم ومعارف کے دریا بہاتے، آیات وروایات کی جھڑیاں لگاتے، ائمہ اربعہ کے مذاہب، دیگر فقہاء ومجتہدین کے آراء، صحابہ وتابعین کے اقوال بیان کرتے، سب کے دلائل پیش کرتے، ہر امام کا ادب سے نام لیتے، ان کے کمالات کا اعتراف کرتے، اور اپنی تقریر کے ذریعہ طلبہ کو باور کراتے کہ یہ سب مذاہب قرآن وسنت سے ماخوذ اور برحق ہیں، ان کی تنقیص وبے ادبی کو خسران وبدبختی کا سبب قرار دیتے، امام ابوحنیفہؒ کا مسلک کامل انشراح وبشاشت، اور شرح وبسط سے بیان کرتے، دلائل وشواہد اور قرائن کی بھرمار ہوتی، مذہب امام اعظم کو اس خوبی سے ترجیح دیتے کہ ہر منصف مزاج کا دل صاف گواہی دیتا ہے کہ حق اِسی جانب ہے، وجوہات ترجیح بیان کرتے، احادیث کا ظاہری تعارض دور کرتے، احادیث محتملہ کی ایسی تشریح فرماتے کہ بات اک دم دل میں اُتر جاتی، جی چاہتا ہے کہ چلتے چلتے حضرت شیخ الہندؒ کی انوکھی اور نرالی تشریحِ حدیث کے چند جواہر پارے بطور نمونہ پیش کردوں تاکہ حضرت کے کمالات کی کچھ جھلک ہمارے سامنے آجائے۔

(۱) امام بخاری نے اپنی صحیح کا آغاز حمد سے کیوں نہیں کیا، شراح بخاری نے اس کے بہت سارے جوابات رقم کئے ہیں، اور سب اپنی جگہ اہم ہیں، مگر حضرت شیخ الہندؒ کی بات ہی نرالی ہے، حضرت فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری اپنے اس طرزِ عمل سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو دیکھو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عالم کے نام لکھوائی ہوئی کتاب کا آغاز صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے فرمایا ہے، اگر حمد لکھنا ضروری ہوتا تو آپ اس پر ضرور عمل فرماتے، امام موصوف کا عزم یہ ہے کہ اس کتاب کی تمام چیزیں سنت کے مطابق ہوں، اس لیے آپ کا یہ طرز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ہے۔

(۲) بخاری شریف میں باب وحی کی تیسری حدیث میں نبوت سے پہلے غارحراء میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی اور آغاز وحی ونبوت کے وقت جبرئیل کے آپ کو دبوچنے کا ذکر ہے، شراح بخاری اور علماء ومحدثین نے اپنے اپنے انداز سے دبوچنے کا مقصد تحریر کیا ہے، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی تو بات ہی نرالی اور دل کو چھولینے والی ہے، حضرت فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصد زندگی بتلانے کے لیے

جبرئیل امین کو بھیجا گیا تھا، جبرئیل امین نے آپ کو مقصد کی نشاندہی کرانی چاہی، تو اس وقت آپ پر عبدیت کا غلبہ تھا، آپ نے بیچارگی میں کہہ دیا، میرے اندر اس کی اہلیت نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حقیقت سے واقف نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمالات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، اور کسی جانب متوجہ کرنے کی صورت یہی ہوتی ہے کہ پہلے دوسری تمام توجہات ذہن سے ہٹا دیئے جائیں، خیالات پر پابندی لگانے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ذہن کو دباؤ میں ڈالا جائے اس لیے سب سے پہلے جبرئیل نے دفعتاً آ چونکایا کہ پڑھئے، لیکن آپ نے مقام عبدیت کو نہیں چھوڑا، تو اس کے لیے دوبارہ اور سہ بارہ دبوچا گیا، اور جب دیکھا کہ توجہ کامل ہوگئی، تو آیات تلاوت فرمادیں، یہی قوت و جبرئیل نے کئی بار میں پہنچائی، یکبارگی پہنچائی جاتی تو تحمل مشکل ہوتا، اس دبوچنے کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اپنے متعلق عدم اہلیت کا گمان تھا، وہ ختم ہوگیا، جبرئیل نے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ جو چیز غلبۂ عبدیت کی بناء پر نگاہوں سے اوجھل تھی، اس طرح دبوچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھلا دی، جیسے کسی حسین نے کبھی آئینہ نہ دیکھا ہو، اور اسے اپنے حسن و جمال کا احساس نہ ہو، لیکن دفعتاً اس کے سامنے آئینہ پیش کردیا جائے، اور وہ اس میں اپنی صورت دیکھ لے تو اسے اپنی صورت بھانے لگتی ہے، حالانکہ آئینہ نے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔ (ماخوذ از ایضاح البخاری: ۱۰۱)

(۳) بخاری شریف کی کتاب العلم کا دوسرا باب ہے، ''من سئل علماً وھو مشتغل فی حدیثه فاتم الحدیث ثم اجاب السائل''

شراح نے اس عنوان کے الگ الگ مقاصد بیان کئے ہیں، کسی نے لکھا ہے کہ معلم و متعلم کے کچھ آداب بیان کرنا مقصود ہے، کسی نے لکھا یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی مصلحت سے معلم کا سائل کے جواب سے اعراض کرنا کتمان علم نہیں جس کی مذمت قرآن پاک میں وارد ہے، حضرت شیخ الہندؒ مقصد ترجمہ کے بارے میں کچھ اور ہی فرماتے ہیں، حضرت کا ارشاد ہے کہ معلم کو سائل کا جواب فوری طور پر دینا ضروری نہیں، وہ اپنی ضروریاتِ لاحقہ سے فارغ ہوکر جواب دے سکتا ہے جیسا کہ آپ نے پہلے سے چل رہی بات سے فارغ ہوکر اطمینان سے اعرابی کا جواب دیا، عنوانِ باب اور حدیث پر نگاہ ڈالنے سے شیخ الہند کی بات سب سے زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔ (ماخوذ از ایضاح البخاری: ج ۱/ ۴۵۱)

یہ چند مثالیں 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر ذکر کردیئے ہیں ورنہ تو حضرت کی شرح ابواب بخاری اور تقاریر ترمذی و ابوداؤد میں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں:

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

بس انھیں معروضات کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔ وصلی اللّٰہ علی النبی الکریم وعلی اله و اصحابه اجمعین. و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین.

# حضرت شیخ الہندؒ کا طریقۂ تدریس

**تحریر: مولانا محب اللہ**

مرکز علوم و معارف دیوبند اپنی مرکزیت کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے، وہاں کے چند ممتاز خاندانوں میں سے ایک خاندان مولانا ذوالفقار علی عثمانیؒ کا ہے، جو اپنے وقت کے صاحب اقبال دینی و دنیوی حیثیت سے صاحب وجاہت وثروت عالم تھے۔ آپ نے علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل مدرسہ غازی الدین، موجودہ عربک کالج، اجمیری گیٹ، دہلی میں استاذ العلماء، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک العلی صدیقی نانوتویؒ سے کی۔ فراغت کے بعد محکمہ تعلیم میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ عرصہ تک ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز رہ کر پنشن یافتہ ہوئے، آپ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ عربی اور فارسی کے بہترین ادیب تھے، عربی کی بلند پایہ دواوین ''قصیدہ بانت سعاد، قصیدہ بردہ، سبعہ معلقہ، دیوان حماسہ، دیوان متنبّی، معیار البلاغہ اور تسہیل الحساب'' کے اُردو ترجمے کئے، جو کہ آپ کی علمی یادگار ہیں۔ اللہ نے آپ کو چار صاحبزادے عطا کئے جو اپنے وقت کے آفتاب و مہتاب اور عالم و فاضل تھے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں میں سب سے بڑے حضرت مولانا محمود حسن عثمانیؒ تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ولادت باسعادت ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن کریم کی تکمیل میاں جی منگلوریؒ اور میاں جی عبداللطیفؒ سے کی۔ فارسی اپنے چچا مولانا مہتاب علی عثمانی سے پڑھی اور ابتدائی عربی بھی ان ہی سے حاصل کی۔ آپ کی عمر کے پندرہویں سال جبکہ قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے اور اسلامی سال کا پہلا مبارک مہینہ تھا، ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ء میں مرکز علوم دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ ملا محمود صاحب عثمانیؒ مدرس مقرر ہوئے۔ دیوبند کی قدیم مسجد ''مسجد چھتہ'' کے فرش پر انار کے درخت کے سائے میں درس کا آغاز ہوا۔ اس کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود عثمانیؒ تھے اور سب سے پہلے طالب علم یہ نونہال جو آگے چل کر شیخ الہند ہونے والے تھے، مولانا محمود حسن تھے۔ جملہ علوم وفنون کی تحصیل ملا محمود عثمانی اور دیگر اساتذہ وقت سے کی۔ صحاح ستہ کی تکمیل قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے میرٹھ، نانوتہ اور دہلی میں رہ کر کی۔ حضرت مولانا نانوتویؒ منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی دہلی اور مطبع ہاشمی میرٹھ میں تصحیح کتاب کرتے تھے۔ تصحیح کے ساتھ ساتھ دو چار شائقانِ علوم کو تفسیر و حدیث اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بعدہٗ فنون کی بعض کتابیں اپنے والد ماجد سے بھی پڑھیں۔ ۱۲۹۰ھ میں حضرت نانوتویؒ اور دیگر اکابر کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔ تعلیم کے زمانہ ہی سے آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا۔ حضرت نانوتویؒ کے تین مایۂ ناز شاگرد مولانا سیّد احمد حسن محدث امروہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور شیخ الہندؒ تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنی بصیرت اور نورِ فراست سے پہچان لیا تھا کہ یہ اپنے وقت کا مجاہدِ اعظم اور ملتِ اسلامیہ کا عظیم فرزند ہوگا۔ اپنی خاص شفقتوں اور عنایتوں سے نوازتے رہے، آپ کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ارباب دارالعلوم نے تدریس کے لیے منتخب کیا اور مدرس چہارم کی حیثیت سے درس و تدریس کا آغاز ۱۲۹۱ھ میں کیا۔ ترقی کرتے ہوئے ۱۳۰۸ھ میں منصب صدارت پر فائز ہوئے۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس سپرد ہوا۔ آپ کے درس حدیث کی شہرت ملک کے کونے کونے میں ہوئی تو شائقانِ حدیث نے جوق در جوق دیوبند کا رُخ کیا اور آپ کے درس سے تشفی حاصل کی۔

۱۲۹۴ھ میں اکابرین دیوبند نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا، اس قافلہ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین عثمانیؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ، حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ، مولانا سیّد احمد حسن محدث امروہیؒ اور دوسرے علماء بھی تھے۔ آپ بھی اس قافلے کی معیت میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے، ظاہری علم وفضل کی طرح باطن بھی آراستہ پیراستہ تھا۔ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی بیعت کا شرف حاصل تھا۔

استاذ الاساتذہ مولانا شاہ عبدالغنی فاروقی مجددی مہاجر مدنیؒ سے بھی

مدینہ منورہ میں اجازت حدیث حاصل کی۔ حرمین شریفین سے واپس آ کر پھر درس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کے فیض تعلیم اور طریقہ درس سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا سیّد اصغر حسین محدث دیوبندیؒ، مولانا سیّد فخر الدین احمد، مولانا اعزاز علی امروہیؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مشاہیر علماء کی جماعت وجود میں آئی۔

آپ کا درس علمی مباحث سے پُر ہوتا تھا، بہت سے ذی استعداد اور ذہین وفطین طالب علم جو مختلف اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد آپ کے درس میں حاضر ہوتے اور اپنے شکوک وشبہات کے شافی جواب پانے کے بعد آپ کی زبان سے آیاتِ قرآنیہ اور حدیث نبویہؐ کے معانی اور مضامین عالیہ سن کر معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں۔

مولانا سیّد اصغر حسینؒ نے ''حیات شیخ الہند'' میں آپ کے درس کی خصوصیات کے بارے میں ارقام کیا ہے:

''حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے درس حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب از بر۔ صحابہؓ وتابعینؒ، فقہاء ومجتہدینؒ کے اقوال محفوظ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اُردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی متخنی اور منکسر المزاج، ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ، مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی، لہجہ میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا لیکن خدا نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دلنشین ہوجاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اُٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں، حق ہے۔''

سلوک وتصوف کی منزل حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے طے کر کے دونوں کی طرف سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی۔

وطن عزیز کی آزادی میں آپ کی خدمات اور کارنامے بے مثال ہیں۔ آزادئ وطن کے لیے جدوجہد اس وقت شروع کردی تھی جبکہ انڈین نیشنل کانگریس وجود میں نہ آئی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں 'انجمن ثمرة التربیت' قائم کر کے آزادئ وطن کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۹ء میں 'جمعیۃ الانصار'، ۱۹۱۳ء میں 'نظارۃ المعارف القرآنیۃ' پھر ۱۹۱۶ء میں 'تحریک ریشمی رومال' کے نام سے آپ کی انقلابی سرگرمیاں ظاہر ہوئیں۔ استخلاص وطن کا ایسا منصوبہ بنایا تھا اگر وہ کامیاب ہوجاتا تو شاید پوری دنیا سے انگریز یعنی نصاریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا۔ آپ کی تحریک کا دائرہ ہندستان، روس، جرمنی، ترکی، افغانستان اور بلادِ عرب تک پھیلا ہوا تھا مگر تحریک کا راز فاش ہوگیا، وابستگانِ تحریک برطانوی قید خانوں میں نظر بند کردیئے گئے۔ آپ کو بھی مع چار رفقاء مکہ معظّمہ سے قید کر کے مصر اور مالٹا کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا، جہاں تقریباً ساڑھے تین سال گزار کر جون ۱۹۲۰ء میں ہندستان واپس ہوئے۔

جہاں آپ ایک طرف مسند درس حدیث پر فائز تھے اور وطن عزیز کی آزادی میں مصروف تھے، وہیں دوسری طرف تصنیف وتالیف کا کام بھی انجام دیا قرآن مجید کا اُردو ترجمہ (بنام موضح فرقان جو کو مولوی عبدالمجید بجنوری نے اپنے پریس مدینہ بجنور ۱۹۲۵ء میں شائع کیا) ادلہ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، الابواب والتراجم، جہد المقل، مختلف فتاویٰ اور سیاسی خطبات یادگار ہیں۔

یہ گنجینہ علم وعمل وفضل وکمال ملک وملت کے غم خوار ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی واقع دریا گنج دہلی میں ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو رب حقیقی سے جا ملے۔ دو جگہ دہلی میں پھر میرٹھ، مظفر نگر کے اسٹیشن پر اور آخر میں دیوبند میں نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور قبرستانِ قاسمی میں ابدی آرام گاہ بنی:

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

# تحریک شیخ الہندؒ

عادل صدیقی

شیخ الہند مولانا محمود حسن عالمی شہرت یافتہ ادارے دارالعلوم دیوبند کے اوّلین طالب علم تھے جنھوں نے مسجد چھتّہ میں ایک انار کے درخت کے نیچے ایک استاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ استاد محترم کا نام بھی محمود حسن ہی تھا۔ آپ نے ملک کو آزاد کرانے میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ آپ کی ریشمی رومال تحریک کا ذکر ہندستان کے مشہور اور مستند مورخین مثلاً ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ایشور پرساد اور ڈاکٹر کے ایم پانیکر نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی اور دوسرے شیخ الہندان کے بعد حضرت علامہ انورشاہ کشمیری کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۳۱۳ھ میں حضرت شیخ الہند نے حج و عمرہ کے بعد دربارِ رسالتؐ میں حاضری دی، انھیں دنوں شریف حسین والی مکہ معظّمہ نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پرفریب چالوں میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ آپ کے رفقائے کار میں حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی اور مولانا عزیر گل بطور خاص تھے، جب مالٹا کی قید سے رہا ہو کر پانچ سال بعد ممبئی کے راستے ہندستان آئے تو ان کو لینے کے لیے گاندھی جی گئے، ان کے ساتھ دیگر بہت سے ہندو حضرات بھی تھے۔ شیخ الہند نے ہندستان کی آزادی کا نعرہ سب سے پہلے بلند کیا اور ۱۹۱۲ء میں کابل میں جلاوطن حکومت بنانے کا اعلان کیا۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ ہندستان کی آزادی ہندو اور مسلم آپسی اشتراکِ عمل سے ہی لے سکتے ہیں۔ آپ نے کابل میں جس حکومت کا اعلان کیا اس کا پہلا صدر راجہ مہندر پرتاپ سنگھ کو بنایا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو وزیر خارجہ بنایا جنھوں نے پورے یوروپ میں گھوم کر یہ اعلان کیا کہ ہندستان آزاد ہونا چاہتے ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی آزادی کے بعد افریقی ملکوں کو آزاد ہونے کا موقع مل سکا۔ خیال رہے کہ تقسیم کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے، مولانا آزاد کی کتاب انڈیا وِنس فریڈم میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد آخر دم تک ہندستان کی تقسیم کے مخالف تھے مگر لکھتے ہیں کہ جب سردار پٹیل اور جواہر لعل نہرو بھی تقسیم وطن پر آمادہ ہو گئے تو ان کو بھی مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ خیال رہے کہ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور برابر میں اسلامی مملکت بنی، اس کے نتیجے میں ہندستان ایک ہندو ریاست بن سکتا تھا مگر نہیں یہ تو ایک سیکولر ملک بنا۔ ہندستان کا آئین سیکولر ہے، اس کے تمہیدی کلمات انتہائی شاندار ہیں، یہ سب اس لیے کہ شیخ الہندؒ اور دیگر مسلم محبانِ وطن مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبیداللہ سندھی، حسرت موہانی، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر بہت سی شخصیتوں کی آزادیِ وطن کی قربانیاں سامنے تھیں۔ ان کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم ہر سال ۱۵/اگست، ۲۶/جنوری، ۲/اکتوبر کے موقعوں پر آزادیِ وطن، آئین ہند کی سالگرہ اور گاندھی جی کا یومِ پیدائش مناتے ہیں مگر ان محبانِ وطن کی وطنی، قومی، ملکی اور قومی یکجہتی کے لیے کوششوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ بہرصورت تحریک شیخ الہند کی کامیابی کا سہرا جن حضرات کے سر بندھا، ان میں مولانا سیّد حسین احمد مدنی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ ان خدمات کے تئیں ہماری کوئی توجہ نہیں۔ تاریخ ہند کو ہم نے اس کے اصلی تناظر میں کبھی نہیں پڑھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وطن کی خدمت اور ملکی و تعلیمی خدمات کی تعلیم نہ صرف یہ کہ ہم اپنے طلبا کو دیں بلکہ یہ پیغام گھر گھر پہنچائیں، یہ پلسٹی کا دور ہے، ان تاریخی حقائق کو سامنے لانا ضروری ہے۔ اس تناظر میں حضرت مولانا محمد مدنی نے گزشتہ دنوں دیوبند میں تحریک شیخ الہند کو عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ایک اجتماع کیا۔ لیکن گستاخی معاف یہ پیغام تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے اگر ہم اپنے بزرگوں کے تاریخی کارناموں اور خدمت انسانی اور آزادیِ وطن کی ان خدمات کو نمایاں نہ کر سکیں گے تو اس کی ذمہ داری ہم پر آئے گی۔ ❑❑

# خطبۂ صدارت اکتیسواں اجلاسِ عام بسلسلۂ تحریک شیخ الہندؒ

منعقدہ ۲۶،۲۷؍جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۸،۱۹؍مئی ۲۰۱۲ء بروز جمعہ، سنیچر، بمقام: رام لیلا میدان، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وذریاتہ اجمعین، اما بعد:

معزز اراکین جمعیۃ علماء ہند، علماء کرام اور دانشوران ملت! سب سے پہلے میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے تمام تر کمزوریوں، کوتاہیوں کے باوجود جمعیۃ علماء ہند کے اس اکتیسویں اجلاس عام کی صدارت کے لیے منتخب کیا، میں اس بڑی ذمے داری کے ادا کرنے کا قطعاً اہل نہیں ہوں، صرف آپ حضرات کے حسن ظن اور دعاؤں کے طفیل اس بارگراں کو اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا ہوں، اللہ رب العزت آپ کے حسن ظن کے مطابق اس فرض کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ ۹۵؍سالہ جماعت، جمعیۃ علماء ہند کا اکتیسواں اجلاس عام ہندستان کی راجدھانی کے تاریخی میدان رام لیلا میں منعقد ہو رہا ہے، اس سے پہلے بھی حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی صدارت میں دیگر عظیم اجلاسوں اور کانفرنسوں کے علاوہ تین اجلاس ہائے عام ۲۰۰۰ء، ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۵ء کو رام لیلا میدان میں بہت تزک واحتشام کے ساتھ منعقد ہو چکے ہیں، چند سالوں پہلے جمعیۃ علماء ہند کا ۲۹؍واں اجلاس عام نومبر ۲۰۰۸ء کو آندھرا پردیش کی راجدھانی حیدرآباد میں اور تیسواں اجلاس عام نومبر ۲۰۰۹ء کو شہر علم دیوبند میں ملک وملت کے اہم مسائل کو لے منعقد ہوئے تھے، آج یہ اکتیسواں اجلاس عام ملک کے مخصوص حالات میں منعقد ہو رہا ہے، اگر ملک وملت کے مسائل کو آج کے حالات میں دیکھا جائے تو وہ یکسر بدلے نہیں ہیں؛ بلکہ عالمی حالات کے ساتھ ساتھ ملک وملت کے حالات بھی کچھ نئے مطالبات اور نئے تقاضوں کے ساتھ ہمارے سامنے آئے ہیں، ملکی او رعالمی سطح پر ملک وملت کو جو بھی مسائل ومشکلات درپیش ہیں، ان پر غور و فکر کر کے ان کے حل کے طریقوں کی نشاندہی ہمیں کرنی ہوگی، آج ہم اسی مقصد سے یہاں جمع ہوئے ہیں، حالات کا جو منظر نامہ ہمارے، آپ کے سامنے ہے، اس کے مدنظر ہمیں تمام ضروری مسائل پر غور وخوض کر کے ضروری اقدامات کرنے ہوں گے۔

## مسلمانوں کے لیے ریزرویشن:

حضرات گرامی قدر! ہمارے سامنے مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایندگی کا مسئلہ بہت اہم ہے، ملت اسلامیہ کے دیگر مسائل بھی کوئی کم اہم نہیں ہیں، مگر مسلمانوں کی مختلف شعبوں میں جو حالت ہے، اس کے مدنظر ریزرویشن کا مسئلہ، دیگر مسائل کے مقابلے خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے، مسلمانوں کے مختلف مسائل ومشکلات کے جائزہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے سرکاری، نیم سرکاری (یا پرائیوٹ) اداروں، شعبوں میں نمایندگی، موجودگی ہو جائے گی، تو بہت سے دیگر مسائل حل ہو جائیں گے، یا بڑی حد تک کم ہو جائیں گے۔ مثلاً پولیس وغیرہ میں اگر مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے ہوں گے، تو فسادات یا دیگر مواقع پر اس طرح کے خراب حالات پیدا نہیں ہوں گے، جس قسم کے حالات آج پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد ہی سے ملک کے مخصوص ماحول میں مسلمانوں کے لیے متناسب نمائندگی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا، لیکن اسے تحریک کی شکل میں حضرت فدائے ملت مولانا اسعد مدنیؒ نے اپنے دور صدارت میں ایسے حالات میں پیش کیا تھا، جب کہ اس کے متعلق سوچا تک نہیں جا رہا تھا، اور بعض لوگ تو اس مطالبے کو مسلمانوں کے لیے تباہ کن قرار دے رہے تھے، مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن کے مطالبے کو لے کر جمعیۃ علماء ہند کئی دور میں ملک وملت بچاؤ تحریک بھی چلا چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پورے ملک میں مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کا مسئلہ موضوع ذکر و بحث سے گزر کر مطالبات کی

فہرست میں نمایاں طور پر شامل ہو چکا ہے۔اس سلسلے میں کبھی کبھار مایوسی کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ ہماری جدوجہد کا نتیجہ کیا برآمد ہوا، اب تک اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے ریزرویشن کے متعلق کچھ سوالات بجا طور سے سامنے آئے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنے دائرۂ اختیار میں کیا کچھ کرسکتے ہیں ہمارا کام مطلوبہ نتائج نکلنے اور کامیابی ملنے تک جدوجہد کرتے رہنا ہے۔ ریزرویشن دینا مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں کی ذمے داری اور کام ہے۔ ہماری جدوجہد کے پس منظر میں مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کے سلسلے میں یہ کوئی کم بڑی بات نہیں ہے کہ اب ہر سطح پر مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کا معاملہ چرچے کو موضوع بن چکا ہے۔ مشرا کمیشن کے علاوہ دیگر کمیشنوں اور کمیٹیوں نے مسلمانوں؛ خصوصا ان کے پس ماندہ طبقے کے لیے ریزرویشن کو اپنی رپورٹوں اور سفارشوں میں شامل کیا ہے۔ مرکزی سرکار کی طرف سے تشکیل کردہ ہائی لیبل کمیٹی، سچر کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات میں بھی جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد کا بڑا عمل دخل ہے۔ اگر جدوجہد نہ کی جاتی تو سرکار از خود یہ اقدام نہ کرتی۔ سرکاریں تو عام طور سے مسائل کو دباتی ہیں، اگر ہم اپنی جدوجہد کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھیں گے، تو ان شاء اللہ اس کے بہتر نتائج نکلیں گے۔ آندھرا پردیش، بہار، بنگال، یوپی اور ان سے پہلے کرناٹک، کیرالا وغیرہ اور اب مرکزی سطح پر مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کے سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے، یہ یقیناً ہماری کوششوں کا اثر ہے؛ لیکن اس سے جمعیۃ علماء ہند کے مطالبات پورے نہیں ہوتے ہیں۔ ہماری جدوجہد کا نشانہ مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دلانا ہے، نہ کہ اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کا معاملہ۔ مسلمانوں کے سوا دیگر اقلیتیں جہاں کھاتی پیتی ہیں، وہیں وہ مسلمانوں کی طرح ہر شعبۂ حیات میں پسماندہ نہیں ہیں۔ مسلمان تو سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دلتوں سے مختلف اعتبارات سے زیادہ پس ماندہ ہوگئے ہیں۔ اس لیے دیگر اقلیتوں میں مسلمانوں کو شامل کر کے مرکزی سطح پر ریزرویشن دینے کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس سے نہ تو جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ پورا ہوتا ہے اور نہ ہی ریزرویشن کا مقصد۔ او بی سی کے لیے پہلے سے مقرر کوٹے میں سے دیگر اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں کو ساڑھے چار فی صد ریزرویشن کے معاملے کو جہاں فرقہ پرست عناصر فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں، وہیں غیر مسلم

او بی سی کو بھی ان کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں یہ غلط پروپیگنڈا بھی کیا جارہا ہے کہ مسلم او بی سی کو ریزرویشن مذہب کی بنیاد پر دیا گیا ہے اس دعوے کے ساتھ آندھرا ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ اور اب ساڑھے چار فی صد اقلیتوں کے لیے او بی سی کو ریزرویشن دینے کے فیصلے واقدام کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ داخل کردی گئی ہے، جس پر عدالت نے مرکزی سرکار کو نوٹس بھی جاری کردیا ہے کہ وہ بتائے کہ ایسا اس نے کس بنیاد پر کیا ہے؟ ریزرویشن کے سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے عدالتوں میں قانونی لڑائی جاری ہے، جس میں بھاری مالی صرفہ آرہا ہے، ریزرویشن کے معاملے میں جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے صرف مسلمانوں کے معاملے میں ہنگامہ کھڑا کیا جاتا ہے، رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ دیگر ذاتوں اور قبیلوں کے ریزرویشن کے متعلق ایسا کچھ نہیں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں بار بار مذہب کا حوالہ دے کر ریزرویشن سے ان کو محروم رکھنے کا کام کیا جارہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا مطالبہ کس نے کیا اور کون مذہب کے نام پر ریزرویشن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنی تاریخ میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن کے مطالبے میں مذہب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ بابائے قانون ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے کسی کمیونٹی کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی اور ریزرویشن کی مکمل حمایت کی ہے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کی تجاویز کے عنوان کے تحت سرکاری ملازمتوں میں نمایندگی کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''نمایندگی کا مسئلہ غیر متنازع ہے۔ یہ سرکاری اصول کہ سرکاری ملازمتوں میں ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے رکھا جائے اور کسی ایک طبقے کے لوگوں کو ترجیح نہ دی جائے، یہ ایسا اصول ہے، جس کو گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی مان لیا ہے''۔ (کلیات، نگارشات وخطبات باباصاحب بھیم امبیڈکر، جلد دوم، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔ مطبوعہ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر فاؤنڈیشن وزارت سماجی انصاف اور اختیار دہی حکومت اکتوبر ۱۹۹۹)

اور جمعیۃ علماء ہند مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے مختلف شعبوں میں نمایندگی اور ریزرویشن کے مطالبے کو لے کر ہی تحریک چلا رہی ہے۔ اس کے مدنظر مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن قطعاً نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے سہولیات ومراعات سے محروم نہ کیا جائے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ مذہب کی

بنیاد پر کسی بھی کمیونٹی کے ساتھ امتیاز برتنا اور بھید بھاؤ کرنا آئین ہند کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو دیگر پس ماندہ قبائل اور ذاتوں اور غیر مسلم برادریوں کی طرح پستی سے نکالنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں؛ خصوصا محنت مسلم برادریوں، او بی سی کو مذہب کی بنیاد پر محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ریزرویشن سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس اسٹیج سے ہمارا مرکزی سرکار سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ رنگا ناتھ مشر کمیشن کی رپورٹ کو پارلیامنٹ میں پیش کر کے اس کی سفارشات کے مطابق مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کے لیے اقدام کرے۔ جمعیۃ علماء ہند بنیادی طور پر تین سطحوں پر مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کا جو مطالبہ کرتی رہی ہے، وہ یہ ہے کہ

۱- مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ہر شعبے میں نمایندگی دی جائے اور اس کی راہ میں جو بھی بظاہر آئینی اور دوسری رکاوٹیں ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ خوش حال طبقات (کریمی لیر) کو مستثنی کر کے مسلمانوں کو انتہائی پسماندہ (موسٹ بیک ورڈ) قرار دے کر ریزرویشن دیا جائے۔

۲- منڈل کمیشن کے تحت پس ماندہ طبقات میں جو ریزرویشن مسلم او بی سی برادریوں کو حاصل ہے، اس کے نفاذ میں عموما مساویانہ سلوک نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے حق سے محروم رہتے ہیں، اس لیے ان کا الگ کوٹہ متعین مختص کیا جائے۔

۳- شیڈول کاسٹ کے لیے ریزرویشن سے متعلقہ آئین کی دفعہ ۳۴۱/ر میں جہاں یہ شرط ہے کہ صرف ہندو، سکھ اور بودھ مذہب ماننے والوں کو ریزرویشن دیا جائے گا، اس میں ترمیم کر کے مذہب کی قید ختم کی جائے اور اس میں مسلم محنت کشوں، برادریوں اور پس ماندہ طبقات کو بھی شامل کیا جائے۔

اس سہ نکاتی مطالبے کے مدنظر مرکزی سرکار نے ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔ پہلے اور تیسرے مطالبے سے متعلق ابھی کوئی قابل ذکر بات سامنے نہیں آئی ہے۔ ہم اس موقع پر اس طرف بھی ارباب حل وعقد کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ منڈل کمیشن نے او بی سی کا جو کوٹہ متعین کیا ہے، وہ بہت پہلے کا مقدر کردہ ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حالیہ اضافہ آبادی کے مطابق او بی سی کے کوٹے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ بات خوش آیند ہے کہ اب قومی اقلیت کمیشن نے بھی دفعہ ۳۴۱/ر کے ذریعہ جاری امتیاز کو ختم کرنے پر توجہ دی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے بہت پہلے ہی دفعہ ۳۴۱ کے معاملے کو اپنے مطالبات کی فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عام ریزرویشن کے معاملے سے دفعہ ۳۴۱ کا معاملہ قدرے مختلف ہے عام مسلمانوں کو پس ماندہ قرار دے کر ریزرویشن دینے اور مسلم او بی سی کے لیے ریزرویشن کو دینے کا مطلب یہ قطعا نہیں ہے کہ ۳۴۱ کے معاملے کو دبانے کی کوشش کی جائے، جیسا کہ کچھ لوگوں اور وزیروں کی طرف سے کی جارہی ہے۔ سچر کمیٹی میں دفعہ ۳۴۱/ر کے تحت آسکنے والے مسلمانوں کی جو تفصیلات دی گئی ہیں، ان سے بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب منڈل کمیشن کی رپورٹ تیار ہوئی تھی، محنت کش، انتہائی پس ماندہ مسلمانوں -جن کو آج کی تاریخ میں دلت مسلمان کہا جاتا ہے کے حالات واقعی شکل میں سامنے نہیں آئے تھے ۱۹۹۴ء سے ان کی حالت روشنی میں آنی شروع ہوئی تھی۔ یہی وقت ہے، جب جمعیۃ علماء ہند نے فساد متاثرین کے لیے معاوضہ اور قانون سازی اور مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کے مطالبے کو لے کر جدو جہد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور کچھ عرصہ بعد اس کے لیے پورے ملک میں دستخطی مہم چلائی تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ انتہائی پس ماندہ محنت کش مسلم برادریوں - جو موجودہ پوزیشن کے مدنظر دلتوں کے زمرے میں آتے ہیں - کو بھی مسلم او بی سی میں معاملے کو نمٹانے اور دبانے کی کوشش کی جائے۔ غیر مسلم دلتوں میں جو ذاتیں، برادریاں ہیں، بالکل انھی کی طرح نام اور کاروبار اور پیشہ مسلمان بھی کرتے ہیں، پھر ان کو دفعہ ۳۴۱/ر کی سہولیات سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ محض مذہب جدا ہونے سے سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت الگ نہیں ہو جاتی ہے، جیسا کہ گاندھی جی نے بھی کہا ہے۔ دفعہ ۳۴۱ کے تحت ملنے والی مراعات و سہولیات کا تعلق مسلم او بی سی سے نہیں ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں الگ الگ ناموں سے دلت مسلمانوں کے قبیلوں کا نام وہاں کی فہرستوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے آئین و انصاف کا تقاضا ہے کہ ان قبیلوں، برادریوں کو غیر مسلموں میں پائی جانے والی ذاتوں اور قبیلوں کی طرح ریزرویشن دیا جائے مسلم او بی سی سے ان کو الگ کر کے اقدام اور جد وجہد کرنا ضروری ہے تاکہ غیر مسلم دلتوں کی طرح انھیں بھی مفت مکان، مفت تعلیم، غیر سودی قرض، سبسڈیز، تھانہ کورٹ سیل، نوکریاں، نوکریوں میں ترقی، عمر رسیدہ پنشن، الیکشن میں ہر سطح پر ریزرو، انتخابی حلقے جیسی

مراعات مل سکیں۔ مسلم او بی سی کی طرح ان برادریوں کو سرکاری نوکریوں اور تعلیم میں ریزرویشن دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند جن تین نکات پر ریزرویشن کی تجویز اور مطالبہ پیش کرتی رہی ہے، جب تک اس کے مطابق مرکزی وصوبائی سطح پر مؤثر اقدامات نہیں کیے جاتے ہیں، تب تک انصاف کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں اور نہ ہی مسلم اقلیت کی مختلف شعبوں میں مناسب نمایندگی ہوسکتی ہے۔اس سمت میں بھی جدو جہد مطلوبہ نشانہ تک پہنچنے تک جاری رکھنی ہوگی۔ جدو جہد کا نتیجہ ایک نہ ایک دن ان شاء اللہ اچھا نکلے گا۔ ریزرویشن کے سلسلے میں یہ بات بار بار کہی جارہی ہے کہ سپریم کورٹ نے اس کی حد مقرر کردی ہے کہ ریزرویشن ۵۰ رفی صد کی حد تک ہی ہوسکتا ہے؛ لیکن یہ ریزرویشن دینے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔کئی ریاستوں: تامل ناڈو وغیرہ میں ۵۰ رفی صد کی حد تک سے آگے جاکر ریزرویشن دیا جارہا ہے۔اس سلسلے میں کوئی آئینی رکاوٹ نہیں ہے۔ابھی حال ہی میں چھتیس گڈھ اسمبلی نے تعلیمی اداروں میں ۲۰۱۲ء بل منظور کرکے اس کے تحت آدی باسیوں کو ۳۳ رفی صد، درج فہرست ذاتوں کو ۱۲ رفی صد اور دیگر پسماندہ بچھڑے طبقات کو ۱۴ ر فی صد داخلے میں ریزرویشن دیا جائے گا۔ یہ کل ملاکر ۵۸ رفی صد ہوجاتا ہے۔صرف مسلم پس ماندہ ذاتوں، برادریوں کے بارے میں ہی تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ مرکز اور ریاستی سرکاریں مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی متناسب نمایندگی کے لیے مؤثر ضروری اقدامات کریں۔سیاسی پارٹیوں اور اداروں سے ہماری اپیل ہے کہ انصاف کی فراہمی، برابری کے فروغ اور محرومی کو دور کرنے کے لیے اپنے حصے کا کردار ادا کریں۔اگر مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں نے مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دینے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کیے، تو جمعیۃ علماء ہند ان شاء اللہ گرفتاریاں دے کر اپنی تحریک کو ملک گیر پیمانے پر جاری رکھے گی۔

فرقہ وارانہ فسادات کے انسداد کے لیے قانون سازی کا مسئلہ

ہندستان جیسے مختلف فرقوں والے ملک میں باہمی اتحاد اور امن و قانون کو بنائے رکھنے کے لیے انتظامات ضروری ہیں، اس کے بغیر ملک ترقی نہیں کرسکتا ہے۔امن وفرقہ وارانہ ہم آہنگی ملک کی نیک نامی اور بہتر شبیہ کے لیے وقت کا اہم تقاضا ہے، فرقہ وارانہ فسادات اور ان میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات ملک کو ترقی یافتہ زمرے میں شامل ہونے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔اس کے مدنظر ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات پر قدغن لگانے کے لیے ایک مؤثر اور سخت انسداد فرقہ وارانہ فسادات قانون ہو، جس کے تحت فرقہ وارانہ عناصر اور تشدد پسند طاقتوں کو واقعی سزا دی جاسکے۔ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات شاہد ہیں کہ ان میں فرقہ پرست، امن دشمن عناصر پولیس کی پشت پناہی اور ملی بھگت سے لوٹ مار اور قتل وغارت گری کو انجام دیتے ہیں اور اس کے شکار عام طور سے اقلیت کے افراد، مزدور پیشہ اور کمزور لوگ ہوتے ہیں۔اس تناظر میں جمعیۃ علماء ہند اس کے لیے مسلسل کوشاں رہی ہے کہ انسداد منظّم فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے متاثرین کو مساوی معاوضہ کی ادائیگی کے لیے ایسا مؤثر قانون وضع کیا جائے، جس میں فسادات کی ذمے داری ضلعی انتظامیہ، اعلیٰ حکام اور مقامی پولیس عملے پر ہو، نیز ان پر جواب دہی کے ساتھ اس کا بندوبست ہو کہ ذمے دار عناصر، تنظیمیں قرار واقعی سزا سے بچ نہ سکیں۔ گذشتہ کچھ برسوں سے اس سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند اور دیگر تنظیموں کی کوششوں سے فرقہ وارانہ منظّم فسادات کے انسداد کے مقصد سے قانون سازی کے لیے مختلف سطحوں پر کوششیں شروع ہوگئی ہیں اور دوسری تنظیموں، انسانی حقوق اور سماجی خدمات انجام دینے والے اداروں کے اشتراک وتعاون سے قانون سازی کی سمت میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے خدام اور رفقا اس سلسلے کے ہونے والے اجلاسوں اور میٹنگوں کے توسط سے ایک مؤثر قانون وضع کرنے کے لیے اس کے موافق ماحول سازی میں مصروف ہیں، گذشتہ کچھ دنوں سے جو اطلاعات مل رہی تھیں ان سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ انسداد فرقہ وارانہ فسادات کا مسودہ جلد ہی بل کی شکل میں سامنے آئے گا اور پھر وہ قانون بن جائے گا، مگر حال کے کچھ دنوں میں جو حالات پیدا ہوگئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نیت خراب ہوگئی ہے اور وہ قانون سازی کے معاملے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دینا چاہتی ہے۔ حالات کا جائزہ بتاتا ہے کہ انسداد فرقہ وارانہ منظّم فسادات کے مسودے کی دفعہ ۳ روای این میں گروپ کی تعریف میں مذہبی ولسانی اقلیتیں اور دلت طبقہ کو شامل کرکے ہندو اکثریت کو ان کے آمنے سامنے کھڑا کرکے اعتراض کا موقع ایک مخصوص ذہنیت کے تحت فراہم کیا گیا ہے تاکہ اس کا بہانہ بناکر انسداد فرقہ وارانہ بل کے معاملے کو ٹال دیا جائے۔اصل مسئلہ اعلیٰ حکام، پولیس انتظامیہ (بلکہ وزرائے اعلیٰ کو بھی) فسادات کے لیے

جواب دہ بنانا ہے، انصاف اور قانون کی رو سے یہ بات بالکل بے تکی اور نامعقول ہے کہ فلاں گروپ حملہ آور ہو تو تشدد و فساد مانا جائے اور فلاں ہو تو اس کو تشدد و فسادات نہیں مانا جائے گا۔ آئین کی دفعہ ۲۱ ر کے تحت شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری حکومت کی ہے، اگر وہ اس میں ناکام رہتی ہے تو نقصانات کی تلافی اس کے لیے ضروری ہے۔ یہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے فیصلے میں بھی کہا گیا ہے۔ آر ایس ایس بی جے پی اور دیگر تنظیموں کے اعتراضات میں مسئلے کو دبانے کی کوششوں کے ساتھ معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے ہر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ ملک میں امن و امان قائم کر کے اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنا اور قصوروار کو سزا دے کر مظلومین و متاثرین کے لیے انصاف کی فراہمی ہے۔ اگر قانون نہیں بنایا جائے گا تو یہ مقصد کیسے حاصل ہوگا۔ فرقہ وارانہ فسادات جن کا عموماً اقلیتیں اور کمزور طبقات شکار ہوتے ہیں کی روک تھام کے لیے کیا کیا طریق کار اختیار کیے جائیں، اس تناظر میں باہمی مذاکرات کر کے مسئلے کا حل نکالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اعتراضات کا بہانہ بنا کر انسداد فرقہ وارانہ فساد بل لانے سے گریز کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی کے بات ہوگی کہ بڑی طویل جدو جہد کے بعد بل کے تیار مسودے کو کچھ اعتراضات کے سبب دریا برد کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کمیوں اور اعتراضات کو مناسب ترمیمات سے دور کر کے بل کو قانون کی شکل دینے کی راہ میں سرکار کے سامنے کیا رکاوٹیں ہیں، اس سوال کا جواب سرکار کے لیے ضروری ہے۔ امن پسند انسانیت نواز تنظیموں اور افراد کو ساتھ لے کر ایسی متحدہ جدو جہد کرنی پڑے گی، تاکہ سرکار فرقہ پرست عناصر کے دباؤ میں نہ آئے اور بل کو جلد سے قانون کی شکل دے تاکہ فساد متاثرین کے لیے انصاف کی فراہمی کا راستہ ہموار ہو سکے۔

## دہشت گردی سے پیدا حالات اور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا مسئلہ:

سامعین عظام! جمعیۃ علماء ہند بار ہا اس اعلان کا اعادہ کر چکی ہے کہ دہشت گری اور تخریب کاری کے لیے کسی بھی مہذب سماج میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ دہشت گری چاہے فرد کی طرف سے ہو یا تنظیم، ریاست کی طرف سے، قابل مذمت ہے، اس پر ہر ممکن طریقے سے قدغن لگانے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ملک امن کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا ہے اور قیام امن میں انصاف، بے تعصبی اور قانون کی بالاتری کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ جہاں بھی اور جس بھی ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کو فروغ مل رہا ہے، مذکورہ تینوں میں سے کسی نہ کسی کا فقدان ہی اس کا باعث ہے، دہشت گردی میں ناانصافی اور مذہب فرقہ کی بنیاد پر انسداد دہشت گردی کے نام پر اقدامات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، ایسی حالت میں تحقیق و تفتیش کا عمل بھٹکاؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور عموماً اصل قصوروار بچ جاتا ہے اور بے قصور اور کمزور افراد ظلم و زیادتی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے ملک کی توجہ اس جانب بارہا مبذول کرائی کہ دہشت گردی کو کسی مذہب سے متعلق کر کے نہ دیکھا جائے، اس سے تخریب کاروں اور دہشت گردوں کو تقویت ملتی ہے۔ تخریب کاری اور دہشت گردی کو کسی مخصوص فرقہ و مذہب سے منسوب کر کے پیش کرنا ایک یا کچھ افراد پر پوری کمیونٹی کھڑا کرنے کا مذموم عمل اور اسے بدنام کرنے کی غلط کوشش ہے۔ حالاں کی ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج میں دہشت پھیلانے والے کو مین اسٹریم (عمومی قومی دھارے) سے الگ تھلگ کر کے کمزور یا بے زمین کیا جائے، ہاں یہ کوشش ضرور ہو کہ کوئی بے قصور ظلم و زیادتی کی زد میں نہ آ جائے، ایک دو مجرم شبہ کا فائدہ اٹھا کر سزا سے بچ جائیں۔ یہ اس قدر خراب نہیں ہے جتنا یہ کہ ایک بے قصور کو سزا ہو جائے۔ یہ افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ملک میں پولیس سسٹم خراب ہونے کے سبب مجرموں سے زیادہ بے قصوروں کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے اور بسا اوقات ان کی زندگی اور کیریر پوری طرح تباہ ہو جاتا ہے، وہ سماج سے پوری طرح کٹ کر رہ جاتا ہے، دہشت گردی اور تخریب کاری کے واقعات کی تحقیقات میں فرقوں کو سامنے رکھتے ہوئے الگ الگ اور دوہرا پیمانہ اپنانا سراسر انصاف کا خون اور سماج کو توڑنے والا ہے۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کے کئی واقعات میں دوسرے چہرے اور کئی بدنام زمانہ فرقہ پرست تنظیموں سے وابستہ افراد کے سامنے آنے کے بعد بھی تفتیشی ایجنسیوں کے رویے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے اکثریتی فرقے سے تعلق رکھنے والے دہشت گردی کے الزامات میں گرفتار افراد، اس کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگوں کو بچانے کی کوشش ہوتی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے پورے ملک میں دہشت گردی مخالف جدوجہد کے نتیجے میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اور اسلامی دہشت گردی، جہادی دہشت گردی اور مسلم دہشت گردی کی

اصطلاح کے استعمال میں بہت تک کمی آئی۔ مالے گاوں (مہاراشٹر) مکہ مسجد آندھرا، اجمیر بم دھماکہ راجستھان اور سمجھوتہ ایکس پریس (ہریانہ) دھماکے وغیرہ میں دیگر فرقے کے لوگوں کے ملوث ہونے کے معاملے میں سامنے آنے سے کسی مخصوص فرقے رمذہب سے جوڑ کر دہشت گردی کے واقعات کو پیش کرنے میں میڈیا بہت حد تک احتیاط برتنے لگا ہے؛ لیکن تفتیشی ایجنسیوں کی روش میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے، ان کو جب بھی تھوڑا غلط بہانہ بھی مل جاتا ہے کہ دور کی کوڑی لاکر بے بنیاد باتوں کو بھی اہم سراغ قرار دے کر مسلم نوجوانوں کو خطرناک اور بہت سوں کو ماسٹر مائنڈ کے طور پر تشہیر کے ساتھ گرفتار کرکے سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ اور اپنی نااہلی، نا فرض شناسی پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی کو بھی، کہیں سے بھی اٹھالیا جاتا ہے، اس کا ثبوت وہ مسلم نوجوان ہیں، جو عدالت سے بری ہوچکے ہیں اور محمد عامر خان تو اسی دہلی کا نوجوان ہے، جسے ایک درجن سے زائد دہشت گردی اور بم بنانے کے واقعات کا ملزم قرار دے کر جیل میں ڈال دیا تھا۔ مسلم نوجوان عدالتی نظام کی سست رفتاری اور گواہیوں کے سلسلے کی وجہ سے دس دس بارہ بارہ سالوں تک قید خانے میں بھیانک اذیتیں اٹھاتے ہوئے گزار دیتے ہیں، حالاں کہ قانون کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ انصاف میں تاخیر بھی بے انصافی ہے، آج بھی بہت سے نوجوان جیلوں میں درجنوں الزمات کے تحت بند ہیں دو دو سو ڈھائی ڈھائی سو گواہیاں ایک زیر حراست نوجوان کے مقدمات میں ہیں، ظاہر ہے کہ ایسی شکل میں گواہیاں گذارنے میں ان کی زندگی ختم ہوجائے گی۔ اس سے بڑی ناانصافی اور ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ جو ٹاٹا پوٹا سیاہ قوانین ختم کیے جاچکے ہیں ان کے تحت گرفتار افراد کے بارے میں سرکار یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ رہا ہوچکے ہیں اور جس طرح جے پور بم دھماکے کے ۱۴، مالیگاوں بم دھماکے کے ۹ رافراد مکہ مسجد حیدرآباد کے بم دھماکے کے ۲۹ رافراد اور احمد آباد سازش کیس ہرن پانڈیا قتل کیس کے الزامات سے بے قصور ثابت ہوکر عدالتوں سے بری ہوئے ہیں اور اس دہلی کے مسلم نوجوان محمد عامر دہلی، ہریانہ، غازی آباد کے ایک درجن سے زائد معاملے سے بری ہوا ہے کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا ہے کہ ایک سوچھے سمجھے منصوبے کے تحت غلط طور سے ایک مخصوص کمیونٹی کو نشانہ بنایا جارہا ہے، بہار کے بتھانی ٹولہ کے دلتوں کے قتل عام اور گوا کے ایک مدرسے کے منہدم کرنے والے ملزموں کی جس طرح رہائی ہوئی ہے، وہ تشویش ناک ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک ملک میں ایک خاص ذہن کام کر رہا ہے، جس کے نشانے پر اقلیتیں اور دلت طبقات کے افراد اور ادارے ہیں۔ معاملے کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ کمزوروں، بے سہاروں کی مدد کے لیے جب کوئی شخص یا وکیل سامنے آتا ہے تو اسے بھی نشانہ بنایا جاتا ہے، اور اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے ممبئی کا نوجوان وکیل شاہد اعظمی اس کی مثال ہے کہ انھیں کچھ نامعلوم قاتلوں نے شہید کردیا، ملزموں کی پیروی کرنے والے وکلا کو بھی نشانہ بنایا جاتا ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ ان پر وکلا گروپ بھی حملہ کردیتا ہے، غازی آباد، الہ باد، لکھنو وغیرہ میں اس طرح کے کئی واقعات ہوچکے ہیں اگر اس طرح کے واقعات پر مؤثر طور پر روک نہیں لگائی گئی، تو ملک کی حالت دھماکہ خیز ہوسکتی ہے، ہم مجرموں کو سزا دینے دلانے کے حق میں ہیں، چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب وفرقہ سے ہو، ہماری مخالفت ومذمت کا تعلق صرف اس سے ہے کہ ملزموں کو مجرموں کے زمرے میں رکھ کر کارروائی نہ کی جائے اور بے قصوروں کو خطرناک اور ماسٹر مائنڈ بتاکر ان کے ساتھ خطرناک مجرموں اور دہشت گردوں کی طرح سلوک نہ کیا جائے، گذشتہ کچھ دنوں سے اکثریت فرقے سے تعلق رکھنے والے ملزموں کی تفتیش میں جانب داری اور سستی کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے مسلم نوجوانوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ تفتیش کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے کی بجائے کسی مخصوص کمیونٹی کے افراد پر پوری توجہ مرکوز کرنا غلط ہے، اس سے ملک میں امن وامان کے قیام میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس تناظر میں ہمارا مطالبہ اور تجویز ہے کہ:

- تفتیش کے عمل میں شفافیت اور فرقہ و مذہب سے اوپر اٹھ کر انصاف کو ملحوظ رکھا جائے۔
- زیر حراست نوجوانوں کے معاملے کو سریع الحرکت عدالتوں میں پیش کرکے ۲ سے ۶ مہینے میں نبٹا دیا جائے، نیز کوئی شبہ نکلے تو ضمانت پر رہا کرکے مقدمہ چلایا جائے۔
- جو افراد عدالتوں سے بری ہوچکے ہیں، ان کو معقول معاوضے کی ادائیگی اور بازآبادکاری کے ساتھ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے اور معاوضے کی ادائیگی میں بے قصوروں کو گرفتار کرکے زندگی خراب

کرنے والے افسران کی تنخواہوں سے بھی رقم وصول کی جائے، آندھرا سرکار نے اس سمت میں تھوڑی بہت قابل تقلید کارروائی کی ہے، ڈاکٹر محمد حنیف کے معاملے میں آسٹریلیا حکومت کے نمونۂ عمل کو بھی اختیار کرنا چاہیے، صرف فتیچ باتوں میں ہی یورپ اور مغرب کی تقلید کیوں کی جاتی ہے۔

- ہمارا ایک مطالبہ غیر قانونی سرگرمیوں کے قانون (یو، اے، پی، اے) کو ختم کرنے کا بھی ہے، جو انسانی حقوق کی پامالی اور حکومتوں اور ان کی پولیس انتظامیہ کی غیر منصفانہ کارروائیوں کا ذریعہ و محرک ہوا ہے۔
- خفیہ اور تفتیشی ایجنسیوں کو بالکل بے لگام نہ چھوڑا جائے، ان کی جواب دہی اور ذمے داری کو طے کرنا ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

**تحریک شیخ الہندؒ سے روشناس کرانے کی ضرورت:**

ہمدردان ملک وقوم! آپ کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ اور مؤقر اکابر و اسلاف کے روشن کارنامے حال کو بنانے اور مستقبل کی نقشہ گری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ اور اپنے اکابر کے نقوش حیات و خدمات کو گم کر دیں گے تو ہم خود حالات و زمانے کے جنگل میں کھو جائیں گے۔ نئی نسل کی کامیابی میں بزرگوں کے کارناموں کی رہ نمائی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ایسے ہی اکابر و اسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے جرأت و رہ نمائی اور ظلم و جبر کے خلاف جدو جہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک وقوم کو توقیر و بلندی ملتی ہے۔ تحریک آزادیِ ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برٹش سامراج کے خلاف جدو جہد کے روشن ابواب آتے ہیں۔ ۱۹ویں صدی اور بیسویں صدی کی دو دہائی تک اگر غور سے دیکھا جائے، حضرت شیخ الہند دیوبندیؒ کی شخصیت اور فکر چھائی نظر آتی ہے۔ اس دور کی بیشتر عظیم شخصیات چاہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہوں، یا مولانا محمد علی جوہر، یا گاندھی جی، مولانا حسرت موہانی، یا دیگر سماجی، سیاسی، مذہبی شخصیات سب کے لیے حضرت شیخ الہندؒ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ مولانا عزیر گل، جیسے اعاظم رجال تو ان کے تلامذہ ہی تھے اور ان میں ہر ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا و تلامذہ نے ان کی رہ نمائی و قیادت میں ملک وقوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برٹش سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے کی جو عظیم جدو جہد کی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس بے توجہی اور بے اعتنائی و نافرض شناسی کا غلط نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے۔ اور ان کی تحریک نے ملک و ملت کے وقار و معیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیاد سے محروم کر دیا جائے، تو وہ فکر و عمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کر پائے گی۔ اب تو یہ حال ہوتا جارہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اس کے مدنظر شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ''نام نیکاں ضائع مکن'' کی آواز لگاتے ہوئے موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابر و اسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اس نیک مقصد کے پیش نظر سو سال پورے ہونے پر جمعیۃ علماء ہند نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی سمت میں قدم بڑھایا ہے اور طے کیا ہے کہ پورے ملک کے مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینارز کیے جائیں۔ اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ آبرومندانہ زندگی کی نیک خواہش اور اس کے لیے جدو جہد کی تاریخ ہمارے لیے راہ عمل کے تعین میں کس حد تک رہ نمائی کرتی ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حالات و ضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لاکر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔ یہ حالات کا تقاضا بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

**قومی یک جہتی کے فروغ کا مسئلہ:**

حضرات اربابِ فکر و نظر! ملک میں جس طرح فرقہ پرستی ہر شعبۂ حیات

میں سرایت کرگئی اور کرتی جارہی ہے، اس کی ایک اہم وجہ قومی یک جہتی کے تصور کا کمزور ہونا بھی ہے، قومی یک جہتی کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے مشترک امور ومسائل میں تمام شہریوں کا، چاہے وہ کسی مذہب وفرقے سے تعلق رکھتے ہوں یکساں نظریہ وعمل ہو، تاکہ ملک کی سلامتی واستحکام قائم رہے، اور وہ امن کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے۔ قومی یک جہتی کا قطعا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ملک کی اقلیتیں اکثریت میں ضم یا گم ہوجائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جہاں ایک طرف اکثریت سے تعلق رکھنے والے ملک کے فرقہ پرست عناصر قومی یک جہتی کا یہ مفہوم بتاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اقلیتیں؛ خصوصا مسلمان اپنی شناخت ختم کرکے اکثریت میں ضم ہوجائیں۔ کم سے کم ثقافتی وتہذیبی سطح پر اکثریت کا حصہ بن جائیں؛ البتہ وہ طریق عبادت الگ الگ رکھ سکتے ہیں۔ مشہور مصنف وادیب رام دھاری سنگھ دنکر نے اپنی کتاب ''بھارتی ایکتا، راشٹریہ ایکتا'' میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ دیگر اقوام وقبائل کی طرح ہندو سماج مسلمانوں کو اپنے میں ضم نہ کرسکا، وہیں دیگر فرقہ پرستی سے متاثر ہونے والے بھی جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابر کو مطعون کرنے کے لیے سیکولرزم اور قومی یک جہتی اور متحدہ قومیت کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان اپنی شناخت ختم کرکے اکثریت میں ضم ہوجائیں۔ جب حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے وطنی تعلق کے تناظر میں متحدہ قومیت کی بات کہی تھی، تو اس وقت بھی ایک طبقے نے زور شور سے یہ پروپیگنڈا شروع کردیا تھا کہ مولانا مدنیؒ مسلمانوں کو اکثریت میں ضم ہوجانے کا مشورہ دے رہے ہیں، اس پروپیگنڈا کے شکار مشہور شاعر شاعر مشرق علامہ اقبالؒ بھی ہوگئے تھے؛ لیکن وضاحت کے بعد انھوں نے حضرت مدنیؒ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرلیا تھا۔ بعد میں بھی مسلمانوں کا ایک طبقہ قومی یک جہتی اور متحدہ قومیت کی خلاف واقعہ تعبیر وتشریح کرکے ملک کے مشترک مسائل میں متحدہ کوششوں کو کمزور کرنے میں کوشاں رہا ہے، ہندستان میں سیکولرزم اور نیشنل انٹی گریشن کا لغوی معنی مراد نہیں ہے؛ بلکہ ملک کے مخصوص ماحول اور پس منظر میں عرفی وسماجی مفہوم زیادہ بامعنی اور قابل عمل ہے۔

جس طرح لامذہبی ولادینیت سے ہندستانی سیکولرزم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح نیشنل انٹی گریشن کا بھی اس مفہوم سے کوئی لینا دینا نہیں کہ مسلمان اپنی شناخت اور انفرادیت کو ختم کرکے اکثریت کا حصہ ہوجائے۔ قومی یک جہتی کا صرف اتنا مطلب ہے کہ قومی وطنی مسائل میں ملک کے تمام لوگوں کی جہت یکساں ہو، اس طرح سے قومی یک جہتی کی بات صرف مشورے تک محدود نہیں رہ جاتی ہے؛ بلکہ وہ ضرورت بن جاتی ہے۔ ہندستان میں جس قسم کے مختلف فرقے اور مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، وہاں قومی یک جہتی کے فروغ اور اس سے تمام فرقوں اور مذاہب والوں کو جوڑنا وقت کا بڑا تقاضا ہے۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے آزادی وطن کے ساتھ ہی فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈا کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم ایک آزاد سیکولر ریاست کی تعمیر کررہے ہیں، جس میں ہر مذہب اور طبقے کو پوری آزادی اور مساوی منزلت حاصل ہے، جس میں ہر شہری برابر کی آزادی اور برابر کا موقع رکھتا ہے''۔ پنڈت جی کی پالیسی پر گامزن رہتے ہوئے آج کی تاریخ میں بہت ضروری ہوگیا ہے کہ فرقہ پرست عناصر سے ملک کے تمام شعبوں؛ خصوصا کلیدی شعبوں کو پاک کیا جائے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے مؤثر انتظامات کیے جائیں اور پورے ملک کے مجموعی مفادات کو مدنظر رکھ کر کام کیا جائے۔ گذشتہ کچھ برسوں سے علاقائیت وصوبائیت کو حد سے زیادہ ابھارنے کی کوشش کی جارہی ہے، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، آسام جیسے صوبوں میں آئے دن دوسرے صوبوں سے آکر رہنے والوں کے خلاف زیادتیوں کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں، جس سے آئین کی روح اور ملک کا مرکزی کردار مجروح ہوتا ہے۔ قومی مسائل میں بلاامتیاز مذہب وفرقہ تمام ہندستانیوں کا یک جہت اور متحد ہونا ضروری ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد مسلسل اس سمت میں جدوجہد کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی یک جہتی کے پیغام اور تصور سے لوگوں کو جوڑا جائے۔

### مسئلۂ اوقاف کا تحفظ اور مساجد کی واگزاری:

سامعین کرام! ملک میں اوقاف کے تحفظ اور مساجد کی واگزاری کے دو مسئلے بہت اہم ہیں۔ ملک میں حتی کہ ملک کی راجدھانی دہلی میں اور ریاستی راجدھانیوں میں بھی بہت سی مساجد پر سرکاروں اور عوام کا ناجائز قبضہ ہے، ان کو واگزار کراکے نماز کے لیے راہ ہموار کرنا ایک بڑی ضرورت ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے گذشتہ دنوں صرف مغربی یوپی کے اضلاع: سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ اور غازی آباد وغیرہ کا سروے کرایا، تو پتہ چلا کہ کچھ مساجد پر ناجائز قبضہ ہے، کچھ قابل مرمت ہیں تو کچھ ویران

ہیں۔ علاقے کے غیر مسلم مرمت اور آباد کرنے نہیں دیتے؛ غرض کہ مساجد کے متعلق کئی طرح کے کام کی ضرورت ہے: قبضہ سے واگزار کراکے نماز کے لیے حاصل کرنا، قابل مرمت مساجد کی مرمت اور جہاں نماز کے لیے رکاوٹ ہے، وہاں رکاوٹ ختم کرانے کے لیے ضروری اقدام، آثار قدیمہ کی نگرانی میں جو مساجد ہیں، ان کو تفریح گاہ میں بدلنے کے بجائے حکومت نماز کے لیے کھول دے۔ اور جن پر ناجائز قبضہ ہے، اسے بھی ختم کرکے وقف بورڈ کے حوالے کردے تاکہ عبادت کے مقصد کی تکمیل کے مدنظر ان میں نماز ہوسکے، چاہے وہ عام مسجد ہو یا آثار قدیمہ کے تحت کی مساجد، کسی میں بھی نماز سے روکنا مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ یہ مداخلت فی الدین ہے اور مسلمانوں کو مذہب سے متعلق حقوق سے محروم کرنے کا عمل ہے۔ جس طرح مساجد کی حالت ہے، اسی طرح اوقاف کی دیگر جائدادوں کے تحفظ کا مسئلہ پریشان کن بنا ہوا ہے۔ ملک میں پائی جانے والی ۶ رلاکھ سے زائد اوقاف کی جائدادوں کے تحفظ کا مسئلہ انتہائی اہم ہے، اگر موقوفہ جائدادوں سے ہونے والی آمدنیوں کو وقف کرنے والے کے منشا اور شریعت کے مطابق صحیح مصارف میں خرچ کیا جائے تو مسلمانوں کے بڑے بڑے مذہبی، سماجی، فلاحی، تعلیمی اور ترقیاتی کام ہوسکتے ہیں، لیکن افسوس کہ پورے ملک میں موقوفہ جائدادوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے، بے شمار موقوفہ جائدادوں پر غیر سماجی عناصر، زمینی مافیا، انتظامیہ کے بدعنوان افراد، حتی کہ سرکار اور عوام کا بھی ناجائز قبضہ ہے، وقف بورڈ کے بدعنوان عملہ کی طرف سے بھی موقوفہ جائدادوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کردینے کا سلسلہ جاری ہے، ممبئی میں ایک بڑی کمپنی کو وسیع موقوفہ اراضی بیچ دینے کا معاملہ گذشتہ دنوں سامنے آیا تھا، کچھ دنوں پہلے ہریانہ کے کرنال میں واقع قبرستان کو بیچ دینے کا معاملہ سامنے آیا تھا۔ ابھی حال ہی کرناٹک میں موقوفہ اراضی و جائداد میں گھپلے کا ایسا بھیانک معاملہ سامنے آیا ہے، جس نے سب کو تکلیف دہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ جب پہرے دار اور نگراں ہی ڈاکہ ڈالنے لگے، تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔ حیرت ہے کہ دہلی جیسی جگہ میں وقف بورڈ کا عملہ موقوفہ جائداد کی دیکھ بھال کے لیے دورہ کرتا رہتا ہے، اس کے باوجود بورڈ وقف کی زمین پر کئی منزلہ عمارتیں تعمیر کرکے بیچ دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عمارتیں ایک آدھ گھنٹے یا ایک دو دن میں تعمیر و تیار نہیں ہوگئی ہوں گی۔ بورڈ کے عملے کی ملی بھگت کے بغیر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ملک کے دیگر صوبوں اور علاقوں میں بھی موقوفہ جائداد پر قبضہ اور عمارتیں، دفاتر کی تعمیر کی گئی ہے، سیاسی پارٹیوں اور سرکاری عملے کا قبضہ بھی ان پر ہے، اس سلسلے میں معاملے کو اس قدر پیچیدہ اور مشکل بنادیا گیا ہے کہ اس سمت میں کی جانے والی کوئی بھی کوشش ثمر آور نہیں ہوتی ہے، صورت حال اس قدر خراب ہے کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ہے، اس سے متعلق مشترکہ پارلیمانی کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوقاف کی حالت اس قدر خراب ہے کہ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے، جہاں کی بڑی موقوفہ جائداد پر ناجائز قبضہ نہ ہوا ہو، جمعیۃ علماء ہند ہمیشہ اوقافی جائدادوں کے تحفظ اور ان سے ہونے والی آمدنیوں کو صحیح مصارف میں خرچ کرنے کو لے کر جدوجہد کرتی رہی ہے، خاص طور سے حضرت فدائے ملتؒ ایوان بالا اور اس سے باہر ہر موقع پر اوقاف کے تحفظ کی طرف سرکار اور متعلقہ ذمے داروں کو متوجہ کرتے رہے ہیں، آج تک یہی دیکھا گیا ہے کہ مرکزی اور صوبائی سرکاریں اوقاف کے تحفظ کے تئیں انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کرتی آرہی ہیں، ابھی مناسب ترمیمات کے ساتھ نئے بل کے مواد کو پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا ہے۔ مشترکہ پارلیمانی کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں اس کا اظہار کیا ہے کہ بورڈوں کی کارکردگی کے معائنے میں ریاستی سرکار ناکام رہی ہے اور وقف کے انتظام میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے اور جو وقف ایکٹ بنایا گیا ہے، اس کی خلاف ورزی اور وقف کی قیمتی املاک پر ناجائز قبضے کے معاملے میں خاموش تماشائی بنی رہی ہے، جناب کے، رحمٰن خان کی سربراہی میں بنی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی نے جو سفارشات، تجاویز اور مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند وغیرہ نے جو ترمیمات و تجاویز پیش کی ہیں، ان پر فوری توجہ دیتے ہوئے اوقاف کے تحفظ کی سمت میں مؤثر اقدامات کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ ناجائز قبضوں کو ختم کرکے اوقاف کی آمدنیوں کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مؤقر ملک گیر تنظیموں کی طرف سے بااختیار نمائندگی کے ساتھ، داغی اور وقف کے مقاصد کے خلاف کام کرنے والے افراد جو مقدمات میں ملوث رہے ہوں یا زیر تحقیق و تفتیش ہوں، بورڈ میں کسی بھی حیثیت سے نہ لیے جائیں۔

اگر حکومت اور بورڈ کا عملہ ایمان داری سے کام کرے، تو بہت سی

موقوفہ جائداد کی بازیابی کا راستہ کھل سکتا ہے۔ابھی حال میں آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے منی کونڈہ جاگیر اراضی سے متعلق جو فیصلہ دیا ہے، وہ امید کی کرن ہے۔جس اراضی پر ملٹی نیشنل اور منکو ہلز ادارے قائم ہیں، ان کو ہائی کورت نے وقف اراضی قرار دیا ہے۔۱۶۶۴/۱ ایکڑ پر مشتمل یہ اراضی حکومت آندھرا نے نہایت سستے داموں میں سرکاری اراضی بتا کر مذکورہ اداروں کو بیچ دی تھی۔اب امید ہے کہ ہائی کورٹ کے فیصلے سے وقف بورڈ کو یہ اراضی مل جائیں۔اوقاف کے تحفظ کے لیے ہر ایسا طریقہ اختیار کیا جائے، جس سے اوقافی جائداد کو بچانے میں مدد ملے۔مثلا جو بھی موقوفہ املاک حکومت، دیگر ادارے یا ایجنسیوں کے قبضے میں ہوں، وہ تین سے چھ مہینے کے اندر اندر آزاد کرا کے وقف بورڈ کے حوالے کر دیے جائیں۔ بہ صورت دیگر قبضہ کی تاریخ سے رائج الوقت کرایہ بورڈ کو ادا کیا جائے۔اس مضمون کا ایک خط اندرا گاندھی نے ۳۵، ۳۶ سال پہلے ریاستی وزرائے اعلی کو لکھا تھا۔زیادہ تر اوقافی جائداد پر سرکار کا قبضہ ہے، وہ فوری طور سے اپنا قبضہ ختم کر کے بورڈ کو حوالے کرے یا رائج الوقت کرایہ ادا کرے۔

وقف بورڈ کی تشکیل کا اختیار ریاستی سرکاروں کو دیا گیا ہے۔اور وہ اپنی پسند کے افراد کا اس میں تقرر و نامزدگی کرتی ہیں۔اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں تک اوقاف کے تحفظ میں معاون ہوں گے؛ بلکہ سرکار سے وفاداری زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری رائے ہے کہ وقف بورڈ میں تقرر کیے جانے والے افراد کے سلسلے میں مؤقر اہم ملک گیر تنظیموں سے بھی رائے لی جائے ؛ بلکہ ان کے نمائندوں کو بااختیار حیثیت دے کر بورڈ میں شامل کیا جائے۔

## کشمیری عوام کے ساتھ انصاف اور جمہوری و دستوری حقوق کی بحالی:

ارباب ملک وقوم! ہم کچھ باتیں کشمیری عوام کے ساتھ انصاف اور ان کے جمہوری و دستوری حقوق کی بحالی کے تعلق سے کہنا چاہتے ہیں۔واضح رہے کہ ہم مسئلہ کشمیر پر بات نہیں کر رہے ہیں ؛ بلکہ کشمیری عوام-جنھیں ہم ہندستانی شہری مانتے ہیں- کے مسئلے کے تعلق سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔جمعیۃ علماء ہند ۱۰/ اکتوبر کو دیوبند میں اور ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو دہلی میں کشمیر کانفرنس کر چکی ہے۔ یہ امید افزا بات ہے کہ گذشتہ کچھ دنوں سے پہلے کے مقابلے کشمیر میں بہتر تبدیلی آئی ہے اور ریاست نسبتاً امن کی سمت میں بڑھ رہی ہے۔اگر ریاست کے عوام کو اعتماد میں لے کر کام کیا جائے، تو حالات مزید بہتر ہوں گے، جمعیۃ علماء ہند نے امن، جمہوریت اور انصاف کی فراہمی کے لیے ہمیشہ کوشش کی ہے، اسی کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ کشمیری عوام کے اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالات پر توجہ دیتے ہوئے ان کے حقوق کے بحالی پر سنجیدہ توجہ دی جائے اور اس کی کوشش کی جائے کہ فوج کو عوام کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے دی جائے، اس سے صورت حال بہتر ہونے کے بجائے خراب ہوتی ہے۔ نیز کشمیری عوام اور ریاست کی ترقی کے لیے جو وعدے کیے گئے ہیں، وہ جلد سے جلد پورے ہوں، تاکہ عوام کا اعتماد بحال ہو سکے۔ وہاں ریاست کی قیادت کو بھی ہم اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ جمہوریت کی بحالی، فوجی تسلط سے رہائی اور شہری حقوق کی مکمل حصول یابی کے لیے ریاست میں امن و امان کی بحالی ناگزیر ہے، اس کے بغیر مطلوبہ عوامی تعاون ممکن نہیں۔ مذکورہ باتوں کے پیش نظر ہمارا مطالبہ اور تجویز یہ بھی ہے کہ

- کشمیری عوام کے جائز مطالبات کو دستور کے مطابق تسلیم کر کے امن و امان کے فروغ کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔
- ریاست کی ترقی و استحکام کے لیے خصوصی پیکیج کے وعدوں پر عمل در آمد کے لیے سنجیدہ توجہ دی جائے۔
- آبادی والے علاقوں سے مسلح افواج کے انخلا کے لیے جتنی جلد ممکن ہو سکے، کارروائی کی جائے۔
- آرمڈ فورسیز اسپیشل پاور ایکٹ اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے نفاذ کو ختم کرنے کی سمت میں ضروری اقدامات کیے جائیں۔

## آسام میں مسلمانوں کے حق شہریت کا تحفظ

آسام میں شہریت کا مسئلہ ایک منصوبے کے تحت پیدا کر کے وہاں رہنے والے مسلمانوں کو حق رائے دہی سے محروم اور ہراساں و پریشان کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند اس طرح کی کوششوں کے خلاف اور آسام کے باشندوں کی شہریت کے تحفظ کے لیے آواز اٹھاتی رہی ہے۔ وہ اس کے حق میں بالکل نہیں ہے کہ کسی غیر ملکی کو ہندستانی شہری قرار دیا جائے؛ بلکہ جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ کسی بھی ہندستانی شہری کو محض زبان یا فرقے سے جڑے ہونے کی وجہ سے شہریت اور رائے دہی (ووٹ) کے حق سے محروم نہ کیا جائے اور

شہریت کے ثبوت کے لیے صرف پیدائش کے سرٹیفکیٹ ضروری قرار نہ دیا جائے۔ ملک میں ۷۰،۸۰ ؍فی صد باشندوں کے پاس سرٹیفکیٹ نہیں ہے، حتیٰ کہ وزرا؛ بلکہ وزیر داخلہ تک کے پاس برتھ سرٹیفکیٹ نہیں پایا گیا ہے۔ شہریت کے فیصلے کا حق واختیار فورس ؍ پولیس کو نہیں دیا جاسکتا ہے، جب کہ آسام وغیرہ میں شہریوں کی شہریت کے فیصلے کا اختیار عملاً پولیس کو دے دیا گیا ہے، حالاں کہ ممبئی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ہے کہ پولیس کو شہریت کے فیصلے کا کوئی حق نہیں ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے آسام کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو مشکوک شہری قرار دے کر رائے دہی کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر خاص طور سے ڈی ووٹرس کے مسئلے کو بہت زیادہ اچھالا جاتا ہے اور سیاسی فرقہ پرست پارٹیاں اس کو خاص رنگ میں پیش کر کے ماحول کو خراب کر رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے اور حالات سے پتا چلتا ہے کہ ایسے عناصر اور پارٹیوں کو سرکاری پشت پناہی حاصل ہے۔ بڑی تعداد میں لوگوں پر بنگلہ دیشی ہونے کا الزام لگا کر جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ تشویش ناک حالت ہے۔ اس طرح اپنے شہریوں کو بنیادی حق سے محروم کرنا آئین اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ بنگلہ زبان بولنے والوں کو بنگلہ دیشی قرار دے کر آسام کے لیے خطرہ بتانا کھلی فرقہ پرستی ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کیا جارہا ہے کہ آزادی سے قبل آسام کی ایک تہائی آبادی بنگلہ زبان بولنے والوں کی تھی ۱۹۸۵ء میں مرکزی سرکار اور حق شہریت کے خلاف احتجاج کرنے والوں کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ مارچ ۱۹۷۱ء تک جو لوگ بھی آئے ہیں، وہ ہندستانی شہری ہیں؛ لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ لاکھوں لوگوں کے مقدمات غیر ملکی ہونے کے سلسلے میں التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سنگین اور تکلیف دہ صورت حال ہے۔ اس کا پائدار حل نکالنے کے لیے مرکز اور صوبائی سرکاروں کا سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ یہ تکلیف دہ بات ہے کہ این، آر، (نیشنل رجسٹر) میں نام درج ہونے سے پہلے ہی آئی، ایم، ڈی، ٹی ایکٹ کو سپریم کورٹ کے ذریعے کالعدم کر دیا گیا۔ اس سے حالات مزید خراب ہو گئے، جن کا استعمال فرقہ پرست پارٹیاں اپنے حق میں کرتی رہتی ہیں۔ اگر وہ سٹیزن شپ ایکٹ ۱۹۵۵ء کی دفعہ ۶ اے کو کالعدم کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، تو نہ صرف تقریباً ایک کروڑ مسلمان؛ بلکہ تیس پینتیس لاکھ ہندو بنگالی بھی اس سے متأثر ہوں گے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ فرقہ پرستی سے متأثر احتجاجیوں کی شرپسندی کے ازالے کے سلسلے میں ریاستی حکومت کا رویہ غیر اطمینان بخش ہے، اس کی طرف سے جاری کردہ شواہد اس قدر کمزور ہے کہ عدالت میں حکومت کی شکست ایک طرح سے طے لگ رہی ہے۔ اس کے مدنظر ہمارا مرکزی حکومت سے مطالبہ ہے کہ اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے اپنے شہریوں کو اپنے ملک میں ہی غیر ملکی بننے سے روکیں اور کیس کو عام سرکاری وکیل کے حوالے کرنے کے بجائے اٹارنی جنرل کو دیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ شہریت کا حق بنیادی حق ہے۔ اور حق رائے دہی بھی ہر بالغ شہری کا آئینی حق ہے۔ ہم حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے حقوق کے تحفظ کی آئینی ذمے داری نبھائے اور ان کو پریشانی سے باہر نکالے۔

**عالم اسلام:**

دانشوران قوم وملت! عالم اسلام جن حالات سے گزر رہا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے، امریکہ، صیہونی عناصر اور ان کے حلیفوں کی چیرہ دستیوں کی زد میں پورا عالم اسلام ہے، دہشت گردی کے خاتمہ، جمہوریت، آزادی اور خطرناک وتباہ کن اسلحہ سے دنیا کو پاک کرنے کے نام پر امریکہ کی قیادت میں جو دہشت گردی ہو رہی ہے اس نے پوری دنیا کے امن وقانون اور خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کے اقتدار اعلیٰ کو خطرے میں ڈال دیا ہے، عراق، لیبیا، افغانستان، شام، تیونس، بحرین اور مصر وغیرہ میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے حالات پوری طرح آئینہ ہو جاتے ہیں۔ عراق کو خطرناک کیمیائی اسلحہ ہونے کے بہانے سے ختم کر دیا گیا، صدام حسین کو پھانسی دے دی گئی اور یہ سب کچھ آزادی اور عراقی عوام کو ظلم وبربریت سے نجات دلانے کے نام پر کیا گیا، کہا یہ گیا کہ عراق پر حملہ کرنے کا مقصد عراقی عوام کے ہاتھوں میں عراق کی باگ ڈور دینا اور امن کا قیام ہے لیکن اصل صورت حال کیا ہے وہ جگ ظاہر ہے امریکہ کا جھوٹ پوری طرح سامنے آچکا ہے وہاں کوئی تباہ کن ہتھیار نہیں ملا، عراق میں قتل وغارت گری اور تباہی وبربادی اور انارکی کی وہ صورتحال پیدا ہو گئی ہے، جس کا تصور پہلے نہیں کیا جاسکتا تھا، امریکی فوج عراق سے جاچکی ہے؛ لیکن امریکہ نے جو وہاں بدترین حالات پیدا کر دیے ہیں، اس سے عراقی عوام ابھی تک نہیں نکل سکے ہیں۔ بم دھماکے، خودکش حملے جاری ہیں۔ شہریوں کی زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہے۔ اب خود امریکہ

اوراس کے حلیف اعتراف کررہے ہیں کہ عراق میں حالات قابو میں نہیں آرہے ہیں اورصورتحال انتہائی سنگین ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ عراقی عوام کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے دیا جائے، غیرملکی طاقتوں کے تسلط کے سایے میں کوئی ملک خودمختاری اور آزادی کے ساتھ ترقی اور جمہوریت سے ہمکنارنہیں ہوسکتا ہے۔عراق میں سرگرم مختلف گروپوں کو اپنے ملک اورعوام کے مفاد میں متحد ہوکر ایثاروقربانی سے کام لیتے ہوئے حکمت عملی تیارکرنا چاہیے۔خون خرابے کا سلسلۂ صہیونی امریکی کاز کوہی تقویت دیتا ہے۔افغانستان کے حالات بھی اس نہج پرنہیں آرہے ہیں کہ وہاں مطلوبہ ترقی کا عمل شروع ہوجائے اور امن قائم ہوجائے۔امریکہ اوراس کے حلیفوں کی فوجیں افغانستان میں اب بھی موجود ہیں۔ وہاں کی جوتصویریں مختلف مواقع پر سامنے آتی رہتی ہیں، ان سے لگتا ہے کہ صورت حال ٹھیک ہونے میں اب بھی کافی وقت لگے گا۔ عالمی برادری؛ خصوصا ترقی پذیرممالک اور جوناوابستہ تحریک سے جڑے ہوئے ہیں اوروہ تمام امن پسند ممالک، جوامن وترقی کے خواہاں ہیں، افغانستان کے عوام کی مرضی کے مطابق جمہوری حکومت کے قیام میں تعاون کریں اور امریکہ کو اپنا تسلط ختم کرنے کے لیے اس پر دباو ڈالیں۔مصراور لیبیا میں اقتدار کی تبدیلی تو ہوگئی ہے، لیکن امن وقانون کے قیام کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں، شام کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔قتل وغارت گری کا سلسلہ جاری ہے، تیونس میں عوامی مزاحمت سے اقتدار میں تبدیلی آچکی ہے، کہیں انتخاب کا عمل پورا ہوچکا ہے اور کہیں شروع ہونے والا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات میں حکمراں طبقہ کواس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ عوام کی جائز خواہشوں اورامنگوں پرتوجہ دیتے ہوئے ملک کے وسائل میں عوام کی حصے داری کے تعین میں جمہوری طرزعمل اپنائیں۔اسی کے ساتھ تبدیلی کے لیے سرگرم جماعتوں کے لیے اس کالحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ملک کوانارکی کی طرف جانے اور غیرملکی طاقتوں؛ خصوصا صہیونی اورامریکہ کی غلط مداخلت سے اس کو بچانے کی کوشش کریں۔امن کے ساتھ ہی ترقی وتبدیلی ملک وعوام کے مفاد میں ہوتی ہے۔

**مسئلۂ فلسطین اور القدس کی صورت حال:**

عرب فلسطینیوں کی مظلومی ومقہوریت، امریکی وبرطانوی سازش اوراسرائیل کے ظلم وجارحیت اورعربوں کی زمین پر قبضہ کرنے کی ناپاک خواہشات کی علامت بن چکی ہے، جمعیۃ علماء ہند نے ہمیشہ اسرائیل کے عزائم واقدامات کی مذمت ومخالفت اور فلسطینیوں کے حق ومطالبہ کی حمایت کی ہے، اس وقت خطے میں حالات بہت دھماکہ خیز ہیں، مسجد اقصی کا وجودمعرض خطر میں ہے، اسرائیل اپنے ناپاک مقصد کے تحت اس کوختم کردینے کے درپے ہے، آئے دن ایسے اقدامات کرتارہتا ہے، جن سے مسجد اقصیٰ کے وجودکولاحق خطرات میں اضافہ ہورہا ہے۔ چند سال قبل سے امریکی صدر باراک اوبامہ اورامریکی وزیرخارجہ نے قضیہ فلسطین کے حل کی سمت میں پیش قدمی کی بات کہی تھی، لیکن عملاً اس سمت میں کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے، اسرائیل بے اختیار غیرمسلح فلسطین کی بات کررہا ہے، جب کہ کسی بے اختیار اور غیرمسلح حکومت کا تصور سراسر بےمعنی ہے، اسرائیل کی جارحیت وبربریت میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے، روڈمیپ اور معاہدہ امن کی خلاف ورزی مسلسل کرتا آرہا ہے، مختلف پابندیوں سے فلسطینیوں کی اذیتوں میں اضافہ ہوتارہتا ہے، بغیرمقدمہ چلائے بڑی تعداد میں فلسطینیوں کوان جیلوں میں قید کر رکھا ہے، جہاں کسی طرح کی؛ حتیٰ کہ پڑھنے لکھنے تک کی سہولت حاصل نہیں ہے اورقیدی اذیت ناک زندگی گذاررہے ہیں۔ فلسطینی صدر کا یہ فیصلہ مناسب ہے کہ قیدیوں کے معاملے کواقوام متحدہ میں رکھا جائے گا۔ آج بھی فلسطین کی صورتحال تشویشناک ہے، یہ بات افسوسناک ہے کہ عالم اسلام اورعرب ممالک اسرائیل کوجارحیت سے روکنے کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈال پارہے ہیں، یہ بات عالم اسلام کے لیے شرمناک ہے؛ البتہ انسانی لحاظ سے یہ خوش آئند ہے کہ فلسطینیوں کی بےکسی کا احساس ان لوگوں نے کیا جن کی غالب اکثریت غیرمسلم ہے، یہ شرم ناک بات ہے کہ انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اورافراد کے قافلے کو بھی اسرائیل اپنی بربریت وزیادتیوں کا نشانہ بنانے سے بازنہیں آتا ہے اورانسانی ضروریات؛ حتیٰ کہ ادویہ کی فراہمی سے بھی روک دیتا ہے۔ مختلف عالمی اداروں؛ حتیٰ کہ امریکی وزیرخارجہ کے کہنے کے باوجود اسرائیل نہ تو فلسطینی علاقوں سے یہودی بستیاں ہٹانے کے لیے تیار ہے نہ نئی بستیاں بسانے پرروک لگارہا ہے۔

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی اس تنقید کے باوجود کہ مغربی کنارہ پر اسرائیل کی طرف سے کوئی بھی بستی غیرقانونی ہے، نئی بستیوں کی تعمیر جاری رکھے ہوئے ہیں، ابھی حال ہی میں اسرائیل نے نئی یہودی

آبادیوں کی تعمیر کی ہے، ایسا اس کے باوجود ہورہا ہے کہ ماہ اپریل کے اوائل میں امریکہ سمیت یورپی یونین، روس اور اقوام متحدہ نے مذمت کی تھی۔ مصر اور دیگر ممالک کے حالات کی تبدیلی سے ہمیں امید ہے کہ دیر سویر صورت حال میں بہتر تبدیلی آئے گی، عالمی سطح پر قیام امن میں فلسطین کا مسئلہ اہم رول ادا کرے گا، فلسطینیوں کی آزادی اور باعزت زندگی اور خودمختار ریاست کے قیام سے عالمی سطح پر حالات میں تبدیلی کے قوی امکانات ہیں، ہمارا مطالبہ ہے کہ امریکہ، روس اور عالمی برادری ایک خودمختار آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں اپنے وعدے کے مطابق تعاون کریں، بے گھر اجڑے فلسطینی عوام کی بازآبادکاری اور گھر واپسی کے لیے راہ ہموار کی جائے، عرب مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل خالی کردے۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کی مستقل رکنیت کی منظوری دلانے میں عالمی برادری تعاون کرے۔ یونیسکو میں فلسطینی ریاست کی مستقل رکنیت کی منظوری صحیح سمت میں ایک اچھا قدم ہے۔ اس سلسلے میں ہندستانی حکومت کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، یہ افسوس ناک بات ہے کہ اسرائیل اور فلسطین کے سلسلے میں ہندستان کی پالیسی میں امریکہ اور اسرائیل کے دباؤ سے تبدیلی اور انحراف پیدا ہوگیا ہے، گاندھی، نہرو اور ملک کی سابقہ روایت و پالیسی کو نظرانداز کرکے اسرائیل سے حد سے زیادہ قربت و موافقت کی راہ پر حکومت گامزن ہے، اس کے پیش نظر ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندستان، مظلوموں، کمزوروں کی اعانت وحمایت کی سابقہ پالیسی پر چلے۔

### فتنۂ ارتداد کی روک تھام کے لیے جدو جہد :

حضراتِ علماء کرام وفکرمندانِ ملت! یہ امر سخت تشویش کا باعث ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں قادیانیوں، کرسچن مشنریوں اور دیگر عناصر کے ذریعہ منظم انداز میں ارتدادی تحریکات چلائی جاری ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں یہ ارتدادی سرگرمیاں پوری قوت سے چل رہی ہیں، مسلم اکثریتی ریاست کشمیر تک میں ان کے غلط اثرات نکل رہے ہیں۔ مسلم نوجوان خاص طور پر ان کے نشانے پر ہیں، ان سرگرمیوں سے وابستہ افراد اچھے مستقبل کے خواب دکھا کر دین سے ناواقف جدید تعلیم یافتہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنے دام فریب میں گرفتار کرتے ہیں اور ان کے لئے ہر طرح کے اسباب عیش مہیا کرکے انہیں مرتد بنانے کی کوششیں کررہے ہیں۔ ان واقعات سے متأثر ہونے والے بہت سے نوجوان گذشتہ دنوں جمعیۃ علماء ہند کے خدام اور دیگر بعض علما کی ہوش مندی سے دوبارہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جمعیۃ کی مجلس عاملہ کے رکن مولانا رحمت اللہ کشمیری اور ان کے رفقا نے ایسے بہت سے نوجوانوں سے رابطہ قائم کرکے جو تفصیلات پیش کی ہیں، وہ تشویش ناک ہیں، ملک میں کتنے ایسے نوجوان ہوں گے جوان کے دام فریب میں پھنس کر اپنا دین وایمان تباہ کرچکے ہوں گے، ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آسام، آندھرپردیش، راجستھان، گجرات، پنجاب، ہریانہ وغیرہ سمیت ملک کے دیگر حصوں میں ارتدادی سرگرمیاں تیزی سے جاری ہیں، اس لیے ہمیں ہر جگہ چوکنا اور بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ قادیانیت جیسی ایمان کش ارتدادی تحریک کا پوری مستعدی سے مقابلہ کیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند میں کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت قائم ہے، اس سے ربط کرکے متأثرہ علاقوں میں اجتماعی طور پر کام کیا جائے، اور پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں تک ردقادیانیت کے متعلق اپنا لٹریچر پہنچایا جائے؛ تاکہ اپنے مسلم بھائیوں کا دین وایمان محفوظ رکھا جاسکے۔ قادیانیوں کی سرگرمیوں سے ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی کے واقعات پیش آرہے ہیں، جمعیۃ علماء ہند ایسے معاملات میں اگرچہ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر کسی بھی کارروائی کو روا نہیں سمجھتی؛ لیکن حکومت کو اس جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتی ہے کہ وہ قادیانیوں کی اشتعال انگیزیوں پر ہر جگہ روک لگائے؛ تاکہ ردعمل میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آئے۔

قادیانی جھوٹ، دھوکا اور لالچ سے کام لے کر سیدھے سادے ان پڑھ مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں اور مختلف عنوانات سے پروگرام کرکے قادیانیت سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گذشتہ دنوں قادیانیوں نے دہلی میں نمائش قرآن کے عنوان سے ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں افسوس کی بات ہے کہ قومی اقلیتی کمیشن کے چیرمین تک شریک ہوئے، اس طرح کی تقریبات کا اہتمام پہلے بھی وہ کرتے رہے ہیں، لیکن دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے خدام اور دیگر حضرات کی بروقت اقدام اور لوگوں کو بیدار کردینے کے سبب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ قادیانی مختلف ترکیبوں سے اداروں، تنظیموں میں بھی داخل ہونے اور جگہ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وقف بورڈوں وغیرہ سے قادیانیوں کو نکال باہر کیا جائے، جیسا کہ گذشتہ دنوں آندھرا وقف بورڈ نے اس سمت میں اہم قدم اٹھاتے ہوئے ان کو نکال باہر کیا، اس لیے بورڈ، چیرمین اور ان

کے رفقا قابل مبارک باد ہیں۔اس سلسلے میں جمعیۃ علماء آندھرا کے صدر حافظ پیر شبیر اور جمعیۃ کے دیگر خدام کا بھی قابل قدر رول ہے۔ دیگر ریاستوں کے وقف بورڈوں میں بھی اگر کوئی قادیانی ہے تو اسے الگ کرنے کیے لیے اقدام کرنا چاہیے۔اسی طرح سنگھ کی ارتدادی سرگرمیوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔گذشتہ دنوں یہ بات سامنے آئی کہ کچھ لوگ روحانی سکون حاصل کرنے کے عنوان سے اس سے وابستہ ہوگئے اور کچھ مسلم نوجوان گمراہ ہوکر اس مہم میں شامل ہوگئے۔اللہ کا شکر ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے خدام کی کوششوں سے تین درجن نوجوان واپس آگئے ہیں۔زندگی کا فن سکھانے اور کامیابی، صحت اور روحانیت حاصل کرنے کے عنوان سے ملک میں مختلف تحریکات چل رہی ہیں، بعض تو صوفیانہ اور اسلامی اصطلاحات کا مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں، جس سے بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور ناکافی علم دین ہونے کے سبب غلط کو صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں۔اس طرح کے فتنے سے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ مستند صاحب علم و بصیرت علما کے رابطے میں رہا جائے۔

کرسچن مشنریوں کے فتنہ اور ارتدادی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ اور قرآن سے نفرت اور غلط فہمیاں پھیلانے کے ساتھ دنیا کو عیسائیت کے رنگ میں رنگنے کے لیے وسیع پیمانے پر مختلف قسم کے پروگرام چلائے جارہے ہیں۔ اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملہ کس قدر قابل توجہ ہے۔سیدھے سادے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے بعض چینلوں پر بائبل کو قرآن کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے ایسے حالات میں علما، اہل مدارس اور ملک کے اصحاب خیر کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ ارتدادی سرگرمیوں کا مقابلہ اور انسداد وسائل کی فراہمی کے ساتھ دین و شریعت سے روشناس کرانے کی موثر جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔

## پسماندہ علاقوں میں دینی مکاتب کے قیام اور چلانے کی ضرورت:

رہنمایانِ ملک وقوم! اس حقیقت سے یقیناً آپ واقف ہوں گے کہ مسلمانوں کے وجود و بقا کے لئے دینی مکاتب کا قیام ناگزیر ہے، آج جہاں بھی دینی رونقیں اور اسلامی شعائر آباد ہیں، وہ انھی مکاتب دینیہ کی بدولت ہیں، ورنہ جن آبادیوں میں مکاتب کا وجود نہیں ہے وہاں کے دینی حالات ناقابل بیان اور ناگفتہ بہ ہیں۔ جوں جوں آبادی بڑھ رہی ہے اسی اعتبار سے مکاتب کی ضرورت بھی روز افزوں ہے۔ بالخصوص دیہی آبادیوں میں دین سے جہالت اور دینی فرائض واحکامات سے ناواقفیت تشویش ناک حد تک بڑھ چکی ہے، آج بھی یہ صورتحال ہے کہ بیوی کی موجودگی اور اس کی حیات میں اس کی بہن سے شادی کردی جاتی ہے گزشتہ کچھ دنوں پہلے آندھرا کے کچھ علاقوں سے جب یہ اطلاع موصول ہوئی، تو جمعیۃ علماء کے خدام نے فوری قدم اٹھاتے ہوئے اس شرعا حرام کام کو روکنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیابی ملی۔ ملک میں کچھ عناصر مسلسل اس کی تشہیر کرکے عوام کو دھوکے میں ڈالتے ہیں کہ خالہ زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد بھائی بہن کے درمیان ازداجی رشتہ قائم کرنا غلط ہے، حالاں کہ ایسے بھائی بہن کے درمیان ازدواجی رشتہ بالکل جائز ہے ایسے حالات میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ عوام کا رشتہ علما اور مدارس سے قائم ہو یہ عام مشاہدہ ہے کہ شہر اور قصبات میں جو مسلم بچے عصری تعلیم کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ بڑے ہونے کے باوجود دین کی بنیادی باتوں سے بے خبر رہتے ہیں، ایسے بچوں کو دین کی بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لئے صباحی اور شبینہ مکاتب میں ضرور بھیجنا چاہئے۔ضروری ہے کہ ہر مسجد کے ساتھ مکتبی تعلیم کا نظم ہو، جس میں جمعیۃ علماء ہند کے دینی تعلیمی بورڈ کا مجوزہ نصاب پڑھایا جائے، اہل خیر حضرات مکاتب کے قیام کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ فراہم کریں۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے اپنے بجٹ کا دس فیصدی حصہ مکاتب کے لئے مختص کرنے کی تجویز ہے، نیز سبھی بڑے اداروں اور تنظیموں سے بھی پرزور درخواست ہے کہ وہ اپنے بجٹ کا معقول حصہ مکاتب کے قیام اور ترویج واشاعت میں صرف کرنے کا نظام بنائیں تو بڑا فائدہ ہوگا۔ دیگر بہت سی غلط رسموں، فتنوں اور باطل افکار کی تنظیموں کی گمراہ کن باتوں سے بچنے میں بھی مدد ملے گی۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس نظام کے تحت دینی تعلیم سے روشناس کرانے کے مقصد سے دینی تعلیمی بورڈ قائم کیا ہے۔ ماضی میں اس نے دین وملت کی بقا اور نئی نسل کے ایمان کی حفاظت میں اہم کردار ادا کیا ہے گذشتہ دنوں اسے فعال کرکے کام شروع کیا گیا ہے، جمعیۃ علماء ہند فکر منداصحاب خیر کے تعاون سے حسب استطاعت کام کررہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کام میں آسانی اور کام کرنے والے افراد اور اسباب مہیا فرمائے، آمین۔ دینی مکاتب کے قیام اور ان کو چلانے کا کام غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے،

اس لیےاس میں خصوصی دل چسپی وتوجہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

**اسلامی تشخص کے تحفظ اور معاشرتی اصلاح کی ضرورت:**

حضراتِ گرامی! اگر کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک صاحب کلمہ وایمان کو اپنی مذہبی ونظریاتی شناخت کا تحفظ ہر ممکن طریقے پر کرنا چاہیے۔ خیرامت اور داعی ہونے کے ناتے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے امتیازات و خصوصیات اور اسلامی تشخص کے ساتھ سماج کے سامنے رہے، تاکہ دوسروں کو رہ نمائی حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ مغربی تہذیب وتمدن کے بڑھتے اثرات اور جدید دور کا ظاہرہ لوگوں کو اس کے لیے آمادہ کررہاہے کہ وضع قطع لباس میں کوئی فرق اور الگ شناخت نہ ہو، سب ایک ہی جیسے ہوجائیں۔ حتیٰ کہ مرد وعورت کا لباس بھی یکساں ہوتا جارہا ہے۔ اس بیماری میں سبھی مذاہب اور فرقے کے لوگ بڑی تیزی سے مبتلا ہورہے ہیں۔ اسلامی شریعت نے مرد کو عورت کی ہیئت وشکل اور عورت کو مرد کی ہیئت وشکل اپنانے سے سختی سے روکا ہے۔ ایسی روش کو ملعون عمل قرار دیا ہے، اس کے مدنظر مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت اور تشخص کے ساتھ زندگی گذاریں۔ آج ہمارے ملک اور پورے عالم میں مسلمانوں پر جو حالات آرہے ہیں، قرآن وسنت کی نظر میں اس کی بڑی وجہ خود ہماری کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں۔

اس لیے حالات کی تبدیلی کے لئے جہاں ہمیں ظاہری تدبیریں اپنانی ہیں وہیں اپنی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی بھرپور توجہ دینی ہے، ورنہ ہم اپنے مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوسکیں گے؛ کیوں کہ اہل ایمان کو عزت ورفعت صرف اور صرف اسی وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ دین پر کامل طور پر کاربند ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے: ''تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لئے قوت دے گا، اور ان کو اس خوف کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔'' (النور: ۵۵)

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اثر میں دین کو نافذ کرنے کی فکر کرے اور معاشرہ سے برائیوں کو مٹانے کے لئے ہر ممکن جدو جہد کرتا رہے۔ ہر علاقہ اور شہر کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ آبادی میں پھیلنے والے منکرات پر نگاہ رکھیں اور ایک ایک منکر کو معاشرہ سے مٹانے کے لئے مناسب تدبیریں اور اسباب اختیار کریں، ورنہ معاشرہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تباہ اور برباد ہوجائے گا۔ اس دین کی بقا کا مدار ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ہے، اگر اس کام کو جاری نہ رکھا جائے تو امت کبھی بھی عافیت سے نہیں رہ سکتی۔ اسی وجہ سے جمعیۃ علماء ہند کے تعمیری پروگراموں میں ''اصلاح معاشرہ'' کو مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے اور سابق صدر محترم حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ۱۹۹۲ء سے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے پورے ملک میں اصلاح معاشرہ تحریک شروع فرمائی تھی اور مرکزی وصوبائی جماعتوں کے زیر اہتمام ''اصلاح معاشرہ عشرہ'' منانے اور علماء کے وفود بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو آج بھی جاری ہے، تاہم اس میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ مقامی اکائیوں کے فعال ہوئے بغیر اس تحریک میں کامیابی نہیں مل سکتی؛ اس لئے میں تمام ہی اراکین جمعیۃ اور دردمندانِ ملت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اصلاح معاشرہ کو مشن بنا کر محنت کریں اور اپنے فرض منصبی سے کبھی غافل نہ رہیں۔

**تقریبات میں سادگی اپنائیں:**

حضراتِ گرامی قدر! اصلاح معاشرہ کے سلسلے میں آج کی تاریخ میں اس پر خصوصی توجہ دینی ضروری ہے کہ شادی بیاہ میں سادگی سے کام لیا جائے، یہ افسوسناک بات ہے کہ آج مسلمانوں کا بڑا قیمتی سرمایہ ان کی تقریبات کی فضول خرچیوں میں ضائع ہورہا ہے، بڑے بڑے معروف دین دار لوگ بھی سادگی کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ جہازوں میں تقریب نکاح منعقد کرتے ہیں اور براتیوں کو بھاری قیمتی تحفے دیتے ہیں۔ اس کا مقصد اپنی دھاک جمانے اور نام ونمود کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ہے۔ عین اس وقت جب کہ امت کا ایک بڑا طبقہ غربت وافلاس کی مار جھیل رہا ہے، یا آفاتِ سماویہ میں گرفتار ہے اور دانے دانے کو محتاج ہوگیا ہے، ان سے صرفِ نظر کرکے اس طبقہ کا اسراف وتبذیر میں مبتلا ہونا بڑی بے حسی کی دلیل ہے۔ یہ تبذیر کا راستہ کھلی ہوئی تباہی کی طرف لے جانے والا ہے، جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فضول خرچی اور واہی تباہی میں پیسہ ضائع کرنے کے بجائے کارخیر، ضرورت مند طلبہ کی تعلیم، تعلیمی ادارے کے قیام وضروریات کی فراہمی اور غریب بچیوں کی شادی

بیاہ کرانے میں لگائیں تو ملک وقوم کا بھلا ہوگا۔اور سماج ترقی کی طرف گامزن ہوگا، بہت سے ملی، دینی، سماجی کام ایسے ہیں جو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے ہیں اور بہت سے شروع ہی نہیں ہو پاتے ہیں۔اس طرح کے امور پر سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے۔

## عریانیت اور فواحش پر بھی روک لگانے کی سخت ضرورت ہے:

حاضرین محترم! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''میں نے اپنے بعد اپنی امت میں مردوں کے لئے بدکار عورتوں سے زیادہ خطرناک فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا''۔ (بخاری ومسلم) اسی وجہ سے قرآنِ پاک اور احادیث شریفہ میں عورتوں کو پردہ کے سخت احکامات دئے گئے ہیں، حتیٰ کہ انہیں بلاضرورت گھر سے نکلنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔مسلم سماج میں بے پردگی بڑھتی جارہی ہے جو انتہائی تشویش کی بات ہے؛ اس لئے پردہ پر سختی سے عمل کرانے کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں درج ذیل امور کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے:

۱- اس وقت مسلم معاشرہ میں سودی اور حرام معاملات کی کثرت بھی حد درجہ باعثِ تشویش ہے۔مسلم آبادیوں میں جوا اور سٹہ عام ہے، لاٹری کی نحوست کی وجہ سے کتنے خاندان تباہ ہو چکے ہیں، اس حرام خوری کے بدترین اثرات ہمارے دینی مزاج پر پڑ رہے ہیں، آج منکرات کی کثرت اور بے دینی کا ایک بڑا سبب حرام آمدنی کا استعمال بھی ہے۔

۲- ملت کا مستقبل نوجوانوں سے وابستہ ہے، آج ہمارے نوجوانوں کی بے راہ روی ایک المیہ سے کم نہیں ہے، ان کی اصلاح پر خصوصی توجہ دی جانی چاہئے۔

۳- مرد داڑھی رکھیں، شرعی لباس اور اسلامی وضع قطع کا خیال رکھیں۔

۴- آپسی نزاعات اور لڑائی جھگڑے سے پرہیز کیا جائے، بالخصوص مقدمہ بازیوں میں پڑ کر اپنے دین وایمان اور سرمایہ کو تباہ نہ کریں۔

۵- جھوٹ، غیبت، الزام تراشیوں اور بدگوئی سے بچنے کا اہتمام کیا جائے۔

## امارت شرعیۂ ہند کے نظام کو مستحکم کرنے کی ضرورت:

حضرات علمائے کرام اور ہمدردان ملت! ملک کی عدالتوں میں مقدمات کی جس طرح بھرمار ہے اور انصاف ملنے میں تاخیر ہورہی ہے، اس کے مدنظر اس کی بڑی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ امارت شرعیہ کے نظام کو مستحکم کیا جائے۔ملک کی عدالتوں میں تین کروڑ سے زائد ایسے مقدمات ہیں جن کی سماعت کی تاریخ ہی نہیں لگی ہے، اس کے ساتھ ہی آئے دن نئے نئے مقدمات آتے رہتے ہیں۔مفاد عامہ کی رٹوں کے بے تحاشا سلسلے نے صورت حال کو اور بھی پریشان کن بنادیا ہے، کم سے کم معاشرتی مسائل کے متعلق معاملات اگر محاکم شرعیہ میں آکر فیصل ہونے لگیں، تو بڑی مقدار میں لوگوں کا پیسہ اور وقت کی بچت کے ساتھ بروقت اور کم وقت میں انصاف کے حصول وفراہمی میں بڑی مدد ملے گی اور انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں گے۔ملک کا جو قانون ونظام ہے، اس میں فوج داری، حدود وتعزیرات کے مقدمات، محاکم شرعیہ میں نہیں لیے جاسکتے ہیں؛ مگر مسلم پرسنل لاء کے مسائل کے لیے تو محاکم شرعیہ کی طرف رجوع کیا ہی جاسکتا ہے۔محاکم شرعیہ کے تحت مقدمات کے فیصلے اور انصاف کی فراہمی کا نظام ملک کے عدالتی نظام کے متوازی ومقابل نہیں ہے، جیسا کہ کچھ برخود عناصر پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں؛ بلکہ یہ ایک معاون نظام ہے، جو آئین کے تحت ہے۔اگر امارت شرعیہ کے تحت محاکم شرعیہ کا نظام عمل صحیح طریقے سے جاری ہوجائے تو ملک کی عدالتوں کا بار خاصا کم ہوجائے گا۔عدالتوں میں ججوں کی کمی کی تلافی بھی کسی حد تک اس سلسلے سے ہوسکے گی۔ جمعیۃ علماء ہند اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے بارہا اس کی کوشش کی کہ قاضی بل لاکر اسے قانون کی شکل دے دی جائے، تو کم از کم مسلم پرسنل لاء کی حد تک کے مسائل تو محاکم شرعیہ کے نظام سے ملک کی عدالتوں کو بڑی مدد ملے گی۔آزادی سے پہلے سید محمد احمد کاظمی اور آزادی کے بعد بھی حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ نے قاضی بل کا مسودہ بارہا ہندستانی پارلیامنٹ سے منظور کرانے کی کوشش کی؛ لیکن افسوس کہ ارکان کی اکثریت کے مختلف ذہنی تحفظات کے سبب اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔قاضی بل کا مسودہ اس قدر مکمل ہے کہ اگر وہ قانون بن کر نافذ ہوجائے تو نکاح، طلاق، خلع، تولیت، وراثت کے معاملات بہ خوبی تصفیہ ہوجائیں۔

- ہماری مرکزی سرکار سے اپیل ہے کہ قاضی بل کو منظور کرکے قانون بنانے کی سمت میں قدم اٹھائے۔ دیگر سیاسی پارٹیوں سے بھی ہماری اپیل ہے کہ وہ اس سلسلے میں تعاون دے کر انصاف کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کریں۔

- مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کرنا ہم دینی وملی فریضہ سمجھتے ہیں کہ وہ غیر ضروری طور سے مسلم پرسنل لاء سے متعلق مقدمات کے فیصل ہونے کے انتظار میں برسوں لگا دیتے ہیں، سرمایہ کی بربادی الگ ہوتی ہے، اس کے مدنظر دنیا آخرت دونوں میں ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ مسلم پرسنل لاء کے مقدمات ومعاملات میں محاکم شرعیہ کی طرف رجوع کریں۔
- آخر میں علمائے کرام اور شریعت کے واقف کاروں سے اپیل ہے کہ وہ مرکزی امارت شرعیہ ہند سے رابطہ قائم کرکے امارت شرعیہ کے نظام کے استحکام اور مرکزی مقامات پر محاکم شرعیہ کے قیام میں تعاون کریں۔

**تنظیمی استحکام کا مسئلہ**

معزز اراکین گرامی! کسی بھی جماعت کے لیے افراد ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، جماعت کی ترقی کا مدار مخلص کارکنان پر ہی ہوتا ہے، تنظیم کے مقاصد کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں اگر اس کا تنظیمی ڈھانچہ مضبوط نہیں ہے تو وہ کبھی بھی اپنے عزائم کو روبہ عمل نہیں لاسکتی، اس لیے میں تمام ہی اراکین ومتعلقین سے گذارش کروں گا کہ وہ جماعت کی تنظیم کو مستحکم کرنے پر بھرپور توجہ دیں اور کوئی بھی تنظیم اس وقت تک مستحکم نہیں ہوسکتی جب تک کہ اپنے تعمیری پروگراموں پر بھرپور توجہ نہ دے، ہماری جماعت کے اکابر کے نزدیک تعمیری پروگراموں کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ انھیں باقاعدہ دستور اساسی کا جزو بنا دیا ہے۔

میرے محترم! یہی تعمیری پروگرام ہماری جماعت کی اصل روح ہیں اور جو اکائیاں باقاعدگی سے انھیں عمل میں لاتی ہیں انھیں عوام وخواص میں بے مثال پذیرائی اور قبولیت حاصل ہوتی ہے، دیگر اکائیوں کو بھی ان کی تقلید کرنی چاہیے۔ تنظیمی استحکام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقی ممبر سازی کی جائے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو جمعیۃ علماء ہند سے جوڑا جائے۔ خاص طور سے نوجوانوں کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔ ملک کے بدلتے حالات اور ضروریات کے مدنظر دستور میں شامل تعمیری پروگراموں کے علاوہ ان پروگراموں پر بھی توجہ کی ضرورت ہے، جو جماعت کے تنظیمی استحکام میں معاون بن سکتے ہیں۔ مختلف طبقات کی ضروریات و مسائل پر توجہ دے کر، ان کو متعلقہ افراد واداروں سے حل کرانے کے لیے جمعیۃ علماء کے خدام وکارکنان جدوجہد کریں، تاکہ لوگوں کی اس سے وابستگی کی راہ ہموار ہو اور جمعیۃ علماء ہند کو تقویت حاصل ہوسکے، انھیں یہ محسوس ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ ایسی ایک تنظیم ہے، جس کے نزدیک تعمیری پروگراموں کی بڑی اہمیت ہے اور خدمت خلق کا بڑا درجہ ہے۔

**خاتمہ**

حضرات! آخر میں سمع خراشی کے لیے آپ سے معذرت خواہ ہوں اور آپ حضرات کی مساعدت وعنایت کے لیے شکرگزار ہوں، وقت کے مسائل ومشکلات اور مختلف قسم کی آزمائشوں کے تعلق سے آپ کی توجہ پھر اس جانب مبذول کرانا چاہوں گا کہ ہم خدا ہی کو تمام مشکلات کا حل کرنے والا اور اس کو کارساز حقیقی سمجھ کر پورے یقین واذعان کے ساتھ اس پر بھروسہ کریں اور استقامت کے ساتھ اپنی دینی، ملی، قومی، انفرادی، اجتماعی، معاشی اور اقتصادی حالت سنوارنے کے لیے سرگرم عمل ہوجائیں، ملکی، قومی وآئینی نوعیت کے مسائل کے حل کے لیے کی جانے والی اپنی جدوجہد میں جمہوریت پسند، ملک دوست برادران وطن کو ساتھ لیں، اس متحدہ طاقت کے ساتھ آگے بڑھیں، ان شاءاللہ کامرانی آپ کا استقبال کرے گی۔

**وآخر دعوانا ان الحمد اللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.**

آمین. ❑❑

# تجاویز اکتیسواں اجلاسِ عام بسلسلۂ تحریک شیخ الہندؒ

منعقدہ ۲۶/۲۷/ رجمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۸/۱۹/ مئی ۲۰۱۲ء بروز جمعہ، سنیچر، بمقام: رام لیلا میدان، نئی دہلی

## (۱) ریزرویشن سے متعلق تجویز:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ریزرویشن کا مطالبہ دہراتے ہوئے ارباب اقتدار کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہے کہ ریزرویشن دینے کے عنوان پر سرکار کے حالیہ اقدام سے مطالبہ پورا نہیں ہوتا، لہذا ریزرویشن کے سلسلے میں جمعیۃ علماء ہند کا مطالبہ ہے کہ:

۱. مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ہر شعبے میں نمائندگی دی جائے اور اس کی راہ میں جو بھی آئینی اور دوسری رکاوٹیں ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ خوش حال طبقات (کریمی لیر) کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں کو انتہائی پسماندہ (موسٹ بیک ورڈ) قرار دے کر ریزرویشن دیا جائے۔

۲. منڈل کمیشن کے تحت پسماندہ طبقات میں جو ریزرویشن مسلم او بی سی برادریوں کو حاصل ہے، اس کے نفاذ میں عموما مساویانہ سلوک نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے حقوق سے محروم رہتے ہیں، اس لیے ان کا الگ کوٹہ متعین کیا جائے۔

۳. شیڈول کاسٹ کے لیے ریزرویشن سے متعلقہ آئین کی دفعہ ۳۴۱/ میں جہاں یہ شرط ہے کہ صرف ہندو، سکھ اور بودھ مذہب ماننے والوں کو ریزرویشن دیا جائے گا، اس میں ترمیم کر کے مذہب کی قید ختم کی جائے اور اس میں مسلم، محنت کشوں، برادریوں اور پسماندہ طبقات کو بھی شامل کیا جائے۔

اس سہ نکاتی مطالبے میں سے پہلے اور تیسرے مطالبے سے متعلق ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے؛ البتہ دوسرے مطالبے میں مسلم او بی سی سے متعلق ۲۷/ فی صد میں سے اس کا کوٹہ مختص کرنے کا جو مطالبہ تھا، وہ بھی ساڑھے چار فی صد (۴٫۵) میں دیگر اقلیتوں کو شامل کر دینے کے سبب پورا نہیں ہوتا اس لیے اس اجلاس عام کا یہ مطالبہ ہے کہ اقلیتوں کے بجائے مسلمانوں کے لیے ریزرویشن اور متناسب کوٹہ مختص کیا جانا یقینی بنایا جائے۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام اس بات کی طرف سرکار کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی حالیہ آبادی کے تناسب سے او بی سی کے کوٹے میں اضافہ کیا جائے۔

جمعیۃ علماء فرقہ پرست عناصر کی طرف سے ریزرویشن کے مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی مذمت کرتے ہوئے ان کے اس دعوے کی تردید کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے، ملک کے دبے کچلے اور انتہائی پسماندہ طبقات کو قومی دھارے سے جوڑنے کے لیے ریزرویشن کی ضرورت قیام جمہوریت کے ساتھ ہی ملک میں شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی تھی، لہذا انھیں ریزرویشن دینے کے لیے ۱۹۴۹ء میں قانون کی دفعہ ۳۴۱ کی تجویز پیش کی گئی جسے ۱۹۵۰ء میں صدر جمہوریہ نے قانونی شکل دے دی۔ مگر اس قانون میں ہندو کی قید لگا کر دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا۔ حالاں کہ اس وقت مذکورہ قانون میں مذہب کی قید لگانے کی سخت مخالفت کی گئی تھی، اس کے باوجود مذکورہ ریزرویشن کو صرف ہندو طبقات کے لیے خاص کر دیا گیا۔ اس قانون کے خلاف مسلسل احتجاج کا نوٹس لیتے ہوئے حکومت نے بعد میں مذکورہ قانون میں ترمیم کر کے سکھ اور بودھ مذہب کے پسماندہ طبقات کو اس میں شامل کر لیا، مگر مسلمان مسلسل نظر انداز کیے جاتے رہے حالاں کہ دفعہ ۳۴۱ میں مذہب کی قید دستور کی دفعہ ۱۴ (قانونی مساوات) دفعہ ۱۵ (مذہب، نسل، جنس، ذات اور پیدائش کی بنیاد پر امتیاز کی ممانعت ہے) اور دفعہ ۱۶ (پبلک ملازمت میں برابری کے مواقع) کے تحت دیے گئے بنیادی حقوق کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ مرکزی سرکار رنگا ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ کو پارلیمنٹ میں پیش کر کے، اس کی سفارشات کے مطابق مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کے مطالبے پر عمل کرے۔ صوبائی حکومتوں سے ہمارا مطالبہ ہے کہ آندھرا پردیش، کرناٹک اور تامل ناڈو کے طرز پر معاشی، سماجی اور تعلیمی طور پر پسماندہ مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کے لیے قانون بنایا جائے۔ سماج وادی پارٹی نے اتر پردیش کے حالیہ الیکشن کے دوران اپنے انتخابی منشور میں اقلیتوں کو ۱۸/ فی صد ریزرویشن دینے کا وعدہ کیا ہے، ہم اس کا

استقبال کرتے ہوئے مطالبہ کرتے ہیں کہ معینہ مدت میں اس وعدے پر عمل کیا جائے، اسی طرح مغربی بنگال میں مسلمانوں کو جو ریزرویشن دینے کا اعلان کیا گیا ہے، ہم اس کا بھی استقبال کرتے ہیں اور اس اعلان پر عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اجلاس عام اعلان کرتا ہے کہ اگر ہمارے ریزرویشن کے مطالبے کو نظر انداز گیا تو ہم عنقریب ملک و ملت بچاؤ تحریک چلائیں گے اور پورے ملک میں جیل بھرو آندولن شروع کیا جائے گا۔

**(۲) انسداد فسادات سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام اس بات پر تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ ملک میں آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ پرست عناصر اور تشدد پسند طاقتوں کی منظّم سرگرمیوں کے باوجود ابھی تک انسداد فساد قانون نہیں بنایا جاسکا ہے۔ آزادی کے ساتھ باعزت زندگی گزرانے کا حق دستور میں ہر شہری کو حاصل ہے، اس کے باوجود میرٹھ، ملیانہ، ہاشم پورہ، نیلی، بھاگل پور اور گجرات جیسے بھیانک فسادات میں ظلم وتشدد کے شکار افراد کو طویل مدت کے بعد بھی نہ تو انصاف ملا ہے اور نہ ہی عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق۔ تاریخ شاہد ہے کہ پولس اور انتظامیہ کی فسادیوں سے ملی بھگت یا فرائض کے تئیں غفلت کی وجہ سے فسادات بھیانک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ یو پی اے حکومت نے ۲۰۰۴ء میں اپنے ''کامن منیمم پروگرام'' میں اعلان کیا تھا کہ وہ انسداد فرقہ وارانہ فسادات اور متاثرین کو معاوضہ دینے کا قانون بنائے گی، لیکن سول سوسائٹی اور انصاف پسند تنظیموں کی طویل جدوجہد کے باوجود یہ قانون نہیں بن سکا ہے، حال کے کچھ دنوں میں جو حالات پیدا ہوئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نیت درست نہیں ہے اور وہ قانون سازی کے معاملے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دینا چاہتی ہے۔ یہ بات باعث تشویش ہے کہ بار بار اصلاحات کی کوشش کے باوجود ملک وانصاف کے حق میں جمعیۃ علماء کی پیش کردہ تجاویز کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے مدنظر جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام انسداد فساد قانون سازی کی فوری ضرورت پر توجہ دلاتے ہوئے حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

۱. انسداد فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے متاثرین کو مساوی معاوضہ کی ادائیگی کے لیے ایسا مؤثر قانون وضع کیا جائے جو مذہبی یا اقلیتی و اکثریتی تفریق سے بالاتر ہو اور جس میں سرفہرست فسادات کی ذمے داری ضلعی انتظامیہ، اعلیٰ حکام اور مقامی پولیس عملے پر ہو، نیز انھیں اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اتنا فعال بنایا جائے کہ فسادات کے لیے ذمے دار عناصر، سیاسی جماعتوں کے برسر اقتدار رہنما، تنظیمیں قرار واقعی سزا سے نہ بچ سکیں، ساتھ ہی فساد متاثرین کو یکساں، منصفانہ اور عادلانہ معاوضہ کا حق حاصل ہو اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ انھیں مقررہ معاوضہ جلد اور آسانی کے ساتھ مل جائے۔

۲. مجوزہ انسداد فساد بل کے مسودے پر اگر کسی جانب سے کوئی اعتراض ہو تو اسے جلد از جلد باہمی مذاکرات کے ذریعہ حل کیا جائے

۳. امن پسند انسانیت نواز تنظیموں اور افراد کو ساتھ لے کر ایسی متحدہ جدوجہد کی جائے کہ سرکار فرقہ پرست عناصر کے دباؤ میں نہ آئے اور بل کو بلا تاخیر قانونی شکل دے تاکہ فساد متاثرین کے لیے انصاف کی فراہمی کا راستہ ہموار ہو سکے۔

**(۳) دہشت گردی سے پیدا شدہ حالات اور بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری پر تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام دہشت گردی کے تمام واقعات کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے اسے ملک وقوم کے اور انسانیت کے خلاف سنگین جرم قرار دیتا ہے، لہٰذا اس لعنت سے نجات کے لیے سخت اقدامات کی ضرورت ہے۔ پورے ملک میں دہشت گردی کے خلاف جمعیۃ علماء ہند نے گذشتہ تین سالوں میں پوری طاقت کے ساتھ تحریک چلائی اور دو سو سے زائد کانفرنسیں اور ریلیاں منعقد کیں۔ جمعیۃ علماء کے اقدام کے بعد دیگر تنظیمیں بھی اپنی اپنی سطح پر حرکت عمل میں آئیں۔ آج اس کا نتیجہ اور فائدہ عیاں ہے، ایک طرف تو اسلام کی شبیہ بگاڑنے کی مہم کو روک لگی دوسری طرف دہشت گردی کے سلسلے میں مذہب اسلام کے حوالے سے دارالعلوم دیوبند کے فتوے کے بعد واضح نظریہ اتفاق رائے کے ساتھ منظور کر لیا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردی کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء ہند اس پر سختی سے کاربند ہے اور دہشت گردی کے خلاف ذہن سازی کا پروگرام جاری رکھے گی۔ تاہم جمعیۃ علماء ہند نے شدت سے یہ نوٹ کیا ہے کہ دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوانوں کو مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مسلم نوجوانوں کی مسلسل گرفتاریوں اور بغیر مقدمہ چلائے نظر بندی پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کے تئیں تفتیشی ایجنسیوں کے اس رویے کو نہ صرف ظالمانہ بلکہ جمہوری ملک میں حقوق انسانی کی پامالی کے اس عمل کو شرمناک قرار دیتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ:

۱. مختلف مقدمات میں بے بنیاد پھنسائے گئے ملزمان کے خلاف سماعت کے لیےاور اگر کسی ایک ملزم کے خلاف مختلف ریاستوں میں دہشت گردی کے الزامات میں مقدمات درج ہیں تو ان تمام مقدمات کو یکجا کر کے کسی فاسٹ ٹریک عدالت کو سونپا جائے اور روزانہ کی بنیاد پر مقدمات کی سماعت کو یقینی بنایا جائے۔

۲. غیر قانونی سرگرمیوں کے قانون (یو،اے، پی،اے) پر نظر ثانی کی جائے اوراس کے بے جا استعمال کو فوراروکا جائے، جیسا کہ ممبئی ہائی کورٹ نے اس کی بعض دفعات کو غیر آئینی قرار دیا ہے تا کہ انسانی حقوق کی پامالی، پولیس اورانتظامیہ کی غیر منصفانہ کارروائیوں کا سد باب ہوسکے۔

۳. جن ملزمان کے خلاف قانون کی رو سے ایک مدت گزرنے کے باوجود چارج شیٹ داخل نہیں کی گئی ہے انھیں فوراضمانت پر رہا کیا جائے۔ دہشت گردی کے الزامات میں قید لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھنا انسانی حقوق کی صریح پامالی ہے۔

۴. عدالتوں سے دہشت گردی کے الزامات میں بے گناہ ثابت ہونے پر رہائی پانے والے افراد کی بازآبادکاری و معاوضہ کو بطورحق تسلیم کیا جائے، بازآبادکاری کے ساتھ ان کو کیرکٹر سرٹیفیکیٹ بھی دیا جائے اور معاوضے کی ادائیگی میں بے قصوروں کو گرفتار کر کے زندگی خراب کرنے والے افسران کی تنخواہوں سے بھی رقم وضع کر کے دی جائے۔

۵. ان خاطی پولس افسران کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے جو بے قصور مسلم نوجوانوں کو پھنسانے کا کام کرتے ہیں۔

۶ خفیہ اور تفتیشی ایجنسیوں کو بالکل بے لگام نہ چھوڑا جائے، ان کی جواب دہی اور ذمے داری کو طے کرنا ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی کو یقینی بنانا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

۷ دہشت گردی کے الزام میں گرفتاری بلا تفریق مذہب کسی شخص کو جرم ثابت ہوئے بغیر مجرم قرار دینا غیر منصفانہ فعل ہے، حکومت کو بھی اور میڈیا کو بھی اس سے احتراز کرنا چاہیے، ہمارا پہلے سے یہ موقف ہے کہ نہ ہم کسی قصوروار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ کسی بے قصور کی گرفتاری اوراس کے خلاف الزام تراشی کو برداشت کریں گے۔

ملک کے مفاد اور سلامتی کے حوالے سے یہ اجلاس عام تمام اہل وطن سے اپیل کرتا ہے کہ ملک دشمن طاقتوں کی سرگرمیوں سے پوری طرح خبردار رہیں اور ان کے بھڑکانے، بہکانے یا بہلانے میں ہرگز نہ آئیں۔

## (۴) تحریک شیخ الہند سے متعلق تجویز:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام تحریک آزادی کے معمار، قافلہ حریت کے سپہ سالار اور جمعیۃ علماء ہند کے فکری رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تحریک ریشمی رومال کے سو سال پورے ہونے کے موقع پر خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ان اکابر واسلاف میں سے ہیں، جنھوں نے ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد میں ایسے بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے ملک و قوم کو توقیر وسربلندی ملتی ہے۔تحریک آزادیِ ہند کے حوالے سے تحریک شیخ الہند ایک ایسا عنوان ہے، جس کے تحت آزادی اور برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے روشن ابواب آتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ اوران کے رفقا و تلامذہ نے ان کی رہ نمائی و قیادت میں ملک وقوم کی خدمت، تحریک آزادی اور برطانوی سامراج کو ملک سے نکال باہر کرنے میں جو عظیم قربانی دی ہے، وہ تحریک آزادیِ ہند کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس کے ذکر کے بغیر آزادی ہند کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔افسوس ناک بات ہے کہ تحریک آزادی کی تاریخ نگاری میں حضرت شیخ الہندؒ اوران کے رفقا اور تحریک شیخ الہندؒ کو مسلسل نظر انداز کیا جارہا ہے۔اس بے اعتنائی اور بزرگوں کی قربانیوں سے عصبیت کی بنیاد پر صرف نظر کرنے کا یہ غلط نتیجہ برآمد ہورہا ہے کہ ہماری نئی نسل کو اس کا علم ہی نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کون تھے اوران کی تحریک نے ملک وملت کے وقار و معیار کو بلند کرنے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔اگر ہماری نسل کو اپنی تاریخی بنیادوں سے محروم کردیا جائے، تووہ فکروعمل کی عمارت کی تعمیر کیسے کر پائے گی۔اب تو یہ حال ہوتا جارہا ہے کہ بڑے اور پرانی نسل کے لوگ بھی اپنی تاریخ اور بزرگوں کے کارنامے فراموش کرتے جارہے ہیں۔اگر یہ سلسلہ دراز ہوگا تو ہم تاریخ اور ماضی کی رہ نمائی سے کٹ کے رہ جائیں گے۔اس کے مدنظر یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ:

۱. آنے والی نسلوں کے لیے اپنے اکابر واسلاف کے کارناموں سے وابستگی کا سامان بہم کیا جائے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور ان کی تحریک سے روشناس کرانے کی غرض سے ملک بھر میں مرکزی مقامات پر پروگرام اور سیمینار کیے جائیں۔اس سے ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگی کہ باعزت زندگی کی نیک خواہش اوراس کے لیے جدوجہد کی تاریخ راہ عمل کے تعین میں کس

حد تک رہ نمائی کرتی ہے اور ماضی کے آئینے میں حال کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔

۲. جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام احمد آباد گجرات سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ صوبائی، ضلعی اور مقامی جمعیتیں بھی حسب حال وضرورت، حضرت شیخ الہند: اور ان کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کا اہتمام کریں اور ہر ممکن طریقے کو عمل میں لاکر تحریک شیخ الہندؒ سے ملک کو روشناس کرانے کی کوشش کریں۔

۳. حضرت شیخ الہند کے نام کسی یونیورسٹی کو منسوب کیا جائے

۴. نصاب کی کتابوں میں حضرت شیخ الہند کا تذکرہ شامل کیا جائے۔

**(۵) قومی یکجہتی سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام اس بات پر تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی ہر شعبۂ حیات میں سرایت کرتی جارہی ہے، اس کی ایک اہم وجہ قومی یک جہتی کے تصور کا کمزور ہونا بھی ہے۔ ہندستان جہاں مختلف فرقے اور مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، وہاں قومی یک جہتی کے فروغ اور اس سے تمام فرقوں اور مذاہب والوں کو جوڑنا وقت کا بڑا تقاضا ہے۔ مذہب اسلام نے بھی برادران وطن کے ساتھ خوش گوار سماجی تعلقات کے فروغ کے لیے موثر ہدایات دی ہیں، ملک وسماج میں فرقہ وارانہ نفرت کا ماحول برپا نہ ہونے پائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک کے مجموعی مفادات کو مد نظر رکھ کر کام کیا جائے:

۱. جمعیۃ علماء ہند کا ماننا ہے کہ ملک کی اکثریت امن وآشتی، باہمی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں یقین رکھتی ہے، پرامن بقائے باہم اور متحدہ قومیت ہمارے اقدار کی ریڑھ کی ہڈی ہے، یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندستانی عوام حرب وضرب سے بیزار، صلح وآشتی کے جویا اور شیدائی ہیں، البتہ مٹھی بھر افراد اور جماعتیں نفرت پسند اور فتنہ پرور ضرور ہیں، اگرچہ تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہیں مگر خرمن امن کو جلانے کے لیے ایک چنگاری کافی ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ ان سماج دشمن عناصر پر کڑی نظر رکھی جائے۔

۲. جمعیۃ علماء کا اجلاس عام اس امر پر فکر وتشویش کا اظہار کرتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے علاقائیت وصوبائیت کو حد سے زیادہ ابھارنے کی کوشش کی جارہی ہے، مہاراشٹرا، مدھیہ پردیش، آسام جیسے صوبوں میں آئے دن دوسرے صوبوں سے آکر رہنے والوں کے خلاف زیادتیوں کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں، جس سے آئین کی روح اور ملک کا مرکزی کردار مجروح ہورہا ہے۔ قومی مسائل میں بلا امتیاز مذہب وفرقہ تمام ہندستانیوں کا یک جہت اور متحد ہونا ضروری ہے۔

۳. جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام تمام سیاسی رہنماؤں، سول سوسائٹی، سٹیزن گروپ، مذہبی، سماجی وفکری قائدین اور پرنٹ والیکٹرانک میڈیا سے اپیل کرتا ہے کہ ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر مذہب، سماج، ذات اور طبقہ کی بنیاد پر تفریق پیدا کرنے والی فکر کے خلاف متحدہ جد وجہد کریں اور ان عناصر کو ناکام بنادیں جو نفرت کا سودا کرتے ہیں۔

۴. قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے اکیڈمک سطح پر کوشش کی جائے اور ملک وسماج کو توڑنے والے مواد سے نصابی کتابوں کو پاک کیا جائے۔

۵. جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق تمام مذاہب کے ماننے والوں اور طبقات، بالخصوص دلتوں اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ رواداری، مدارات، حسن اخلاق کا برتاؤ کریں اور ان سے اچھے روابط رکھے جائیں۔

۶. جمعیۃ علماء ہند نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد مسلسل اس سمت میں جدوجہد کی ہے اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اس کے اکابر کا کردار روز روشن کی طرح عیاں ہے، ان شاءاللہ جمعیۃ علماء آگے بھی اپنے بزرگوں کے طریقے پر کاربند رہے گی۔

**(۶) ملک کے پسماندہ وناخواندہ علاقوں میں مکاتب کے قیام سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام ملک کے پسماندہ وناخواندہ علاقوں میں دینی مکاتب کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہے۔ دیہی آبادی اور خاص طور سے دور دراز کے علاقوں میں جہالت اور دین وایمان سے بے خبری عام ہے، بہت سے افراد ایسے ہیں جو صحیح کلمہ جانتے نہیں اور عصری تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو دین کی ابتدائی اور اہم بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں ہیں، ان میں شرک وکفر اور بدعات کا جذبہ تیزی سے بڑھ رہا ہے، بلکہ آگے بڑھ کر اس میں کھلے عام شریک ہورہے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال میں جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام پوری ملت اسلامیہ سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ:

۱. ملک کے دینی یا سماجی طور سے پسماندہ علاقوں میں ایسے دینی مکاتب کا قیام عمل میں لایا جائے، جہاں کم از کم ابتدائی بنیادی تعلیمات کا معقول نظم ہو۔

۲. ایسے دینی مکاتب میں کل وقتی تعلیم یا کم از کم صباحی، شبینہ تعلیم کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔

۳. یہ اجلاس عام ملک کے تمام دینی تعلیمی اداروں اور مدارس سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے کل بجٹ کا ۱۰ ؍فیصد دینی مکاتب کے قیام اور ان کو موثر طریقے پر چلانے کے لیے مختص کریں، بالخصوص جماعتی اکائیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم آبادیوں کا جائزہ لے کر زیادہ سے زیادہ مکاتب کے قیام کے لیے متواتر جدوجہد کرتی رہیں۔

**(۷) دینی تعلیمی بورڈ کو فعال بنانے پر تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام موجودہ دینی و تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ضروری سمجھتا ہے کہ جمعیۃ کے ماتحت ''دینی تعلیمی بورڈ'' کو مزید منظم، سرگرم اور اس کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ آج کے ماحول میں جب کہ عصری تعلیم کی طرف قومی رجحان روز افزوں ہے اور ملت کا ایک بڑا طبقہ ابتدائی دینی معلومات سے بھی ناواقف ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ایسے بورڈ کی شدید ضرورت ہے جو تعلیمی معیار اور ضرورتوں کا باریکی سے جائزہ لے کر قوم وملت کی رہنمائی کرسکے۔ اس بورڈ کے تحت درج ذیل کام ہونے چاہئیں:

۱. جو مکاتب اور اسکول ملک کے طول وعرض میں چل رہے ہیں ان کو بورڈ سے باقاعدہ ملحق کرنے کی سعی کی جائے۔

۲. بچوں کی صلاحیت اور معیار کے مطابق مختلف زبانوں میں مزید نصابی کتابیں اور لٹریچر مہیا کرائے جائیں اور ملحق مکاتب اور اداروں کے نصاب میں یکسانیت لائی جائے۔

۳. نیز تعلیم بالغان کے لیے فاصلاتی تعلیمی نظام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مربوط نظام قائم کیا جائے۔

۴. مکاتب اور اسکول کے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ بہتر سے بہتر نتائج سامنے آسکیں۔ یہ اجلاس عام سبھی اراکین جمعیۃ سے اپیل کرتا ہے کہ وہ پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ دینی تعلیمی بورڈ کے نظام کا تعاون کریں اور آئندہ نسلوں کے دین کے تحفظ کیلئے اپنی خدمات پیش کریں۔

**(۸) فتنہ ارتداد عیسائیت و قادیانیت کی روک تھام سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام قادیانی پرچارک، عیسائی مشنریوں و دیگر ارتدادی سرگرمیوں میں مصروف تنظیموں کے ذریعہ غریب اور ان پڑھ مسلمانوں کو مرتد بنانے کی مہم کی مذمت کرتا ہے۔ قادیانی وعیسائی مشنریوں کے ذریعے ملک میں منظّم انداز میں ارتدادی تحریکیں چلائی جارہی ہیں، خاص طور سے مسلم نوجوان ان کے نشانے پر ہیں، کپڑے، کھانے، تعلیم، علاج، ملازمتوں، نقد امداد اور بینک کے قرضوں کے علاوہ مختلف قسم کے اسباب تعیش کا لالچ دے کر ایمان کی خرید وفروخت کے سودے کیے جارہے ہیں، قادیانیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بدامنی کے واقعات بھی روز افزوں ہیں، جمعیۃ علماء ہند اس طرح کے معاملات میں قانون کو ہاتھ میں لینے کے خلاف ہے، تاہم عوام کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ وہ قادیانیوں کی ارتدادی سرگرمیوں سے خبردار رہتے ہوئے ان کے فریب میں نہ آئیں۔ اسی طرح سنگھ کی ارتدادی سرگرمیوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ دنوں یہ بات سامنے آئی کہ کچھ لوگ روحانی سکون حاصل کرنے کے عنوان سے اس سے وابستہ ہوگئے اور کچھ مسلم نوجوان گمراہ ہوکر اس مہم میں شامل ہوگئے، ارتدادی سرگرمیوں کا دائرہ انتہائی وسیع ہے، اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور قرآن سے نفرت اور غلط فہمیاں پھیلانے کے ساتھ دنیا کو سامی رنگ میں رنگنے کے لیے وسیع پیمانے پر مختلف قسم کے پروگرام چلائے جارہے ہیں۔ اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملہ کس قدر قابل تشویش ہے۔ سیدھے سادے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے بعض چینلوں پر بائبل کو قرآن کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ اجلاس عام تمام اسلامی تعلیمی اداروں، مدارس اور دعوتی تنظیموں سے اپیل کرتا ہے کہ:

۱. ارتدادی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متأثرہ علاقوں میں علما اور مبلغین کا تقرر نیز تربیتی کیمپ اور اجلاس عام کا اہتمام کریں تاکہ غریب عوام کے دین وایمان کی حفاظت کو یقینی بنایا جاسکے، اس سلسلے میں قادیانیوں کے سماجی بائیکاٹ کو روبعمل لایا جاسکتا ہے۔

۲. ارتدادی سرگرمیوں کا مقابلہ اور سدباب کے لیے وسائل کی فراہمی کے ساتھ دین وشریعت سے روشناس کرانے کی مؤثر جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔

۳. یہ اجلاس عام ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے ائمۂ مساجد اور علمائے کرام لوگوں کو ارتدادی سرگرمیوں کی زد میں آنے سے بچانے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اجتماعی طور سے اس منہج پر کام کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں گذارش ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت، ردعیسائیت کمیٹی اور

جمعیۃ علماء ہند سے مدد لے کران فتنوں کی سرکوبی کے لیے جدوجہد کو اپنا شرعی فریضہ تصور کریں۔

۴. ریاستوں کے وقف بورڈوں میں بھی اگر کوئی قادیانی ہے تو اسے الگ کرنے کیے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔

۵. زندگی کا فن سکھانے اور کامیابی، صحت اور روحانیت حاصل کرنے کے عنوان سے ملک میں مختلف تحریکات چل رہی ہیں، بعض تو صوفیانہ اور اسلامی اصطلاحات کا مختلف مواقع پر استعمال کرتے ہیں، جس سے بہت سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور ناکافی علم دین ہونے کے سبب غلط کو صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں۔اس طرح کے فتنے سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ مستند صاحب علم وبصیرت علما کے رابطے میں رہا جائے۔

## (۹) اسلامی تشخص کے تحفظ اور معاشرتی اصلاح سے متعلق تجویز:

مغربی تہذیب کے غلبے اور جاہلی رسوم وروایات کے فروغ کی وجہ سے مسلم معاشرہ بھی پوری طرح بگاڑ کا شکار ہو گیا ہے۔معاملات، تجارت، شادی بیاہ ہر چیز میں مذہبی بے راہ روی عام ہے، جوا، سٹہ، لاٹری، سینما بینی، فحش ٹی وی جہیز، شراب نوشی، بے پردگی اور رحم مادر میں قتل نفس نے خطرناک شکل اختیار کرلی ہے، بے حیائی بدکاری تیزی سے بڑھ رہی ہے، فحش گانوں کا بجانا اور علی الاعلان سننا سنانا، موبائل کے ذریعے گندے اور غیر اخلاقی مواد کی اشاعت نے حیا وشرافت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ان برائیوں اور بے حیائیوں کے بارے میں شریعت میں جو وعیدیں آئی ہیں ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے اور درج ذیل طریقہ اختیار کر کے اسلامی تشخص اور معاشرہ کی اصلاح میں علماء، ائمہ اور ذمہ داران حضرات اپنا مذہبی فریضہ ادا کریں:

۱. ہر بستی اور محلّہ میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کر کے عوام کو دین کی طرف متوجہ کیا جائے، نماز، روزہ کے علاوہ آپس میں سلام کا رواج، صورت وسیرت کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی ترغیب، توحید ورسالت، آخرت وغیرہ بنیادی عقائد عام کریں اور گھروں میں دینی ماحول قائم کیا جائے، نوجوانوں اور ان کے والدین کو سمجھایا جائے کہ شادی میں جہیز پر نظر رکھنا شریعت اور اعلی انسانی قدروں کے خلاف ہے۔موجودہ ذرائع ابلاغ مثلاً ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ فحاشی، بے حیائی، جھوٹ فریب جیسے گناہوں کی نشر واشاعت اور ترغیب کا ذریعہ بن گئے ہیں، نوجوان نسلوں میں خاص طور سے اس کے خلاف مہم چلائی جائے۔

۲. یہ اجلاس عام خاص طور سے رحم مادر میں دختر کشی، جہیز کے لیے قتل او ربات بات پر طلاق کے بڑھتے ہوئے واقعات پر شدید تشویش ظاہر کرتا ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان سماجی لعنتوں سے ہر حال میں خود کو دور رکھیں اور جو لوگ ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں ان سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

۳. جہاں اصلاحی کمیٹیاں قائم ہیں ان کی میٹنگ باقاعدگی سے ہر ماہ ضرور کی جائے اور کمیٹیوں کی سرگرمیوں پر مشتمل رپورٹ پابندی سے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کو ارسال کی جائیں۔

۴. جمعیۃ علماء ہند کی تحریک پر عشرہ پروگراموں کو پوری جدوجہد سے ملی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیا جائے، عشرہ پروگراموں، انفرادی ملاقات، میٹنگوں، لٹریچر اور دیگر طریقے اختیار کر کے خصوصیت سے سنیما بینی، ٹیلی ویژن کے فحش پروگراموں اور دوسری خرافات سے بچنے اور بچانے کی تلقین کی جائے، مردوں کو داڑھی رکھنے، شرعی لباس اور اسلامی وضع قطع کے مطابق زندگی گذارنے کی ترغیب دی جائے، انسداد فحاشی مہم کے لیے شرعی واسلامی طریقوں پر زور دیا جائے۔

۵. شادی بیاہ ختنہ وغیرہ امور میں اسراف بے جا اور جہیز وتلک کی ناجائز رسموں کے خلاف تحریک چلائی جائے۔

ان امور کو استقلال اور اولوالعزمی کے ساتھ چلانے کیلئے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو جوڑنے کی کوشش کی جائے، منشیات کا استعمال نوجوانوں میں تیزی کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے جس کے مفاسد بھی عیاں ہیں، مسلم معاشرہ میں بہت سی ایسی غلط رسمیں پھیلتی جارہی ہیں جن کی وجہ سے دینی بے راہ روی کے علاوہ ہماری معاشی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی بدتر ہوگئی ہے، مختلف مواقع پر عدالتوں کے فیصلے بھی اسلامی احکام وتعلیمات کے منافی آتے ہیں، مغربی تہذیب اور عیش کوشی کے بڑھتے رجحانات سے اسلامی تشخص ختم ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پوری مستعدی اور استقامت کے ساتھ اصلاح معاشرہ، امارت شرعیہ کے نظام اور جمعیۃ علماء ہند کے تعمیری پروگرام کے کاموں کو ملی فریضہ سمجھ کر انجام دیا جائے۔

## (۱۰) کشمیری عوام کے ساتھ انصاف اور جمہوری و دستوری حقوق کی بحالی سے متعلق تجویز:

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام کشمیری عوام کے ساتھ مسلسل ناانصافی اور فوجی مداخلت پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے، بے قصور شہریوں کی بلا جواز گرفتاری، بغیر عدالتی چارہ جوئی کے طویل قید، فرضی تصادم کے مسلسل واقعات اور آرمڈ فورسیز اسپیشل پاور ایکٹ اور پبلک سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین کے بے دریغ اور غیر محتاط استعمال سے وہاں کے شہری خوف وہراس کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اس اجلاس کا ماننا ہے کہ طاقت کا بیجا استعمال کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں بلکہ اس سے معاملات مزید الجھیں گے اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو شہ ملے گی۔ امن و امان کا قیام اور انصاف دونوں لازم وملزوم ہیں، اس لیے کشمیر میں دیرپا امن وامان کے قیام کے لیے لازم ہے کہ مظلوموں کو انصاف مہیا کرانے کی حکومت فوری تدابیر اختیار کرے۔ نیز حکومت کو یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کشمیریوں کے ساتھ کی جانے والی مسلسل وعدہ خلافیوں کی وجہ سے حالات بگڑتے ہیں۔ اس لیے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے حکومت کو سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی۔ یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور جغرافیائی وحدت پر سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

١. وہ کشمیر میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے کشمیری عوام کے دیرینہ مطالبات دستور کے مطابق تسلیم کرے اور جملہ جمہوری حقوق کی بحالی کا اعلان کرے۔ اور مسئلہ کے پائیدار حل کے لیے مرکزی کمیٹی کی سفارشات پر عمل در آمد کرے۔ پبلک سیفٹی ایکٹ ریاستی حکومت کا عائد کردہ ہے، اس لیے ہمارا ریاستی حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ اس کو ہٹانے کے لیے فوراً اقدام کرے۔
٢. ریاست کی ترقی واستحکام کے لیے خصوصی پیکج کے وعدوں پر عمل درآمد کرے اور ریاست کے بے گھر کئے گئے لوگوں کی گھر واپسی اور بازآبادکاری کے لیے کارگر انتظامات کرے۔
٣. آبادی والے علاقوں سے مسلح افواج کے انخلاء کا حکم جاری کرے۔
٤. آرمڈ فورسیز اسپیشل پاور ایکٹ اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے نفاذ کو ختم کرے۔
٥. انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور فرضی تصادم کے مسلسل واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرا کر مجرموں کو سزا دی جائے اور مظلوموں کے ساتھ انصاف کیا جائے، نیز مہلوکین ومتاثرین کو منصفانہ معاوضہ دیا جائے اور گمشدہ اور لاپتہ ہزاروں نوجوانوں کی تلاش او ربازیابی کے لیے کمیشن بنایا جائے۔ ہم کشمیری عوام کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بحیثیت ایک شہری کے ہم ان کے غم اور جائز مطالبات میں ان کے ساتھ شریک اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ہم ان کے مفادات کو عام ہندستانی مسلمانوں کے مفادات سے علیحدہ نہیں سمجھتے ہیں۔

## (١١) مسئلہ فلسطین اور القدس کی صورت حال پر تجویز:

عرب فلسطینیوں کی مظلومیت ومقہوریت، امریکی وبرطانوی سازش اور اسرائیل کے ظلم وجارحیت اور عربوں کی زمین پر قبضہ کرنے کی ناپاک خواہشات کی علامت بن چکی ہے،، اس وقت خطے میں حالات بہت دھماکہ خیز ہیں، مسجد اقصیٰ کا وجود خطرے میں ہے، اسرائیل اپنے ناپاک مقصد کے تحت اس کو ختم کردینے کے درپے ہے، آئے دن ایسے اقدامات کرتا رہتا ہے، جن سے مسجد اقصیٰ کے وجود کو لاحق خطرات میں اضافہ ہورہا ہے۔ بغیر مقدمہ چلائے بڑی تعداد میں فلسطینیوں کو جیلوں میں قید کر رکھا ہے، قیدی اذیت ناک زندگی گذار رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی تنقید کے باوجود مغربی کنارہ پر اسرائیل کی طرف سے غیر قانونی بستیوں کی تعمیر جاری ہے۔ ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ علماء ہند کے اس اجلاس عام کا مطالبہ ہے کہ:

١. امریکہ، روس اور عالمی برادری ایک خودمختار آزاد فلسطینی ریاست کے قیام میں اپنے وعدے کے مطابق تعاون کریں، پناہ گزیں فلسطینی عوام کی بازآبادکاری اور وطن واپسی کے لیے راہ ہموار کی جائے، عرب مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل خالی کردے۔
٢. فلسطینی عوام کے لیے زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی راہ ہموار کی جائے۔
٣. غزہ میں بھیانک جنگی جرائم کے ارتکاب پر اسرائیل پر بین الاقوامی جنگی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ مسجد اقصیٰ کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے، بیت المقدس سے اسرائیل اپنا غاصبانہ قبضہ فوراً ہٹائے اور اوسلو معاہدہ کے مطابق القدس شہر کا کنٹرول فلسطینیوں کے حوالے کیا جائے۔
٤. اقوام متحدہ میں فلسطین کی مستقل رکنیت کی منظوری دلانے میں عالمی برادری تعاون کرے۔ یونیسکو میں فلسطینی ریاست کی مستقل رکنیت کی منظوری صحیح سمت میں ایک اچھا قدم ہے۔ اس سلسلے میں ہندستانی

حکومت کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

۵. جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مشرق وسطی خاص طور پر فلسطین کے تعلق سے ہندستان کی طے شدہ اور تاریخی خارجہ پالیسی سے موجودہ مرکزی حکومت کے انحراف کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے اور یو پی اے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہندستان کی دیرینہ پالیسی پر پھر سے عمل درآمد شروع کرے جس کے تحت ہندستان نے ہمیشہ فلسطینیوں کی جدوجہد اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی ہر فورم پر کھل کر حمایت کی ہے۔ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ کانگریس کی قیادت والی مرکزی حکومت کی اسرائیل نواز پالیسی سے فلسطین کاز کو سخت نقصان پہنچا ہے، حالاں کہ ہندستان پچاس برسوں تک فلسطینی کاز کے لیے ہر فورم پر جدوجہد کرتا رہا ہے۔ یہ اجلاس ہنداسرائیل دوستی کو امن عالم کے لیے سنگین خطرہ تصور کرتا ہے، حالیہ دنوں میں مرکزی وزراء کے اسرائیل دوروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ہر سطح پر رشتے مستحکم ہورہے ہیں حالاں کہ حکومت ہند بھی یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسرائیل آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی راہ میں نہ صرف مسلسل رخنہ اندازی کررہا ہے بلکہ فلسطینیوں کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والوں پر بدترین مظالم کا ارتکاب بھی کررہا ہے۔

٦. یہ اجلاس مرکز کی یو پی اے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کروڑوں انصاف پسند انسانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اسرائیل کے ساتھ تعلقات اور دوستی کی پالیسی پر فوراً نظر ثانی کرے، ساتھ ہی یہ اجلاس مرکزی حکومت کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر اس نے عوام کے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے مشرق وسطی میں یہی روش جاری رکھی تو اسے ہندستان میں سیاسی اور انتخابی نقصانات کا ہر حال میں سامنا کرنے پڑے گا۔

**(۱۲) عالم اسلام سے متعلق تجویز :**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام عالم اسلام خاص طور سے شام، لیبیا، تیونس، مصر، فلسطین، عراق اور افغانستان کی صورت حال پر سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ اس وقت پورا عالم اسلام امریکہ، صیہونی عناصر اور ان کے حلیفوں کی چیرہ دستیوں کی زد میں ہے، دہشت گردی کے خاتمہ، جمہوریت، آزادی اور خطرناک وتباہ کن اسلحہ سے دنیا کو پاک کرنے کے نام پر امریکہ کی قیادت میں جو دہشت گردی ہورہی ہے اس نے پوری دنیا کے امن وقانون اور خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک کے اقتدار اعلیٰ کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ عراق کو خطرناک کیمیائی اسلحہ ہونے کے بہانے سے تباہ کردیا گیا، امریکی فوج عراق سے جاچکی ہے؛ لیکن امریکہ نے جو وہاں بدترین حالات پیدا کردیے ہیں، اس سے عراقی عوام ابھی تک نہیں نکل سکے ہیں۔ بم دھماکے، خودکش حملے جاری ہیں۔ شہریوں کی زندگی غیر محفوظ ہوکر رہ گئی ہے۔ افغانستان کے حالات بھی اس نہج پر نہیں ہیں کہ وہاں مطلوبہ ترقی کا عمل شروع ہوجائے اور امن قائم ہوجائے۔ امریکہ اور اس کے حلیفوں کی فوجیں افغانستان میں اب بھی موجود ہیں۔ مصر اور لیبیا میں اقتدار کی تبدیلی تو ہوگئی ہے، لیکن امن وقانون کے قیام کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہیں، شام کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری ہے، تیونس میں عوامی مزاحمت سے اقتدار میں تبدیلی آچکی ہے، کہیں انتخاب کا عمل پورا ہوچکا ہے اور کہیں شروع ہونے والا ہے۔ اس درمیان امریکی فوج میں مسلمانوں کے خلاف برسوں سے جاری نفرت کی تعلیم اور ہیروشیما ناگاساکی کے طرز پر مقامات مقدسہ مکہ و مدینہ کو تباہ کرنے کے شرانگیز ارادوں کے انکشاف نے پوری دنیا خاص طور سے عالم اسلام کو غم وغصہ میں مبتلا کردیا ہے۔ جمعیۃ علماء کا یہ اجلاس عام امریکی جنرل کی اس سازش کو انتہائی نفرت انگیز اور دل دہلا دینے والی قرار دیتا ہے اور عالم اسلام کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اپیل کرتا ہے کہ:

۱. عراق میں سرگرم مختلف گروپوں کو اپنے ملک اور عوام کے مفاد میں متحد ہوکر ایثار وقربانی سے کام لیتے ہوئے حکمت عملی تیار کرنا چاہیے۔

۲. خون خرابے کا سلسلہ صہیونی امریکی کاز کو ہی تقویت دیتا ہے، اس لیے اسے روکنے کے لیے ان ممالک کے علما اور بااثر افراد کو اپنا رول ادا کرنا چاہیے۔

۳. عالمی برادری؛ خصوصا ترقی پذیر ممالک اور جو ناوابستہ تحریک سے جڑے ہوئے ہیں اور وہ تمام امن پسند ممالک، جو امن وترقی کے خواہاں ہیں، افغانستان کے عوام کی مرضی کے مطابق جمہوری حکومت کے قیام میں تعاون کریں اور امریکہ کو اپنا تسلط ختم کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالیں۔

۴. مسلم ممالک کے حکمرانوں کو بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات میں اس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ عوام کی جائز خواہشوں اور امنگوں پر توجہ دیتے ہوئے ملک کے وسائل میں عوام کی حصے داری کے تعین

میں جمہوری طرزِ عمل اپنایا جائے۔ اسی کے ساتھ تبدیلی کے لیے سرگرم جماعتوں کے لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ملک کو انارکی کی طرف جانے اور غیر ملکی طاقتوں؛ خصوصاً صہیونی اور امریکہ کی غلط مداخلت سے اس کو بچانے کی کوشش کریں۔ امن کے ساتھ ہی ترقی و تبدیلی ملک و عوام کے مفاد میں ہوتی ہے۔

۵. حکمراں طبقہ امریکی اور صیہونی طاقتوں کی سازشوں سے ہوشیار رہیں اور ان کے ایجنٹوں اور دلالوں پر کڑی نگاہ رکھیں۔

۶. جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انصاف کا ساتھ دیتے ہوئے مظلوموں کی حمایت کی اپنی دیرینہ پالیسی پر عمل کرے اور افغانستان سمیت عالم اسلام و دیگر ممالک میں امریکی مداخلت کی مخالفت میں اپنا رول ادا کرے۔

## (۱۳) اوقاف کے تحفظ اور مساجد کی واگزاری سے متعلق تجویز:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام ہندستان میں اوقاف کی زبوں حالی و بربادی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے، اوقاف کی جائیدادوں میں ناجائز تصرف اور غیر قانونی خرد برد کا سلسلہ جاری ہے۔ اوقاف کی جائیدادیں اور ان سے حاصل آمدنی حکومت اور مقامی انتظامیہ سمیت زمینی دلالوں، بے ایمان عناصر کے ناجائز قبضوں اور تسلط کی وجہ سے واقف کے منشاء کے مطابق استعمال نہیں ہو پا رہی ہیں، قف بورڈوں کے بدعنوان عملہ کی طرف سے بھی موقوفہ جائدادوں کو اونے پونے داموں میں فروخت کردینے کا سلسلہ جاری ہے، ابھی حال ہی میں ایک بڑی کمپنی کو وسیع موقوفہ اراضی بیچ دی گئی، ہریانہ کے کرنال میں واقع قبرستان کی فروخت، کرناٹک میں موقوفہ اراضی و جائداد میں گھپلے کا ایسا بھیانک معاملہ سامنے آیا ہے، جس نے سب کو تکلیف دہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ جب پہرے دار اور نگراں ہی ڈاکہ ڈالنے لگیں تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملہ کتنا سنگین ہے۔ ملک میں مسلم اوقاف کے تحفظ اور ان سے حاصل آمدنیوں کا جائز اور درست مصرف میں خرچ ہمیشہ سے ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ مذہبی اور سماجی نقطۂ نظر سے بھی اس کی خاص اہمیت ہے، اسی بناء پر جمعیۃ علماء ہند نے ہمیشہ اس مسئلہ کو اپنے خصوصی ایجنڈے میں رکھا اور تحفظ اوقاف کے لیے برابر کوشاں رہی۔ وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء نافذ ہونے کے باوجود ان حالات سے نپٹنا ممکن نہیں ہو رہا ہے اور اس ایکٹ کے ذریعے اوقاف کا تحفظ نہیں ہو پا رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء کا یہ وقف قانون مسلمانوں کے حقوق سے متعلق دیگر قوانین کی طرح تعصب کا شکار اور افسر شاہی کی نذر ہوگیا اور اس کی حیثیت بے سود کاغذی کارروائی سے زیادہ نہ ہوسکی، جس کی وجہ سے وقف جائیدادوں پر نہ صرف ناجائز قابضین کا قبضہ بحالہ باقی ہے، بلکہ اوقاف میں یہ تصرف روز افزوں ہے۔ اوقاف کی طرح مساجد کی واگزاری کا مسئلہ بھی اہم ہے، ملک میں حتیٰ کہ ملک کی راجدھانی دہلی میں اور ریاستی راجدھانیوں میں بھی بہت سی مساجد پر سرکاروں اور عوام کا ناجائز قبضہ ہے، ان کو واگزار کرا کے نماز کے لیے راہ ہموار کرنا ایک بڑی ضرورت ہے۔ ان مساجد میں نماز کے علاوہ سب کچھ جائز ہے، اگر اجازت نہیں ہے تو صرف نماز کی، اے ایس آئی (محکمہ اثار قدیمہ) کا رویہ ایسا ہے جیسا کہ کسی ملک پر حملہ آوروں کا ہوتا ہے، جو وہاں کی ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مطالبہ کرتا ہے کہ:

۱. وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء میں کے رحمٰن خان کی سربراہی میں بنی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات، تجاویز اور مسلم پرسنل لاء بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے مطالبے کے مطابق ضروری وضاحت ترمیم و اضافہ کر کے اس کا ایماندارنہ نفاذ کیا جائے، تاکہ اوقاف سے حاصل اربوں روپے کی آمدنی کا صحیح نظم ہوسکے اور واقفین کی نیتوں کے مطابق اس آمدنی کے مستحقین اس سے استفادہ کرسکیں۔

۲. ملک کے تمام صوبوں میں وقف جائیدادوں کو کرایے کے قانون سے مستثنیٰ کیا جائے اور اس استثناء کو افسر شاہی کے اختیار پر موقوف نہ کیا جائے۔

۳. وقف جائیدادوں کو پبلک پراپرٹی ایکٹ کے طرز پر خالی کرانے کے لیے وقف ایکٹ میں مناسب ترمیم کی جائے۔

۴. مسلم اوقاف کے عملی نظام کو بھی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے طرز پر قائم کیا جائے تاکہ اس نظام کار کو صحیح سمت دی جاسکے۔

۵. موقوفہ املاک سے سرکاری، غیر سرکاری ناجائز قبضہ ختم کیے جائیں۔

۶. اوقاف کے تحفظ کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں، وقف بورڈ کی تشکیل میں موقر اور اہم ملک گیر تنظیموں سے بھی رائے لی جائے بلکہ ان کے نمائندوں کو بااختیار حیثیت دے کر بورڈ میں شامل کیا جائے۔

۷. مساجد کو سرکاری قبضوں سے واگزار کرا کے مسلمانوں کو پانچوں وقت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے، نئی مساجد کی تعمیر و پرانی مساجد کی مرمت و اضافہ وغیرہ پر عائد اس قسم کی تمام پابندیوں کو بھی فوری

طور سے ہٹایا جائے، اور جن مساجد پر ناجائز قبضہ ہے، اسے بھی ختم کر کے وقف بورڈ کے حوالے کر دیا جائے تا کہ عبادت کے مقصد کی تکمیل کے مدنظر ان میں نماز ہو سکے، چاہے وہ عام مسجد ہو یا آثار قدیمہ کے تحت کی مساجد، کسی میں بھی نماز سے روکنا مذہبی آزادی، بنیادی حقوق کی خلاف ورزی اور مداخلت فی الدین اور مسلمانوں کو مذہب سے متعلق حقوق سے محروم کرنے کا عمل ہے۔

**(۱۴) تنظیمی استحکام کے لیے دستور میں موجود تعمیری پروگرام سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام جمعیۃ کے کاموں کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تنظیمی استحکام کو از حد ضروری اور انتہائی قابل توجہ سمجھتا ہے اور جمعیۃ علماء ہند کے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کے استحکام کی ضرورت اور اہمیت کی جانب اراکین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، واضح ہو کہ کسی بھی جماعت کے اغراض و مقاصد کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں اگر اس کا تنظیمی ڈھانچہ مضبوط اور منظم نہیں ہے تو وہ کبھی بھی اپنے عزائم اور مقاصد کو روبہ عمل نہیں لاسکتی ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے تنظیمی ڈھانچہ کے استحکام کے لیے جمعیۃ علماء کے دستور اساسی میں مذکور تعمیری واصلاحی پروگرام پر تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ عمل درآمد کی ضرورت ہے، اس کے بغیر نہ تو جماعتی ذہن سازی ہوسکتی ہے اور نہ ہی جماعتی اثر ورسوخ میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے، اسی لیے جمعیۃ علماء کے دستور اساسی میں ریاستی، ضلعی، شہری اور مقامی اکائیوں کو اصلاحی وتعمیری جدوجہد کے پروگرام پر عمل درآمد کیلئے واضح ہدایات دی گئی ہیں، لہذا جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنے تمام مقامی، شہری، ضلعی وریاستی جمعیتوں کے لیے طے کرتا ہے کہ:

۱. وہ دستور اساسی میں مقرر فرائض کو انجام دینے کے لیے موجودہ ٹرم میں تعمیری جدوجہد کا کوئی منصوبہ بنائیں اور تقسیم کار کے ضروری اصول کے مطابق اس پر عمل درآمد کے نقشے بنائیں، نیز اپنی اس کارروائی کی نقل بالا دست جمعیتوں کو روانہ کر کے ان کا تعاون حاصل کریں۔

۲. آئندہ ٹرم میں حسب دستور اساسی ایسے لوگوں کو عہدے کے لائق سمجھیں جو تعمیری پروگرام کے کسی حصے میں سرگرم رہے ہوں۔

۳. سال میں ایک ''سیرت کانفرنس'' اور کارکنوں کی میٹنگ بھی ضرور کریں۔

۴. یہ اجلاس تمام مسلمانان ہند سے اپیل کرتا ہے کہ اپنی اقتصادی ترقی، معاشرتی اصلاح، تعلیمی سرگرمی، دینی زندگی اور معاشی بہبود کے لیے ہر جگہ جمعیۃ علماء کی شاخیں قائم کریں اور جماعتی کارکنوں سے بھرپور تعاون کریں۔

۵. یہ اجلاس عام انتہائی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ جماعت سے وابستہ تمام عہدیداران، کارکنان اور بہی خواہان جماعت کے تنظیمی استحکام کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

**(۱۵) تربیتی کیمپ کے انعقاد سے متعلق تجویز:**

جمعیہ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنی شاخوں اور اکائیوں کو اس بات کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہے کہ جمعیۃ علماء کے اغراض وطریقہ کار کو سمجھنے کے لیے علاقہ کے جملہ کارکنوں کا دوروزہ یا سہ روزہ اجلاس طلب کر کے مذاکراتی وتربیتی کیمپ منعقد کیا جائے، دستور میں مذکور تعمیری پروگرام اور اس پر عمل درآمد کے طریقوں کو واضح کیا جائے، عملی دشواریوں کا حل پیش کیا جائے، تا کہ عزم وحوصلے کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو اور ملک وقوم کی ترقی میں جمعیۃ علماء کے کارکنان بھرپور حصہ لے سکیں۔ اب سے دو سال قبل ملک کو پانچ زون میں تقسیم کر کے تربیتی پروگرام منعقد ہوئے تھے جس کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا تھا اور جماعتی کارکنان میں اجتماعی قوت و توانائی کے ساتھ کام کرنے کی راہ ہموار ہوئی تھی۔

**(۱۶) آسام میں مسلمانوں کی حق شہریت سے متعلق تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام آسام میں حق شہریت سے متعلق صورت حال پر تشویش کا اظہار کرتا ہے، آسام میں شہریت کا مسئلہ ایک منصوبے کے تحت پیدا کر کے وہاں رہنے والے مسلمانوں کو حق رائے دہی سے محروم اور وطن سے بے وطن کرنے کی کوششیں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں، جمعیۃ علماء ہند روز اول سے ہی شہریوں کو وطن سے نکالنے اور محروم کرنے کی سخت مذمت کرتی رہی ہے، جمعیۃ کے سابق صدر مولانا سید اسعد مدنیؒ کی بے بس آسامی مسلمانوں کے لیے ناقابل فراموش قربانی کی تاریخ شاہد ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام واضح طور سے کہہ دینا چاہتا ہے کہ اس کو کسی غیر ملکی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، تاہم یہ اجلاس مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو خبردار کر دینا چاہتا ہے کہ شہریوں کو زبان یا مذہب سے جڑے ہونے کی وجہ سے بے وطن کرنے کی کوشش ہندستان کے مسلمان اور انصاف پسند غیر مسلم کسی طرح برداشت نہیں کریں گے،

حال میں ساڑھے چار لاکھ سے زائد شہریوں کو ڈی یعنی ڈاؤٹ فل ووٹر کہا گیا، جو ووٹ دینے سے محروم ہیں، حالاں کہ ان کے نام ووٹر لسٹ میں موجود ہیں، مگر مردم شماری مہم کے ناخواندہ یا نیم خواندہ کارکنان کے کہنے پر ان کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا کسی شہریت کا فیصلہ ایسے افراد کرنے کا حق رکھتے ہیں اور وہ بھی بلا ثبوت، آسام کے مختلف علاقوں میں ایس پی کے ذریعہ غیر ملکی ہونے کا شبہ والا نوٹس عوام کو بھیج کر ہزاروں ہزار لوگوں کو پریشان کیا جارہا ہے۔ شہریت کے فیصلے کا حق واختیار فورس اور پولیس کو نہیں دیا جاسکتا، جب کہ آسام وغیرہ میں شہریوں کی شہریت کے فیصلے کا اختیار عملاً پولیس کو دے دیا گیا ہے، جو غیر قانونی ہے، شہریت کا فیصلہ عدالتوں سے ہونا چاہیے نہ کہ پولس کی مرضی پر اسے چھوڑ دیا جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ ۱۹۸۵ء میں اے جی پی سرکار کے وزیر داخلہ نے تمام پولس اسٹیشن کو ہدایت کی تھی کہ ہر مہینے کم از کم پچاس غیر ملکی شہریوں کو نشان زد کریں، بصورت دیگر پولس اسٹیشن کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی، اس ہدایت کے مطابق پولس کو ٹارگیٹ حاصل کرنا تھا، جس کے شکار ہزاروں بے قصور بنگالی ہندو و مسلمان ہوئے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کیا جارہا ہے کہ آزادی سے قبل آسام کی ایک تہائی آبادی بنگلہ زبان بولنے والوں کی تھی، ۱۹۸۵ء میں مرکزی سرکار اور حق شہریت کے خلاف احتجاج کرنے والوں کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ ۲۵/ مارچ ۱۹۷۱ء تک جو لوگ بھی آئے ہیں، وہ ہندستانی شہری ہیں؛ لیکن اس پر عمل نہیں ہورہا ہے۔ یہ تکلیف دہ بات ہے کہ ہائی کورٹ میں ایک پی آئی ایل کے ذریعہ آسام معاہدہ کے تحت سٹیزن شپ ایکٹ ۱۹۵۵ء کی دفعہ ۶-اے اور سٹیزن شپ رولز کی دفعہ ۴-اے کو کالعدم کرانے کی کوشش کی جارہی ہے، جس میں اپیل کی گئی ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بجائے اسے ۱۹۵۱ء کردیا جائے، اگر ایسا ہوتا ہے تو نہ صرف تقریباً ایک کروڑ مسلمان؛ بلکہ تیس پینتیس لاکھ بنگالی ہندو بھی اس سے متاثر ہوں گے اور وہ نہ تو ہندستانی شہری رہ پائیں گے اور نہ ہی بنگلہ دیش آسام معاہدے کے مطابق انھیں قبول کرے گا۔ مزید براں جمعیۃ علما ہند فارنر ایشو کے متعلق اس بات کو بھی واضح کرنا چاہتی ہے دریائے برہم پترا اور اس کی شاخوں کے کٹاؤ کی وجہ سے لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے ہیں۔ ان کی مصیبت سے فائدہ اٹھا کر چند مفاد پرست عناصر نے بنگلہ دیشی دراندازی کا مسئلہ کھڑا کیا۔ ابھی تک تقریباً تین ہزار مربع کلومیٹر سے زیادہ زمین ان ندیوں کے کٹاؤ کی شکار ہوئی اور گذشتہ ۵۵ سالوں میں تیس لاکھ سے زیادہ لوگ بے گھر ہوئے جن میں ۸۰ فیصد غریب مسلمان ہیں۔ اس لیے جمعیۃ علماء کا اجلاس عام حکومت ہند وحکومت آسام سے مطالبہ کرتا ہے کہ:

۱. شرارتی عناصر کے ذریعہ پی ائی ایل کے جواب میں ریاستی حکومت کی جانب سے پیش کردہ حلف نامہ غیر اطمینان بخش ہے، اس کی طرف سے جاری کردہ شواہد اس قدر کمزور ہیں کہ عدالت میں حکومت کی شکست ایک طرح سے طے لگ رہی ہے۔ چوں کہ مذکورہ ایکٹ مرکزی ہے اس لیے حکومت ہند فوری طور سے اٹارنی جنرل یا سالیسیٹر جنرل کو اس کے مضبوط دفاع کی ہدایت دے۔
۲. این آرسی حاصل کرنے کے لیے آسان طریقہ اپنایا جائے تاکہ لوکل پنچایت اور سرکاری دفاتر سے ضروری کاغذات لوگ حاصل کرسکیں
۳. ڈی ووٹرس کے تحت مشکوک شہریوں کا معاملہ جلد از جلد حل کیا جائے اور بلا ثبوت نیم خواندہ کارکنان کے ذریعے مشکوک قرار دیے گئے افراد سے یہ ٹیگ ہٹالیا جائے۔
۴. فارنرز ایکٹ کی دفعہ ۹ کو کالعدم قرار دیا جائے اور اپنی شہریت اور بے گناہی ثابت کرنے کا بھار خود شہریوں پر نہ ڈالا جائے بلکہ اسے الزام عائد کرنے والوں کے ذمے رکھا جائے یہی قانون وانصاف کا تقاضا ہے۔
۵. متعینہ مدت کے اندر ایف ٹی میں دائر مقدمات جلد از جلد فیصل کیے جائیں تاکہ لوگوں کو انصاف مل سکے نیز حکومت لوگوں کو اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے ضروری کاغذات مقامی پنچایت اور سرکاری دفاتر سے بسہولت حاصل کرنے کی جملہ سہولیات مہیا کرائے۔
۶. دریا کے کٹاؤ کو قومی مسئلہ قرار دیا جائے اور ضلع دھیماجی سے دھوبری- بنگلہ دیش کی سرحد تک دریاے برہم پتر کے کناروں پر پتھروں سے پشتہ باندھنے کے لیے ضروری فنڈ مہیا کرے۔
۷. ساحلی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کو زمین کا پٹہ مہیا کی جائے جس کے نہ ہونے سے سرکاری اور بینک کی تمام سہولیات سے یہ لوگ محروم ہیں۔ دریاے برہم پترا کے اوپر بننے والا دھوبری پھول باڑی پل کا کام جلد شروع کیا جائے تاکہ میدرٹاری جیسا افسوسناک حادثہ دوبارہ پیش نہ آئے۔
۸. مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے آسام کے مسلم اکثریتی ضلع دھوبری میں علی گڑھ یونیورسٹی کا کیمپس قائم کیا جائے۔

**(۱۷) امارت شرعیہ ہند کے نظام کے استحکام**

**پر تجویز:**

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لیے امارت شرعیہ کے نظام کو مزید مستحکم کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ ہندوستان میں نظام شرعی کے قیام کی ضرورت اسی وقت سے محسوس ہونے لگی تھی جب یہاں مسلم حکومت کا چراغ گل ہوا تھا، چنانچہ مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ نے اولاً امارت شرعیہ کے قیام کا فتویٰ دیا، جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ اوران کے رفقاء نے طویل جدوجہد فرمائی۔ بعد میں جمعیۃ علماء ہند کے روز قیام سے ہی اس فرض کی ادئیگی کا شدت سے احساس کیا گیا۔ بالاخر جمعیۃ علماء ہند کے مختلف اجلاسہائے عام میں اس کی ضرورت پر زور دیا گیا، چناں چہ جمعیۃ علماء ہند کے بھرپور تعاون سے ۲؍نومبر ۱۹۸۶ء کو دہلی میں ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جس میں تقریباً تین ہزار علماء اور ارباب حل وعقد شریک ہوئے اور مفصل بحث وتمحیص کے بعد کل ہند امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کے تحت ملک کے متعدد صوبوں میں نظام امارت قائم ہوا اور عائلی ومعاشرتی تنازعات کو شریعت کی روشنی مین حل کرنے کے لیے محاکم شرعیہ قائم کئے گئے جو متعدد مقامات پر سرگرم عمل ہیں۔ تاہم عوام وخواص میں اس بات کی ذہن سازی ضروری ہے کہ:

۱. آپسی مقدمات بالخصوص معاشرتی تنازعات کو محاکم شرعیہ کے روبرو پیش کرکے شرعی حکم کو برضا ورغبت قبول کریں اور جن علاقوں میں ابھی تک محاکم شرعیہ قائم نہیں ہوسکے ہیں وہاں امارت شرعیہ کے دستور کی روشنی میں محکمہ شرعیہ ضرور قائم کیے جائیں اور انھیں پر اعتماد بنا کر ان کی سرگرمیاں مسلسل جاری رکھی جائیں اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی محنتیں کی جائیں۔ اس کام کو مربوط اور منظّم کرنے کے لیے موقع بموقع تربیتی کیمپ لگائے جائیں۔
۲. امارت شرعیہ کے مرکزی دفتر میں دینی رہنمائی کیلئے دارالافتاء قائم ہے جس سے حسب ضرورت شرعی مسائل کے سلسلہ میں جواب حاصل کیا جاسکتا ہے۔
۳. اسی طرح ہر ماہ پابندی کے ساتھ رویت ہلال کمیٹی امارت شرعیہ ہند کی میٹنگ ہوتی ہے اور چاند کے بارے میں باقاعدگی کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جماعتی اکائیوں کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے یہاں ضرورت کے موافق رویت ہلال کمیٹیاں قائم کرکے انھیں مرکزی رویت ہلال کمیٹی سے مربوط کریں۔
۴. امارت شرعیہ کے قیام کا ایک اہم مقصد مسلمانوں میں اوامر کی اشاعت اور منکرات ونواہی پر روک ٹوک بھی ہے لہٰذا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اثر میں انفرادی واجتماعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے محنت کرے۔

**(۱۸) خواتین کے حقوق کی ادائیگی سے متعلق تجویز:**

اسلام نے خواتین کو جو بے مثال حقوق عطا کیے ہیں اس کی نظیر دنیا کے کسی قانون میں پیش نہیں کی جاسکتی، عورت کی فطری ساخت اور طبعی مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے ہی اسلام نے عورت پر محدود ذمے داریاں عائد کی ہیں اور اس کے حقوق مردوں پر لازم کیے ہیں، جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ عورت ایک ماں، ایک بہن اور ایک بیوی کی حیثیت سے معاشرے کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس لیے اسلام نے ہر مرحلے پر خواتین کے تحفظ کو اولین حیثیت دی ہے، اسلام نے بچیوں کی اچھی پرورش کرنے پر جنت کی خوش خبری سنائی ہے اور ماں کی خدمت کو جنت کی ضمانت قرار دیا ہے، نیز اس مرد کو سب سے بہتر شخص کہا گیا ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سب سے اچھا معاملہ کرے، اسی طرح اسلام نے متعین طور پر ہر طرح کے متروکہ مال میں عورت کو وراثت کا حق دیا ہے، جو اسلام کا ایک اہم امتیاز ہے۔

مذکورہ ناقابل انکار حقائق کے باوجود جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام محسوس کرتا ہے کہ آج کا مسلم معاشرہ اپنے خواتین کے حقوق کی ادائیگی میں سخت کوتاہی کا مرتکب ہورہا ہے، افسوس ہے کہ آج بچیوں کو بوجھ سمجھا جانے لگا ہے اور ان کی پرورش، پرداخت، اور معقول تعلیم وتربیت میں سخت غفلت برتی جارہی ہے اسی طرح وراثت میں ان کا شرعی حق دینے میں بہت ٹال مٹول کی جاتی ہے نیز ازدواجی زندگی میں بیوی کے ساتھ ظلم وناانصافی حتی کہ طلاق کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے۔

آج کی خواتین دوطرفہ آزمائش میں مبتلا ہیں، ایک طرف مغرب کی طرف سے آنے والا فواحش کا سیلاب ہے جس نے خواتین کی نسوانیت کو داغدار کردیا ہے، دوسری طرف خود اپنے معاشرے کی طرف سے بے حسی اور حق تلفی کی فضا ہے، جس کی وجہ سے بہت سی خواتین خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہیں، اس لیے جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام پوری امت مسلمہ سے اپیل کرتا ہے کہ وہ خواتین کے متعلق اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرکے اس پر عمل پیرا ہوں اور ان کی دینی ودنیوی اصلاح کے بارے

میں فکر مند ہوں تاکہ ان خواتین کی گود میں پلنے والی نسلوں میں دینی وملی شعور پروان چڑھ سکے۔مندرجہ بالا تناظر میں یہ اجلاس عام مطالبہ کرتا ہے:

۱. ملک کے قانون میں عورتوں کو زرعی اراضی میں حق وراثت نہیں ہے جو کہ عورتوں کے ساتھ زبردست ناانصافی ہے اور اسلامی وراثت کے قانون کے منافی ہے۔اس لیے قانون میں فوری ترمیم کی جائے اور عورتوں کو ان کا حق دیا جائے۔

۲. ایک طرف قانون میں ناانصافی ہے، دوسری طرف عملی طور پر مسلم معاشرے میں وراثت کی تقسیم میں عورتوں کو ترکے سے عام طور سے محروم رکھا جاتا ہے جو شرعا ناجائز ہے۔مسلم معاشرے کو اس سلسلے میں پیش قدمی کرنی چاہیے اور اس کے لیے باقاعدہ تحریک شروع کرنی چاہیے تاکہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی اچھی مثال قائم ہو اور پورے ملک کی خواتین کی حالت زار میں سدھار آجائے

۳. خواتین کی تعلیم نہایت اہم مسئلہ ہے اور واضح ہونا چاہیے کہ تعلیم کے بارے میں شریعت میں مرد وعورت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں، البتہ شریعت میں مرد وزن کا اختلاط اور بے پردگی روا نہیں، اس لیے ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم ایک طرف خود ایسے لڑکیوں کے ادارے قائم کریں جہاں باپردہ خواتین بلا ناجائز اختلاط بسہولت تعلیم حاصل کرسکیں۔نیز دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اگر باپردہ خواتین کے خلاف کوئی امتیازی سلوک یا امتناعی قوانین سامنے آئے ان کے خلاف مثبت اور قانونی اقدام فوری طور پر کیا جائے۔

۴. عائلی معاملات میں عورتوں کے ساتھ انصاف کے لیے محاکم شرعیہ کو مزید فعال بنانا چاہیے، نیز ملت میں بیداری کے لیے تحریک کی ضرورت ہے۔

### (۱۹) اقتصادی پالیسی پر تجویز:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غربت پر سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے،قومی پیداوار میں زبردست اضافے کے باوجود اس فائدوں سے ملک کے غریب عوام اور متوسط طبقے محروم ہیں او رمعاشی ترقی کے فائدے،حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے صرف سرمایہ داروں اور امراء کی ایک نہایت قلیل تعداد تک محدود ہیں، یہ بات انتہائی حیرت انگیز بھی ہے اور تشویش ناک بھی کہ کئی سالوں تک معاشی ترقی کے باوجود ملک میں غربت، بے روزگاری اور بھک مری بڑھتی جارہی ہے اور ہیومن ڈیلپ مینٹ انڈیکس میں دنیا کے ممالک میں ہندستان کا مقام گرتا جارہا ہے۔اجلاس کے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت کا سارا زور معاشی ترقی پر ہے، ترقی کے ثمرات کی منصفانہ تقسیم پر کوئی توجہ نہیں ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرے، فلاحی اسکیموں پر خرچ بڑھائے، غربت کے خاتمہ او رغریبوں کی بہبود نیز روزگار پیدا کرنے اور خاص طور پر دیہی روزگار بڑھانے اور زرعی شعبہ میں ترقی کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔

### (۲۰) تجویز تعزیت:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس عام ملک و بیرون ملک کی ان مقتدر اور اہم شخصیات کے سانحہ ارتحال پر رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور مغفرت و بلندی درجات کی دعا کرتا ہے جو گذشتہ اجلاس عام منعقدہ ۳ر نومبر ۲۰۰۹ء سے اب تک داغ مفارقت دے کر راہی آخرت ہوئے ہیں، بالخصوص حضرت مولانا مرغوب الرحمٰنؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا غلام رسول خاموش کارگزار مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا نصیر احمد خاںؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، عالمی تحفظ ختم نبوت کے امیر فاضل دارالعلوم دیوبند شیخ المشائخ خواجہ خان محمد ملتان، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا ابوبکر غازی پوری رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، حاجی محمد عیسیٰ عم محترم مفتی ابوالقاسم نعمانی، اہلیہ مولانا محمد سالم قاسمی دیوبند، علامہ عثمان غنی شیخ الحدیث جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا رئیس احمد مرحوم شیخ الحدیث مظاہر علوم وقف، پروفیسر وصی احمد صدیقی نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، حکیم شمیم احمد سعیدی بانی جامعہ طبیہ دیوبند، اہلیہ مولانا خالد غازیپوری، مولانا مسرت حسین کاظمی سنسارپوری، ڈاکٹر غیور احمد علی گڑھ، ڈاکٹر سید محمد اکبر امبیڈکر نگر، جناب سید محمد شمیم کچھوچھ، قاضی ظفر مسعود فرزند قاضی اطہر مبارکپوری، حافظ محمد انور برادر مولانا حافظ پیر شبیر صاحب صدر جمعیۃ علماء آندھرا پردیش، ڈاکٹر حافظ ولی اللہ، حافظ محمد مصطفیٰ حیدرآباد، مولانا عبدالتواب صاحب گونڈہ، جناب نصیر احمد صاحب گونڈہ، شبو میاں مرادآباد، مولانا عبدالصمد تاراپوری، والدہ محترمہ مفتی احمد دیولا صاحب جمبوسر گجرات، جناب کعبۃ اللہ صاحب گونڈہ اسیر سابرمتی جیل، جناب عبدالحفیظ بھائی ڈاکور، والدہ محترمہ مولانا نیاز احمد فاروقی رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، جناب محمد ہارون صاحب بہنوئی مولانا حکیم الدین قاسمی پڑتاب گڑھ، حفظ الرحمٰن عرف کلن بھائی پڑتاپ گڑھ، جناب محمد مصطفیٰ بنگلور، ہمشیرہ مولانا محمد قاسم

پٹنہ، محمد عاصم شمسی امیر تبلیغی جماعت مراد آباد، ڈاکٹر حافظ نور الاسلام صدیقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، والدہ محترمہ مولانا سعید منی پور، مولانا عبداللطیف قاسمی تیوڑا، قاری غریب نواز تاولی، مولانا حشمت علی ریڈھی تاجپورہ، جناب محمد حسن ایڈوکیٹ سہارنپور، جناب بدرالدین پرتاپ گڑھ، جناب عتیق الرحمٰن پرتاب گڑھ، مفتی محمد یوسف اوتھا میوات، مولانا نثار احمد قاسمی سروٹ، حافظ مقصود صاحب، مولانا محفوظ الرحمٰن مرزاپور پول، بابو محمد اقبال پانڈولی، نور احمد لدھیانوی، حافظ ظریف احمد سیکری، ڈاکٹر محبوب اللہ فتح پور، این احمد باشہ پریمٹ مدراس، ملاجی مقصود دخلہ کھیڑی، سلمٰی خاتون بھنگا شریف، والدہ ماسٹر انیس نجیب آباد، الحاج پیرزادہ نسیم احمد سہارنپور، اہلیہ زوجہ دوست محمد گجرات، قاری مظفر حسین کیلی میرٹھ، صاحبزادہ مولانا عرفان گجرات، حاجی مناظر علی میرٹھ، والدہ قاری محمد عارف قاسمی مظفرنگر، حافظ محمد یعقوب کیلی میرٹھ، ثمینہ پروین ہمشیرہ وصاحبزادہ حاجی وسیم شیروانی پریس دہلی، خسر مولانا طیب مظاہری بہٹ، ہمشیرہ مولانا محمد طاہر مظاہری، داماد حاجی محمد یامین نکر، ہمشیرہ ابومسعود سہرسہ، حافظ محمد فضیل ابن حافظ زبیر عالم مظفرنگر، والدہ مولوی محمد حسن ککرولی، والد مولانا شفیق الرحمٰن بنگلور، پھوپھی عبدالمنان غازی پور، چودھری عبدالرزاق فیروز پور جھرکہ، محترمہ کنیز فاطمہ دہلی، قاری محمد محسن مظفرنگر، ہمشیرہ قاری امیر اعظم میرٹھ، جناب محی الدین ارریہ، اہلیہ ضمیر احمد ایڈیٹر احوال مشرق، صاحبزادہ حاجی محمد یوسف شیخاوٹی راجستھان، ہمشیرہ مولانا محمد شجاعت علی میرٹھ، والدہ قاری رحم علی استاد جمعیۃ چلڈرن ولیج، حفیظ بھائی والد ڈاکٹر جاوید، برادر خورد سلیم چاند کی والدسورت اور حکیم مولانا شبیر احمد بن مولانا حکیم عبدالقدوس ڈروا، پرتاپ گڑھ، ماسٹر طیب صاحب والد مولانا عظیم اللہ صدیقی جمعیۃ علماء ہند، جناب حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی، استاذ دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا عبدالعزیز صاحب حیدرآبادی، جناب مولانا محمود حسن صاحب پٹھڑوی، جناب حضرت مولانا صفی اللہ صاحب مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد، جناب مولانا باقر حسین صاحب مہتمم مدرسہ امدادیہ مرادآباد، اہلیہ محترمہ جناب قاسم صاحب جہاز قطعہ گڈا، والدہ محترمہ جناب حاجی فاروق صاحب احمد آباد گجرات، جناب مفتی محمد طیب صاحب سہارن پوری مجاز حضرت فدائے ملتؒ، جناب قاری دین محمد صاحب میوات، جناب حافظ عقیل الرحمٰن صاحب صاحب زادہ الحاج راؤ فضل الرحمان صاحب رائے پوری، جناب حافظ محمد عباس صاحب تحویل دار سہارن پور، والدہ محترمہ جناب مولانا احمد دیولہ صاحب مسماۃ حواری بہن، ممانی جناب مولانا کلیم الدین صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم مدرسہ قاسم العلوم تیوڑہ، جناب ڈاکٹر انظار صاحب لکھنو، جناب مولانا مختار احمد قاسمی والد محترم جناب مولانا مفتی جناب افتخار احمد قاسمی صدر جمعیۃ علماء کرناٹک، جناب حاجی محمد ہارون صاحب بھیج انڈا بھنڈارو والدہ محترمہ جناب کریم خان صاحب پرتاپ گڑھی، جناب مولانا احسن مفتاحی رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند، والدہ محترمہ جناب مولانا راغب جمال صاحب، والدہ محترمہ جناب مولانا حکیم الدین صاحب قاسمی، والدہ محترمہ جناب ڈاکٹر سید محمد فاروق صاحب معروف سماجی کارکن، جناب حاجی علیم الدین صاحب قریشی میرٹھ، جناب عظمت اللہ صاحب خانقاہ بہار، مولانا حکیم محمد عثمان صاحب مقیم مدینہ منورہ عزیز جناب مولانا طاہر صاحب مظاہری آرگنائزر جمعیۃ علماء ہند، جناب نصر اللہ خان صاحب انگلینڈ، جناب مولانا محمد سعید صاحب بانکا بہار، محترمہ امیر بانو ہمشیرہ جناب حاجی محمد حنیف قریشی صاحب میرٹھ، حافظ رحیم الدین صاحب رائے پوری، جناب حاجی رمضان صاحب پرتاپ گڑھ، اہلیہ محترمہ جناب شاعر ملت حافظ محمد اسحاق صاحب سہارنپور، کارکن جمعیۃ علماء ہند جناب جاوید عالمی کاظمی کی خوش دامنہ کی بہن محترمہ نسیمہ خاتون صاحبہ، جناب حاجی محمد اجلال صدیقی رام نگر، جناب مولانا انعام الحق مفتاحی سہرسہ بہار، جناب علی حسن صاحب بھوج پور، جناب جمشید علی صاحب ٹھیکیدار مدرسہ حسینیہ کیلی، جناب سعادت علی صاحب کیلی، جناب محمد انعام الحق صاحب فرزند جناب مولانا ادریس صاحب م جناب حاجی محمد اسحاق صاحب چورو راجستھان، جناب منشی محمد عمر صاحب میرٹھ، الجمعیۃ کے کارکن جناب حاجی عبدالمنان صاحب کے والد محترم جناب حاجی محمد ظہیر صاحب، جناب حاجی محمد نیاز احمد صاحب مکرانہ، جناب حاجی احمد عبدارحمان اعلانی صدر جمعیۃ علماء پور بندر، جناب سید منظور عرف بابا اندوری، جناب مولانا محمد الیاس صاحب کھوڑہ کالونی، جناب حافظ محمد صدیق صاحب مرادآباد، جناب بھائی سلیمان صاحب ڈرائیور انجار گجرات، خوش دامن جناب مولانا عبدالمعید صاحب قاسمی ناظم تنظیم جمعیۃ علماء ہند، جناب عبدالحکیم صاحب کھتاڑی، جناب محمد اشتیاق صاحب گورکھپور، جناب محمد ابراہیم صاحب کھوکھر، محترمہ رخسانہ خاتون بھانجی جناب مولانا جلیس صاحب قاسمی؛ مولائے کریم ان تمام مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلٰی مقام عطا فرمائیں، آمین، یارب العالمین۔ آمین۔ □□